مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اسلامیات

دوسرا پرچہ

علوم اسلامیہ

(قرآن، حدیث، فقہ اسلامی، تصوف)

(ایم۔اے، سال اول)

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

(A Central University established by an Act of Parliament in 1998)

(Accredited "A" Grade by NAAC)

پروفیسر محمد میاں
شیخ الجامعہ

ڈاکٹر خواجہ محمد شاہد
نائب شیخ الجامعہ

پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال احمد
ڈائرکٹر

ڈاکٹر محمد فہیم اختر
کورس کوآرڈی نیٹر

خود اکتسابی مواد برائے

اسلامک اسٹڈیز (سال اول)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032

EPABX : 040-23008402/03/04

یونیورسٹی فون نمبر: 040-23006612-15

www.manuu.ac.in

طبع: RCL Technologies Limited 2014

تحریری معاونین

مصنفین:

نام	اکائیاں
پروفیسر شاہد علی عباسی	1 تا 6
مولانا عمر عابدین	7 تا 12
مولانا مصطفیٰ عبد القدوس	13 تا 19
پروفیسر اختر الواسع	20 تا 24

مدیرین:

ڈاکٹر محمد فہیم اختر

مولانا محمد اعظم ندوی

ڈاکٹر علیم اشرف جائسی

مدیر اعلیٰ: (تصحیح، تہذیب، ترتیب)

ڈاکٹر محمد فہیم اختر

اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

فہرست مضامین

بلاک 1 : قرآن

بلاک 2 : حدیث

بلاک 3 : فقہ اسلامی

بلاک 4 : تصوف

پیش لفظ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت 1998ء میں قائم ہوئی، ملک کی واحد مرکزی یونیورسٹی ہے، جہاں اردو زبان کے ذریعے مختلف مضامین کی تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ یونیورسٹی روایتی اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے تعلیم وتدریس کی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے جہاں روایتی تعلیم کے تحت سائنس اور سماجی علوم کے اندر پانچ سالہ مربوط پی جی پروگرام، سائنس، سماجی علوم، لسانیات، انتظامیہ وکامرس، تعلیم وتربیت اور صحافت وغیرہ کے مختلف مضامین میں یوجی اور پی جی کی سطح سے لے کر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک متعدد کورسز چلائے جارہے ہیں، وہیں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت انڈر گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ، سرٹی فیکیٹ اور ڈپلومہ کی سطحوں پر مختلف مضامین کے کورسز چلائے جارہے ہیں، جن کے ذریعہ پورے ملک کے طلبہ وطالبات کی ایک بہت بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہورہی ہے۔ روایتی تعلیم کے تحت جاری کورسز میں ایم اے 'اسلامیات' کا کورس بھی شامل ہے، جس کی دوسالہ تعلیم یونیورسٹی کے مرکزی کیمپس واقع حیدرآباد میں دی جارہی ہے۔

یونیورسٹی نے چند برسوں قبل فاصلاتی تعلیم کے تحت بی۔ اے کے تین سالہ کورس میں ایک اختیاری مضمون کے طور پر 'اسلامیات' (Islamic Studies) کو شامل کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار ملک کے اندر اردو زبان میں اسلامیات کا نصابی مواد فاصلاتی تعلیم کے نہج پر پیش کیا گیا تھا۔ بی اے کا یہ کورس کامیابی کے ساتھ جاری ہے، اور طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد 'اسلامیات' کے ساتھ بی اے کی تعلیم مکمل کرچکی ہے۔

اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ فاصلاتی نظام کے تحت 'اسلامیات' میں ایم اے کی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ ملک کے مختلف حصوں سے اس کے مطالبے بھی کئے جارہے تھے۔ اب اسی ضرورت اور طلبہ وطالبات کے تقاضوں کے پیش نظر ایم اے 'اسلامیات' کا آغاز کیا گیا ہے۔ زیرنظر کتاب اسی کورس کے لئے تیار کئے گئے 'خود تدریسی مواد، (Self Learning Material) کا مجموعہ ہے۔

ایم اے اسلامیات کورس کے لئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے جدید دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے نیا اور جامع نصاب تیار کیا ہے۔ اور اس نصاب کے مطابق اسلامیات کے ماہرین کی مدد سے درسی مواد تیار کئے گئے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو اس حوالہ سے دوبارہ یہ اعزاز حاصل ہورہا ہے کہ ملک میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں ایم اے اسلامیات کا درسی مواد معیاری سطح پر پیش کیا جارہا ہے۔ اور اس سے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت مکمل ہورہی ہے۔

اسلامیات کا موضوع بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں کے ڈیڑھ ہزار برس کے طویل دورانیہ پر مشتمل اور ہندوستان کے بشمول دنیا کے ایک بڑے حصہ میں پھیلے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ وثقافت اور علوم وفنون کے میدانوں کی سرگرمیوں کا احاطہ شامل ہے۔ اس لئے اسلامیات کا موضوع نہ صرف سماج کے ایسے متعدد پہلوؤں کے مطالعہ کا موقع فراہم کرتا ہے جو انسانی زندگی سے گہرا ربط رکھتے ہیں' بلکہ انسانی سماج کے گوناگوں مسائل کے بارے میں گہری بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔

ایم اے اسلامیات کا یہ کورس آٹھ پرچوں پر محیط ہے، جسے دو سال کی تعلیم کے دوران مکمل کیا جائے گا۔ سال اول کے چار پرچوں میں اسلام کے تعارف اور بنیادی تعلیمات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسلامی علوم کے تحت قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی وتصوف کے موضوعات کا جامع تعارف پیش کرتے ہوئے ان میدانوں میں ہونے والے علمی کاموں اور اصحاب کار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کے مختلف میدانوں سے متعلق اسلامی افکار ونظریات اور ان کی تشکیل میں حصہ لینے والے مسلم اسکالرس اسلامیات کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس موضوع پر اسلام کے سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظریات کے عناوین کے تحت متعدد اکائیوں کے تحت جامع اور تجزیاتی بحث کی گئی ہے۔ اسی ضمن میں عصر حاضر کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اٹھنے والے اہم ترین سوالات اور مسائل جیسے اسلام اور حقوق انسانی، اسلام اور ماحولیات، اسلام اور خواتین اور اسی طرح اسلام اور علم کے موضوعات پر اسلامی تصورات اور تعلیمات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مسلم تہذیب وثقافت کی تاریخ کے ذیل میں ماقبل اسلام عرب سماج کے مذہبی واخلاقی احوال، اسلام کی آمد، عہد نبوی ﷺ کے مکی اور مدنی دور، خلافت راشدہ، عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس کی ثقافتی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر مشرق اور مغرب میں قائم ہونے والی چھوٹی خاندانی حکومتوں کی تمدنی تاریخ کے علاوہ عہد عثمانی کی جامع تاریخ وثقافت پر گفتگو کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب سال اول کا دوسرا پرچہ ہے، جو ''علوم اسلامیہ'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس کے چار بلاک قرآن، حدیث، فقہ اسلامی اور تصوف کے موضوعات پر ہیں۔ ان چار بلاکوں میں چوبیس اکائیوں کے تحت علوم اسلامیہ کے چاروں مضامین پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ان مضامین کے تعارف اور ان پر ہونے والے کاموں کے تاریخی تسلسل کے ساتھ معاصر مباحث کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، نیز ان میدانوں میں ہندوستانی اہل علم وفن کی خدمات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

یونیورسٹی نے اس نصابی مواد کی تیاری میں ممتاز ماہرین اسلامیات اور دانشورانِ فن سے استفادہ کیا ہے، جنھوں نے بڑی محنت اور استناد کے ساتھ اسے تیار کرکے یونیورسٹی کو اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اسلامیات کے طلبہ وطالبات کی ضرورت بہتر طور پر پوری کرے گی، ساتھ ہی اسلامی مطالعات کے باب میں قابل قدر استفادہ کا باعث بنے گی۔

پروفیسر محمد میاں

شیخ الجامعہ

بلاک:1 قرآن

فہرست

اکائی 1 : تعارف اور جمع وتدوین

اکائی کے اجزاء

1.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ اس بات سے واقف ہوجائیں گے کہ قرآن کا نزول کس طرح ہوا، اس کی جمع وتدوین کے کیا مراحل رہے۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہوں گے کہ دورنبوی ﷺ میں ممتاز حفاظ صحابہ وصحابیات کون تھے، نیز انھیں فن تجوید، فن کتابت اور قراء کرام کے بارے میں بتایا جائے گا۔

1.2 تمہید

اس اکائی میں قرآن مجید کا اجمالی تعارف کرایا جائے گا۔ نیز قرآن مجید کے جمع وتدوین سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ممتاز حفاظ صحابہ کرام اور صحابیات کا ذکر اور فنِ کتابت سے واقف صحابہ اور فنِ کتابت کے اصول کو بیان کیا جائے گا۔ تجوید تلاوت کی زینت ہے، چنانچہ تجوید اور قراء سبعہ کی شخصیت وروایت کے بارے میں بتایا جائے گا۔

1.3 تعارف

تمام مسلمانوں کا ایمان وایقان ہے کہ قرآن مجید اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی تنزیل کردہ کتابوں میں آخری کتاب ہے۔ جو خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے رفتہ رفتہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں نازل کی گئی۔ یہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا انسانیت کے نام آخری پیغام ہے جس میں تمام انسانوں کے انفرادی واجتماعی، سیاسی واقتصادی، اخلاقی ومعاشرتی، فکری وجذباتی، باطنی وظاہری، انتظامی وقانونی، مادی وروحانی مسائل کا تدارک وحل ہیں۔ اس میں فوز وفلاح کی راہیں، اللہ کے عذاب سے بچنے کے راستے اور جہنم کے امکانی عذاب سے نجات کے طریقے بیان ہوئے ہیں، یہ کمال انسانیت کے حصول کی خاطر مقصد تخلیق انسانی (عبدیت، عبادت وعبودیت) اور قرب ورضائے الٰہی کی تحصیل کا مظہر، علم وحکمت، فراست اور تفقہ وتفکر وتدبر ونورِ حق سے منور پیکر ہے۔

اس کے مخاطب سارے انسان ہیں۔ خاتم النبیین ﷺ کی بعثت کے بعد رنگ، نسل، قومیت، وطن، زبان، زمان ومکان سب پر احاطہ کیے اس کے مضامین وآیات اس کے شاہد ہیں۔ مثلاً: 1) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا 2) اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔ عرب ہو یا عجم، جاپانی ہوں یا چینی، ترک ہوں یا دیلمی، جنوب مشرقی ایشیائی ہوں یا افریقی، امریکی ہوں یا یوروپی، سرخ وسفید ہوں یا بھورے وکالے سب اس سے رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں۔

قرآن مجید کے موضوعات بے شمار ہیں۔ اللہ رب العٰلمین، انسان، دماغ، روح، حق وباطل، حقیقت ومظہر، فضائل اخلاق، رذائل اخلاق، علم، عقل، حکمت، نیکی، بدی، تخلیق کائنات، وقت، مکان، حیات، موت، حیات بعد الممات، قیامت، حشر، حساب کتاب، سوال جواب، جنت جہنم، بارش، خشک سالی، زلزلے، آفات سماوی، فطرت انسانی، فناء انشاء جدیدہ کا سلسلہ، نکاح وطلاق، ایک زوجگی یا چند زوجگی، حیض ونفاس، وضو وغسل، جائیداد، تجارت، اثاثہ، نفع ونقصان، وراثت، حصول واشاعت علم، دعوت وتبلیغ دین، فنون لطیفہ، سنگ تراشی، تصویر کشی، موسیقی، زن وشوہر، لڑکے ولڑکیاں، ماں، باپ، بہن بھائی ودیگر اقارب، دوست، پڑوسی، سب کے حقوق وفرائض، امن وجنگ، حلال وحرام، ذرائع آمدنی، اوامر ونواہی، کبیرہ وصغیرہ گناہ، جسمانی وروحانی، پاکی وناپاکی، اللہ رب العٰلمین کی خوشنودی کا حصول، ذکر وفکر، تدبر فی القرآن، ایمانیات، عبادات، معاملات، معاشرت، عقوبات (قصاص وحدود) تزکیہ وتہذیب نفس، جہاد فی سبیل اللہ، سیرت رسول، کردار سازی، انبیاء ورسولوں اور گذشتہ اقوام کے واقعات، غرض کیا ہے جو قرآن مجید میں نہیں۔ سچ کہا اللہ نے (جَلَّ جلالُه و عم نَوالُه): تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (ہر چیز کا بیان ہے) اور هُدًى لِّلنَّاسِ (تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے)۔ لیکن دو باتیں سامنے رکھنی ضروری ہیں۔

1. اللہ رب العٰلمین کی مرضیات ونامرضیات سے متعلق تمام امور میں عبارۃً یا دلالۃً یا اقتضاءً قرآن مجید میں بیانًا لِّكُلِّ شيءٍ کی شان ہے۔

2. قرآن مجید نہ فلسفہ کی کتاب ہے نہ علم سیاست کی، نہ علم معاشیات کی، نہ علم تجارت کی، نہ علم تاریخ کی، نہ علم سماجیات کی، نہ علم نفسیات کی، نہ علم ادب کی، نہ فن تعمیر کی، نہ فنون لطیفہ کی، نہ علم حیاتیات کی، نہ علم طب کی، نہ علم الحساب، نہ علم طبیعات کی، نہ علم فلکیات کی، نہ علم نظم ونسق کی، نہ قانون کی، نہ اخلاق کی۔ جیسے کہ آج ان علوم نے شکل اختیار کی ہے اور ان کے مضامین ومشمولات جن میں بکثرت تغیر ہو رہا ہے اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ ان کا جزو لازم کیا ہے؟ ان تمام علوم میں حالات وزمانے کے اعتبار سے ترقی ہوتی رہتی ہے، نئے نتائج سامنے آتے رہتے ہیں۔ مثلاً حیاتیات، علم فلکیات، علم طبیعات میں خیال، نظریہ، قانون اور مسلمہ حقیقت کے درمیان فرق کیا جاتا ہے جن کا علم رکھنا ضروری ہے۔ ان عام علوم میں جو علوم نافع اور تعمیری مزاج رکھتے ہوں، ان میں اور قرآن مجید میں بہت سارے حقائق مشترک ہیں۔

اللہ سبحانہٗ کی صفات وافعال کے اسماء قاری کو ناقابل تصور حقیقت کا کسی قدر ادراک عطا کرتے ہیں، وہ اللہ کے حسن وجمال، اس کی صفات کمالیہ وجمالیہ وجلالیہ، اس کی عظمت وکبریائی، اس کی قدرت کی نیرنگی، اس کی لامتناہی ہمہ گیری، اس کی وحدت ذاتی، اس کے خواص الوہیت، اس کی مرضیات، اس کی مشیت مطلقہ کی ہمہ گیری، اس کی رحمانیت ورحمت کی وسعت، اس کی صفت مغفرت، اس کی عطائیں، اس کی نعمتیں، اس کے عجائب قدرت، اس کی مخلوق کے لئے محبت، اس کی جباریت وقہاریت وسرعت عقاب انسانوں کو اللہ کے ذکر واستحضار اور عفوو درگزر و بخشش کے لئے اسی کی بارگاہ میں دست دُعا بلند کرنے کی قوی تحریک کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کے تئیں جذبات محبت وانس وسکون وعبدیت وعبادت میں غرق کر دیتے ہیں اور انسان اللہ سبحانہٗ کے اخلاق کا پرتو بننے کی کوشش اور عقیدہ توحید وطریقہ تفویض میں سلامتی کا بچشم خود معائنہ کرتا ہے۔

ایمانیات میں اللہ کی ذات تمام صفات وافعال میں یکتائی، اس کے فرشتوں، اس کے انبیاء ورسولوں، اس کی کتابوں، یوم آخر، حشر اجساد، اللہ کی بارگاہ میں حساب اور اس کے نوشتہ تقدیر (اچھا ہو یا بُرا) اسی کے اذن وحکم سے ہوتا ہے اور نعمتیں ہوں یا بلائیں اسی کی طرف سے یا تو سزا یا آزمائشیں ہیں۔ مومن کے لئے ہر مصیبت میں رحمت پوشیدہ ہے بشرطیکہ وہ اشارہ سمجھ کر اپنی لغزشوں، غفلتوں اور نافرمانیوں پر توبہ نصوح کر کے صبر کرے گا تو اس کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے گا اور اللہ کی شعوری معیت حاصل ہوگی اور اگر شکر ادا کرے گا تو رفع درجات ہوگا ان شاء اللہ۔ ایمان درحقیقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل پیغام کی بصدق دل تصدیق کا نام ہے جو اللہ کی وحدت اور محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے زبان سے اعتراف اور جوارح سے اس تصدیق واعتراف کی توثیق ہی سے محقق ہوتا ہے۔

عبادات میں پانچ وقت پابندی سے جماعت سے نماز اپنی تمام صفات کے ساتھ پڑھنا جن میں اللہ کے قوی استحضار کا غلبہ ہو، رمضان کے مہینہ میں بشرط صحت وقیام در وطن تمام فرائض وواجبات کے ساتھ خالصتہً لوجہ اللہ روزہ رکھنا، زکوٰۃ ہر سال خوشی خوشی ادا کرنا، حج بشرط استطاعت عمر میں ایک بار ادا کرنا، جو مانگنا اللہ تبارک وتعالیٰ ہی سے مانگنا، جب حالات کا تقاضہ ہو تو امام کے حکم جہاد پر لبیک کہنا، اللہ کے ذکر سے زبان وقلب معطر رکھنا، احکام قرآن کے سانچہ میں ذہن وقلب وروح وبدن وعمل ڈھال لینا مقصود ومطلوب ہیں۔

تمام صلاحیتیں وجود انسانی، دماغ، ہاتھ پیر، جسم کا اندرونی نظام، حواس خمسہ، زندگی، وقت، توانائی، علم، عقل وعمل وغیرہ سب اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں، ان کو اللہ کی مرضیات کے حصول کے لئے استعمال کرنا اور اللہ کی نامرضیات سے بچانا ضروری ہے۔ صحابہ کرام کا خیرامت کے منصب تک پہونچنا دشوار تھا جب تک وہ اس سے بخوبی آگاہ نہ ہوجاتے۔ اس طرح صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد نے قرآن کریم کے طریقۂ تلاوت کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم وعمل بھی سیکھ لیا۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ اور فرمایا: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ، ان آیات میں تدبر اور عقل سے کام لینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

1.4 جمع قرآن

1. رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید تقریباً 22 سال چھ ماہ (جسے کبھی 23 سال سے بھی تعبیر کردیا جاتا ہے) کے عرصہ میں حسب موقع وحسب ضرورت تدریجاً قطعات (ٹکڑوں) کی صورت میں نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وقال الذین کفروا لولا نُزِّل علیہ القراٰن جملۃً واحدۃً کذلک لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُوَادکَ وَ رَتَّلْنٰہُ تَرْتِیلاً (الفرقان:32)۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: لا تُحَرِّکْ بِہٖ لِساَنَکَ لِتَعجَلَ بہ، اِنَّ علیناَ جَمعَہٗ و قُرءانَہٗ، فَاِ ذَا قَرَاْنٰہُ فَا تَّبِعْ قُرانَہٗ (القیامۃ:16-18)۔ اور تیسرے مقام پر فرمایا: اَناَّ نحن نزّلناَ الذِّکرَ و اِناَّ لَہٗ لَحاَ فِظُوْنَ (الحج:9)۔ بعض سورتیں مکمل یکبارگی نازل ہوئیں (مثلاً سورۃ الکوثر، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفاتحہ، سورۃ براءۃ) اور بعض سورتوں کے اجزاء وآیات مختلف موقعوں پر نازل ہوتے رہے۔ مکی ومدنی (ماقبل ہجرت ومابعد ہجرت) دور میں یہ بھی ہوا کہ منشاء الٰہی کے مطابق بعض سورتوں کا کچھ حصہ مکی دور میں نازل ہوا اور ماقبی مدنی دور میں۔ بہر حال قرآن مجید نازل ہوتا رہا اور رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قلم آشنا افراد صحابہ کو نازل شدہ آیات نزول وحی کے فوری بعد لکھواتے رہے۔ لکھوانے کے بعد بالالتزام کاتب وحی سے لکھا ہوا حصہ سنتے رہے تاکہ کتاب تصحیف سماعت وتصحیف کتابت وتصحیف بصارت وتصحیف قراءت سے محفوظ رہے۔ اطمینان صحت کے بعد متعلقہ کاتب وحی کو تلقین کرتے رہے کہ وہ تازہ نازل شدہ آیات دوسروں تک پہنچادے تاکہ دیگر اصحاب اگر لکھ سکتے ہوں تو لکھ لیں ورنہ کم ازکم یاد کرلیں۔ معروف روایت کے مطابق قبیلہ قریش میں لکھنے پڑھنے کا رواج کم ہونے کے سبب کوئی سترہ افراد ہی فن کتابت سے آشنا تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہی کتابت وحی کی خدمت انجام دی۔ جن اشیاء پر کتاب اللہ پہلے مرحلہ میں لکھی گئی ان میں پتلے مسطح پتھر، کھجور کی شاخیں، اونٹ کے محمل، گھوڑے کی زین، اونٹ بکری، بھیڑ وغیرہ کی شانے کی ڈھلی ہوئی ہڈیاں، ان ہی کی دباغت شدہ پاک کھال، باریک چمڑہ مہرق (حریر) اور تختیاں شامل تھیں۔ قرآن مجید میں کتاب، صحف، رق منشور، قراطیس کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

2. قرآن مجید کا جتنا حصہ لکھ لیا جاتا، اسے یاد کرلیا جاتا، کثرت سے تلاوت کیا جاتا، نمازوں میں پڑھا جاتا، ایک دوسرے کو سنایا جاتا، تاکہ غلطیوں کی فی الفور تصحیح ہوجائے اور حفظ پختہ سے پختہ تر ہوتا جائے۔ مختلف اوقات میں مختلف سورتیں یا مختلف آیات پڑھنے کے فوائد وفضائل ذوق تلاوت کو مہمیز دینے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا استحضار صحابہ کرام کو چوکنا رکھتا، ان کی خوش الحانی اور خشیت قلبی میں اضافہ کرتا اور قرآن مجید کی تلاوت کی کشش کوئی بھی موقع گنوانے سے انھیں دور رکھتی، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ

خودفرماتا ہے: الذین یذکرون اللّٰہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السمٰوٰتِ والارضِ ربّنا ما خلقت ھٰذا باطلاً سبحانک فقنا عذاب النّار (ال عمران: 191)۔ قرآن مجید کی آیات پرعمل ان کا مقصداور معانی قرآن پر تفکر وتدبران کا مزاج بن گیا تھا۔

3. قرآن مجید کی تازہ نازل شدہ آیات کوکس سورت میں، کن آیات سے پہلے یا کن آیات کے بعد درج کیا جانا ہے اس کی بھی ہدایت فرما دیتے تاکہ کسی قسم کے اشتباہ کوراہ نہ ملے۔

4. قرآن مجید کے حفظ کے فضائل بیان فرماتے ۔مسند امام احمد بن حنبل، سنن ترمذی، سنن ابی داوداورسنن نسائی میں روایت نقل کی گئی ہے کہ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور چڑھتا جا، تمہاری منزل وہاں ہے جہاں تم آخری آیت پڑھوگے: یقال لصاحب القراٰن اقراء وارق ورتل کماکنت ترتل فی الدنیا فان منزلک عند اٰخر اٰیۃ تقرء ھا۔صحیح بخاری میں ہے کہ سب سے افضل شخص وہ ہے جوقرآن سیکھے اورسکھائے: ان افضلکم من تعلم القراٰن وعلمہ۔صحیحین میں روایت کی گئی ہے کہ قرآن کو پڑھتے رہا کروورنہ یہ اس طرح ذہن سے نکل جائے گا جس طرح اونٹ اپنی رسی سے نکل جاتا ہے: تعاھدوا القراٰن فوالذی نفسی بیدہ ھو اشد تفصیاً من الابل فی عقلھا۔چنانچہ صحابہ کرام کا معمول رہا کہ قرآن مجید کا جوحصہ نازل ہوتا اسے فوراً حفظ کر لیتے، بئر معونہ کے سانحہ میں قرآن مجید کی تعلیم کے لئے بھیجے گئے ستر (70) حفاظ قرآن صحابہ شہید کر دیے گئے۔اس ایک واقعہ سے کثرت حفاظ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

5. جیسے جیسے نئے نئے قبائل اور نئے نئے قریے مشرف بہ اسلام ہونے یا اسلام کے بارے میں جاننے کی دلچسپی ظاہر کرتے ان کے پاس حفاظ قرآن روانہ کئے جاتے تاکہ اسلام کی بنیادی کتاب ان تک پہنچ جائے۔

6. مخصوص سورتوں کو خاص خاص موقعوں پر (مثلاً سونے سے پہلے سورہ اخلاص ومعوذتین) تلاوت کرنے کے دینوی (مثلاً سورہ واقعہ سے فاقہ کشی دور ہونے) واخروی (مثلاً سورہ فاتحہ کے نصف قرآن، سورہ اخلاص کے ثلث قرآن، سورہ یٰسں کی تلاوت کے دس مرتبہ قرآن ختم کرنے کے اجر کے برابر) فوائد ارشاد فرماتے اور صحابہ کرام فوراً عمل پیرا ہو جاتے۔

7. قرآن مجید دیکھ کر پڑھنے کی فضیلت بیان فرماتے جس کے لئے قرآن مجید کا لکھا ہونا ضروری ہوتا۔

8. قرآن مجید نماز میں کثرت سے پڑھنے کی ترغیب دیتے اور خود بھی اس پر عمل فرماتے۔

9. کم خواندہ افراد کو اٹک اٹک کر پڑھنے کے دہرے ثواب سے آگاہ فرماتے۔چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں حضرت عائشہ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ جوشخص قرآن پڑھنے میں دشواری محسوس کرتا ہے اور اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اس دوہرا اجر ملے گا: مثل الذی یقرء القراٰن وھو حافظ لہ مع السفرۃ الکرام ومثل الذی یتعاھدہ و ھو علیہ شدید فلہ اجران۔

10. مختلف صحابہ کرام کو تلاوت قرآن کا حکم فرماتے اوران کے حسن قراءت کی تعریف فرماتے۔بعض خوش الحان صحابہ سے قرآن سن کران کو تلاوت کے موقع پر بڑی حکمت سے خشیت قلبی واشکباری کی طرف توجہ دلاتے۔

11. قرآن مجید کی سورتوں کے ناموں سے صحابہ کرام کو مطلع فرماتے تاکہ سورتوں میں باہم تمیز ہو سکے۔ بعض سورتوں کے متعدد نام غالباً ان سورتوں کے متعدد اوصاف کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

12. بعض سورتوں کی تلاوت کا اجر خصوصی یا فائدہ بیان فرماتے۔ ان میں سورہ یٰس، فاتحہ، اخلاص، کافرون، زلزال، تکاثر، زھراوین، ملک، معوذتین شامل ہیں۔

13. قرآن مجید کا جتنا حصہ نازل ہو چکا ہوتا اسے ہر سال حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ماہ رمضان میں سناتے، عرضہ اخیرہ (آخری مذاکرہ) میں قرآن مجید کو دو مرتبہ حضرت جبرئیل کو سنایا، اس موقع پر حضرت زید بن ثابت کو بھی مکمل قرآن دو بار سننے کی سعادت ملی۔

14. قرآن مجید سیکھنے اور سکھانے والے کی بابت فرمایا: **خیر کم من تعلم القران وعلّمه**. کیا اس میں سماعت، کتابت، قراءت، تلقین، تحفیظ، تبلیغ، تفہیم، تدریس، توضیح، تفسیر، تبیین، تفکر و تدبر، باہمی مذاکرہ، مزاولت، وممارست سب نہیں آگئے؟ اور کیا صحابہ کرام سے لے کر اخلاف تک یہ سب امور ثابت نہیں؟

15. مدینہ طیبہ تشریف آوری کے کچھ عرصہ کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ جس نے بھی کتاب اللہ کے ساتھ کوئی لفظ یا عبارت (توضیحی، تفسیر، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) لکھا ہو وہ اس کو مٹا دے **فلیمحه**۔ پھر جب یہ اطمینان ہو گیا کہ اب کلام الٰہی اور کلام بشری میں کسی قسم کا خلط ملط نہیں ہو گا، لکھنے کی جازت دے دی۔

16. جزیرۃ العرب میں مختلف قبائل آباد تھے جن کے لہجے، لغات، روزمرہ، محاورے اور طریقہ تلفظ جدا جدا تھے، اور قرآن مجید عربی مبین میں نازل ہو رہا تھا، اس کے مخاطب اول بلحاظ تاریخ قبیلہ قریش اور مخاطب دوم دیگر قبائل تھے۔ آپؐ نے فرمایا: انزل القران علی سبعة احرف (قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا) (علامہ سیوطی نے الازھار المتناثرہ میں اسے متواتر احادیث میں شمار کیا ہے)۔ قرآن مجید کی متنی ولغوی تحقیق کے ماہر علماء جانتے ہیں کہ اس سے قرآن مجید کے لسانی ومعنوی فوائد کا دائرہ کتنا وسیع ہو گیا۔

17. قرآن مجید کی جو آیات منسوخ التلاوۃ ہو جاتیں ان پر خط تنسیخ پھیرنے کا حکم فرما دیتے۔

1.5 ممتاز حفاظ صحابہ وصحابیات

صحابہ وصحابیات میں بے شمار افراد نے قرآن مجید حفظ کیا تھا ان میں چند افراد کے نام ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

1) حضرت ابوبکر صدیق 2) عمر بن الخطاب 3) عثمان بن عفان 4) علی بن ابی طالب 5) عبداللہ بن عمرو بن العاص 6) عبداللہ بن مسعود 7) عبداللہ بن عمر 8) ابی بن کعب 9) معاذ بن جبل 10) زید بن ثابت 11) ابو زید 12) ابوالدرداء 13) قیس بن صعصعہ 14) سعد بن منذر 15) عقبہ بن عامر الجہنی 16) تمیم الداری 17) معاذ بن حارث 18) عبداللہ بن سائب 19) سعد بن عبید بن نعمان 20) مسلمہ بن مخلد 21) سالم مولی ابی حذیفہ 22) طلحہ بن عبداللہ 23) سعد بن ابی وقاص

24) حذیفہ بن الیمان 25) ابو موسیٰ الاشعری 26) ابو ہریرۃ 27) عبادۃ بن صامت 28) ابوحلیمہ معاذ 29) مجمع بن حارثہ 30) فضالہ بن عبید 31) عمرو بن العاص 32) سعد بن عبادہ 33) عبد اللہ بن عباس 34) ابو ایوب انصاری 35) عبید بن معاویہ 36) سلیمان بن ابی حثمۃ 37) عبداللہ ذوالبجادین 38) ام المومنین عائشہ 39) ام المومنین حفصہ 40) ام ورقہ (طبقات ابن سعد، صحیح بخاری، فتح الباری للعسقلانی، جامع ترمذی، سنن ابی داود، کنز العمال، الاستیعاب امام بن عبدالبر، اسد الغابہ لابن اثیر، مفتاح السعادۃ لطاش کبری زادہ، تہذیب الکمال للمزی، تذکرہ الحفاظ للذھبی تہذیب التہذیب للعسقلانی، الاصحابہ للعسقلانی)

صحیح بخاری کی ایک روایت میں حضرت انس سے ابی بن کعب، معاذ، زید اور ابو زید کی بابت جمع قرآن کی صراحت ملتی ہے اور دوسری روایت میں ابی بن کعب کے نام کی جگہ ابو الدرداء کا نام ملتا ہے، بعض لوگوں کو جمع قرآن سے صرف حفظ قرآن کا دھوکا ہوا ہے اور بعض دوسرے لوگوں نے اس کو حصر پر محمول کیا حالانکہ سیاق وسباق پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ کلمہ فخر ہے نہ کہ کلمہ حصر جو اوس اور خزرج کے درمیان ہوئے ایک مباحثہ میں حضرت انس نے اوس پر خزرج کی فضیلت جاننے کے لئے ارشاد فرمایا تھا۔ مزید برآں خزرج سے مکمل قرآن کو قید کتابت میں لانے والے مراد تھے نہ کہ حفظ کرنے والے، ورنہ جب حضرت عمر نے اپنے امراء سے حفاظ قرآن کی فہرستیں طلب کی تھیں تو ابو موسیٰ الاشعری نے اپنے علاقہ کے تین سو سے زائد افراد کی فہرست روانہ کی تھی جس سے دوسرے علاقوں میں حفاظ کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

1.6 صحابہ اور فن کتابت

صحابہ کرام میں جو فن کتابت سے بخوبی واقف تھے ان میں خلفاء اربعہ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے علاوہ 1) عبداللہ بن ارقم 2) حنظلہ بن ربیع 3) عمرو بن رافع 4) اوس بن خولی 5) ابوعبس عبدالرحمٰن 6) ابی بن کعب 7) ام المومنین حفصہ بنت عمر 8) سعد بن ربیع 9) شھر بن سعد 10) عبداللہ بن زید 11) ابوخزیمہ بن ثابت 12) منذر بن عمر 13) اسید بن حضیر 14) سعد بن عبادہ 15) رافع بن مالک 16) زید بن ثابت 17) ابوزید 18) ابوالدرداء 19) معاذ بن جبل 20) عبداللہ بن رواحہ 21) ابو یونس مولی ام المومنین عائشہ 22) عبدالرحمٰن بن حر 23) عبداللہ بن سعید 24) نافع بن طریب 25) زبیر بن العوام 26) سعید بن العاص 27) علاء الحضرمی 28) خالد بن ولید 29) محمد بن مسلمہ 30) عبداللہ بن عبداللہ بن ابی سلول 31) مغیرہ بن شعبہ 32) شرحبیل بن حسنہ 33) عبداللہ بن ابی سرح 34) خباب بن الات کے نام ملتے ہیں جن میں متعدد صحابہ نے کتابت وحی میں بھی حصہ لیا۔ غزوہ بدر کے بعد یہ تعداد غیر معمولی تیزی سے بڑھی۔ اس فہرست میں مندرجہ بعض افراد مثلاً زید بن ثابت نے غزوہ بدر کے بعد ہی مکی قیدیوں سے ہی فن کتابت وقراءت سیکھا۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کی فوج کے ہاتھوں ستر (۷۰) حفاظ قرآن کی شہادت، حضرت عمر کا اضطراب اور حضرت ابوبکر پر جمع قرآن کے لئے بار بار اصرار، حضرت ابوبکر کا انکار پھر بالآخر رضامندی، زید بن ثابت کا تقرر، اسلامی ریاست میں عہد رسول میں آپؐ کے حکم پر لکھی گئی، رسول کو سنائی گئی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

اطمینان کے بعد دوسروں تک پہنچائی گئی آیات دارالخلافہ لانے اور زید بن ثابت کو دو گواہوں کے ساتھ ان آیات کو دینے کا عام اعلان، سورہ توبہ کی آخری دو آیتوں کی ابوخزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس دستیابی، المصحف الامام کی تیاری اور خلیفہ سوم حضرت عثمان ذوالنورین کے زمانہ خلافت میں حذیفہ بن الیمان کی توجہ دہانی پر قرآن مجید کے سات یا آٹھ نسخوں کا اہتمام اور دیگر نسخوں کا احراق ایسے موضوعات ہیں جن پر بعض محقق علماء نے بہت سخت جرح کی ہے لیکن خاکسار ان روایتوں کو رد کرنے کی بوجوہ ضرورت نہیں محسوس کرتا کیونکہ ان سے تحفظ قرآن پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

1. رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول قوی یا ضعیف کوئی ایسی روایت نہیں ملی جس میں آپ کو صراحۃً بتا دیا گیا ہو کہ آخری آیت نازل ہو چکی لہٰذا قرآن مجید کو یکجا لکھوا دیجئے۔ یعنی عقلاً اس کا امکان باقی تھا کہ مزید کوئی سورۃ یا کوئی آیت نازل ہوتی۔

2. قرآن مجید مختلف اشیاء پر لکھا جمع تھا، لیکن ترتیب کے بارے میں صرف حفاظ قرآن یا کاتب و جامع ہی جانتے تھے۔ اگر ان سب کے گزر جانے کے بعد ترتیب بگڑ جاتی یا توضیحی وتفسیری عبارت کو جامع و کاتب کے ورثہ قرآن کا جزء ماننے لگتے تو اختلاف کی یکسوئی کیسے ہوتی؟

3. روایات کے بعض اجزاء سے قطع نظر جو جزء حاصل روایات ہے وہ ہے قرآن مجید کا بین الدفتین جمع کیا جانا۔ اگر کوئی قوی شہادت ایسی مل جاتی ہے جس کی رُو سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی میں آپؐ کے حکم پر قرآن مجید کو مجلد شکل دے دی گئی ہو تو راقم اپنے موقف سے رجوع کرلے گا۔

4. صحابہ کرام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا، آپ کو قرآن سنایا، اپنے اپنے نسخے تیار کیے اور جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر کے یا آپؐ کے خطاب میں قرآنی لغات وآیات پر توضیحی یا تفسیری اہم نکات سن کر اپنے نسخوں میں حاشیہ میں یا بین السطور، خاص اپنی رہنمائی کے لئے درج کر لیے۔ اس کا اندیشہ بہر حال تھا کہ صحابہ کے ورثہ میں سے کوئی فرد تحریر کی یکسانیت کے باعث اشتباہ میں پڑ جاتا اور یہ اشتباہ منافقین ومفسدین کی شرارت سے اختلاف میں اور اختلاف تفرقہ میں بدل جاتا۔ جب بیبا کی اور قصور فہم کے سبب ایک فرقہ وجود میں آسکتا تھا تو سبائی فتنہ تحریری شہادت کو بآسانی تفریق کو ہوا دینے کے لئے مضبوط بنیاد بنا سکتا تھا۔ ایسا نہ ہونا قرآن کی صحت پر قوی دلیل ہے۔

5. یہ ممکن ہے کہ روایات میں ادراج ہوا ہو لیکن سرے سے ان روایات یا واقعات کا انکار کر دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

6. رہی بات عبداللہ بن مسعود، سورۃ الفاتحہ اور معوذتین کی، یا ابی بن کعب اور دعائے قنوت کی، یا مزعومہ ترتیب عثمانی کی تو تواتر سے ثابت روایات کے مقابلہ میں ان اخبار احاد وضعاف کی کوئی اہمیت نہیں۔ پھر قراءات متواترہ سے امام عاصم کوفی، امام کسائی، امام حمزہ اور امام خلف سے جو قراءات اور نسخے ہم تک پہنچے ہیں ان میں سورہ فاتحہ اور معوذتین شامل ہیں، دعائے قنوت شامل نہیں اور ترتیب وہی ہے جو عرضہ اخیرہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سنائی تھی اور جو تواتر سے بفضل اللہ ہم تک پہنچی۔ تواتر لفظی اور تواتر طبقہ کے ہوتے غریب روایات کو ترجیح دینا تحقیق نہیں فریب اور کج فہمی ہے۔

7. ڈاکٹر سید وحید الدین (پروفیسر شعبہ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ، دہلی یونیورسٹی و جامعہ ہمدرد) دوسری جنگ عظیم کے موقع پر جرمنی میں بغرض تحصیل دکتورۃ موجود تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ خاکسار سے ایک نجی ملاقات میں بتایا کہ جرمنی میں ایک مرکز برائے تحقیق کتب آسمانی قائم کیا گیا تھا جس میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے قدیم مخطوطات کے متون کی تقابلی تحقیق جاری تھی، ابتدائی نتائج نے محققین کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا کہ یہودیت و نصرانیت کی بنیادی مخطوط کتابوں میں دو لاکھ سے زائد ناقابل حل اختلافات پائے گئے تھے۔ پھر انھوں نے قرآن مجید کی طرف توجہ کی اور سینکڑوں یا ہزاروں قدیم مخطوطات ومطبوعات اور ان کی فلمیں بنوا کر ان کا تقابلی مطالعہ کیا تو ابتدائی نتائج نے انھیں حیران کر دیا کیونکہ انھیں چند سو سے زیادہ اختلافات ملے اور ان اختلافات کی نوعیت ایسی تھی کہ بآسانی حل کر لئے جاتے مثلاً زیر، زبر یا نقطہ کسی کسی نسخہ میں رہ گیا تھا۔ تحقیق کا کام آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اتحادی افواج کی جانب سے داغے گئے بم اس مرکز کی عمارت پر گرے اور وہ عمارت اپنے اس بے بہا خزانہ کے ساتھ مکمل تباہ ہوگئی۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے خطبات بھاولپور سے اس بیان کی توثیق ہوتی ہے۔

جمع قرآن کا دوسرا مرحلہ آیا جب حضرت ابوبکر کو نبوت کا جھوٹا دعوی کرنے والوں، مرتدوں، اور زکوٰۃ مرکز مدینہ طیبہ بھیجنے سے انکار کرنے والوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حین حیات متعدد لوگ خود ساختہ نبی بن کر میدان میں کود پڑے تھے، ان میں اسود عنسی، طلیحہ، اور ایک خاتون سجاح بھی شامل تھے۔ چنانچہ تین محاذوں پر جنگ چھڑ گئی، اللہ تعالیٰ کا دین سب پر غالب آیا، طلیحہ اور سجاح ارتداد سے توبہ کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے لیکن اسود عنسی کے ساتھ جو جنگ یمامہ میں ہوئی اس میں کثرت سے حفاظ قرآن شہید ہو گئے، حضرت عمر کو خیال ہوا کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ممات دنیوی سے مستثنیٰ نہ تھے تو ہم کسی شمار میں؟ اگر اوراق قرآن ہماری موت کے بعد منتشر ہو گئے تو تحفیظ قرآن پر اختلاف چھڑ سکتا ہے اور جو شکل توراۃ، زبور اور انجیل کے ساتھ پیش آئی وہی قرآن کریم کے ساتھ بھی پیش آسکتی ہے، چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر کو اس کی طرف متوجہ کیا، حضرت ابوبکر کا موقف ابتدا میں یہ رہا کہ جو کام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا میں بھلا کیسے کر سکتا ہوں۔ حضرت عمر کے پیہم اصرار اور دلائل پر وہ مان گئے کہ حفاظت قرآن کے لئے باتفاق آراء ایک متن جس کی بنیاد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے املاء، سماعت، تصحیح اور قبول کئے گئے تحریری سرمایہ پر ہو اور آسمانی ترتیب کے مطابق آیات وسور کا جمع ہونا اور تجلیدی شکل اختیار کرنا مقاصد نزول قرآن سے ہے، چنانچہ انھوں نے حضرت زید بن ثابت کو طلب کیا اور یہ کام ان کے تفویض کیا، چند ماہ کے بعد زید بن ثابت اس عظیم کام کے آغاز و تکمیل کے لئے تیار ہو گئے۔ اسلامی مملکت میں یہ اعلان کرایا گیا کہ جس صحابی کے پاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی املاء وقبول کردہ آیات اور سورتیں ہوں وہ دو گواہوں کی تصدیق کے ساتھ زید بن ثابت کے پاس لے آئے۔ ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ زید بن ثابت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے موقع پر کم سن تھے اور انصاری تھے۔ اکابر صحابہ بالخصوص مہاجرین کو چھوڑ کر زید بن ثابت کو کیوں منتخب کیا گیا؟ جواب بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہر سال ماہ رمضان میں اس وقت تک نازل شدہ قرآن مجید حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سناتے۔ آخری رمضان میں عرضہ اخیرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل السلام کو قرآن دو مرتبہ سنایا، اس مبارک موقع پر حضرت زید بن ثابت بھی موجود تھے جن کی ذہانت، فطانت، مختلف زبانیں سیکھنے کی صلاحیت، حسن وصحت کتابت، ملفوظ ومکتوب قرآن میں مہارت معروف تھی۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کے ذہن میں ان کی کم عمری کے باعث جو تحفظ تھا اس کے باوجود حضرت زید بن ثابت کا انتخاب حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا انتخاب

تھا جس کا انھیں پورا اختیار تھا اور حضرت زید بن ثابت کے کارنمایاں نے اس انتخاب پر مہر تصدیق بھی ثبت کر دی ۔ حضرت عمر اور حضرت زید بن ثابت کی ہر ممکن تحقیق کے بعد بفضل اللہ یہ کام اتمام کو پہنچا ۔ یہاں اس واقعہ کا تذکرہ ضروری ہے کہ سورہ توبہ کی آخری دو آیتیں لقد جآءکم رسول من انفسکم سے لے کر رب العرش العظیم تک تحریری صورت میں صرف ابوخزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس ملیں جن کی شہادت کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادتین (دو شہادتوں) کے برابر اعلان فرمایا تھا، اس باعث ان آیتین کو سورہ توبہ میں ان کے موجودہ مقام پر رکھ دیا گیا، یہ آیتیں تمام اکابر صحابہ کو یاد تھیں لیکن مسئلہ صرف یادداشت کا نہ تھا کیونکہ قرآن مجید نہ صرف بہت سے صحابہ کو یاد تھا بلکہ مختلف صحابہ کرام کے پاس مخطوط کی شکل میں بھی محفوظ تھا لیکن اس کا ثبوت نہ تھا کہ مخطوط قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پڑھا گیا تھا اور آپ نے مخطوط نسخوں کی تصدیق فرمائی تھی ۔ بہر حال دور ابی بکر میں جمع کردہ قرآن کی سب نے توثیق و تصدیق کی اور اس کو المصحف الامام کے نام سے موسوم کیا گیا۔

حضرت عمر کے دور میں فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا، روم و فارس کی ریاستیں اسلامی مملکت میں شامل ہو گئیں، کیا مرد اور کیا خواتین لاکھوں کی تعداد میں مشرف بہ اسلام ہونے لگے ۔ مفتوحہ علاقوں میں مسجدوں، اماموں، معلموں اور قرآن مجید کے نسخوں کی ضرورت بڑھتی چلی گئی ۔ ہزاروں نسخے المصحف الامام کی روشنی میں تحقیق و تدقیق کے ساتھ تیار کیے گئے اور تمام علاقوں میں بھیجے گئے ۔

حضرت عمر کی شہادت کے بعد حضرت عثمان بن عفان نے عنان خلافت سنبھالی ۔ توسیع مملکت اور تبلیغ دین کے دونوں کام جاری رہے ۔ ایک فوجی دستہ آذربیجان میں خیمہ پذیر تھا، راتوں میں عبادت و تلاوت اور دن میں معرکہ آرائی مجاہدین کا عام شیوہ تھا۔ مشہور صحابی رسول حذیفہ بن الیمان رات میں گشت کر رہے تھے کہ انھیں سپاہیوں کی بلند آواز میں بحث سنائی دی، وہ قریب پہنچے تو دیکھا کہ دو مختلف قبیلوں سے وابستہ سپاہی قرآنی آیات کی طرز ادائیگی پر بحث میں مشغول ہیں ۔ دونوں افراد نہ صرف اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دے رہے تھے بلکہ اپنے اپنے قبیلہ کی زبان و قراءت و لہجے کو دوسرے قبیلہ کی زبان و قراءت و لہجے پر ترجیح دے رہے تھے ۔ جنگ کے اختتام کے بعد حذیفہ بن الیمان نے ایک تفصیلی خط اس واقعہ کے بارے میں حضرت عثمان کو لکھا اور ان کو توجہ دلائی کہ اگر اس باب میں جلد کوئی قدم نہ اٹھایا گیا تو قرآن مجید کا تحفظ خطرے میں پڑ سکتا ہے ۔ حضرت عثمان نے خط کے ملتے ہی مدینہ منورہ میں موجود صحابہ کرام کو مسجد نبوی میں طلب کیا، ان سب کو یہ خط بآواز بلند پڑھ کر سنایا اور ان سے مشورہ مانگا۔ تمام مشوروں کی روشنی میں درج ذیل فیصلے کیے گئے ۔ بعض صحابہ نے اپنی طبیعت کی گرانی اور رنجیدگی کو کنارے رکھا اور تمام قراردادوں سے اتفاق کیا۔

1. حضرت زید بن ثابت، سعید بن العاص، عبد الرحمٰن بن حارث بن ہشام اور عبد اللہ بن زبیر پر مشتمل ایک مجلس تشکیل دی جائے گی جس کے سپرد قرآن مجید کے صحیح نسخوں کی از سر نو تدوین ہوگی ۔
2. تین مہاجر صحابہ اور ایک انصاری صحابی پر یہ لازم ہوگا کہ قرآن کے صحیح نسخوں میں قراءت قریش کو ترجیح ہوگی کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اصلاً قرشی تھے ۔ مثلاً لفظ تابوت گول ''ۃ'' کے بجائے کشش والی ''ت'' کے ساتھ لکھا جائے گا۔
3. دیگر تمام نسخ قرآن، بشمول صحابہ کرام کے ذاتی نسخ، قرآن مجید کے تازہ نسخوں کی تیاری کے بعد حکومت کے مرکز میں جمع کر دیے جائیں گے اور بعد میں ان ہزارہا نسخوں کو نذر آتش کر کے امت مسلمہ کو ممکنہ انتشار و بحران سے بچا لیا جائے گا۔

4. ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر کی حفاظت میں رکھا گیا ''المصحف الامام'' طلب کیا جائے گا تاکہ اس کی نقول احتیاط سے تیار ہو سکیں۔

ان تجاویز کے محرک حضرت علی بن ابی طالب تھے جن کی تائید حضرت عباس نے فرمائی اور تمام صحابہ کے اتفاق سے کام آگے بڑھنے لگا۔ رفتہ رفتہ کاتبین قرآن کی تعداد چار سے سترہ تک پہنچی۔ نسخ اولی کو یمن، بحرین، کوفہ، بصرہ اور مکہ مکرمہ بھیجا گیا اور ایک نسخہ مدینہ منورہ ہی میں رہا، انہی کی بنیاد پر دیگر نسخے لکھے جانے لگے اور دیکھتے دیکھتے ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔

حضرت علی، حضرت حسن، حضرت معاویہ، یزید اور معاویہ بن یزید کا (انتہائی مختصر) دور گزر گیا، پھر کئی لوگ عبداللہ بن زبیر کی خلافت سے غیر مطمئن اکھاڑے میں کود گئے جن میں مروان بن الحکم بھی شامل تھا، چھ ماہ کے قلیل عرصہ کے بعد اس نے بھی ملک الموت کو لبیک کہا اور ذمہ داری عبدالملک بن مروان پر آپڑی، عبداللہ بن زبیر نے نامعلوم اسباب کی بناء پر اپنے اقتدار کو حجاز کی حد تک محدود رکھا تھا جس سے عبدالملک بن مروان اپنے علم، حلم، دانشمندی اور حکمت و تدبیر سے اپنی قوت بڑھاتا رہا۔ اس کے منتخب کردہ لوگوں میں ایک طرف عمر بن عبدالعزیز تھے تو دوسری طرف بنوثقیف کا ایک مدرس حجاج بن یوسف جس کی بابت یہ مشہور ہے کہ تقریباً ستر (۷۰) ہزار مسلمان اس کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ایک کام جو روایتوں میں حجاج بن یوسف سے خدمت قرآن کے سلسلہ میں نقل کیا گیا ہے، وہ عربی ناآشنا لوگوں کے لئے تلاوت قرآن کی تسہیل ہے۔

عراق، ایران، شام، شمالی افریقہ، وسطی ایشیا کے باشندوں کی زبان عربی نہ تھی قرآن مجید کی قراءت کے دوران ان سے بکثرت غلطیاں ہوتیں۔ حجاج بن یوسف نے ابوالاسود الدوٴلی سے کوئی ایسا طریقہ دریافت کرنے کے لئے پیغام بھیجا جس سے حروف کے درمیان امتیاز کیا جا سکے اور قرآن کی صحیح قراءت ہو سکے۔ ابوالاسود الدوٴلی حضرت علی کے خاص شاگرد تھے جنہوں نے عربی زبان کے اصول ورموز پر درجہ کمال حاصل کر لیا تھا، چونکہ ان کی ہمدردیاں اہل بیت کے ساتھ تھیں اور چونکہ وہ بنوامیہ سے ناراض تھے ابتداء میں انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ تب یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ ایک شخص کو ابوالاسود الدوٴلی کے گھر اور مسجد کے درمیان راستہ پر کنارے بیٹھنے اور قرآن مجید کی ایک آیت اِنَّ اللّٰہ بَرِیٓءٌ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہ' میں رَسُوْلُہ' کو رسولِہ پڑھنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اذان ہوتے ہی ابوالاسود الدوٴلی مکان سے نکلے اور مسجد کی طرف چلے، حجاج کی طرف سے مقرر کردہ شخص نے بآواز بلند آیت کو غلط پڑھنا اور بار بار دہرانا شروع کر دیا۔ ابوالاسود الدوٴلی فوراً مکان لوٹ گئے اور اپنی آمادگی کا خط روانہ کر دیا، ان کی مدد کے لئے نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر کو مقرر کیا گیا۔ نقطوں (ایک، دو اور چار) کے ذریعہ حروف مکتوبہ کے درمیان امتیاز کیا گیا (جیسے 'ب'، 'ت'، 'ث'، 'ج'، 'ح'، 'خ'، 'د'، 'ذ'، 'ر'، 'ز'، 'س'، 'ش'، 'ص'، 'ض'، 'ط'، 'ظ'، 'ع'، 'غ'، 'ف'، 'ق'، 'ک'، 'ن' وغیرہ) اور طریقہ تلفظ کے لئے اعراب (َ ، ُ ، ِ ، ٔ ، ّ فتحہ، ضمہ وکسرہ و جزم وتشدید) متعارف کئے گئے۔ اللہ نے اس خدمت میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ عربی زبان میں انقلاب آ گیا، قواعد نحو وصرف اور لغت نویسی کی بنیادیں پڑیں، حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، تعیین مصدر وغیرہ میں ان سے کیا نفع اٹھایا گیا، جاننے والے خوب جانتے ہیں، آگے چل کر چار نقطوں کو تین نقطوں میں بدل دیا گیا۔

غیر عرب اقوام میں عربی زبان سیکھنے اور قرآن کے قریب سے قریب تر ہونے کا جذبہ پیدا ہوا جس کے باعث دعوت دین، اشاعت علم اور تحفظ قرآن و دین آسان ہو گئے۔

قرآن مجید وہ آخری کتاب الٰہی ہے جو جن وانس کی دائمی رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہے۔ تمام اہل قلب وعقل اس کے مخاطب اور اپنی دنیوی واخروی کامرانیوں کے لئے اس کی تعلیمات کو جاننا، ماننا اور اپنی استعداد وصلاحیت کے مطابق ان پر عمل آوری سب کے لیے سرمایہ سعادت ونجات ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو قسم کے حلقوں کا تذکرہ ملتا ہے ایک اہل ذکر وفکر کا اور ایک اہل علم وقراءت کا۔ قراء کی تعلیم بشمول دیگر صحابہ حضرت عبادہ بن صامت کے سپرد تھی۔ جو لوگ دن میں وقت نہ دے پاتے وہ مدینہ طیبہ کے ایک معلم کے پاس رات میں جاتے اور جو قبائل مدینہ طیبہ سے دور تھے، ان میں سے بعض اپنے نمائندوں کو تعلیم قرآن کی غرض سے بھیجتے جن کی میزبانی کی ذمہ داری انصار لے لیتے، اور بعض قبائل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلمین کی فراہمی کی درخواست کرتے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ماہرین قرآن کو ان کی درخواست پر روانہ فرماتے۔

صحابہ کرام میں حضرت ابی بن کعب نے دس دس آیتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راست سن کر حاصل کی تھیں جس کے باعث تجوید وتفسیر میں ان کو امتیازی مقام حاصل ہو گیا تھا۔ دیگر قراء صحابہ میں ابوبکر، عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، عبادہ بن صامت، معاذ بن جبل، ابوایوب انصاری، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابو الدرداء، اور تابعین میں عبدالرحمٰن سُلمیؒ اور مجاہد بن جبیر ممتاز تھے۔

نزول قرآن کے آغاز کے وقت حجاز میں خط قیراموزی وخط حیری رائج تھے، پھر خط کوفی رواج پا گیا جس کے بعد چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں خط نسخ شروع ہوا۔ خط کے بدلنے سے کلمات قرآنی کے رسم الخط میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ حروف تہجی کو ملا کر لفظ کی صورت بنانے کو خط کہتے ہیں اور حروف میں فصل ووصل اور حذف وزیادتی کو رسم الخط، جیسے اِنَّ مَآ کو اِنَّمَآ یا اِنَّ مَا کو اِنَّمَا لکھنا رسم الخط ہے۔ العٰلَمِیْن کو الف مقصورہ کے ساتھ لکھنا اور العَالَمِیْن پڑھنا رسم الخط ہے، اسی طرح الرحمٰن، مٰلِک، قٰنِتٰتٌ، عٰبِدٰتٌ، الصّٰلِحٰتُ، تابوت وغیرہ رسم الخط کہلاتے ہیں۔

قرآن مجید کا یہ رسم الخط رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر واملاء سے ثابت ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اسی طرح تعلیم دی جو جامعہ از ہر کے متفقہ فتوی کے بموجب لوح محفوظ میں موجود رسم الخط کے عین مطابق ہے چنانچہ قرآن مجید کا رسم الخط توقیفی ہے۔ امام جعبری نے ائمہ اربعہ کا یہی موقف نقل کیا ہے۔

کلام اللہ کی کتابت کے لئے خط نسخ کو جب سے اپنایا گیا، خوب سے خوب تر کی تلاش نے حسن خط کی طرف متوجہ کیا اور فن خطاطی وجود میں آیا، اس فن کے چند اہم اصول ذیل میں درج ہیں:

1. لکھتے وقت ہاتھ، قلم اور دماغ میں ہم آہنگی اور ہاتھ وقلم کی حرکت قابو میں ہو
2. کرسی حد مقرر کے عین مطابق ہو، نہ اونچی نہ نیچی
3. حروف کے جوڑ درست ہوں
4. دائرے حسین ویکساں ہوں

5. حروف ولفظ میں حسن تناسب ہو

6. سطور، الفاظ اور حروف میں مناسب فاصلہ ہو

7. نوک پلک برابر ہوں

8. قلم سے لفظ ایسا لکھا جائے کہ روشنائی سب جگہ برابر پہنچے

9. تحریر میں پختگی ہو

10. صفائی اور ستھرا پن حروف والفاظ لکھنے میں ایسا ہو کہ نہ اعراب میں خلط ملط ہو، نہ نقطوں میں اور نہ حروف والفاظ میں التباس کا اندیشہ ہو۔ عبارت صاف، رواں اور پیچیدگی سے مبرا ہوتا کہ قاری صحت مخارج وصفات کے ساتھ تلاوت کر سکے۔

1.7 تجوید

تجوید قرآن مجید کی تلاوت کا زیور اور قراءات کی زینت ہے۔ حروف کو ان کے صحیح مخارج وصفات کے ساتھ ادا کرنا، ان کے مراتب وترتیب کا لحاظ رکھنا، مکرر ادائیگی میں یکسانیت ملحوظ رکھنا، لفظ کی ساخت وہیئت کے اعتبار سے اس کے تلفظ کا اہتمام اور ادائیگی میں متوازن حسن لطافت پیدا کرنا تاکہ نہ حدود سے تجاوز ہو نہ قواعد سے ٹکراؤ ہو، نہ افراط وتکلف ہو نہ اسراف وتعسف۔ پس تجوید یہ نہیں ہے کہ زبان کو توڑا مروڑا جائے یا منہ کو پھاڑا جائے یا جبڑوں یا منہ کو ٹیڑھا کیا جائے یا آواز میں ارتعاش یا کپکپاہٹ پیدا کی جائے یا تشدید کو لمبا کیا جائے یا ممدود کے ٹکڑے کر کے پڑھا جائے یا آواز میں تصنع اور غنغنا پن پیدا کیا جائے یا بے محل غنّے پیدا کیا جائے یا ''راء'' کی تکرار میں یا ''ظا'' کی ادائیگی میں مبالغہ کیا جائے یا ایسے طریقے سے پڑھا جائے کہ طبیعتوں پر انقباض اور کانوں پر ناگوار اثر ہو۔ نہ ہونٹوں کو بنایا جائے، نہ لفظوں کو چبایا جائے، نہ ادائیگی میں بناوٹ وتصنع، نہ حروف غیر ممدودہ کو کھینچا جائے۔ زیر، زبر، پیش، مدلازم اور مدجائز کے درمیان واضح فرق ملحوظ رکھا جائے، فصحاء عرب اور وجوہ قراءات میں سے کسی ایک وجہ کے مطابق ہو۔

تغنی بالقرآن سے قواعد موسیقی یا گانا مراد لینا یا استغناء پر محمول کرنا صحیح نہیں۔ تغنی بالقرآن کے معنی تحسین صوت کے ہیں جس میں قواعد قراءت، قوانین تجوید اور کلمات اور حروف نظم کی رعایت شامل ہیں، اسی طرح استحضار باری تعالیٰ، خشوع وخضوع، خشیت الٰہی، شوق وذوق اور ایسی آواز مراد ہے جس سے دلوں میں نرمی پیدا ہو، اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا رعب، اس کو اسی کا کلام بطریق احسن سنانے کی لذت، آیات رحمت وترغیب پر شوق اور آیات عقاب وعتاب پر خوف پیدا ہو، آواز میں درد، رعب ورقت اور خوف وحزن پائے جائیں، دل دہلے ہوئے ہوں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں اور دیکھنے یا سننے والے کو یہ لگے کہ قاری اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے ڈر رہا ہو تو ان شاء اللہ یہ تحسین صوت اور تحسین قراءت میں شامل ہوگا۔

فن تجوید وقراءت میں چونکہ بیسیوں کتابیں، مثلاً مقدمہ الجزری، خلاصہ التجوید، ہدیہ التوحید (قاری عبدالوحید الہ آبادی)، فوائد مکیہ (قاری عبدالرحمٰن مکی)، جمال القرآن (اشرف علی تھانوی)، تسہیل الترتیل (پروفیسر الیاس برنی)، سہل تجوید (پروفیسر

قاری کلیم اللہ حسینی)، آسان تجوید (قاری عبدالکریم تسکین) لکھی گئی ہیں اور اساتذۂ فن کے سامنے زانئے تلمذ تہہ کئے بغیر، مخارج وصفات ان سے سیکھے اور کثرت مشق کیے بغیر اس فن میں مہارت مشکل ہے لہذا فن تجوید کی تفصیل قلم انداز کی جاتی ہے۔

1.8 قراءکرام

1. ابوعمرو بن العلاء: زبّان بن العلاء المازنی البصری کا شمار عظیم المرتبت قراء میں ہوتا ہے وہ سن 68ھ میں پیدا ہوئے۔ قراء صحابہ سے تحصیل فن قراءت وتجوید کی، قرآن مجید اور علوم عربیہ میں مہارت رکھنے کے ساتھ ثقاہت، امانت اور دینداری میں ممتاز رہے۔ یونس اور دیگر مشائخ بصرہ نے ان کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ابوعمرو زبان کی وفات 154ھ میں ہوئی۔ آپ سے ابوعمرو حفص اور ابوشعیب صالح السوسی نے روایت کی۔

2. ابوالحسن نافع بن عبدالرحمٰن اللیثی المدلی 70ھ کے آس پاس اصفہان میں تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت مدینہ طیبہ میں پائی اور وہیں کے ہو رہے۔ تابعین کے بعد لوگ کثرت سے ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ تلامذہ میں الاصمعی اور قالون جیسی ہستیاں شامل تھیں، قراءت اور تفسیر میں آپ کی تصانیف موجود ہیں سن وفات 169ھ ہے۔ آپ سے ابوموسیٰ قالون اور ابوسعید ورش نے روایت کی۔

3. ابن کثیر: کنیت ابومَعْبَدَ اور نام عبداللہ بن کثیر بن المطلب الداری ہے، سن 45ھ میں پیدا ہوئے۔ عمرو بن علقمہ کے غلام تھے۔ صحابہ کرام کا زمانہ پایا اور ان سے ملاقات وتحصیل علم کا شرف حاصل کیا۔ مکہ مکرمہ کے طبقہ ثانیہ کے قراء میں گنے جاتے تھے، اپنے وقت کی علمی سیادت انھیں حاصل رہی۔ 120ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور وہیں تدفین کی گئی۔ آپ سے ابو الحسن بزی اور ابوعمرو قنبل نے روایت کی۔

4. عاصم بن بَہدَلہ الاسدی الکوفی: ان کی اپنی کنیت ابوبکر، والد کی کنیت ابوالنجود اور والدہ کا نام بَہدَلہ تھا۔ عاصم الکوفی نصر بن قُعَیْن الاسدی کے غلام اور ابوعبدالرحمٰن السلمی اور زِرّ بن حُبَیش کے شاگرد تھے۔ ان کا شمار کوفہ کے طبقہ ثالثہ کے قراء میں ہوتا تھا۔ حدیث وعربیت، تجوید وقراءت اور حسن صوت میں بلند مرتبہ کے حامل تھے۔ ان کی وفات 127ھ میں ہوئی۔ آپ سے ابوبکر شعبہ اور حفص بن سلیمان نے روایت کی۔

5. عبداللہ بن عامر الیَحْصُبی (صاد بالضمہ وبالکسرہ معروف ہے): کنیت ابوعمران تھی، صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت سے سماعت قرآن کی، جن میں حضرت معاویہ، نعمان بن کثیر اور فضالہ بن عبید شامل ہیں، فن قراءت خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفانؓ کے شاگرد مغیرہ بن ابی شہاب سے حاصل کیا۔ قُراء سبعہ میں بزرگ ترین شخصیت کے حامل تھے۔ شام میں فن قراءت میں درجہ امامت حاصل تھا۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں ہشام اور ذکوان کو شہرت ملی۔

6. حمزہ بن حبیب الزیات: ابوعمارہ حمزہ بن حبیب الزیات الکوفی سن 80ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے، صحابہ کرام کا آخری زمانہ پایا۔ فن قراءت میں سلیمان بن مہران الاعمش، جعفر الصادق، ابواسحٰق السبیعی اور قاضی ابن ابی لیلیٰ کے شاگرد، نہایت عابد

وزاہد، عاقل وفہیم اور امام ومقتدیٰ تھے۔ ان کے تلامذہ میں ابراہیم بن ادہم، سفیان بن سعید الثوری اور شریک بن عبداللہ ممتاز تھے، عاصم اور اعمش کے بعد امامت ان کی طرف منتقل ہوگئی تھی۔ تجارت ان کا کسب معاش تھا۔ 156ھ میں وفات ہوئی اور حلوان میں تدفین انجام پائی۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں خلف اور خلاد مشہور ہوئے۔

7. کسائی: ابوالحسن علی بن حمزہ بن عبداللہ بن بہمن ایرانی نژاد قاری تھے۔ ان کا بھی شمار مذکورہ بالا قراء کے علاوہ قراء سبعہ میں ہوتا ہے۔ پرورش کوفہ میں ہوئی، تحصیل علم کی تڑپ ان کو شہر لے گئی۔ بنو اسد سے رشتہ ولا تھا۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ اور حمزہ بن حبیب سے فن قراءت کی تحصیل وتکمیل کی، آپ کے تلامذہ میں امام احمد بن حنبل اور امام یحیٰ بن معین ممتاز تھے: کسائی کو علم قراءت اور علم نحو میں درجہ امامت حاصل تھا۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں ابوالحارث اور لیث الدوری مشہور ہوئے۔

1.9 خلاصہ

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں میں آخری کتاب ہے۔ اس میں تمام انسانیت کے لئے ہدایت ہے۔ قرآن مجید ''تبیاناً لِکُلِّ شَیٍّ'' اور ھدی لِلناس ہے۔ اسے رسول اکرمؐ پر تقریباً 22 رسال چھ مہینے کی مدت میں تدریجاً نازل کیا گیا۔ نازل شدہ آیات اور سورتوں کو صحابہ کرام اسی وقت یاد کرلیتے اور لکھ لیا کرتے۔ اس طرح قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہی محفوظ ہوگیا۔ پھر حضرت ابوبکر کے دور میں ایک مصحف کی شکل میں جمع کیا گیا اور حضرت عثمان کے دور میں ایک قراءت پر جمع کیا گیا۔ پھر اموی گورنر حجاج بن یوسف کے عہد میں اعراب سے مزین کیا گیا تاکہ عربی ناآشنا لوگوں کے لئے تلاوت میں غلطی نہ ہو۔

تجوید قرآن مجید کی تلاوت کا زیور اور قراءت کی زینت ہے، چنانچہ قرآن کی تلاوت میں تجوید کا اہتمام ضروری ہے۔ حروف کو ان کے صحیح مخارج وصفات کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ اس فن پر کئی تصانیف دستیاب ہیں۔ مثلاً مقدمۃ الجزری، خلاصۃ التجوید، ہدایۃ التوحید، فوائد مکیہ وغیرہ۔ فن تجوید کے ماہرین میں قراء سبعہ اہم اور قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے اپنے شاگردوں کے ذریعہ اپنی روایت کو آگے بڑھایا اور عام کیا۔

1.10 نمونے کے امتحانی سوالات

1. قرآن کی تدوین پر تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
2. قرآن مجید کا اجمالی تعارف پیش کیجیے۔
3. کتابت قرآن پر روشنی ڈالیے اور فن خطاطی کے چند اہم اصول بیان کیجیے۔
4. حفاظ صحابہ وصحابیات قرآن کا تعارف کرائیے۔

1.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تدوین قرآن : مولانا سید مناظر احسن گیلانی
2. جمع قرآن : مولانا تمنا عمادی
3. تاریخ القرآن : ڈاکٹر عبدالصمد صارم ازہری
4. علوم القرآن : ڈاکٹر صبحی محمصانی
5. علوم القرآن : مولانا تقی عثمانی
6. علوم القرآن : ڈاکٹر احسن الدین

اکائی 2: مضامین کا تعارف

اکائی کے اجزاء

2.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ قرآن کریم کے مضامین کیا ہیں، توحید، رسالت، آخرت اور زندگی کے دیگر امور کے بارے میں قرآن نے کیا مضامین بیان کئے ہیں۔

2.2 تمہید

اس اکائی میں قرآن کریم کے مضامین پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا جائے گا کہ توحید کیا ہے؟ اور رسالت کسے کہتے ہیں؟ نیز قرآن کے دیگر مضامین کیا ہیں؟ اور قیامت کی ہولنا کی نیز دوسرے امور زندگی کے بارے میں قرآن میں کیا کیا مضامین بیان کئے گئے ہیں۔

2.3 قرآن کا مضمون: توحید

قرآن کریم میں توحید کا مضمون بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس حقیقت کی دل کی گہرائیوں سے تصدیق کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ وہی ہے جس نے تمام کائنات بشمول فرشتے، جن، جہنم و جنت کو عدم سے وجود بخشا، اسی نے تمام

آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا آغاز کیا اور تمام ستاروں اور سیاروں سے خلاء بسیط کو مزین فرمایا، تمام کہکشاؤں پر اسی معبود برحق کا حکم کارفرما ہے، تمام کمالات علم و ارادہ و قدرت و تکوین اسی کو زیب دیتے ہیں، وہی مستوی علی العرش ہے اور اسی کی کرسی سارے آسمانوں اور زمین پر وسیع ہے، تمام عیوب و نقائص سے پاک وہی قدسی صفات ہے۔ اسی نے جانداروں اور بے جانوں کی تخلیق کی، موت و حیات کی تخلیق کی تاکہ انسانوں کو آزمائے کہ ان میں سے کون حسن عمل کرتا ہے اور کون اعمال بد اختیار کرتا ہے، کون اللہ سبحانہ' کی یکتائی و تنزیہ پر ایمان لاتا ہے اور کون انکار کرتا ہے۔ اس کے بکثرت اسماء حسنٰی ہیں تاکہ وہ جو اس تک عقل کی نارسائی سے بے چین ہو جائے اللہ سبحانہ کا اجمالی تعارف حاصل کرلے۔

وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، نہایت مہربان، بہت رحم والا، وہی بادشاہِ حقیقی ہے، پاک ہے، ہر نقص سے سلامت، امان دینے والا، پناہ میں لینے والا، ہر شئے پر غالب جس کے قبضہ قدرت سے کوئی باہر نہیں، کبریائی اسی کے لئے خاص، تخلیق کرنے والا، وجود بخشنے والا، شکل و صورت دینے والا، خوبیوں کو ظاہر اور برائیوں پر پردہ ڈالنے والا، مطلق غلبہ والا، بہت دینے والا، رزق و روزی کے اسباب پیدا فرمانے والا، مشکلوں کو دور اور رحمتوں کے خزانے کھولنے والا، ظاہر و باطن ازل سے جاننے والا، تنگی اور فراخی کرنے والا، جسے چاہے عزت اور جسے چاہے ذلت دینے والا، بے واسطہ سننے اور دیکھنے والا، غیر متزلزل فیصلہ کرنے والا، عدل کرنے والا، تمام بھیدوں اور حکمتوں سے واقف، مہربانی کرنے والا، ہر شئے کے باطن سے باخبر، بردبار، عظمت والا، بے انتہاء پردہ پوشی و بخشش کرنے، عمل قلیل پر اجر کثیر عطا فرمانے والا، بے حد بلند اور عظمت و قدرت کا مالک، تمام اشیاء کی حفاظت اور تمام اقسام کی روزیاں عطا فرمانے والا، بندوں سے حساب لینے والا، کامل الصفات بلند ترین شان رکھنے والا، بے سوال وطلب عطاء کرنے والا، ساری مخلوق کی نگہبانی کرنے والا، ہر دعا مانگنے والے کو اپنی حکمت سے قبول کرنے والا، علم، رحمت و قدرت میں ہر شئے کا احاطہ کرنے والا، تمام اشیاء کے رموز و حقائق کو بکمال علم جاننے والا، مومنین اور عمل صالح میں مشغول فرمانبرداروں سے محبت کرنے والا۔

وہی اللہ تمام جہانوں کا رب ہے جو تمام مخلوقات کی حاجات ضرورت کے مطابق رفتہ رفتہ پوری کرتا ہے، وہی رب البیت ہے وہی رب المشارق والمغارب ہے، وہی رب الفلق ہے اور وہی رب الناس، وہی احد ہے، وہی واحد جو اکیلا اپنی ذات سے قائم ہے۔ وہی عدم سے وجود میں لانے والا، وہی ابتداء کرنے والا، وہی لوٹانے والا۔ وہی اللہ ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا جب کہ ماسوی اللہ زماں ہو کہ مکاں مجردات ہوں کہ مادیات سب اس کی مخلوق، وہی عالم الغیب والشہادہ اور وہی علام الغیوب، صرف اسی کا علم ذاتی، دوسروں کا عطائی، جو کچھ ہے اسی کی قدرت کا مظہر، پس وہی ظاہر وہی باطن وہی اول وہی آخر، وہی اعلیٰ، وہی اکبر، وہی جان ڈالنے والا، وہی جان لینے والا، زمین ہو یا آسمان، سیارے ہوں یا ستارے، آدمی ہو یا جن و جاندار ہوں کہ بے جان، فرشتے ہوں یا ارواح، خلائیں ہوں یا کہکشائیں سب اس کی ملکیت اور وہ تمام جہانوں کا بادشاہ حقیقی، اس نے جس کو علم دیا محدود دیا، قدرت دی محدود دی، اختیار دیا محدود دیا، جس کو جتنا دیا گیا وہ اس کا امین، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے کوئی اس سے باز پرس کی جسارت نہیں کر سکتا، وہ خوش بھی اپنے اختیار سے ہوتا ہے اور خفا بھی اپنے اختیار سے، انفعالی کیفیات سے اس کی ذات ماوراء ہے۔

2.4 قرآن کا مضمون: رسالت

توحید کے بعد قرآن کے مضامین میں رسالت کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ رسالت کا لغوی معنی ہے پیغام بری ''رسول'' پیغامبر، قاصد، ایلچی، سفیر۔ اصطلاحی معنی میں ''رسول'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا وہ برگزیدہ بندہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی رہنمائی کے لئے اپنا پیغام ہدایت پہنچانے کی خاطر منتخب اور مبعوث فرمایا ہے۔ ''رسول'' کا انتخاب اللہ سبحانہ اپنے اختیار سے فرماتا ہے کیونکہ وہی جانتا ہے کہ منصب رسالت کسے، کیسے، کب اور کہاں سونپا جائے، اللہ تعالیٰ اپنی احدیت، الوہیت، عظمت و کبریائی، قدرت خلاقی، رحمت ورزاقی، وحدانیت وربوبیت، لوگوں کے عقیدہ، نیت وعمل پر اس کی نظر سے لوگوں کو آگاہ کرنے، زندگی کے تمام شعبوں میں اس کے احکام کی اطاعت کرنے، علم وفکر وعمل کو مثبت رخ دینے اور اپنی اپنی زندگی کو با مقصد تعمیری جہت دینے کے لئے نوع بشر ہی میں سے بے داغ معصوم انسانوں کو عالم انسانیت کی رہنمائی کے لئے بھیجتا ہے جو اپنے مخاطبین کو ان کی اپنی زبان میں اللہ کے احکام کی اطاعت پر خوش خبری دیتے اور انکار وسرکشی پر دردناک انجام سے آگاہ کرتے ہیں تاکہ اتمام حجت ہو اور آخرت میں ان کو نافرمانی کے لئے کوئی بہانہ نہ ہو۔

رسول آئے اپنے کردار، اپنی متحرک زندگی، اپنے پیغام اور اپنے عمل میں فکر انگیز واضح دلائل اور اسوہ حسنہ لے کر آئے، سب کا پیغام یہی رہا کہ لا الٰہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں) سب رسول بشر تھے اور بشری ضرورتوں سے مزین، کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، ہنسنا، رونا، بولنا، سننا سب بشری تقاضوں سے مرصع تھے، نہ صرف نزول وحی بلکہ عصمت کاملہ، کمال عبادت وعبودیت، کمال تضرع وخشیت، کمال علم وعرفان، کمال عدل وانصاف، کمال ذہانت وفراست وغیرہا ان کو عام انسانوں، ابرار وصالحین، اولیاء وصدیقین سے ممتاز کرتے تھے۔ اللہ نے ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی لیکن کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ کسی رسول کو کسی دوسرے رسول پر فضیلت دے۔ تمام رسولوں کو یہی حکم تھا کہ وہ پاکیزہ چیزیں کھائیں اور احکام الٰہی پر کاربند رہیں۔

خاتم الرسل سے پیشتر جتنے رسول آئے، مخصوص زمانے، مخصوص علاقے اور مخصوص امت کی رہنمائی کے لئے آئے، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہ واحد رسول ہیں جن کو قیامت تک کے زمانے کے لئے، کرہ ارض کے چپے چپے کے لئے اور آپ کی بعثت کے ساتھ تمام انسانوں کی رہبری کے لئے مبعوث فرمایا گیا، اس طرح ساری انسانیت آپ کی امت دعوت ٹھہری، کوئی امت ایسی نہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول نہ بھیجا ہو اور اس امت کے بعض لوگوں نے اس کو جھٹلایا نہ ہو یا اس کے ساتھ استہزائیہ سلوک نہ کیا ہو۔ تمام مخالفتوں، عداوتوں اور ہمہ اقسام کی رکاوٹوں کے باوجود کسی رسول نے کار رسالت میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی، کوئی رسول ایسا نہیں گزرا جس کی اطاعت اللہ کی جانب سے واجب نہ کی گئی ہو اور جس کسی نے رسول کی اطاعت کی اس کو اللہ ہی کی اطاعت نہ قرار دیا گیا ہو اور جس کسی نے اللہ اور اللہ کے رسول کے احکامات کے درمیان تفریق کی اس کو گمراہ نہ کہا گیا ہو بلکہ بعض محققین کے نزدیک حصول ہدایت کو اطاعت رسول سے مشروط کیا گیا۔

2.5 قرآن مجید کے دیگر مضامین

قرآن مجید میں توحید اور رسالت کے علاوہ دیگر متعدد مضامین بیان ہوئے ہیں، ان کا ایک اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

امورِ آخرت: ایک طرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا تعارف کراتا ہے، دوسری طرف اس کی وحدت وعظمت وکبریائی کے باوصف اس کی محبت، رأفت، رحمت کی وسعت، مودت، لطف وکرم کی مقربین، اصحاب الیمین، متقین، صالحین، ابرار، شہدا، وغیرہم پر بارش کی طرف بھی توجہ مبذول کراتا ہے۔ علاوہ ازیں ملائکہ، انبیاء ورسل (جن کے ذریعہ صراط مستقیم سے اجمالی وتفصیلی طور پر متعارف کرایا جاتا رہا ہے) کتب سماویہ، روز آخرت میں انسان کی نشاۃ ثانیہ، اس کے عقائد واعمال کی جزا وسزا، تقدیر یعنی دنیا وآخرت میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہوگا وہ سب کا سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے ازلی علم کے مطابق اسی کی قدرت سے وجود پذیر ہو رہا ہے۔ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں کوئی مناسبت نہیں رکھتی لیکن دنیا دار اس کی دولت، حکمرانی، چمک دمک، آسائش، آرائش میں مسابقت (دوڑ) میں اپنا وقت، توانائیاں، صلاحیتیں صرف کرنے میں گم ہیں اور ہمیشگی کی زندگی اور اس کی تیاریوں سے یکسر غافل، سوال، جواب، ثواب وعذاب سے لاپرواہ زندگی کی وجہ سے نایاب شئی ضائع کر رہے ہیں جب کہ دین دار اور متقی دنیا سے بقدر ضرورت اپنا مقدور حصہ لے کر اس پر قانع ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ عزت وذلت، دولت اور احتیاجات، مناصب و اختیارات کا دینا نہ دینا کس کے اختیار میں ہے، ہر ذمہ دار اپنے ماتحتین کے بارے میں پوچھا جائے گا لہٰذا ذمہ داریوں سے حتی الوسع دور رہنا ہی بہتر ہے الا یہ کہ کوئی متبادل صورت باقی نہ بچے۔

علم: علم کا حصول ہر ذی شعور وذی عقل کے لئے ضروری ہے تاکہ حق وباطل کے درمیان تمیز کر سکے اور حق طلبی، حق شناسی، حق گوئی اور تبلیغ ودعوتِ حق میں سب کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے حق کی اشاعت وحفاظت کے لئے اپنا وقت، اپنی معلومات، اپنی توانائیاں، اپنی صلاحیتیں، اپنی زندگی، اپنا مال خرچ کر سکے، جو کچھ ہے اسی مالک الملک کا دیا ہوا ہے اور لوٹنا بھی آخر کار اسی کی طرف ہے، وَاتَّقُوا يَوماً تُرجَعُونَ فِيهِ اِلَى اللّٰهِ. اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام علوم کا سرچشمہ اللہ سبحانہٗ ہی ہے لیکن نفع بخش اور ضرر رساں علوم کے درمیان فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جو علم خالق کل شیءٍ کی معیت کا احساس دلاتا ہے، جو علم خلق الٰہی سے مضرت کو دفع کرنے میں ممد ومددگار رہے اور فیوض الٰہی کو خلق الٰہی تک پہنچانے کی سبیلیں فراہم کرتا ہے، مطلوب ہے۔

ایمان کا حصول اور برقراری: ایمان کا حاصل کرنا ہی فرض نہیں بلکہ اس کے تحفظ اور اس کو فعال رکھنے کی تدبیریں اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی وحدانیت کا زبان سے اقرار، قلب سے متحقق تصدیق اور انسانی اعضاء وحرکات سے ایمان کی تطبیق تو اہم ہیں ہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دعوت کی تصدیق جس پر زبان، قلب، دماغ، روح اور طرز زندگی، طرز فکر، حسن معاشرت، حسن معاملات، حسن اخلاق پر شہادت دیتے ہوں بھی لازمی ہیں۔

عبادات: عبادات میں ابتداءً طہارت، لباس، زبان، بدن ومقام عبادت کا ذکر ہے وَيُنزل عليكم من السَّماء ماءً لِيُطَهِّرَكم به (انفال: 11)، وَاَنزَلنَا مِنَ السَّمَاء مَاءً طَهُوراً (الفرقان: 48) اور پانی کی غیر موجودگی یا اس کے استعمال سے ضرر کے قوی گمان پر تیمّم کی سہولت سے سرفراز کیا (المائدۃ: 6) حیض اور جنابت کی صورت میں غسل شرعی کا حکم دیا گیا

(البقرۃ:222؛ المائدہ:6)، حدث اصغر میں نماز کی ادائیگی کے لئے وضو مشروع کیا گیا، مباشرت کے بعد بھی غسل شرعی واجب کیا گیا، المسجد الحرام کو قبلہ دائمی قرار دیا گیا (البقرۃ:144)، پانچ نمازوں کی فرضیت عائد کر کے (النساء:102)، مومنوں کو راست رب العلمین سے ہم کلامی کا شرف عطا کیا گیا، سفر میں قصر کی اجازت عطا فرمائی گئی (النساء:101) محاربہ کے دوران صلوٰۃ الخوف مشروع کی گئی (النساء:102)، صلوٰۃ الجمعہ فرض کی گئی (الجمعہ:9) نماز میں قیام کا حکم اور گفتگو کی ممانعت (البقرۃ:238)، اللہ کی طرف یکسوئی (الاعراف:29)، تکبیر تحریمہ (المدثر:3)، اللہ سبحانہٗ کی حمد وثناء (الانعام:161-163)، تلاوت قرآن (الفاتحہ:1-7) اور تلاوت کے دوران توجہ سے سننے اور خاموشی اختیار کرنے کا حکم (الاعراف:204) رکوع وسجدہ (الحج:77)، مریض کی نماز (الاعراف:46؛ المومنون:62)، جماعت سے نماز (آل عمران:200؛ النور:36-37)، گھر میں نماز (یونس: 87)، تہجد کی نماز (الفرقان:64؛ السجدۃ:16؛ المزمل:6) کفار ومنافقین پر نماز جنازہ پڑھنے کی ممانعت (التوبہ:84)، نماز سے لاپرواہی کرنے والوں کی تنبیہ (النساء: 42؛ مریم: 59؛ الماعون: 4-5)، زکوٰۃ کی ادائیگی (البقرۃ: 110؛ الحج: 78؛ النور:56)، زکوٰۃ کے مصارف فقراء، مساکین، عاملین، جن کے قلب جیتنے ہوں، مقروض، قیدی، مجاہدین، مسافرین (التوبہ: 60)، انفاق وصدقہ (التوبہ:103؛ البقرۃ:254،261،267؛ الذاریات:19؛ التغابن:16)، خرچ میں اعتدال (الاسرا: 29؛ الفرقان:67)، روزہ کی فرضیت (البقرۃ:183-184)، ماہ رمضان (البقرۃ:185)، رمضان کی ابتداء وانتہاء (البقرۃ: 185)، مریض ومسافر کے لئے رعایت (البقرۃ:184)، روزہ پر قدرت نہ رکھنے والے کے لئے فدیہ کی سہولت (البقرۃ:184) حج کی فرضیت (ال عمران:97؛ البقرۃ:196)، حج کا زمانہ (البقرۃ:197)، حج میں تاخیر کی ممانعت (المنافقون:10-11)، میقات (البقرۃ:189)، نیت اور تلبیہ (البقرۃ:197)، مزدلفہ سے منیٰ روانگی (البقرۃ:199)، ایام تشریق (البقرۃ:202) حج تمتع میں قربانی (البقرۃ:196)، بیمار کا فدیہ (البقرۃ:196)، حلق وتقصیر (البقرۃ:196؛ الفتح:27) شکار کا کفارہ (المائدۃ:95)، رمی جمرات، حلق اور قربانی (الحج:29)، نذر کا پورا کرنا (الحج:29)، طواف زیارت (الحج:29)، حج سے متعلق آیات (البقرۃ: 125،158،196-203؛ آل عمران:96-97؛ المائدۃ:94-97؛ التوبہ:28؛ الحج:26-30،33-34،36-37؛ الفتح:27)، عبادات سے متعلق یہ احکام وحدت الٰہ اور وحدت امت کا آئینہ دار ہیں۔

اجتماعی امور: اسی طرح اجتماعیات میں نکاح کی مشروعیت (النور:32؛ النساء:3،24،127)، مقصد نکاح یعنی قلب وذہن وبدن وروح کا سکون (الاعراف:189؛ الروم:21)، محرم وغیر محرم رشتے (النساء:22،23)، دو بہنوں کو ایک وقت میں نکاح میں رکھنے کی حرمت (النساء:23)، ایک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی ممانعت (النساء:30) کسی اور کی منکوحہ (النساء:24) اور عدت سے پہلے عورت کے نکاح (البقرۃ:235) اور مشرکین سے نکاح کی حرمت (البقرۃ:221)، زانی یا زانیہ سے توبہ سے قبل نکاح کی ممانعت (النور:3،26؛ النساء:25؛ المائدۃ:5)، نکاح کے لئے عورت کی رائے معلوم کرنے کا اہتمام (البقرۃ:232، 234)، مہر کی فرضیت اور خوش دلی سے ادائیگی (النساء:4)، زوجہ کو دے دی گئی اشیاء واپس لینے کی ممانعت الا یہ کہ حدود اللہ کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو (النساء:20-21)، والدین اور بیوی، بچوں کے نفقہ کی زوج پر ذمہ داری (البقرۃ:233؛ الطلاق:6-7) زوجین کے درمیان حسن معاشرت (النساء:19)، زوجین کے باہمی حقوق وفرائض کی ادائیگی میں حسن تعاون (البقرۃ:228)، مرد وزن میں اختلاف کی شدت پر صلح جوئی کی کوشش (النساء:35،128)، بدمزاجی ودرازلسانی پر

زوجہ کی فہمائش یا توجہ دہانی کا طریقہ (النساء: 24)، نااتفاقی کی صورت میں زوجین کو نکاح کی ذمہ داریوں سے ایک دوسرے کو آزاد کرنے کی اجازت (البقرۃ: 229، 231؛ الطلاق: 2)، طلاق اور فسخ طلاق پر عادل گواہوں کی موجودگی کا حکم (الطلاق: 2)، عدت طلاق کا تین حیض یا تین طہر ہونا (البقرۃ: 228)، عدت وفات کا چار ماہ دس دن ہونا (البقرۃ: 234)، حالت حمل کی عدت (الطلاق: 4)، ستر عورت، پردہ اور غض بصر کا حکم (الاعراف: 26-27؛ النور: 30-31؛ الاحزاب: 59)، بے پردگی کی ممانعت (النور: 60؛ احزاب: 33) نکاح و طلاق (بشمول رجعی، بائن، مغلظہ، ایلاء، لعان، ظہار وغیرہ) (البقرۃ: 221-237؛ النساء: 1، 3، 4، 19-25، 32-35، 227-230؛ المائدۃ: 5، 87؛ البقرۃ: 226؛ المجادلۃ: 2-4؛ النور: 3، 6-8 وغیرہ)، طلاق مغلظہ کا اپنی ناپسندگی کے باوجود واقع ہونا (البقرۃ: 229)، نان نفقہ و سکنی کی ذمہ داری قبول کرنے کے باعث مرد کو حق طلاق (الاحزاب: 28-29) اور کراہت رفاقت کے سبب زن کو حق خلع (البقرۃ: 22)، طلاق مغلظہ کے بعد مطلقہ کا کسی اور سے نکاح اور ملاپ کے بعد شوہر کی وفات یا دوبارہ طلاق کے بعد پہلے شوہر سے از سر نکاح کی اجازت، تقسیم میراث (النساء: 7-8؛ 11-12، 19، 176)، کسب حلال، بیع و شراء (حلال اشیاء) تجارت کی اجازت (البقرۃ: 195، 275، 282؛ النساء: 29، 32، المائدۃ: 2)۔

حسن اخلاق: والدین کی خدمت، دائرہ شریعت میں اطاعت اور حسن سلوک کا حکم اور بے رخی، بے توجہی یا ناگواری کے اظہار کی ممانعت (النساء: 36؛ الاسراء: 23-24؛ العنکبوت: 8؛ لقمان: 14-15؛ الاحقاف: 15)، رشتہ داروں سے حسن سلوک (النساء: 1؛ النحل: 90؛ محمد: 22) پڑوسیوں، قرابتداروں، یتامیٰ، مساکین، دوستوں، مسافروں اور خادموں سے حسن سلوک (النساء: 36)، لوگوں سے، بالخصوص دوسرے مذاہب سے وابستہ افراد سے، بات چیت میں، ملاقات میں، بحث و مباحثہ میں جداگانہ موقف رکھنے کے باوجود، غصہ کو قابو میں رکھتے ہوئے تہذیب و شائستگی سے اختلاف کا اظہار اور دلآزاری سے گریز (البقرۃ: 83؛ آل عمران: 134؛ النحل: 125؛ الاسراء: 53؛ العنکبوت: 46؛ فصلت: 34-35)۔

جرم و سزا: اللہ تعالیٰ نے جرائم کی ہمت شکنی کے لئے قصاص و حدود مقرر فرمائے، کیونکہ جرائم کو نظر انداز کرنے پر مرض جرم متعدی ہوسکتا ہے، قصاص میں جان کے بدلے جان، دانت کے بدلے دانت، آنکھ کے بدلے آنکھ کا قانون نازل فرمایا لیکن ساتھ میں دیت کی سہولت بھی دی، حدود میں محصن، غیر محصن اور غلاموں میں امتیاز فرمایا، محصن کو سنگساری، غیر محصن کو 100 کوڑے اور غلاموں کو 50 کوڑوں کی سزا مقرر کی، زنا کاری کی تہمت (قذف) پر چار گواہوں کی غیر پیشی پر 80 کوڑے مقرر کیے، سرقہ حفاظت میں رکھی گئی اشیاء کو چوری پر داہنے ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا اور جرم کے اعادہ پر بایاں پیر، مے خواری پر حدیث رسول کے ذریعہ 40 کوڑوں کی سزا، رہزنی (قطع الطریق) پر مجرمین کے ہاتھ پیر کاٹ کر مرنے کے لئے چھوڑ دیے جانے کا حکم فرمایا۔ یہ سزائیں بظاہر بہت سخت معلوم ہوتی ہیں لیکن ایک پُر امن معاشرہ میں قانون کی حکمرانی اور جان، مال، عزت و آبرو کے ساتھ جینے کے لئے نفاذ سزا ضروری ہے، اسی طرح اسلامی حکومت کے خلاف کھڑے ہونے والے باغیوں کا قتل اور ان کو سرکوبی بھی ضروری ہے، اسلامی مملکت کی سرحدوں اور اسلامی مملکت کے باشندوں کو جان، مال، عزت و آبرو کا تحفظ فراہم کرنے، تربیت یافتہ اور جدید ترین اسلحہ سے مسلح فوج کی موجودگی بھی ضروری ہے، جہاد کے اعلان کا اختیار صرف امیر مملکت کو ہے، مقررین کی جوشیلی تقریروں سے متاثر ہو کر

اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا صحیح نہیں، سازشوں کے ماحول میں پُر امن طریقے اختیار کرنا اور امت مسلمہ کو شکار ہونے سے بچانے کے لئے اصحاب فکر و علم و دانش و تجربہ کے یکجا ہو کر بدلتے حالات میں مؤثر و کامیاب حکمت عملی اپنانے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

تزکیہ و تربیت: اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مؤمنین کے تزکیہ کا کام بھی لیا ہے۔ بعض اوصاف جو اللہ سبحانہٗ کو ناپسندیدہ ہیں یا جن کا غیر محل میں اظہار یا جن میں حدودِ شرعیہ سے تجاوز ناپسند ہے، ان کا موقع بموقع ذکر فرمایا، ان کو امام غزالی نے مہلکات میں شمار فرمایا ہے۔ جب کہ وہ اوصاف جو اللہ سبحانہٗ کو مومن کی ذات میں مطلوب و محبوب ہیں ان کو غزالی نے منجیات میں شمار فرمایا ہے۔ ناپسندیدہ اوصاف میں سرفہرست شرک، کفر، نفاق، باغیانہ رویہ، تکبر، سرکشی، بدکاری ہیں۔ اور پسندیدہ اوصاف میں توحید، اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ، خاتم الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مجاہدہ و مجاہدانہ زندگی سے محبت، وحدت الٰہ، رسالت، کتب سماویہ، ملٰئکہ، تقدیر، یوم آخر، بدنی حشر و نشر، حساب، کتاب و ایمان، اللہ کی ربوبیت، محیط کل ازلی علم، قدرت مطلقہ مستقلہ پر راسخ علم و ایمان، دین میں استقامت، عدل اور تقوی سرفہرست ہیں، دیگر اوصاف رذیلہ میں قرآن یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بے بنیاد شک و تکذیب، عہد شکنی، زمین میں کشت و خون اور انتشار و فساد، لڑکیوں کی زندہ تدفین، قتل اولاد، ہر قسم کا ظلم (یعنی حقوق کی عدم ادائیگی)، حق و باطل میں تلبیس، حق پوشی، جادو (سحر)، حرام کردہ اشیاء کو کھانا، فتنہ انگیزی و فتنہ پروری، عورتوں پر ظلم و تعدی، سود خوری، کنجوسی، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء سازی، ان کے ارشاد کردہ کلمات میں تبدیلی اور ان کی نافرمانی، جنسی بے راہ روی، حسد، ریاکاری، بہتان طرازی، غیبت، دین یا دین کے حاملین کا مذاق اڑانا، حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینا، مکر و فریب، اسراف و تبذیر، کسی مومن سے عداوت، بغض و کینہ رکھنا، نفس کے بھڑکانے سے حدود اللہ سے تجاوز کرنا، اللہ سبحانہٗ اور اس کی مخلوق کے احسانات کی ناشکری کرنا، ضد و ہٹ دھرمی، اللہ کی رحمت سے مایوسی، دھوکا دہی، جھوٹ، سازش، تعذیب، فحش کلامی، تخریب کاری، والدین کو ایذاء پہنچانا، فضیحت گوئی یا کسی کو رسوا کرنا، جھوٹی شہادت دینا شقاوت و قساوت قلبی، قبول حق میں ناگواری، گمراہی، پاکیزہ مردوں یا عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگانا، رشوت لینا، چھوٹی چھوٹی بات پر ٹوکنا یا گرفت کرنا، امت میں افتراق پیدا کرنا، جماعت مسلمین کے مصالح یا اتفاق علماء کی مخالفت کرنا، فال بدلینا، الوہیت یا رسالت کا دعوی کرنا، لڑنا جھگڑنا، چغل خوری کرنا، مومنین کے درمیان شکوک و شبہات اور جنگ و جدال کرانا، زینت کی نمائش کرنا، شریعت کے مقاصد، اصول، قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر کے جمہور سے الگ راہ بنانا، غیر ضروری تجسس، اتباع ھوی نفس یا بالفاظ دیگر اپنے نفس کو الٰہ بنالینا، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام اور حج کی ادائیگی میں اور کار خیر میں رکاوٹیں پیدا کرنا اللہ کے غضب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بھیانک اوصاف ہیں (اعاذنا اللہ منہا)۔ ایسے تمام اخلاق کا قلع قمع ضروری ہے ورنہ اللہ جل جلالہٗ کے عتاب، عقاب اور عذاب سے بچنا دشوار ہے۔

اچھے اوصاف: اخلاق و اوصاف فاضلہ میں استمراری اور پھر دائمی ذکر اللہ میں مشغولیت، استحضار حق جل شانہٗ میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے، نفس، قلب، ذہن و روح کو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی خشیت، خوف، شوق اور محبت سے پُر رکھنا اور بصورت غفلت تجدید استحضار کرنا تمام اخلاق فاضلہ کی جڑ ہیں؛ ایفاء عہد، انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ہمہ وقت آمادگی، خوف، صبر، شکر اللہ سے بندے کا رشتہ قوی سے قوی تر بنانے میں مؤثر ہیں۔ ان کے علاوہ اولوالامر کی اطاعت تاوقتیکہ وہ معصیت کا حکم نہ دے ضروری ہے،

والدین، اعزہ، اقرباء یتامیٰ، مساکین، فقراء، پڑوسی، مسافر، سائل، زوجات/زوجہ، اولاد، ملازم اور تمام خلوق کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، چھوٹی موٹی غلطیوں پر عفوودرگزر کرنا، قرآن تلاوت کرنا اور اس کے مضامین میں تفکر وتدبر کرنا، اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتے رہنا، اقوال، اعمال اور کردار میں صدق کوملحوظ رکھنا، اصلاح انسانیت کے لئے فکر مند رہنا اور آسان قابل عمل حکمت عملی تشکیل دینا، قلب، ذہن، بدن، لباس اور روح کی پاکیزگی کا مسلسل اہتمام کرنا، اللہ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اولوالامر کی فرمانبرداری (سیاسی، انتظامی، فوجی، دینی، مخلص، حکیم، دانا، منصف، عالم وفاضل افراد کی اطاعت کرنا (اگر وہ قرآن حکیم اور حدیث نبوی کی صراحتوں کے مطابق حکم دیتے ہوں یا مباح امور بجالانے کا فرمان دیتے ہوں تو رعایاء پر اطاعت گزاری واجب ہے)، امانتوں کو ادا کرنا، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا، نیک کاموں سے متعلق اوامر کی ترغیب دینا اور تشویق دلانا اور منکرات سے دور رہنے کی ہدایت کرنا اور منکرات ومناہی سے کراہت دلانا تاکہ کوئی فرد اللہ کے غضب میں مبتلا نہ ہوجائے، تدبیر کرنا لیکن بھروسہ اللہ ہی کی ذات پر کرنا، اہم ونازک امور میں صائب الرائے متخصصین سے مشورہ کرنا، عدل کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کرنا اگرچہ فیصلہ اپنی ہی ذات کے خلاف کیوں نہ پڑے، اگر قدرت شرعیہ حاصل ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تنزیل کردہ آخری کتاب قرآن مجید اور خاتم النبین سے ثابت شدہ ارشادات کی روشنی میں فیصلے کرنا، نیکی وتقویٰ کے امور میں باہمی تعاون کرنا، اور ظلم وزیادتی میں نہ صرف عدم تعاون کرنا بلکہ اگر استطاعت شرعیہ رکھتا ہو تو ظلم وتعدی سے روکنا، اللہ کی عظمت و کبریائی اور اسی کی عطا کردہ توفیق عمل نیک کے احساس کے تحت تواضع کرنا، عمل صالح میں مسارعت ومسابقت کرنا، نفس کے محاسبہ سے کبھی غفلت نہ کرنا کہ وہ شیطان کا غفلت کی حالت میں آسان شکار ثابت ہوسکتا ہے (اعاذنا اللہ منہا)، جو کہنا، کرنا یا لوگوں کو ترغیب وترہیب دینا خالصۃ لوجہ اللہ دینا، اللہ جل جلالہ ہی سے استعانت، استغاثہ اور استعاذہ مانگنا، دین کا علم حاصل کرنے کی حسب استعداد کوشش کرنا حتیٰ کہ اللہ حکیم وکریم دین میں تفقہ (سمجھ داری) عطا فرمادے، ضدی لوگوں سے غیر ضروری گفتگو بالخصوص مباحثہ سے بچنا، مہمان کا اکرام کرنا اور حسب توفیق اس کے لئے طعام فراہم کرنا معاصی وسیأت سے پرہیز کرنا اور اگر کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو فوراً استقلال قلبی کے ساتھ توبہ کرلینا، گناہ چاہے کوئی ہو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے بڑا نہیں ہوسکتا، توبہ کے علاوہ نیک عمل کے ذریعہ سیئہ کو حسنہ میں تبدیل کرالینا، رحمت وشفقت، نرمی، بردباری، حیاء وشرم، عفت وپاکبازی، شجاعت، حق پر ثابت قدمی، رزق حلال کے حصول کی کوشش، جود وسخاوت، طیبات سے شرعی وطبعی رغبت، صنعت وحرفت سے کسب حلال، کسی بھی مکان میں داخل ہونے سے پیشتر اجازت کا لزوم، زوجہ کے علاوہ کسی کی طرف بھی شہوانی نظروں سے اجتناب اور غض بصر کا اہتمام، سنت نکاح پر عمل، شیطان سے عداوت، قوت قلبیہ، ذہنیہ، روحیہ، بدنیہ علمیہ کو بڑھانے کی تدابیر اللہ جل جلالہٗ کی عظمت، کبریائی، جلال اور جمال اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب، توقیر، تعظیم، احترام، فرمانبرداری میں محبت کی مٹھاس، ضرورت مندوں کی قضائے حاجات، کبائر وفواحش سے پرہیز، ملک الموت کی آمد کا پرتپاک استقبال۔ مختصر یہ کہ مومن عباد الرحمٰن کے اخلاق کا چلتا پھرتا مظہر ہو اور اس باب میں انک لعلی خلق عظیم کا حتی الوسع ایسا متبع رسول پیکر ہو کہ جو اسے دیکھے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اسے یاد آجائیں اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کامکمل طور پر اختیار کرنے کا ایک شدید جذبہ اس کے اندر پیدا ہوجائے، عبدیت وعبودیت اور اللہ لطیف وکریم کا دائمی استحضار اس پر ایسا غالب آجائے کہ وہ اللہ کا مطلوب مومن بن جائے، علم وعمل ہوں یا اخلاق وکردار،

شوق واشتیاق ہوں یا جوش وہوش فراواں اس کی توجہ کا مرکز صرف اللہ کی ذات ہو اور وہ صفات الٰہیہ کی تجلیات سے اپنا مقسوم حاصل کرلے تاکہ سراپا دعوت الی الحق بن جائے۔

قیامت اور اس کے مناظر : قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے مختلف نام لیے ہیں، مثلاً یوم الدین، الآخرۃ، یوم القیامۃ، الدار الآخرۃ، الیوم الآخر، الساعۃ، یوم الحسرۃ، یوم البعث، یوم الفصل، یوم التلاق، یوم الازفۃ، یوم الحساب، یوم التناد، یوم الجمع، یوم الوعید، یوم الخلود، یوم الخروج، الواقعہ، التغابن، الحآقّۃ، القارعۃ، الطامّۃ الکبریٰ، الصّآخّۃ، الغاشیۃ.

جب ساری کائنات اور ساری مخلوق فنا ہو جائی گی، کرسی، عرش، جنت، جہنم، سمٰوات، زمین، ستارے، سیارے، ارواح، فرشتے سب فنا ہو جائیں گے کُلُّ شَیٍ ھَالکِ الا وجھہ کے معنیٰ محقق علماء نے یہی بتائے ہیں، حتیٰ کہ صور پھونکنے والے فرشتے کو بھی فنا ہو جانے کا حکم ہوگا اور وہ بھی اپنے صور کے ساتھ فناء ہو جائے گا۔ پھر جب اللہ جل جلالہٗ کا حکم ہوگا صور پھونکنے پر مامور فرشتہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کو اللہ وجود بخشے گا ان کے صور کو بخشے گا اور پھر صور پھونکنے کا حکم ہوگا۔ فنا شدہ مخلوق وجود پذیر ہوتی جائے گی۔ زمین کو چپاتی کی شکل دی جائے گی یعنی زمین بدل جائے گی اور اپنی اپنی قبروں سے انسان اس طرح نمودار ہونے لگیں گے جیسا کے روئیدگی نمودار ہوتی ہے، بے لباس، غیر مختون مرد وعورت جن کی نظریں اوپر دیکھ رہی ہوں گی اپنے اپنے قائدین کے ساتھ گروہ در گروہ اللہ کی بارگاہ میں جمع ہونے لگیں، ان میں جن، انسان، پرند، چرند اور درندے سبھی شامل ہوں گے۔ دیکھنے والے یہ سمجھیں گے کہ یہ مدہوش لیکن یہ مدہوش نہ ہوں گے بلکہ حواس کی پراگندگی ان پر نمایاں ہوگی۔

فرشتوں کو حکم ہوگا تو وہ سب کو تین گروہوں میں بانٹ دیں گے؛ اصحاب الیمین، اصحاب الشمال اور مقربون، اپنے اپنے ایمان وعمل کے لحاظ سے کسی کے صرف تلوے میں پسینہ ہوگا، کوئی ٹخنوں تک، کوئی گھٹنوں تک، کوئی سینہ تک اور کوئی گردن تک پسینہ میں شرابور ہوگا۔ اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بالآخر مقام محمود سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بارگاہ میں حمد وثناء کے بعد حساب شروع کرنے کی درخواست کریں گے۔ آج بادشاہت حقیقی بادشاہ ہی کے پاس ہوگی، لِمَنِ المُلک الیوم ط للہ الواحد القھار. داہنی جانب کے لوگوں کو ان کے اعمال نامہ سیدھی جانب سے دیے جائیں گے اور ان کے چہرے روشن ہو جائیں گے، بائیں جانب کے لوگوں کو ان کے اعمال نامہ بائیں جانب سے دیے جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے۔ یوم تبیَضُّ وجوہٗ وَ تَسود وجوَہٗ. انبیاء ورسل کو علیحدہ ممتاز انعام دیا جائے گا (اور جیسا کہ صحیح حدیث میں روایت کیا گیا ہے سات قسم کے لوگوں کو عرش الٰہی کے سایہ میں جگہ دی جائے گی)۔ حساب شروع ہوگا، میزان قائم کی جائے گی، شرک، کفر، نفاق، ایمان کو جیسے کہ میزان کی شان ہوگی اس کے مطابق تولا جائے گا، عمل کو تولا جائے گا۔ جس کا پلڑا ایمان واعمال صالحہ سے جھک جائے وہ جنت کا مستحق قرار دیا جائے گا اور جس کا پلڑا بداعتقادی اور سیاہ کاریوں سے ہلکا پڑ جائے گا وہ جہنم کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔ اللہ جل جلالہٗ کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کی جسارت نہ ہوگی، یہ وہ دن ہوگا جب دوست دوست سے بھاگے گا، بھائی بھائی سے، والدین اولاد سے اور اولاد والدین سے بھاگے گی، ساری محبتیں، ساری دوستیاں، سارے تعلقات کافور ہو جائیں گے۔ کفار ومشرکین اس روز کہیں گے کہ کاش میں مٹی ہوتا کہ آج اس روز حساب سے بچ جاتا۔ کفار ومشرکین میں سے کچھ اس روز بھی

اپنی طلاقت لسانی سے اللہ کے سامنے مختلف اعذار پیش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لبوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے اعضاء بدن کو قوت گویائی عطا فرمائے گا اور وہی اعضاء جن کی تسکین کے لئے انھوں نے شیطان ونفس کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور دے دی تھی، ان کا سارا کیا دھرا اللہ سبحانہ' وتعالیٰ کی بارگاہ میں بے کم وکاست بیان کر دیں گے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرے گا، عدل ہوگا یا فضل، ہاں اللہ اپنی رحمت، مغفرت، عفوودرگزر اور رأفت سے کام لیں گے اور جنتیوں کو جنت اور جہنمیوں کو جہنم بھیجنے کے بعد اجازت یافتہ انبیاء ورسل اور اولیاء کرام کی شفاعت قبول فرمائیں گے، اور جیسا کہ کہا گیا ہے رحمٰن الدنیا ورحیم الآخرۃ اپنے خصوصی فضل ورحمت سے بے شمار لوگوں کو بخش دیں گے۔ اَللّٰھُمَّ اِناَّ نَسئَلُکَ الجنَّۃَ الفِردَوس و نعوذبک من النّار۔

99 فیصد لوگ جہنم کی غذا وایندھن بنیں گے لیکن جب اللہ تعالیٰ جہنم سے دریافت فرمائے گا: ھَلَ امتَلَئتِ؟ تو جہنم کہے گی: ھل من مزید؟ (کیا اور جہنمی ہیں؟) اَللّٰھمَّ اَجِر'نامِنَ النّارِ۔ امین

قرآن مجید میں اور ارشادات نبوی میں اس بابت بہت ضروری تفصیل سے ہمیں مطلع کیا گیا ہے۔

2.6 اشراط الساعۃ

قیامت کی علامات کے بارے میں بھی قرآن میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ایسی کچھ تفصیلات درج ذیل ہیں:

1. حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول وَ اِنۡ مِن اھل الکتاب الا لَیُومِنَنَّ بِہٖ قَبلَ مَوتِہٖ ویوم القِیٰمۃِ یَکوُ ن' عَلَیھِم شَہِیدًا

2. اس دن یاجوج وماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے نیچے اُتر آئیں گے اور (قیامت کے وقوع وسچا وعدہ) قریب آجائے گا۔ کفر کرنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی (اور ان کی زبانیں بول پڑیں گی) ہائے مصیبت! (ہم سے کیسی غفلت ہوئی) یقیناً اس (دن) کو بھلائے بیٹھے رہے بلکہ (یقیناً) ہم ہی ظالم تھے۔

3. اور جب اللہ کا حکم ہوگا تو اللہ تعالیٰ انسانوں کو اپنی قدرت کا ادنیٰ مشاہدہ کرائیں گے۔ زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو انسانوں سے بات چیت کرے گا حالانکہ لوگ اللہ سبحانہ' وتعالیٰ کی بصری، سمعی اور فکری نشانیوں پر یقین نہ رکھتے تھے۔

4. اس دن آسمان ایک گارھا دھواں لے آئے گا جو تمام انسانوں کو گھیر کر دردناک عذاب میں مبتلا کر دے گا۔

5. لوگ گمان کریں گے کہ ان پر ایسی سختی ہوگی جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دے گی، نہیں نہیں، جب جان گلے تک پہنچ جائے گی اور پوچھا جا رہا ہوگا کہ جھاڑ پھونک (سے شفایاب) کرنے والا کہاں ہے، جلد ہی (مرنے والا) سمجھ جائے گا کہ (سب سے) جدائی آپہنچی، پنڈلی سے پنڈلی لپٹنے لگے گی تو بس اس دن سب کو آپ کے رب کی طرف ہی جانا ہوگا۔

6. بادلوں کی کثرت سے آسمان پھٹ پڑے گا اور ملٰئکہ رفتہ رفتہ نیچے اُترنے لگیں گے۔

7. جب حاملہ اونٹنیاں حیران وپریشان پھریں گی۔

8. تمام وحشی جانور جمع ہوجائیں گے۔

9. آسمان سرخ چمڑے کی رنگت اختیار کرلے گا۔

10. ستارے گرادیے جائیں گے اور آفتاب تاریک ہوجائے گا، سمندرودریا پھوٹ کر بہہ نکلیں گے اور قبر پلٹ کردی جائیں گی۔

11. پہاڑ ہوا میں تیرتے پھریں گے بلکہ دھنے ہوئے اون کی طرح اڑتے پھریں گے۔

12. زمین پھیلادی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے باہر نکال پھینکے گی، خالی ہوجائے گی اور ریزہ ریزہ ہوجائے گی۔

2.7 خلاصہ

قرآن میں توحید، رسالت اور آخرت کے علاوہ زندگی کے اجتماعی امور، اخلاق وآداب زندگی، جرم وسزا کی تفصیلات اور قیامت کی علامتوں وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ توحید سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام جہانوں کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ رسالت کا لغوی معنی پیغام بری ہے، رسول کے معنی پیغامبر، قاصد وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاحی معنی میں ''رسول اللہ تعالیٰ کا وہ برگزیدہ بندہ ہے جسے اللہ نے لوگوں کی رہنمائی کے لئے اپنا پیغام ہدایت پہنچانے کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔ حضرت محمدؐ سے پہلے جتنے رسول آئے مخصوص زمانے، مخصوص علاقے اور مخصوص امت کی رہنمائی کے لئے آئے لیکن حضرت محمدؐ قیامت تک کے لئے تمام انسانیت کے لئے رسول ہیں اللہ تعالیٰ نے رسول کی اطاعت ورجت قرار دیا ہے۔ اللہ نے اجتماعی زندگی کے احکام بیان کئے، اچھے اخلاق اور بری عادتوں کا ذکر فرمایا۔ نیز قیامت کی علامات تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائی ہیں۔

2.8 نمونے کے امتحانی سوالات

1. توحید سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ تفصیل سے لکھئے۔

2. قرآن کے مضامین پر روشنی ڈالئے۔

3. رسالت کے بارے میں آپ اپنی معلومات قلمبند کیجئے۔

2.9 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. علوم القرآن : ڈاکٹر احسن الدین

2. علوم القرآن : مولانا تقی عثمانی

3. تاریخ القرآن : ڈاکٹر عبدالصمد صارم ازہری

4. علوم القرآن : ڈاکٹر صبحی محمصانی

اکائی 3 : تعارف تفسیر

اکائی کے اجزا

3.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ تفسیر قرآن اور تاویل کا مفہوم کیا ہے۔ تفسیر قرآن میں کن مصادر سے استفادہ کیا جاتا ہے، وہ اس بات سے بھی واقف ہوں گے کہ تفسیر قرآن کے مختلف مناہج کیا رہے ہیں، اور ہر منہج کے تحت کون سی تفسیری کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ اسی طرح طلبہ کو اس بات کی بھی واقفیت حاصل ہوگی کہ تفسیر کے عمل میں کن شرائط اور اصولوں کو ملحوظ رکھا جانا ضروری ہوتا ہے۔

3.2 تمہید

اس اکائی میں تفسیر کے لغوی اور اصطلاحی معنی پر روشنی ڈالتے ہوئے تفسیر و تاویل کا فرق واضح کیا جائے گا، پھر تفسیر قرآن کے مصدر اول قرآن اور مصدر دوم حدیث نبوی سے استفادہ کے مفہوم اور طریقہ کو واضح کیا جائے گا۔ نیز مختلف مناہج تفسیر جیسے تفسیر بالماثور، تفسیر بالرای، تفسیر بالرای الجائز، اور تفسیر کی دیگر اقسام جیسے فقہی، اشاری و اعتباری، ادبی، لسانی، کلامی، شیعی اور جدید تفاسیر کی کتب کا ذکر کیا جائے گا۔ ساتھ ہی اصول تفسیر اور اس کے شرائط پر روشنی ڈالی جائے گی۔

3.3 تفسیر کا تعارف

معنی ومفہوم: تفسیر فَسَّرَ یُفَسِّرُ تَفۡسِیۡرًا سے ہے جس کے لغوی معنی چند ے مبالغہ کے ساتھ پوشیدہ چیز کو کھول دینا، واضح کر دینا کے ہیں۔ اصطلاح میں "تفسیر" کے معنی قرآن مجید کی آیات کے مراد ومنشاء، اسرار وحکم اور احکام ومطالب واضح طور پر بیان کرنے کے ہیں۔

دوسرا لفظ "تاویل" ہے جو اٰل اِلَیۡہِ اَوۡلاً سے مشتق ہے۔ اس کے لغوی معنی لوٹنا، رجوع کرنا، مقصود کی طرف پلٹنا کے ہیں اَوَّلَ الشَّیۡءَ اِلَیۡہِ تَاۡوِیۡلًا کے معنی "کسی چیز کو لوٹانا" کے ہیں۔ اصطلاح میں تاویل کا مطلب کسی لفظ کے مقصد ومنشاء و مراد الٰہی کی طرف لوٹانے کے ہیں۔

لفظ تفسیر کا مادہ "فسر" ہے جس کے معنی ہیں کھول دینا، بے حجاب وظاہر کرنا، مجد الدین فیروز آبادی اور ابن منظور دونوں کا اتفاق ہے کہ اس کا فعل باب ضَرَبَ اور نَصَرَ دونوں سے آتا ہے۔ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں کہ (اونٹ کا) پالان (یا گھوڑے کی) زین ہٹا کر ان کی پیٹھ ننگی کرنے کو تفسیر کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پیٹھ کو بے حجاب کرنے میں کشف واظہار پایا جاتا ہے۔

ابوحیان مزید لکھتے ہیں کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن کے تلفظ، ان کے مفہوم ومدلول اور ان کے احکام افرادی وترکیبی اور ان معانی ومطالب پر روشنی ڈالی جاتی ہے جن کی طرف ان کی حالت ترکیبی اشارہ کرتی ہے۔ جس علم سے قرآن مجید کے طریقہ نطق وتلفظ کا پتہ چلتا ہے اسے علم القراءت کہا جاتا ہے۔ الفاظ کا معنی ومفہوم علم اللغۃ سے اور احکام ہیئت افرادی وترکیبی صرف ونحو وبیان ومعانی وبدیع سے معلوم ہوتے ہیں، جب کہ حقیقی ومجازی کے درمیان فرق کرنے کے لئے صارف عن الظاہر کا موجود ہونا ضروری ہے، اسی طرح تفسیر کے لئے ناسخ، منسوخ اور اسباب نزول کی پہچان کے علاوہ وہ واقعہ معلوم ہونا چاہئے جو مبہمات قرآن کی توضیح کرتا ہو۔ بالفاظ دیگر عبارۃ النص، دلالۃ النص، اقتضاء النص اور اشارۃ النص واضح ہوتے ہوں۔

بدر الدین زرکشی لکھتے ہیں کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر منزّل قرآن کے مفاہیم ومعانی سمجھے جاتے اور اس کے احکام ومسائل اور اسرار وحکم سے بحث کی جاتی ہے۔ ایک ممتاز مفسر لکھتے ہیں کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں قرآنی آیات کے نزول، ان کے متعلقہ واقعات اسباب نزول، مکی ومدنی (ماقبل الہجرۃ وما بعد الہجرۃ)، محکم ومتشابہ، ناسخ ومنسوخ، خاص وعام، مطلق ومقید، مجمل ومفسر، حلال وحرام، وعد ووعید، امر ونہی، عبرت وامثال (قصص) وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ غرض یہ کہ تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں انسانی استطاعت کی حد تک قرآنی الفاظ وآیات سے اللہ سبحانہ' کی مراد ومنشاء سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غالباً اسی کے مد نظر علماء کی ایک جماعت نے تفسیر وتاویل کو مترادف مانا ہے۔

ابن حبیب نیشاپوری کو اس سے اختلاف ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں ایسے مفسر پیدا ہو گئے ہیں جو تفسیر وتاویل کا باہمی فرق نہ بتا سکیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ قرآن مجید میں تفسیر وتاویل دونوں لفظ وارد ہوئے ہیں، پھر علماء اصول فقہ تاویل وتفسیر کو خاص اصطلاحات کی حیثیت سے استعمال کرنے لگے اگرچہ متکلمین نے اپنی تصانیف میں سلفی روش جاری رکھی۔

امام راغب کا رجحان اس طرف ہے کہ تفسیر وتأ ویل میں عموم وخصوص کا فرق ہے۔ تفسیر کا لفظ عموماً الفاظ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور تأ ویل کا لفظ معانی کے لئے۔ تفسیر مفردات کے لئے بولا جاتا ہے اور تأ ویل آیات اور مرکبات کے لئے۔ یہ الگ بات ہے کہ تأ ویل کا لفظ کبھی عام استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی خاص مثلاً کفر کا لفظ مطلقاً انکار کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور خاص وحدت باری تعالیٰ کے انکار کے لئے بھی، بلکہ احکام باری تعالیٰ سے انکار کے لئے بھی یا مثلاً ایمان مطلق تصدیق کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ' کے منتخب کردہ وپسندیدہ خاص اسلام کے لئے بھی۔

امام ابومنصور ماتریدی کے نزدیک تفسیر میں قطعیت ویقین پائے جاتے ہیں بشرطیکہ کوئی قطعی وحتمی دلیل موجود ہو۔ اس کے برخلاف کسی لفظ میں اگر مختلف معانی کا احتمال پایا جاتا ہوتو دلائل وقرائن سے کسی ایک احتمال کو ترجیح دینا تأ ویل کہلاتا ہے۔

ثعالبی لکھتے ہیں کہ لفظ جس حقیقی یا مجازی مفہوم کے اظہار کے لئے وضع کیا گیا ہو اس کے بیان کرنے کو تفسیر کہتے ہیں۔ مثلاً لفظ صراط کی تفسیر راستہ اور صیب کی بارش کے ساتھ۔ اس کے برخلاف کسی لفظ کے اندرونی وباطنی مفہوم، یعنی قائل کے مقصود کو واضح کرنے کو تأ ویل کہتے ہیں۔ لفظ تأ ویل کا مادہ 'اول' ہے جس کے معنی ہیں نتیجہ وانجام کی طرف لوٹانا۔ لہٰذا حقیقت مراد سے آگاہ کرنے کو 'تأ ویل' اور دلیل مراد کے اظہار کو 'تفسیر' کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں لفظ ''تأ ویل'' مختلف مقامات پر مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ ''آل عمران'' کی ساتویں آیت فاما الذین فی قلو بھم زیغٌ فَیَتَّبِعُونَ ما تشاَ بَہَ منہُ ابْتِغآ ءَ الْفِتْنَۃِ وَ ابْتِغآ ءَ تَا ویلِہٖ میں لفظ تأ ویل تحریف کے معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سورہ ''یوسف'' کی آیت 6 میں تأویل الاحادیث اور آیت 44 میں تأویل الا حلام میں تعبیر خواب مراد ہے جب کہ سورہ ''الکہف'' میں آیت 78 اور آیت 82 میں وضاحت وجہ اور محرکِ سبب مراد ہیں۔

امام بغوی اور کواشی فرماتے ہیں کہ تاویل کے معنی کسی آیت سے ایسا مفہوم مراد لینا ہے جس کی اس میں گنجائش ملتی ہو بشرطیکہ یہ مفہوم سیاق وسباق سے ہم آہنگ ہو اور صراحت کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو۔ اس کے برخلاف آیت کے شان نزول اور واقعہ متعلقہ کے ذکر وبیان کو تفسیر کہتے ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک ''تفسیر'' کا تعلق روایت کے ساتھ ہوتا ہے اور ''تأ ویل'' کا درایت کے ساتھ۔ بعض دیگر علماء کے نزدیک ترتیب عبارت سے جو معنی ظاہر ہوں اس کے بیان کرنے کو تفسیر اور جو معنی اشارۃً معلوم ہوں ان کے کشف واظہار کو تاویل کہتے ہیں۔ متاخرین میں یہی بات مقبول ہے، جیسا کہ علامہ شہاب الدین آلوسی نے مقدمہ تفسیر روح المعانی میں بیان کیا ہے۔ علامہ محمد حسین ذہبی بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ''تفسیر'' اظہار وکشف وبیان کو کہتے ہیں اور مراد الٰہی کی حتمی تعیین اسی وقت ممکن ہے جب دلائل قاطعہ خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رسول سے بطریق صحت روایت ملے۔ ''تأ ویل'' میں یہ حقیقت پیش نظر ہوتی ہے کہ کسی لفظ میں اگر متعدد معنی کی گنجائش موجود ہوتو کسی ایک معنی کو بنا بر دلیل قوی ترجیح دی جائے۔ اس میں لغت وامثال عرب، اسالیب قرآن، سیاق وسباق وغیرہ کی روشنی میں مفہوم کا تعین اور معنی کا استنباط کیا جاتا ہے۔ حاصل یہ کہ تفسیر میں منقولات اور تأ ویل میں قوت استنباط پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

صحابہ کرام قرآن مجید میں بیان کردہ احکام ومسائل سے آگاہ تھے، لیکن اس کے حقائق ودقائق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے اور حدیث نبوی کی روشنی میں فکر ونظر، بحث وتدبُر، اور اس کی تعلیمات کے انجذاب وعمل ہی سے معلوم ہوسکتے تھے

، چنانچہ صحابہ کرام قرآنی آیات پر عمل کے لئے ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ، انفراداً فکر ونظر کرتے اور اجتماعی بحث وتدبر میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق حصہ لیتے اور اگر کسی جگہ کوئی اشکال پیدا ہوتا یا آیات میں باہمی تضاد محسوس ہوتا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے ، جیسا کہ وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيمَا نَهُمْ بِظُلْمٍ کے نزول پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ہم میں کون شخص ہے جس نے ظلم نہیں کیا ہو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہاں ظلم سے شرک مراد ہے۔ اور یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۔ یا عدی بن حاتم اور سیاہ وسفید دھاگوں کا واقعہ بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

الغرض علم تفسیر سے نہ صرف ایمان وعلم اور ذکر الٰہی وتذکیر حاصل ہوتے ہیں بلکہ عقائد، عبادات، معاملات، عقوبات، معاشرت اور اخلاق کے ابواب میں الوہی ہدایات کا معلوم کرنا ہے کہ فرد و معاشرہ، دنیا و آخرت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے مطلوب سانچہ میں ذہن وقلب وروح کو ڈھال سکیں، اپنے فوری، درمیانی اور آخری اہداف مقرر کر سکیں، اور ہر ہر قدم کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں۔ یہ علم جتنا جلیل القدر ہے اتنا ہی قوی استعدادِ قلبی وذہنی اور شدت قوت محرکہ کا متقاضی ہے۔

3.4 مصادر تفسیر

عہد رسالت میں تفسیر قرآن کے لئے درج ذیل مصادر کی تعیین ہوئی ہے۔

1. قرآن حکیم
2. رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
3. اجتہاد

3.4.1 مصدر اول: قرآن حکیم

قرآن کے قاری جانتے ہیں کہ قرآن میں ایجاز بھی ہے اور اطناب بھی، اجمال بھی ہے اور تبیین بھی، کلمات واحکام میں خاص بھی ہے اور عام بھی، مشترک بھی ہے اور ماوّل بھی، ظاہر بھی ہے اور خفی بھی، نص بھی ہے اور مشکل بھی، مجمل بھی ہے اور مفسر بھی، محکم بھی ہے اور متشابہ بھی، حقیقت وصریح بھی ہے اور مجاز وکنایہ بھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق یہ تھا کہ اگر قرآن حکیم میں کوئی حکم صراحتاً مذکور نہ ہوتا تو 1) وحی الٰہی کا انتظار کرتے 2) اہل کتاب کے بیان کردہ احکام کو سامنے رکھتے، یا 3) اجتہاد فرماتے، یا 4) قرآن حکیم ہی پر تدبر فرماتے جسے آج تفسیر القرآن بالقرآن کہا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل ذیل میں مختصراً درج ہے۔

1. ایک موضوع پر مشتمل آیات کو تاریخ نزول کے لحاظ سے جمع کیا جائے کیونکہ قرآن حکیم تدریجاً نازل ہوا ہے اور اس کی آیات احکام میں زمانہ وحالات کے علاوہ مخاطبین کی قبولیت کی رعایت کی گئی ہے۔
2. جو بات ایک مقام پر مختصراً آئی ہے، دوسرے مقام یا مقامات پر مفصلاً وارد ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت آدم وابلیس کا واقعہ یا حضرت موسیٰ وفرعون کا واقعہ۔

3. مجمل کی تبیین کی گئی ہے، مثلاً سورۃ ''المومن'' کی آیت 28 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اور اگر یہ رسول سچا ہے تو جس عذاب کا وعدہ وہ تم سے کرتا ہے اس میں کچھ تمہیں ضرور پہنچے گا۔ اور آگے سورۃ ''المومن'' کی آیت 77 میں فرمایا: جس بات کا وعدہ ہم ان سے کرتے ہیں اس میں کچھ کیوں نہ آپ کو دکھا دیں۔

4. مطلق کو مقید اور عام کو خاص پر محمول کیا جائے۔ سورۃ ''المائدۃ'' میں آیت 6 میں ابتداء میں فرمایا: (وضو کے وقت) اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو۔ اور پھر تیمّم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: اپنے چہروں اور ہاتھوں کو اس سے (پاک مٹی سے) مسح کرلو۔ سورۃ ''البقرۃ'' کی آیت 254 میں روز حساب شفاعت کی نفی بطریق عموم فرمائی، اور آیت الکرسی میں حق شفاعت کو اپنے اذن سے مشروط فرمایا۔

5. تخلیق آدم کی بابت بعض آیات میں فرمایا کہ ان کو تُراب (مٹی) سے پیدا کیا ہے، بعض میں طین (پانی سے گوندھی مٹی یا کیچڑ) اور بعض میں صلصال (کھنکھناتی مٹی) کا ذکر فرمایا۔ کیا یہ تخلیق آدم کے مختلف مراحل نہیں ہو سکتے جن سے حضرت آدم ابتداء تخلیق سے نفخ روح تک گزرے؟

تفسیر القرآن کی نمائندہ تفاسیر میں اضواء البیان للشنقیطی اور تفسیر القران بکلام الرحمن از ثناء اللہ الامرتسری کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

3.4.2 مصدر دوم: حدیث نبوی

صحابہ کرام قرآن مجید کی تلاوت کرتے، اس کے مفہوم کو سمجھتے، غور وفکر کرتے، اور اگر کسی مقام پر کوئی اشکال ہوتا یا کوئی لفظ یا آیت سمجھ میں نہ آتی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضاحت فرما دیتے۔ قرآن مجید کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی ہی یہ تھا:

1. وَ اَنزَلنَاَ اِلَیکَ الذِکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاس مَانزِّل اِلَیہِم

2. اِنَّاَ اَنزَلنَاَ اِلَیکَ الکِتٰبَ بِالحَقِّ لِتَحکُمَ بَینَ النَّاسِ بِماَ اَرَاکَ اللّٰہُ

3. یَا اَیُّھَاَ الرَّسولُ بَلِّغ مَا اُنزِلَ اِلَیکَ مِن رَّبِّکَ

4. اِنَّ الَّذِینَ یَکفُرُونَ بِاَ للّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیدُونَ اَن یُّفَرِّ قُوا بَینَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ

اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان فرق کرنے سے روکنے کا سبب کیا تھا؟

1. اللہ اور اللہ کے رسول کا ایک ہونا جو محال و ناممکن ہے۔

2. اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا ایک ہونا مَن یُّطِعَ الرَّسولَ فَقَد اَطاَعَ اللّٰہ

3. قرآن مجید کے علاوہ اللہ کے رسول کو اللہ کی جانب سے بعض اشیاء کو حلال اور بعض اشیاء کو حرام قرار دینے کا اختیار دینا۔ وَیُحلُّ لَھمُ الطَّیِّباتِ وَیُحرِّمُ عَلَیھِمُ الخبئِث اور مخاطبین کو اس سے آگاہ کرنا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سنو! مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے مثل ایک اور چیز بھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک پیٹ بھرا شخص مسند سے ٹیک لگائے کل یہ کہنے لگے کہ بس قرآن کو تھامے رکھو، اس میں جو چیز حلال پاؤ، اسے حلال جانو اور جو چیز حرام پاؤ حرام جانو''

4. اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کے درمیان فرق کرنے سے روکنا۔

صحابہ کرام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تفسیر قرآن کے باب میں جو کچھ سنا باللفظ یا بالمعنیٰ روایت کر دیا مثلاً:

1. حضرت عدی بن حبان روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے یہودی اور الضَّآلِّیْنَ سے نصاریٰ ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے (مسند احمد و جامع ترمذی)

2. حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلصَّلٰوۃ الوسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے۔ (جامع ترمذی و صحیح ابن حبان)

3. حضرت اُبی بن کعب بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آیت قرآنی وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى میں كلمة التقوى سے مراد کلمہ طیبہ ہے (جامع ترمذی تفسیر طبری)

4. ابو عبدالرحمٰن السلمی (متوفی 73ھ) فرماتے ہیں کہ جو لوگ ہمیں قرآن کریم پڑھایا کرتے تھے مثلاً عثمان بن عفان، عبداللہ بن مسعود، اور دیگر صحابہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات پڑھ لیتے، اس وقت تک آگے نہ بڑھتے جب تک ان آیات کے معانی سے آگاہ نہ ہو جاتے۔

3.5 تفسیر کے مناہج

تفسیر کی کتابوں میں مختلف مناہج اختیار کئے جاتے رہے ہیں۔ ذیل ان مناہج کا تعارف کرایا جاتا ہے:

منہج نقلی (تفسیر بالماثور)

1. تفسیر — عبدالرزاق ابن الہمام
2. تفسیر — عبدالرحمٰن ابن ابی حاتم رازی
3. تفسیر — بقی بن مخلد
4. جامع البیان — محمد بن جریر الطبری
5. التفسیر الکبیر — ابوالقاسم طبرانی
6. الکشف والبیان — ابواسحٰق الثعلبی

7. معالم التنزیل	ابو محمد حسین البغوی
8. زاد المسیر	عبد الرحمٰن ابن الجوزی
9. التفسیر الکامل	تقی الدین احمد ابن تیمیہ
10. تفسیر القرآن العظیم	عماء الدین ابن کثیر
11. الدر المنثور	عبد الرحمٰن جلال الدین السیوطی
12. فتح البیان فی مقاصد القرآن	سید صدیق حسن خان

منہج عقلی/تفسیر بالرای

1. تفسیر	مقاتل بن سلیمان
2. تفسیر	ابو بکر عبد الرحمٰن الاصم
3. جامع التأویل لمحکم التنزیل	ابو مسلم محمد بن بحر الاصفہانی
4. تفسیر	ابو القاسم الکعبی
5 تفسیر	ابو علی محمد بن عبد الوہاب الجبائی
6. فصوص الحکم	ابو نصر فارابی
7. تنزیہ القرآن عن المطاعن	قاضی عبد الجبار ہمدانی
8. غرر الفوائد	شریف مرتضی
9. حقائق التأویل فی متشابہ التنزیل	شریف رضی

منہج نقلی و عقلی/تفسیر بالمأثور والرای الجائز

1. الجامع الکبیر فی معالم التفسیر	ناصر الدین البستی
2. النکت والعیون	ابو الحسن علی الماوردی
3. مفاتیح الغیب/التفسیر الکبیر	فخر الدین رازی
4. مدارک التنزیل	ابو البرکات عبد اللہ النسفی
5. اللباب فی علوم الکتاب	ابو حفص علی ابن عادل

6. لباب التأویل — علاء الدین الخازن
7. غرائب القرآن — نظام الدین القمی النیسابوری
8. المحرر الوجیز — ابن عطیہ اندلسی
9. السراج المنیر — محمد شربینی الخطیب
10. الجواھر الحسان — ثعلبی
11. ارشاد العقل السلیم — ابو السعود محمد العمادی
12. نظم الدرر فی تناسب الآی والسور برہان الدین البقاعی
13. فتح القدیر — محمد بن علی الشوکانی
14. محاسن التأویل — جمال الدین القاسمی
15. روح المعانی — شہاب الدین الآلوسی

منہج فقہی

1. احکام القرآن — ابو بکر الجصاص الرازی الحنفی
2. احکام القرآن — عماد الدین علی الکیاہراسی الشافعی
3. احکام القرآن — ابو بکر محی الدین ابن العربی المالکی
4. الجامع لاحکام القرآن — ابو عبد اللہ القرطبی
5. کنز العرفان — مقداد السیوری الشیعی
6. الاکلیل فی استنباط التنزیل — جلال الدین عبد الرحمٰن السیوطی
7. التفسیرات الاحمدیہ — احمد جیون
8. التفسیر المظہری — قاضی ثناء اللہ پانی پتی
9. نیل المرام — ابو الطیب سید صدیق حسن خاں
10. تفسیر احکام القرآن — ظفر احمد عثمانی، ادریس کاندھلوی، مفتی محمد شفیع، مفتی جمیل احمد تھانوی
11. تفسیر آیات الاحکام — محمد علی السایس وغیرہ

منہج اشاری واعتباری

1. تفسیر القرآن العظیم — سہل بن عبداللہ التُستری
2. حقایق التفسیر — ابوعبدالرحمٰن السُلمی
3. لطائف الاشارات — ابوالقاسم عبدالکریم القشیری
4. عرائس البیان — ابومحمد روزبہان بقلی شیرازی
5. تفسیر الجیلانی — عبدالقادر الجیلانی
6. تفسیر (سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکہف) — ابوبکر محی الدین ابن عربی الطائی الحاتمی
7. التأویلات النجمیہ — نجم الدین دایہ رازی وعلاء الدولہ سمنانی
8. تأویلات القرآن — عبدالرازق کاشانی
9. الملتقط — سید محمد حسینی گیسودراز
10. البحر المدید — ابوالعباسی ابن عجیبہ
11. تبصیر الرحمٰن — علاء الدین علی المہائمی
12. روح البیان — اسمعیل حقی
13. مسائل السلوک — اشرف علی تھانوی

منہج ادبی (علوم البیان والبلاغۃ والبدیع)

1. الکشاف عن حقایق غوامض التنزیل — جاراللہ محمود زمخشری
2. التفسیر البسیط — واحدی
3. التفسیر الوسیط — واحدی
4. البحر المحیط — ابوحیان الاندلسی
5. الدر المصون فی علوم الکتاب المکنون — ابوالعباس سمین الحلبی
6. بلاغۃ القرآن الکریم فی الاعجاز — بہجت عبدالواحد الشیخلی

منہج لسانی

فراء النحوی

1. معانی القرآن — ابراہیم الزجاّج

2. معانی القرآن واعرابہ — شمس الدین ابن نقاّش

3. السابق للاحق — شہاب الدین ابوالعباس الحلبی

4. الدر المصون فی علوم الکتاب المکنون

منہج کلامی

1. تفسیر القرآن الحکیم (سورۃ الفاتحہ تا الکہف) — ابوالحسن علی الاشعری

ابومنصور محمد بن محمد الماتریدی

2. تاَ ویلات اہل السنۃ — ابوبکر محمد ابن فورک

3. تفسیر القرآن — ناصر الدین محمد البیضاوی

4. انوار التنزیل — تقی الدین احمد ابن تیمیہ

5. التفسیر الکامل — سلیمان بن عمر العجیلی الشہیر

6. الفتوحات الالٰہیہ

منہج شیعی

عبداللطیف کازرونی

1. مرآۃ الانوار و مشکوۃ الاسرار — حسن عسکری اثناء عشری شیعہ

بں امام سمجھے جاتے ہیں۔ حیدرآباد سے ایک جلد ـ الدین کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی۔

2. تفسیر حسن عسکری

ابوعلی فضل بن حسن طبرسی

3. مجمع البیان العلوم القرآن — طبرسی

4. الوسیط فی التفسیر — طبرسی

5. الوجیز فی التفسیر — ملامحسن کاشی

6. الصافی فی تفسیر القرآن الکریم

7. صفوۃ التفاسیر (ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل) — سید عبداللہ علوی

8. الجوہر الثمین (تیس ہزار اشعار پر مشتمل) — سید عبداللہ علوی

9. بیان السعادۃ فی مقامات العبادۃ — سلطان محمد خراسانی

10. کنز العرفان فی فقہ القرآن — مقداد السیوری

جدید تفاسیر

1. تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسـ نان — عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی

2. التحریر والتنویر — طاہر بن عاشور

3. الجواہر فی تفسیر القر — طنطاوی جوہری

4. تفسیر المنار (: — مفتی محمد عبدہ وسید رشید رضا

5. فی ظلال ا — سید قطب شہید

6. صفوۃ ا — محمد علی صابونی

القرآن

7. اض — محمد امین شنقیطی

8. — محمد حسنین مخلوف

سعید حوّیٰ

محمد مصطفیٰ مراغی

ابوبکر جابر الجزائری

الکریم فی الاعجاز — بہجت عبدالواحد الشیخلی

نا بالقرآن والسنۃ والآثار — احمد بن عبدالرحمٰن القاسم

ب الحدیث

ر

وسیط — محمد وھبہ زحیلی

محمد وھبہ زحیلی

ن فی تفسیر القرآن — از عبدالمنعم احمد تعیلب

3.6 تفسیر کے اصول اور شرائط

ابتداء میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یا قرآن مجید کے مشکل مقامات کی یا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مراتب فہم کی رعایت کرتے ہوئے تبیین فرمادی اور مناہج استنباط وتفسیر بیان فرمادیے۔ صحابہ کرام میں حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ ابن عباس نے مخاطبین کی علمی سطح اور اغراض سائلین کو سامنے رکھ کر تفسیر قرآن بھی بیان فرمادی۔ ان سے تابعین نے استفادہ کیا جن میں علقمہ بن قیس (متوفی 61 یا 62 ھ)، مسروق بن اجدع (متوفی 63ھ)، اسود بن یزید (متوفی 74 یا 75ھ)، مرۃ ہمدانی (متوفی 76ھ)، عامر شعبی (متوفی 109)، حسن بصری (متوفی 110ھ)، قتادہ بن دعامہ (متوفی 117ھ)، ابوالعالیہ (متوفی 90ھ)، محمد بن کعب القرظی (متوفی 118ھ)، زید بن اسلم (متوفی 136ھ)، سعید بن جُبیر (متوفی 95ھ)، مجاہد بن جبر (متوفی 104ھ)، عکرمہ (متوفی 104ھ)، عطاء بن ابی رباح (متوفی 114ھ)، طاوس بن کیسان ممتاز تھے۔

جب زمانہ آگے بڑھا، مرجیئہ، خوارج، جبریہ، قدریہ، صفاتیہ، مجسمہ، معتزلہ ابھرنے لگے، یونانی فلسفہ کو عربی زبان میں منتقل کیا جانے لگا، یہود، زنادقہ، وعاظ اور سادہ دل صوفیہ وعلماء احادیث وضع کرنے لگے، فقہی مذاہب قائم ہونے لگے، عربی زبان سے واقفیت تفسیر قرآن کے لئے کافی سمجھی جانے لگی تو تفسیر کے لئے شرائط واصول تجویز کئے جانے لگے۔

1. علم لغت میں تبحر تاکہ ہر لفظ کے وضعی اور توسیعی معنی اور مراد ومنشاء الٰہی تک پہنچ سکے۔
2. علم نحو کو ہر مفسر کے لئے لازم قرار دیا گیا کیونکہ اعرابی حالت کی تبدیلی سے معنی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔
3. علم صرف تاکہ ہر لفظ کے وزن اور باب کا پتہ چلے۔ ابن فارس لکھتے ہیں: جو شخص علم صرف سے محروم رہا وہ علم کے ایک بڑے حصے سے نابلد رہا۔ مثال کے طور پر ''وَجَدَ'' ایک مبہم کلمہ ہے جب اس کے مصادر ومشتقات کی تحقیق کی جائے تو معنی ومفہوم کا پتہ چلے گا۔
4. علم الاشتقاق کا جاننا اس لئے ضروری ہے کہ جب کوئی اسم دو مختلف مادوں سے مشتق ہو تو اس کے مشتقات سے مادوں کے فرق واختلاف کا پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً ''مسیح'' ایک اسم ہے جس کے دو مادے ہو سکتے ہیں: ایک سیاحت اور دوسرا مسح۔ پہلے مادہ کے لحاظ سے مسیح کے معنی ہوں گے ''سیاحت کرنے والا'' اور دوسرے مادہ کے لحاظ سے ''چھونے والا''۔
5. علم البیان
6. علم المعانی اور
7. علم البدیع جن کے مجموعہ کو علم البلاغت کہا جاتا ہے۔ علم البیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیا فلاں ترکیب مفہوم مرادی کو

ادا کرنے میں واضح ہے۔ علم المعانی میں یہ پتہ لگایا جاتا ہے کہ کلام کی مختلف ترکیب سے کیا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور علم البدیع کا مقصود ہے کہ کلام کو حسین بنانے کن کے لئے الفاظ اور کس پیرایہ میں ترتیب مناسب ہوگی۔

8. علم القراءت جس سے کلمات قرآن کی قراءت میں جس قدر وجوہ کا احتمال ہے صاف ہوجاتا ہے۔

9. علم الکلام جس سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر مختلف استدلالات، وجوہ استدلال، شریعت کی مدافعت، وجود ملٰئکہ، روح، نفس، اقسام علم، حقیقت حیات وممات، حقانیت قرآن، حشر، الاجساد، یوم آخرت، حساب، رزق ایمان واعمال، جنت وجہنم، روح الٰہی، رسالت ونبوت، علم حق تک پہنچنے کے طرق، ذات وصفات باری تعالیٰ کے تشفی بخش جوابات حاصل ہوتے ہیں۔

10. اصول فقہ جن سے قرآن مجید، حدیث رسول، اجماع علماء، قیاس، استصلاح، استدلال، استحسان، دفع حرج، طریقہ یسر، شرائع ماقبل، عرف وعادت وغیرہ کی شرعی اور افادی حیثیت واضح ہوجاتی ہے۔ اور قرآن میں خاص (فرد، نوع، جنس)، عام، مطلق، مقید، مشترک، مؤول، حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ، ظاہر وخفی، نص ومشکل، مفسر ومجمل، محکم ومتشابہ، کے علم سے غیر معمولی نفع ہوتا ہے اور قطعیات وظنیات میں شکوک کے مراتب وتردد سے بچاؤ۔

11. اسباب نزول جن سے فہم حکم میں بڑی مدد ملتی ہے اور عبارۃ النص کا پتہ چلتا ہے۔

12. علم القصص جس سے قرآن مجید میں بیان کردہ انبیاء ورسل اوران کے اہم دعوت، تبلیغ دین ودعوت حق میں صبر واستقامت، سرکش اقوام پر نزول عذاب کے واقعات کی تفصیل معلوم ہوتی ہے اور آیت کے مجمل مفہوم کی توضیح ہوجاتی ہے۔

13. علم الناسخ والمنسوخ جس سے قرآن مجید کی محکم آیات واحکام اور تاریخ نزول اور تدریج احکام کے اصول معلوم ہوتے ہیں اور منسوخ الحکم آیات سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

14. حدیث نبوی میں مہارت جو علوم حدیث اور اسانید ومتون حدیث پر قابل اعتماد گرفت ہی سے آسکتی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ حدیث صحاح ستہ ومسانید ہی میں محدود نہیں۔ مرکزی ایشیا اور ترکی میں موجود احادیث کی کتب کا کتابت، تقابل، تحقیق وتصحیح کے مراحل سے گزر کر طباعت واشاعت کے مرحلہ تک پہنچنا ضروری ہے۔

15. مواہب ربانی جن کے بغیر تفسیر کی صورت تو بن جائے گی لیکن حقائق سے کوسوں دور۔

16. اسالیب قرآن سے قابل اعتماد آگاہی اور اسباب ووجوہ اسالیب میں تبحر۔

17. علم احوال البشر جس میں تاریخ نوع انسانی، سماجیات، نفسیات (فرد واجتماع)، اقتصادیات، سیاسیات کے اصول وحقایق، اقسام ومدارج علم وحکمت وضرورت، طرق تطہیر قلب وتزکیہ نفس شامل ہیں۔

18. طبی، طبیعی، فلکی، اور خلائی حقائق میں رسوخ علم

مذکورۃ الصدر شرائط کا اہتمام کرنے کے بعد یہ واضح رہے کہ:

1. اعتبار عموم لفظ کا ہوگا نہ کہ سبب خصوص/نزول کا۔

2. اوصاف اور اسماء اجناس پر الف لام استغراق کا فائدہ دیتے ہیں۔

3. اگر نکرہ نفی، نہی، شرط یا استفہام کے سیاق وسباق میں واقع ہو تو عموم پر دلالت کرتا ہے جیسے واعبدوا اللّٰہ ولا تشرکوا بہ شیئاً میں عبادات وعبودیت میں نیت، قول اور فعل میں خالصۃً لوجہ اللّٰہ مقصود رکھنا اور خواص الوہیت وربوبیت میں شرک وشائبہ شرک سے بھی منع کیا گیا ہے۔

4. مضاف بھی عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً حرمت علیکم امھاتکم (النساء:23) میں ماں، نانی، پرنانی، وغیرہ سب شامل ہوں گی، اسی طرح حقیقی باپ کی زوجات بلکہ بیٹی، نواسی، پرنواسی وغیرہ بھی اس عموم میں داخل ہوں گے۔

5. قرآن مجید کا توحید کا نظریہ ایک کلی حقیقت ہے جس کی ضد شرک ہے۔ ایسی عبادات اور ایسے عقائد واعمال سے بچنا ضروری ہے جن سے شائبہ شرک بھی پیدا ہوتا ہو یا قرآنی نظریہ توحید ذات وصفات سے تصادم ہوتا ہو۔

6. حضرت محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی نبوت، رسالت اور ختم نبوت پر قرآن مجید میں جو طرز بیان اختیار کیا گیا ہے اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ نہ آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی بشریت سے انکار متصور ہونا چاہئے، نہ آپ کا اللّٰہ کے پاس خصوصی مقام، نزول وحی آخر کے لئے آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کا انتخاب اور آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے خصوصی اوصاف جو آپ کو عام بشر سے بلکہ صلحاء واولیاء عظام سے ناقابل تصور ممتاز مقام پر شاہد عدل ہیں۔ غرض یہ کہ آپ کو الوہیت کے درجہ تک پہنچا کر آپؐ میں خواص الوہیت ماننا شرک میں داخل ہوگا اور آپ کو ایک عام عالم، عارف یا مصلح ماننا آپؐ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرنا ہے۔

7. قرآن مجید میں موجود مبدا ومعاد کے دلائل میں کسی قسم کا اشتباہ صحیح نہیں۔ کیونکہ وہی خالق ہے موت وحیات کا اور موت وحیات اسی کے اذن کے تابع ہیں۔

8. امور مومنین اور احکام شرعیہ میں قرآن مجید کے طریقہ بیان اور دعوت تدبیر پر غور وفکر کرنا اور خیر وشر کے درمیان امتیاز کرنا اور اللّٰہ کے مطلوب مومن کے اوصاف سمجھنا اور اختیار کرنا، وضاحت سے بیان کرنا، اوامر ونواہی، حلال وحرام، پسندیدہ وناپسندیدہ طریقے واشیاء کی توضیح بھی ضروری ہے۔

9. کفار ومشرکین ومنافقین اور اہل کتاب سے اللّٰہ تبارک وتعالیٰ کے مختلف انداز خطاب اور طریق دعوت الی الحق کا لحاظ اہم ہیں۔

10. قرآن مجید میں حذف جواب شرط مقامات وعید میں احکام الٰہی کی تعظیم پر دلالت کرتا ہے۔

11. متعدد آیات میں اللہ عز وجل نے انسان کو متنبہ کیا ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہی وضلالت میں سرگرداں کر دیتا ہے۔ اور بعض جگہ اللہ عز وجل نے ان اسباب کا ذکر بھی کیا ہے جو ہدایت یا گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسی طرح بتایا ہے کہ اللہ عز وجل جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بخشش سے روک دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے اسے رزق کی فراخی عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اس کے رزق میں تنگی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ سب آیات اللہ عز وجل کی قدرت مطلقہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ یہ بھی اعلان کرتا ہے فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفر۔ چونکہ ایمان یا کفر، نیکی یا بدی چننا اللہ کے دیے ہوئے اختیار ہی کے سبب ہوتا ہے اس لئے امام شافعی کا قول عرفت ربی بفسخ العزائم سامنے رکھنا ضروری ہے۔

12. ایک اعتبار سے جمیع قرآن محکم ہے، دوسرے اعتبار سے جمیع قرآن متشابہ اور تیسرے اعتبار سے بعض محکم ہے اور بعض متشابہ۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا1) احکمت ایٰته ثُم فُصلَت مِن لَّدُنِ حکیمٍ خبیرٍ، 2) اللّٰه نَزَّل احْسَنَ الحدیث کتاباً مُتشاَ بهاً، 3) منه ایاتٌ محکماَت هُن ام الکتاَب وَ اُخَرُ متشا بهاتٌ۔

13. تفسیر و مفسّر میں پوری یگانگت اور موافقت ہونی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ قرآن کا اصل معنی ومفہوم ہاتھ سے جاتے رہیں۔

14. تفسیر میں حقیقی ومجازی دونوں معنوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ بعض مقامات میں حقیقی معنی مراد ہوتے ہیں اور بعض مقامات پر مجازی۔

15. قرآنی آیات میں بعض مقامات پر محسوس ہوتے ظاہری تضاد کو دور کرنے میں اصول نسخ اور توفیق وتطبیق سے کام لینا چاہئے لیکن اس کے لئے بھی دلیل درکار ہوگی۔

16. مفرد الفاظ کے معنی کی تحقیق کرنا چاہئے۔ وضعی، توسیعی، مرادی معنی میں امتیاز کی کاوش نہایت ضروری ہے۔

17. تفسیر لکھتے وقت غیر ضروری مباحث (مثلاً نحوی مسائل کے اسباب وعلل، فقہ، اصول فقہ کی غیر ضروری تفصیل اور دینی عقائد کے دلائل وبراہین) سے اجتناب ضروری ہے کیونکہ لا طائل مباحث قاری کی توجہ کو منتشر اور مقاصد قرآن سے دور کر دیتے ہیں اور وہ ان میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

18. مفسر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ احادیث ضعیفہ اور من گھڑت واقعات واسرائیلیات کی نقل سے پرہیز کرے ورنہ قاری خلجان وتشویش میں مبتلا ہوسکتا ہے اور اس کی توجہ قرآن کے مرکزی مضامین سے ہٹ کر دوسرے بے کار یا جزوی مضامین کی طرف ہوسکتی ہے۔

19. کسی مقام پر معنی ومطالب صاف نہ ہوں تو اہل علم سے دریافت کرنے میں حجاب نہیں ہونا چاہئے۔

20. تفسیر میں ابتداء سے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت رکھے اور تجدید نیت کرتا رہے۔

21. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بقول قرآن حکیم میں صراحۃً بیان کئے گئے علوم پانچ ہیں: (1) علم الاحکام (2) علم الجدل (3) علم التذکیر بآلاء اللہ (4) علم التذکیر بایام اللہ (5) علم التذکیر بالموت و مابعدہ، جن کا مفسر کے پیش نظر ہونا ضروری ہے۔ ابوبکر محی الدین ابن العربی کی کے قول کے مطابق علوم قرآن تین ہیں: توحید، تذکیر اور احکام، ابن جریر طبری کے نزدیک علوم تین ہی ہیں لیکن وہ توحید، اخبار اور دیانات کے نام لیتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا کہ علوم چار ہیں: امر، نہی، خبر اور استخبار اور بعض نے کہا کہ وہ چھ ہیں: امر، نہی، خبر، استخبار، وعد اور وعید۔

اصول تفسیر پر لکھی گئی کتابوں میں (1) المقدمہ فی اصول التفسیر از تقی الدین احمد ابن تیمیہ (2) التعبیر فی اصول التفسیر از سیوطی (3) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، (4) الاکسیر فی اصول التفسیر از صدیق حسن خاں (5) التکمیل فی اصول التأویل از عبدالحمید فراہی (6) شرح اصول فی التفسیر وشرح مقدمہ از عثیمین (7) بحوث فی اصول التفسیر از محمد بن لطفی الصباغ (8) بحوث فی اصول التفسیر ومناہجہ (9) شرح مقدمہ التفسیر از سعد بن ناصر الشثری (10) بہجہ الناظرین فی مناہج المفسرین از توفیق علوان (11) المنہج القدیم فی تفسیر القرآن الکریم از عادل محمد صالح ابو القلا (12) القواعد الحسان فی تفسیر القرآن از عبد الرحمٰن ناصر السعدی۔ یہ وہ رسالے ہیں جن تک راقم کی رسائی ہوسکی۔ چند اور رسائل بھی شامل کئے جاسکتے ہیں لیکن جیسا کہ عبدالحمید فراہی نے فرمایا اس پر مفصل تحقیق کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔

3.7 خلاصہ

تفسیر کے لغوی معنی پوشیدہ چیز کو کھول دینا اور واضح کردینا ہے۔ اصطلاح میں تفسیر کے معنی قرآن کریم کی آیات کے مراد ومنشاء، اسرار وحکم اور احکام ومطالب واضح طور پر بیان کرنے کے ہیں۔ تفسیر سے قریب ایک لفظ ''تاویل'' ہے جس کے لغوی معنی لوٹنا، رجوع کرنا وغیرہ ہے۔ اصطلاح میں تاویل کا مطلب کسی لفظ کے مقصد ومنشاء اور مراد الٰہی کی طرف لوٹانے کے ہیں۔

اس فن کے ماہرین نے تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق کی وضاحت پر مختلف طرح سے روشنی ڈالی ہے۔ عہد رسالت میں تفسیر قرآن کے لئے تین مصادر کا تعین ہوا۔ (1) قرآن مجید (2) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (3) اجتہاد۔ قرآن کی تفسیر کا آغاز رسول اللہ کے زمانہ ہی سے ہوگیا تھا۔ آپ کا طریقہ یہ تھا کہ اگر قرآن میں کوئی حکم صراحتاً مذکور نہ ہوتا تو (1) وحی کا انتظار کرتے (2) اہل کتاب کے بیان کردہ احکام کو سامنے رکھتے یا (3) اجتہاد فرماتے (4) یا قرآن حکیم پر ہی تدبر فرماتے۔

تفسیر قرآن کے کئی منہج رہے ہیں۔ منہج نقلی، منہج عقلی، منہج فقہی، منہج اشاری واعتباری، منہج ادبی، لسانی، کلامی، منہج شیعی وغیرہ۔ اس طرح سے اہل علم نے مختلف پہلوؤں سے تفسیر قرآن کی خدمت انجام دی ہے۔ تفسیر کے لئے کچھ شرائط اور اصول مقرر ہیں۔ تفسیر کے سلسلے میں ان کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔

8. نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کے احسن طریقے۔

9. پیشگی زکوٰۃ کی اجازت۔

10. نمازاور روزہ کے فاسد ہونے کی صورتیں۔

11. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناسخ ومنسوخ آیات کی بھی نشاندہی فرمائی۔

صحابہ کرام کے طریقہ تفسیر میں جو چیز ممتاز دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ قرآنی آیات پر احادیث رسول کی روشنی میں تفکر وتدبر پر عمل کرتے تھے، اور بصورت عدم اطمینان دیگر صحابہ کی مدد لیتے۔ اجتہاد سے کام لیتے، وہ عربی زبان کے اسرار ورموز سے واقف تھے، فصاحت وبلاغت کے اونچے معیار کو جانتے تھے، عربوں کے عقائد، عادات ورسومات، طرز معاشرت، اخلاق وطبائع سے خوب آگاہ تھے، جزیرۃ العرب میں مختلف مقامات پر بسے یہود ونصاری، مجوس وصابئین کے احوال کو اچھی طرح جانتے تھے، قوت فہم وادراک، وسعت علم وعقل اور صبح وشام قرآن مجسم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ نے ان کے تبحر علمی اور قرآن کا مطلوب مومن بننے کے داعیہ نے قرآن کی مختلف تہوں کو ان پر ایسے کھولا تھا کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمادیا یحبھم ویحبونہ اور رضی اللہ عنھم اور کنتم خیرا مۃ۔

مفسر صحابہ میں ہم کو درج ذیل نام ملتے ہیں:

(۱) حضرت ابوبکر	(۲) حضرت عمر بن الخطاب	(۳) حضرت عثمان بن عفان
(۴) حضرت علی بن ابی طالب	(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود	(۶) حضرت اُبی بن کعب
(۷) حضرت زید بن ثابت	(۸) حضرت عبداللہ بن عباس	(۹) حضرت ابوموسیٰ اشعری
(۱۰) حضرت عبداللہ بن زبیر	(۱۱) حضرت انس بن مالک	(۱۲) حضرت ابوہریرہ
(۱۳) حصرت عبداللہ بن عمر	(۱۴) حضرت جابر بن عبداللہ	(۱۵) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص
(۱۶) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ		

ان صحابہ میں تفسیری اقوال کی کثرت کا اعتبار کیا جائے، سرعت ذہن، وسعت وگہرائی علم، فراست، تفقہ فی الدین کو پیش نظر رکھا جائے تو چار صحابہ کے نام سامنے آتے ہیں: (۱) علی بن ابی طالب (۲) عبداللہ بن مسعود (۳) ابی بن کعب (۴) عبداللہ بن عباس۔ کثرت روایت کی بناء پر یہ فہرست مرتب ہو تو اس کی شکل کچھ اس طرح ہوگی: (۱) عبداللہ بن عباس (۲) عبداللہ بن مسعود (۳) علی بن ابی طالب (۴) ابی بن کعب۔

1. عبداللہ بن عباس

عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف قرشی ہاشمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ آپ کی والدہ کا نام لُبابۃ الکبریٰ بنت حارث تھا۔ آپ کی پیدائش اس وقت ہوئی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے افراد خاندان اور

مومنین کے ساتھ شعب بنی ہاشم میں قریشی مقاطعہ کے سبب محصور تھے، پیدائش کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب مبارک ان کے مونھ میں ڈالا۔ آغاز طفولیت ہی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ رہے۔ ان کی خالہ ام المومنین میمونہ ازواج نبی میں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت عبداللہ بن عباس کی عمر 13 یا 15 برس تھی۔ آپ کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی اَللّٰهم فقهه فی الدین و علّمه التاویل اور اللهم علّمه الكتاب والحكمة۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عبداللہ بن عباس اکابر صحابہ سے اکتساب علم کرتے رہے۔ مقامات نزول قرآن، اسباب نزول قرآن اور تاریخ تشریع سے متعلق ان سے استفادہ کیا۔ ان کے اساتذہ کی تعداد بتانا دشوار ہے، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اکابر صحابہ کے علوم کو اچھی طرح جذب کرلیا تھا۔ ذہانت وفطانت، قوت حافظہ، اسالیب قرآن اور عربیت میں مہارت، اجتہاد واستنباط پر غیر معمولی قدرت، حسن صورت وسیرت ان پر مستزاد تھے۔ ایک تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا، دوسرے اکابر صحابہ سے تفسیری وحدیثی وفقہی استفادہ، تیسرے حضرت عمر، حضرت علی کا علمی مسائل میں عبداللہ ابن عباس پر اعتماد، چوتھے حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول "عبداللہ بن عباس ترجمان القرآن ہیں" پانچویں تحقیق اور چھٹے عربیت وخطابت میں کمال نے عبداللہ بن عباس کو مرجع مفسرین وفقہاء ومحدثین وشعراء بنادیا تھا۔

سلیمان بن مہران الاعمش ابووائل سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی نے حضرت ابن عباس کو امیر حج بنا کر بھیجا، آپ نے خطبہ میں سورۃ نور کی تلاوت فرمائی اور ایسی تفسیر بیان کی کہ اگر اہل روم، ترک اور دیالمہ اسے سُن (اور سمجھ) پاتے تو مشرف بہ اسلام ہوجاتے۔

عبداللہ بن عباس سے تفسیری روایت متعدد اسناد سے ہم تک پہنچی ہیں۔ صحیح ترین سند معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ (عن مجاہد بن جبر) عن ابن عباس ہے۔ اور واہی ترین سند محمد بن مردان سدی الصغیر عن محمد بن سائب کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے اسی واہی سند سے منقول روایات کو تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس میں جمع کردیا ہے، اور یہی کتاب اور اس کا ترجمہ بار بار شائع ہورہے ہیں، جب کہ علی بن ابی طلحہ کا نسخہ بھی دریافت وطبع ہوچکا ہے۔

2. عبداللہ بن مسعود

ابوعبدالرحمن عبداللہ بن مسعود کا تعلق بنو ہذیل سے تھا۔ آپ دبلے پتلے، پست قامت اور گندم گوں تھے۔ آپ نے آغاز بعثت کے بعد ہی اسلام قبول کرلیا تھا، چنانچہ خود فرمایا کرتے تھے "میں چھٹا مسلمان تھا" قبولیت اسلام کے بعد قریش کے درمیان آپ نے قرآن مجید کی جہراً تلاوت کی اور اس جرم پر زدوکوب کئے گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے، وضو کے لئے پانی اور مسواک فراہم کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے تو جوتے پہنانے میں مدد کرتے اور بیٹھنے کا ارادہ فرماتے تو جوتے اتار کر اپنے پاس رکھ لیتے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چلنے کا ارادہ فرماتے تو عبداللہ بن مسعود آگے آگے چلتے، جب غسل فرماتے تو پردہ تانے کھڑے رہتے۔

1. ابن ابی ملیکہ نقل کرتے ہیں ''میں نے دیکھا مجاہد [بن جبیر] [عبداللہ] ابن عباس سے قرآن کی تفسیر دریافت کر رہے تھے ان کے ہمراہ تختیاں بھی تھیں۔ ابن عباس کہہ رہے تھے: لکھتے جاؤ حتیٰ کہ مجاہد نے ابن عباس سے پورے قرآن کریم کی تفسیر اخذ کر لی''۔

2. ابو حاتم الرازی فرماتے ہیں ''عبدالملک بن مروان (م 86ھ) نے سعید بن جُبیر کو قرآن کی تفسیر لکھنے کے لئے مامور کیا۔ آپ نے تعمیل حکم کر دی...... عطاء بن دینار نے اس تفسیر کو مرسلاً سعید بن جبیر سے روایت کر دیا''۔

3. عمرو بن عبید معتزلی نے حضرت حسن بصری سے روایت کر کے ایک تفسیر مرتب کی۔

4. ابن جریج (متوفی 150ھ) نے تین ضخیم اجزاء پر مشتمل ایک تفسیر لکھی جس کو محمد بن ثور نے ان سے روایت کیا۔

5. سفیان بن سعید ثوری سے منسوب تفسیر قرآن مشہور محقق امتیاز علی خاں عرشی کی تحقیق و تصحیح کے ساتھ ناتمام شائع ہو چکی ہے۔

6. کتب خانہ رضا رامپور میں امیر المومنین فی الحدیث عبداللہ بن مبارک کی تفسیر کا ایک نسخہ محققین کی توجہ کا طالب ہے۔

7. یزید بن ہارون سلمی (117ھ)، شعبہ بن الحجاج (118ھ)، وکیع بن الجراح (197ھ)، سفیان بن (عُیَیْنَہ) (198ھ)، روح بن عبادہ (205ھ)، آدم بن ابی اباس (220ھ) نے سماعت و روایت حدیث کے علاوہ تفسیری روایت بھی نقل کیں۔

8. عبدالرزاق بن الہمام کی تفسیر القرآن تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

9. تفسیر ضحاک بن مزاحم بھی دو جلدوں میں تحقیق کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

10. ابوالعباس ثعلب کی یا عمر بن بکیر کی خواہش پر فراء نحوی نے معانی القرآن کے نام سے جو تفسیر املاء کی تھی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

11. ابوبکر زجاج کی معانی القرآن و اعرابہ بھی تحقیق کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

12. عبد بن حمید (متوفی 249ھ) کی تفسیر قرآن عبدالرحمٰن جلال الدین سیوطی اور علامہ شہاب الدین آلوسی کو دستیاب تھی۔

13. قرآنی ترتیب کے مطابق ہر ہر آیت کی تفسیر شروع ہوئی تو مندرجہ ذیل علماء تفسیر نے اس طرف توجہ کی اور اپنی اپنی تفاسیر یا تو خود لکھ دیں یا املاء کرا دیں۔

الف محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینی متوفی 273ھ

ب محمد ابن جریر الطبری متوفی 310ھ (متعدد بار شائع ہو چکی ہے)

ج ابوبکر بن المنذر نیسابوری متوفی 318ھ (سیوطی کو دستیاب تھی)

د ابن ابی حاتم الرازی متوفی 327ھ (ناتمام شائع ہو چکی ہے)

ر ابو منصور محمد بن محمد الماتریدی متوفی 333 (تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکی ہے)

ز ابوالشیخ ابن حبان متوفی 369 ھ (سیوطی کو دستیاب تھی)

ح حاکم نیسابوری متوفی 405 ھ

ط ابوالقاسم الطبرانی (مکمل تفسیر ''التفسیر الکبیر'' کے نام سے تحقیق کے ساتھ طبع ہو چکی ہے)

ی ابوبکر بن مَردَوَیہ متوفی 410 ھ (سیوطی کو دستیاب تھی)

تفسیر کی ارتقاء کے اس مرحلہ پر بعض محقق مفسرین نے علوم ادبیہ وعقلیہ وکلامیہ وحدیثیہ وفقہیہ کوضروری جانا، اس طرح اصول تفسیر مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی، ان علوم پر مستقل کتابیں تدوین ہونی شروع ہو چکی تھیں جن کی مدد سے طلبہ علم سے مستفید ہو رہے تھے۔ عقلی، کلامی اور فقہی مباحث نے علماء اہل السنۃ کو مجبور کیا کہ وہ تفسیر بالماثور کی طرف توجہ کریں، زنادقہ کے مطاعن نے زور ڈالا کہ عقلی پہلوؤں پر بھی توجہ کی جائے۔ مسائل توحید، رسالت، بعث بعد الموت، تقدیر، ایمان، کلام اللہ کی حقیقت، اللہ کی شان رحمت اور شان عقاب، ذات وصفات پر بحثیں چھڑیں تو کلامی پہلو کو صاف صاف بیان کرنا ضروری سمجھا گیا۔ تفسیر بالماثور تفسیر بالنقل ہی کا دوسرا نام ہے جس کو جامعیت کے سبب اختیار کیا گیا، اسی کو ہم منہج نقلی کے نام سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عباس کا قول ہے کہ تفسیر کی چار اقسام ہیں:

1. قرآن کریم کے وہ معنیٰ جن کا تعلق عربی زبان کے فہم وادراک کے ساتھ ہے۔
2. قرآن مجید کا وہ حصہ جس کے نہ جاننے سے کسی کو معذور قرار نہیں دیا جا سکتا۔
3. قرآن حکیم کی تفسیر جو علماء کا حصہ ہے اور وہ بخوبی اس سے آگاہ ہیں۔
4. وہ تفسیر جس کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہاں غالباً حروف مقطعات اور آیات متشابہات کی طرف اشارہ ہے جن کے معنی کوئی بالقطع نہیں جان سکتا۔

4.7 جامع البیان فی تفسیر القرآن

اس تفسیر کے مؤلف کا نام محمد بن جریر بن یزید طبَری اور کنیت ابوجعفر ہے، جلیل القدر عالم، مجتہد مطلق اور ماہر علوم کثیرہ تھے۔ آپ کی پیدائش طبرستان میں 223 ھ میں ہوئی۔ 12 سال کی عمر تک مبادیات علوم ختم کر چکے تھے اور شہر میں بظاہر کوئی ایسا عالم نہیں بچا تھا جس سے آپ نے بقدر ظرف اپنا حصہ نہ لے لیا ہو۔ طلب علم کے لئے گھر چھوڑا، مختلف شہروں کی خاک چھانی، علماء سے تشنگی علم جتنی بجھ سکتی تھی بجھائی۔ مصر وشام وعراق کے سفر کیے اور آخر میں مدینۃ السلام بغداد میں مقیم ہو گئے۔

خطیب بغدادی کے بقول ''ابن جریر علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ کے معاصرین میں کوئی شخص آپ کا ہمسر نہ تھا۔ آپ قرآن کریم کے حافظ ومفسر، احکام قرآن کے ماہر، عظیم محدث، صحیح وسقیم اور ناسخ ومنسوخ سے آگاہ، صحابہ وتابعین کے اقوال سے بخوبی آشنا، مسائل حلال وحرام سے واقف اور تاریخ اخبار وواقعات کے زبردست عالم تھے''۔

4.8 الکشف والبیان عن تفسیر القرآن

اس تفسیر کے مؤلف کا نام نامی احمد بن ابراہیم ثعلبی نیسابوری ہے اور کنیت ابواسحٰق ۔ آپ ایک عظیم قاری، مفسر، حافظ، واعظ، ماہر عربیت، انتہائی دیندار، ادیب اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ ثعلبی ان کا لقب ہے نسب نہیں۔

یاقوت حموی لکھتے ہیں ''آپ کی تفسیر انواع واقسام کے معانی واسرار کی جامع ہے۔ اس میں اعراب وقراءت کے بارے میں شاندار مباحث موجود ہیں''۔

ثعلبی نے ابوطاہر ابن خزیمہ اور ابوبکر بن مہران قاری سے تحصیل علم کی۔ دیگر علماء کی خدمت میں حاضری دی اور علم تفسیر کے حصول کے لئے کوشاں رہے، مطالعہ کے لئے رات رات بھر جاگتے۔ جب علم کے دروازے کھلے تو مفسرین قرآن کی چند اقسام ان پر منکشف ہوئیں۔

1. اہل بدعت وضلالت جیسے جُبّائی اور رُمّانی
2. مفسرین کا وہ گروہ جو بہترین عالم ومصنف تھے لیکن انہوں نے سلف صالحین کے ساتھ اہل بدعت کے نظریات وطرق تحقیق گڈمڈ کر دیے مثلاً ابوبکر قفال
3. وہ مفسرین جنہوں نے خود کو نقل وروایت میں محدود کر لیا۔ نقد ودرایت کی جانب توجہ نہ دی جیسے ابویعقوب اسحٰق بن ابراہیم حنظلی
4. ایک قسم مفسرین کی وہ تھی جنہوں نے اسناد کو حذف کر کے بلاتحقیق کتابوں سے مواد جمع کرنے پر اکتفاء کی۔ یہ لوگ ثعلبی کے نزدیک علماء میں شمار نہیں کیے جا سکتے تھے، اس لئے انھوں نے ان لوگوں کو ذکر کرنے تک کے لائق نہیں سمجھا۔
5. مفسرین کی ایک جماعت وہ تھی جس نے حُسن تالیف کا حق ادا کر دیا لیکن تکرار واعادہ کے عیب نے ان کی تصانیف کو داغدار کر دیا۔ ابن جریر طبری کا شمار بھی ثعلبی نے ان میں کیا ہے۔
6. مفسرین کی ایک قسم وہ تھی جنہوں نے اپنی اپنی تفسیروں میں نہ حلال وحرام پر روشنی ڈالی نہ غوامض ومشکلات کی عقدہ کشائی کی اور نہ گمراہ فرقوں کے رد میں دلائل دیے۔ مثلاً مجاہد، سدی اور کلبی۔

لوگوں کی فرمائش پر ثعلبی نے ایک ایسی جامع تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا جو مطلوبہ صفات کی حامل ہو۔ اس غرض سے ثعلبی نے تقریباً ایک سو کتابوں سے مواد منتخب کیا۔ تعلیقات اور متفرق اجزا ان پر مستزاد تھے۔ علاوہ ازیں تین سو کبار شیوخ سے علمی اسرار ورموز اختصار سے جمع کیے۔ تفسیر کا نام ''الکشف والبیان عن تفسیر القرآن'' رکھا۔

1. اسانید کا ذکر آغاز کتاب میں کر دیا اور آگے ان کو حذف کر دیا۔
2. مشکل الفاظ کی صرفی ونحوی توضیح کرتے وقت عربی اشعار سے استشہاد کرتے ہیں۔

3. آیات الاحکام کی تفسیر میں فقہی احکام اور خلافیات کی تفصیل اور دلائل و براہین کے بیان کے وقت قلم ان کے قابو سے نکل جاتا ہے۔ فقہی مسئلہ تو سمجھ میں آجاتا ہے، آیت کے معنی و مطلب تشنہ رہ جاتے ہیں۔ مثلاً یوصیکم اللہ فی اولادکم کے ضمن میں تقسیم ورثہ سے متعلق پوری ایک کتاب تحریر کردی۔ تقسیم ورثہ کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو مؤلف سے چھوٹ گیا ہو حتیٰ کہ عہد جاہلیت کے نظام وراثت تک کا ذکر کر دیا۔

4. علمی مسائل کی تفصیل بیان کرنے میں اتنے اطناب سے کام لیتے ہیں کہ یہ تفسیر تفسیر بالماثور کے دائرہ سے نکلتی دکھائی دیتی ہے۔

5. اسرائیلی قصص واخبار کے بیان میں حدود سے نکلتی فیاضی دکھائی دیتی ہے اور کہیں نقد وجرح کا ذکر نہیں ملتا۔

6. قرآنی سورتوں کے فضائل میں بلاتحقیق موضوع احادیث نقل کر دیتے ہیں جس سے فن حدیث سے ان کی بیگانگی کا پتہ چلتا ہے۔

4.9 معالم التنزیل

مؤلف کی کنیت ابومحمد، نام نامی حسین بن مسعود الفراء البغوی ہے۔ بغ یا بغشور مرو اور ہرات کے درمیان واقع ایک شہر کا نام ہے جو صوبہ خراسان میں آتا ہے۔ اساتذہ میں قاضی حسین کا نام ممتاز ہے جن سے آپ نے حدیث وفقہ کا درس لیا۔ بغوی تفسیر، حدیث اور فقہ کے جلیل القدر امام تھے، بڑے عابد وزاہد، فقیہ، علم وعمل کے جامع، طریق سلف پر گامزن شافعی مسلک سے وابستہ، متعدد کتب کے مصنف تھے۔ چند مشہور تصانیف ذیل میں درج ہیں:

1. معالم التنزیل
2. المصابیح
3. شرح السنته
4. الجمع بین الصحیحین
5. التهذیب فی الفقه

تقی الدین احمد ابن تیمیہ لکھتے ہیں ''سائل نے پوچھا ہے کہ زمخشری، قرطبی اور بغوی کی کتابوں میں سے کس کی کتاب قرآن وحدیث سے قریب تر ہے؟ یا ان کے علاوہ کوئی اور کتاب؟ جواب یہ ہے کہ میرے خیال میں ان تینوں کتابوں میں بغوی کی تفسیر بدعت اور احادیث ضعیفہ کی آمیزش سے نسبتاً زیادہ پاک وصاف ہے۔ بغوی نے اپنی تفسیر میں احادیث ضعیفہ اور مبتدعانہ اقوال کو حذف کر دیا ہے اس لئے ثعلبی کی تفسیر سے مختصر ہے۔

کتانی لکھتے ہیں: ''معالم التنزیل میں ایسی روایات وحکایات موجود ہیں جن کو ضعیف یا موضوع کہا جاسکتا ہے''۔

بغوی نے 510ھ میں 80برس سے متجاوز عمر میں مقام مرو میں وفات پائی اور قاضی حسین کے پہلو میں آپ کی تدفین ہوئی۔

خصوصیات:

1. بغوی کلبی جیسے ضعیف راویوں سے روایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔
2. اختلاف قراءات کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن تفسیر کو اس سے بوجھل نہیں بناتے۔
3. بغوی نحوی مسائل وہیں چھیڑتے ہیں جہاں آیت کا مفہوم نحوی صراحت کا متقاضی ہوتا ہے۔
4. بعض وقت اسرائیلی روایات بلا تنقید ذکر کرتے ہیں۔
5. جہاں کہیں الفاظ قرآن کے ظاہری معنی پر اعتراض کیا جا سکتا ہو وہاں اس کا جواب فراہم کر دیتے ہیں۔

4.10 المحرّر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز

مؤلف کا نام عبد الحق بن غالب ابن عطیہّ اندلسی غرناطی اور کنیت ابو محمد تھی۔ آپ کی ولادت 480ھ میں ایک ممتاز علمی خاندان میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم و تربیت میں والد محترم ابو بکر غالب بن عبد الرحمٰن کا بڑا حصہ رہا۔ وہ ایک بہترین مجود، حافظ حدیث، ماہر طرق و علل اور فن اسماء الرجال میں باکمال معرفت رکھتے تھے۔ حدیث کے متون و معانی مستحضر رہتے۔ ایک اچھے ادیب، شاعر، ماہر لغت عربی اور ممتاز فاضل تھے۔ دیگر اساتذہ میں درج ذیل نام قابل ذکر ہیں۔

1. حافظ حسین بن محمد بن احمد جو محدث اندلس، عربیت، لغت، شعر اور انساب میں کمال بصیرت حاصل تھا۔
2. حافظ ابو علی حسین بن محمد بن سکرۃ الصدفی، وہ علم القرات کے ماہر اور حدیث، طرق، علل، اسماء الرجال اور جرح و تعدیل میں سند کی حیثیت رکھتے اور حسن خط اور ضبط اسماء و لغات میں جید مقام کے حامل تھے۔
3. ابو الحسن علی بن احمد بن خلف الانصاری جو ابن باذش کے نام سے معروف تھے اور صناعۃ العربیہ وقراءت قرآن میں امامت کا درجہ رکھتے تھے۔
4. ابو محمد عبد الرحمٰن بن محمد بن عتاب القرطبی جو علو اسناد، وسعت روایت اور تفقہ کے باعث محقق جانے جاتے تھے۔
5. ابو عبد اللہ محمد بن علی بن عبد العزیز التعلبی زعماء اندلس میں اپنی جلالت علمی اور وجاہت دینی کے لئے معروف تھے۔
6. ابو بحر سفیان بن عاصی بن احمد الاسدی جو جلیل القدر عالم، ادیب اور فقیہ تھے۔

ابن عطیہ کو حصول علم کا بے پناہ شوق تھا چنانچہ آپ حافظ حدیث، جلیل القدر عالم، ذہانت و فطانت اور حسن فہم میں بے نظیر، فقیہ، محدث، مفسر، نحوی، صرفی، لغوی اور ادیب و شاعر تھے۔

ابن عطیہ کی تفسیر ''المحرر الوجیز'' کتب تفسیر میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ آپ کے اخلاص، وسعت و گہرائی علم، جامعیت اور عبارت میں حسن ایجاز نے تفسیر کو حسن قبول سے مزین کیا۔ ابن عطیہ کی وفات 546ھ میں ہوئی۔

خصوصیات:

1. چونکہ ابن عطیہ مطالعہ کے دلدادہ تھے۔ اہم مراجع آپ نے کثرت سے جمع کر لئے تھے اور قدرت نے ذہانت وفطانت سے بھی نوازا تھا، لہٰذا آپ نے کتب اسلاف ومعاصرین کی کتابوں سے ضروری مضامین کا ملخص اپنی تفسیر میں پیش کر دیا اور اس میں روایت ودرایت کے اصول کے تحت صرف قابل اعتماد مواد کو جگہ دی۔
2. یہ تفسیر اس دعویٰ کی شہادت دیتی ہے کہ عربیت ودیگر علوم وفنون میں آپ کو درجہ امامت حاصل تھا۔
3. محمد حسین ذہبی نے لکھا ہے کہ ابن عطیہ ایک آیت ذکر کر کے نہایت شیریں وبلیغ عبارت میں اس کی تفسیر کرتے ہیں پھر تفسیر میں وارد شدہ روایات وآثار ذکر کرتے ہیں۔
4. ابن جریر طبری سے کثرت سے استفادہ کرتے ہیں لیکن کمزور مقامات پر تنقید سے گریز نہیں کرتے۔
5. قرآنی الفاظ کی توضیح کے سلسلہ میں عربی اشعار اور ادبی شواہد سے استدلال کرتے ہیں۔
6. نحوی مسائل میں جہاں ضرورت محسوس ہو تبصرہ میں بخل نہیں کرتے۔
7. مختلف قراءات ذکر کر کے ان کے جداگانہ معانی ومطالب پر روشنی ڈالتے ہیں۔
8. تقی الدین احمد ابن تیمیہ ایک طرف کہتے ہیں کہ ''ابن عطیہ کی تفسیر زمخشری کی تفسیر بلکہ جملہ تفاسیر سے افضل واحسن ہے''۔ دوسری طرف ابن عطیہ کی تفسیر میں بدعت کی آمیزش کے ساتھ اقوال صحابہ اور اقوال سلف کو نظرانداز کرنے جیسے الزامات لگاتے ہیں، ابن عطیہ کی تفسیر میں محققین سے مراد متکلمین ہوتے ہیں۔

4.11 تفسیر القرآن العظیم

لقب عماد الدین، کنیت ابوالفداء اور نام نامی اسمٰعیل بن عمرو بن کثیر بصرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا مسلک شافعی تھا۔ والد کی وفات کے بعد بھائی کی رفاقت میں سات سال کی عمر میں دمشق گئے۔ ابن شحنہ، آمدی، ابن عساکر اور دیگر علماء سے اکتساب علم کیا۔ علامہ جمال الدین مزی کی صحبت اختیار کی اور ان سے تہذیب الکمال کا درس لیا۔ مزّی نے شرف دامادی بخشا۔ پھر تقی الدین احمد ابن تیمیہ کی خدمت میں رہے بلکہ آپ کے دامن سے وابستہ ہوگئے، وہیں ابن قیم الجوزیہ سے تعارف ہوا اور ان کے علوم سے بھی استفادہ کیا۔ ابن تیمیہ کے علمی تبحر سے اتنے متاثر تھے کہ اکثر نظریات میں ان کے ہمنوا ہوگئے۔

ابن کثیر کی ولادت 700ھ کے آس پاس ہوئی۔ 774ھ میں آپ کا وصال ہوا آخری دور میں نابینا ہوگئے تھے۔

آپ کی تصانیف میں حسب ذیل مشہور ہوئیں:

1. تفسیر القرآن العظیم
2. اختصار علوم الحدیث

3. جامع المسانید والسنن

4. البدایہ والنہایہ

5. طبقات الشافعیہ

خصوصیات:

1. تفسیر ابن کثیر کا مقام جامع البیان للطبری کے بعد تسلیم کیا گیا ہے۔

2. تفسیر کے آغاز میں ایک طویل مقدمہ ہے جس میں قرآن مجید سے متعلق علمی مباحث درج کئے ہیں۔ استفادہ اپنے استاد ابن تیمیہ کے رسالہ ''مقدمہ فی اصول التفسیر'' سے کیا ہے۔

3. تفسیر میں اختصار سے دوسری ہم موضوع آیات کو مفہوم کی وضاحت کے لئے نقل کرتے ہیں تاکہ مفہوم قرآنی غبار سے محفوظ رہے۔

4. احادیث مرفوعہ اور اقوال صحابہ آیات کی مراد واضح کرنے کے لئے روایت کرتے ہیں۔

5. حسب ضرورت جرح وتعدیل سے بھی کام لیتے ہیں۔

6. احادیث مرفوعہ نقل کرتے وقت قابل احتجاج اور نا قابل احتجاج احادیث کی نشاندہی کرتے جاتے ہیں اور تائید میں صحابہ، تابعین اور دیگر علماء سلف کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

7. ابن کثیر بعض اقوال کو بعض دیگر اقوال پر ترجیح دیتے ہیں بعض روایات کو صحیح اور بعض کو ضعیف قرار دیتے ہیں اور رواۃ ورجال پر جرح وتعدیل بھی کرتے جاتے ہیں۔

8. اکثر وبیشتر احادیث کتب معتبرہ سے نقل کرتے ہیں۔

9. ابوعبیدہ، ابوالعالیہ اور سدی سے مروی اسرائیلی روایت نقل تو کرتے ہیں لیکن ان پر اعتماد کو درست نہیں سمجھتے الا یہ کہ وہ روایات اسلامی محقق روایات سے ہم آہنگ ہوں۔

10. آیات احکام کے تحت بہت اختصار سے فقہاء کے اختلافی اقوال نقل تو کرتے ہیں لیکن ان کے دلائل و براہین کی تفصیل میں بہت کم کلام کرتے ہیں۔

4.12 الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن

مؤلف کی کنیت ابوزید اور نام عبدالرحمٰن بن محمد مخلوف ثعالبی الجزائری ہے۔ مسلکاً مالکی تھے۔ عالم، فاضل، عابد وزاہد بلکہ اولیاء اللہ میں شمار کئے جاتے تھے۔

آٹھویں صدی ہجری میں الجزائر سے طلب علم کے لئے نکلے۔ تیونس میں تحصیل علم کے بعد مصر کا رُخ کیا اور وہاں کے علماء سے بھر پور فائدہ اٹھایا۔ علم صرف پڑھا نہیں بلکہ جو کچھ پڑھا اس کو جذب کر لیا۔ پھر مغرب یعنی مراقش کا رُخ کیا، اسپین گئے اور اپنے علم کو وسیع وعمیق تر کر لیا۔ نحو وصرف اسی لغت، معانی بیان، بدیع، قراءات، حدیث اور تفسیر میں ممتاز مقام کے حامل بن گئے۔ تصانیف میں حسب ذیل مشہور ہیں:

1. الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن
2. الذھب الابریز فی عزائب القرآن العزیز
3. تحفۃ الاخوان فی اعراب بعض آیات القرآن
4. جامع الامہات فی احکام العبادات

ثعالبی نے 876ھ میں وفات پائی اور الجزائر میں مدفون ہوئے۔

خصوصیات:

1. ثعالبی فرماتے ہیں کہ ان کی تفسیر اکثر و بیشتر المحرر الوجیز از ابن عطیہ سے ماخوذ ہے۔ دوسرے ائمہ کی کتب سے مواد لے کر مفید اضافے کئے گئے ہیں۔ ان کتابوں کی تعداد تقریباً ایک سو ہے۔
2. جو کچھ بھی نقل کیا معتبر مفسرین سے باللفظ نقل کیا۔ بالمعنی نقل سے احتراز کیا۔
3. چونکہ طبری کی تفسیر کا اختصار ان کے مراجع میں رہا لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ کسی لفظ یا عبارت کے سمجھنے میں دشواری ہو تو قاری اصل کی طرف مراجعت اور تصحیح کرلے محض عقل وقیاس سے کام نہ لے۔
4. بعض جگہ مختلف قراءات اور بعض جگہ نحوی مسائل کا بھی ذکر ملتا ہے۔
5. بعض الفاظ کے معانی بتانے کی غرض سے وہ عربی اشعار سے استشہاد کرتے ہیں۔
6. تطویل سے بچنے کے لئے تفسیری روایات بیان کرتے وقت وہ سند نقل کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔
7. اسرائیلی روایات نقل تو کرتے ہیں لیکن کبھی ان پر شدید نقد وجرح کرتے ہیں تا کہ روایت کی عدم صحت واضح ہو جائے اور تذبذب کی صورت میں کہتے ہیں کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون سا واقعہ درست ہے۔
8. تفسیر میں بھرتی کا مواد یکسر موجود نہیں اسی طرح ثعالبی کی اس تفسیر کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں۔

4.13 الدر المنثور فی التفسیر المأثور

لقب جلال الدین، کنیت ابو الفضل اور نام عبد الرحمٰن بن ابی بکر سیوطی۔ 849ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کی عمر تقریباً ساڑھے سات سال ہوگی کہ والد مرض الوفات میں مبتلا ہو گئے۔ اپنے چند قریبی ساتھیوں کو بلا کر انھوں نے سیوطی کی تعلیم وتربیت

وحفاظت کی ذمہ داری ان کے سپرد کردی۔ ابوالغنائم کمال الدین ابن الہمام بھی ان میں شامل تھے۔ ابن الہمام نے تعلیم وتربیت کا ایسا اہتمام کیا کہ آٹھ سال کی عمر میں سیوطی نے قرآن کریم اور بہت سے متون حفظ کر لئے۔ آپ کے اساتذہ کی تعداد 51 اور تصانیف 500 سے زائد نقل کی گئی ہے۔ شاید ہی کوئی موضوع ہوگا جس پر سیوطی کی تصنیف موجود نہ ہو۔

''الدر المنثور فی التفسیر المأثور'' دراصل ان کی مشہور تصنیف ''ترجمان القرآن'' سے ماخوذ ہے۔ لوگوں کی پست ہمتی دیکھ کر انھوں نے اسانید حذف کر دیں اور الدر المنثو روجود میں آگئی۔ سیوطی کو دو لاکھ احادیث یاد تھیں جو تفسیر لکھتے وقت کام آگئیں۔ قرآن مجید پر احادیث مرفوعہ وموقوفہ ومقطوعہ، اقوال صحابہ، روایات مفسرین کا اتنا بڑا مجموعہ انھوں نے مہیا کر دیا کہ ان کی وسعت علمی پر تعجب ہوتا ہے۔

خصوصیات:

1. تفسیر میں صرف منقولات موجود ہیں، مؤلف نے خود کو مطلقاً اس سے باہر رکھا ہے۔
2. روایات کی صحت وعدم صحت پر کوئی تبصرہ نہیں۔
3. احادیث اور اقوال صحابہ وتابعین کے درمیان واقع تعارض کو دفع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں۔
4. سیوطی نے ایک مقام پر تحریر کیا (الاتقان فی علوم القرآن، جلد۲، ص:۱۹):

''میں نے ایک ایسی جامع تفسیر تحریر کرنے کا عزم کیا ہے جو تفسیر سے متعلق ہر قسم کے ضروری مواد پر محیط ہوگی۔ اس میں عقلی مباحث، بلاغی نکات، صنائع وبدائع، اعراب ولغات، استنباطات اور اشارات سبھی ہوں گے۔ وہ تفسیر ایسی ہوگی کہ دیگر تفاسیر سے مستغنی کر دے گی۔ اس کا نام میں نے 'مجمع البحرین ومطلع البدرین' تجویز کیا ہے۔ میری کتاب 'الاتقان' اسی تفسیر کا مقدمہ ہے''

5. اتنی بات صاف ہے کہ نہ ''ترجمان القرآن'' نہ ''الدر المنثور'' ان کے بتائے ہوئے خصائص پورے کرتی ہے۔ کیونکہ یہ صرف نقل روایات پر منحصر ہیں۔

4.14 تفسیر بالرای

رائے کا اطلاق عقل اور قیاس سے اجتہاد کرنے والے کے طریقہ اور اس کے حاصل کردہ نتیجہ پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر میں رائے کے دخل پر علماء میں اختلاف رہا ہے۔ مانعین کا یہ موقف ہے کہ اس سے افتراء علی اللہ لازم آتا ہے۔ وہ استدلال کرتے ہیں جب ذیل آیتوں سے:

1. وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون
2. ولا تقف مالیس لک بہ علم
3. وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل علیھم

مزید برآں چند احادیث بھی اس بارے میں نقل کی جاتی ہیں:

1. عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھ سے وہی حدیث روایت کرو جس کا تمہیں یقین ہو۔ جس شخص نے دانستہ مجھ پر جھوٹ باندھا اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم بنالیا اور جس نے قرآن میں رائے زنی سے کام لیا اس نے بھی اپنا ٹھکانہ جہنم بنالیا''۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے (ترمذی)

2. حضرت جُندُب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے کوئی درست بات کہی تب بھی غلطی کی''۔ (ابوداود، ترمذی)

مجوزین حسب ذیل آیتیں جن میں تفکر وتدبر اور عقل سے کام لینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، رائے کے جواز میں پیش کرتے ہیں:

1. افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفا لها (سورہ محمد)

2. کتاب انزلناه الیک مبارکٌ لیدّ برّوا ایته ولیتذ کراولوا الالباب (سورہ ص)

فکر وتدبر صاحب عقل وشعور ہی کرسکتا ہے اور صاحب عقل وشعور ہی افلا یعقلون یا افلا تشعرون کا مخاطب ہوسکتا ہے۔ اگر یہ بات کہی جائے کہ رائے محمود بھی ہوسکتی ہے اور مذموم بھی۔ رائی محمود مطلوب ہے اور رای مذموم ممنوع تو اختلاف دفع ہوجاتا ہے۔

1. رائی محمود وہ رائے ہے جس کی بنیاد لغت وکلام عرب اور اصول وقواعد کتاب وسنت ہوں اور کتاب وسنت کے گہرے مطالعہ کے بعد بنی ہو، یعنی عقل قرآن وسنت اور ان کے اصول وقواعد کے تابع رہی ہو۔ اس کے برخلاف آزادی عقل کی باگ ڈھیلی کرکے جو رائی بنی قرآن وسنت کی تفسیر اس کے مطابق ہوئی ہو بھی تو بلاشبہ یہ رائی مذموم ہوگی۔ اگر صرف عربیت کافی ہوتی تو عبدالملک اصمعی جیسا نابغہ روزگار امام نحو وصرف تفسیر سے احتراز نہ کرتا۔

2. جس رائی میں نہ شرعی دلائل کو بنیاد بنایا گیا ہو نہ وہ قوانین عربیت سے میل کھاتی ہو، نہ تفسیری شرائط کی کسوٹی پر پوری اترتی ہو تو یہ رائی مذموم وممنوع ہوگی۔

4.15 مفاتیح الغیب

لقب فخر الدین، کنیت ابوعبداللہ نام محمد بن عمر بن حسن۔ آپ 544ھ میں رے میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ضیاء الدین خطیب رے اور کمال سمعانی والمجد جیلی سے اکتساب فیض کیا اور دوسرے علماء سے بھی بھرپور علمی استفادہ کیا حتیٰ کہ علم تفسیر، علم کلام، علوم عقلیہ اور علم لغت میں امامت کے درجہ پر فائز ہوگئے۔

تصانیف:

1. مفاتیح الغیب معروف بہ التفسیر الکبیر
2. المطالب العالیہ
3. المحصول فی اصول الفقہ
4. اساس التقدیس

تفسیر کبیر کی بابت بعض محققین نے صراحت کی ہے کہ امام رازی سورۃ الانبیاء تک تفسیر لکھ پائے تھے کہ ساعت اجل آ پہنچی۔اس کا تکملہ شہاب الدین دمشقی اور نجم الدین مخزومی نے لکھا۔اور بعض نے کہا کہ فخر الدین رازی نے ہی پوری تفسیر لکھی ہے۔ بعض علماء نے تفسیر کی قاموسی حیثیت پر یہ طنز کیا التفسیر الکبیر فیہ کل شی ءِ الا التفسیر جو حقیقت سے بعید ہے۔

خصوصیات:

1. آیات میں باہمی ربط و تعلق بتانے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔
2. الٰہیات کے مباحث میں عقلی استدلال سے کام لیتے ہیں جو اہل السنّت کے مسلک سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔
3. معتزلہ پر ان کے دلائل نقل کرتے ہوئے شدید نقد و جرح کرتے ہیں۔
4. امام شافعی کی حمایت میں بکثرت دلائل و براہین ذکر کرتے ہیں۔
5. تفسیر میں نحو و بلاغت کے نکات کے علاوہ علوم فقہ سے بھی عتنا کیا ہے۔
6. ریاضی ، فلسفہ اور علوم طبیعات کے شمول نے تفسیر پر ایک داغ لگا دیا ہے لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ امام صاحب کے زمانہ میں یہ علوم موضوع بحث بنے ہوئے تھے۔تو امام صاحب تفسیری مباحث کے ذریعہ عوام وخواص کی اصلاح، اشکالات کے حل، فرق باطلہ کا رد، حقائق کا معقول اثبات، اعتراضات کے حتی الوسع تشفی بخش جوابات دینا ضروری سمجھتے تھے۔ جب دین و ایمان خطرے میں ہوں تو قوم جس زبان کو سمجھتی ہو اور جن بے علوم کو اہمیت دیتی ہو تو دین و ایمان کے تحفظ کی خاطر یہاں علوم کی شرعی حیثیت بدل جاتی ہے، امام رازی نے جو کچھ کیا غالبًا اسی مقصد کے حصول کے لئے کیا ہے۔

امام فخر الدین رازی نے 606ھ میں رے میں وفات پائی۔کہا جاتا ہے کہ کرامیہ امام صاحب کے نقد عقائد پر ان سے اسی درجہ خفا تھے کہ انھوں نے آپ کو زہر دے دیا، جس نے اپنا اثر دکھایا۔

4.16 انوار التنزیل واسرار التأویل

لقب ناصر الدین کنیت ابو الخیر اور اسم گرامی عبد اللہ بن عمر بن محمد اور نسبت بیضاوی۔آپ مسلکاً شافعی تھے اور قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے۔

تصانیف:

1. انوار التنزیل
2. کتاب المنہاج وشرحہ فی اصول الفقہ
3. الطوالع فی اصول الدین

ناصر الدین بیضاوی نے انوار التنزیل کی تالیف کے دوران رازی کی تفسیر کبیر اور راغب اصفہانی کی تفسیر سے کافی فائدہ اٹھایا اور صحابہ وتابعین کے اقوال کا اضافہ فرمایا۔ چونکہ ''کشاف'' سامنے رہی اس لئے فضائل سور میں کشاف سے ضعیف اور موضوع احادیث بلا نقد وجرح نقل کرتے چلے گئے۔

خصوصیات:

1. ناصر الدین بیضاوی کی تفسیر متوسط حجم اور تفسیر وتأویل دونوں کی جامع ہے۔
2. عربی زبان کے قواعد اور اہل السنۃ کے اصول وضوابط پر مشتمل ہے اگرچہ بعض جگہ معتزلی نظریات سے متاثر بھی نظر آتے ہیں۔
3. بیضاوی کا اسلوب نگارش بڑا دلکش ہے، گو بعض جگہ اختصار عبارت نہایت دقیق ہوجاتا ہے۔
4. بعض مقامات پر اختلاف قراءات بھی نقل کرتے ہیں لیکن مواترہ، مشہورہ اور احاد وشاذہ میں امتیاز نہیں کرتے۔
5. نحوی مسائل سے بہت کم تعرض کرتے ہیں۔
6. فقہی مسائل کی تفصیلات میں کبھی کبھی کسی قدر دلچسپی بھی ظاہر ہوتی ہے مگر امام شافعی کی مستدل بہا آیات میں امام شافعی کے موقف کو ترجیح دیتے ہیں۔
7. اسرائیلیات کا تذکرہ کم ہے اور جہاں ہے صیغہ تمریض ''قِیلَ'' یا ''رُوِی'' استعمال کرتے ہیں تاکہ اس کے ضعف کی جانب اشارہ کرسکیں۔
8. جہاں تک ان احادیث کا معاملہ ہے جوانھوں نے سورتوں کے آخر میں درج کی ہیں اور بیضاوی نے ان احادیث پر نقد وجرح سے اعراض کیا ہے وہ ناقابل فہم ہے کیونکہ بہت سی احادیث صحت کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ علم حدیث سے عدم مناسبت حیرت انگیز ہے۔

بیضاوی کی تفسیر کو قبول عام حاصل ہوا اور اس پر کثرت سے حواشی لکھے گئے جن کی تعداد 40 سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ان میں حاشیہ شیخ زادہ، حاشیہ قونوی، حاشیہ شہاب خفاجی اور حاشیہ وجیہ الدین علوی اور حاشیہ کورانی مقبول ہیں۔ علامہ بیضاوی کی وفات 685ھ میں ہوئی۔

ہندوپاک اور دنیا کے مختلف خطوں میں اردو رابطہ کی زبان کا درجہ رکھتی ہے چنانچہ اردو زبان وادب میں شروع ہی سے قرآن کے ترجمے اور تفسیر پر بکثرت کام ہوئے ہیں۔ ان ترجموں اور تفسیروں کی اپنی خصوصیات وامتیازات ہیں۔

6.3 اردو ترجمہ معانی قرآن کی ضرورت اور اصول

قرآن مجید صرف ابتدائی مخاطبین کے لئے نازل نہیں ہوا بلکہ تمام اقطاع عالم اس کے مخاطب ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مخاطبین اولی کی ذہنی، علمی، فہمی سطحوں کی رعایت کی گئی اور جزیرۃ العرب میں بسے عربی قبائل، مشرکین، کافرین، منافقین، یہود ونصاری اور مجوسیوں کے عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق کا خیال رکھا گیا بلکہ آئندہ نسلوں اور ان کے علمی ارتقاء کو پیش نظر رکھا گیا، جب مشرق میں ایران، افغانستان، چین، ہندوستان، جاپان اور جنوب مشرقی ممالک جیسے انڈونیشیا، ملیشیا، فلپائن، مغرب میں شمالی افریقہ، سسلی (صقلیہ)، اسپین، پرتگال، جرمنی، فرانس، برطانیہ، اور شمال میں روس اور آئس لینڈ اور جنوب میں آسٹریلیا، نیوزیلینڈ آباد ہوں۔ اور وسطی، مغربی، مشرقی اور جنوبی افریقہ کی قدیم تہذیبوں کے سراغ ملتے ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایمان کے دائرہ میں داخلہ کے لئے عربی زبان کا سیکھنا شرط کے درجہ میں رکھ دیا جائے۔

نزول قرآن کے مقاصد پیغام حق کی اشاعت عامہ قبولیت ایمان، فرضیت عبادات، حسن معاشرت، اصول معاملات، تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس اور مکمل دین پر استقامت ہوں تو لازمی طور پر ان مضامین کی بالترتیب دعوت وتبلیغ ہی آغاز میں فرض ٹھہرے گی۔ بہرحال اردو تراجم کے مطالعہ سے ہم درج ذیل اقسام ترجمہ تک پہنچتے ہیں:

1. تحت اللفظ
2. رواں وبامحاورہ
3. نحوی
4. اسلوبی
5. خیالی

اصولی ترجمہ:

1. جس طرح الفاظ مشترک ہوتے ہیں، اسی طرح اسلوب بھی مشترک ہوتے ہیں۔ مثلاً استفہام انکاری زجر دتسکین ہر دو موقع پر آتا ہے۔ یا مثلاً اما تقسیم اور مقابلہ دونوں مقاصد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
2. ایجاز اور اطناب کا اثر مختلف ہے اس لئے ترجمہ میں اس کا لحاظ ضروری ہے۔
3. اداء، شان اور اظہار جذبات کلام کی روح ہیں، ان سے صرف نظر کرنا عبارت ومعانی کو مسخ کرنا ہے۔ مثلاً واعظ، خطیب، فوجی کمانڈر، نبی اور اللہ کا کلام اس خاص امر میں بالکل ممتاز ہوتے ہیں۔ کلام سے قائل کی عظمت آشکار ہوتی ہے۔

4. مترجم کو ان باتوں کو ابتداء ہی میں صاف کر دینا چاہئے کہ اس کے اپنے حدود کیا ہیں، عربیت سے بعد، کم علمی اور اردو زبان کی کم مائیگی صحیح و فصیح ترجمہ کرتے وقت بار بار مترجم کو روک دیتے ہیں، یا مناسب لفظ فوری طور پر ذہن میں نہیں آتا یا آیت بار بار پڑھی جانے کے باوجود نہیں کھل پاتی۔ اس سے قاری کلام اللہ کی بابت غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ کلام الٰہی میں بجلی کی کڑک اور طوفانی موجوں کے شور سے زیادہ ہیبت ہے، چنانچہ کلام اللہ اگر اپنے حق کے مطابق پڑھا جائے تو اچھے اچھے سخت دل دہل جاتے ہیں اور بے اختیار سامعین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔

5. احادیث نبوی اور کلام جاہلیت کے استقصاء سے پتہ چلتا ہے کہ جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے کیا اسلوب موثر سمجھا جاتا تھا۔ قرآنی آیات پر اس اسلوب کے انطباق پر احساسات میں انقلاب ظاہر ہوتا محسوس ہوگا۔

6. بعض وقت لفظ اپنے وضعی معنی سے نکل کر ثانوی توسیعی معنی میں استعمال ہوتا ہے یا قاعدہ سلب معنی کا اطلاق ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں وضعی معنی کو اختیار کرنا غلط ہوگا۔ باقی رہی یہ بات کہ یہاں وضعی معنی مراد ہیں یا ثانوی/توسیعی تو فہم صحابہ، بیان نبی، قرائن اور کلام عرب کا تتبع ضروری ہوگا مثلاً القـــــارعة کے وضعی معنی ٹھوکنے کے ہیں۔ نزول قرآن سے پہلے یہ لفظ مصیبت اور مشکل کے لئے استعمال ہونے لگا تھا جیسا کہ قويع الدهر اور اقراع سے پتہ چلتا ہے۔

7. بسا اوقات کوئی لفظ ایک ہی معنی کے مدارج میں اشتراک رکھتا ہے جہاں ہر معنی کا احتمال ہے، مثلاً ''رب'' کبھی آقا، کبھی پروردگار، کبھی الٰہ، کبھی حاجت روا کے معنی میں مستعمل ہے۔ یہاں بھی قرینہ سے مطلوب معنی معلوم ہو سکتے ہیں جیسے سورۃ الناس میں ''رب الناس ٭ ملک الناس ٭ الٰه الناس'' میں آقا کے معنی معلوم ہوتے ہیں۔

8. بعض الفاظ مرکب معنی رکھتے ہیں اور کبھی جزوی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ کبھی ایک جزء پر، کبھی دوسرے جزء پر مثلاً لفظ ''حمل'' لاد کر چلنا، کبھی محض لادنا، کبھی محض لے جانا۔ جب ایسے الفاظ مرکب معنی پر دلالت کرتے ہوں تو مجبوراً ان کے ترجمہ میں ایک سے زائد الفاظ استعمال کرنے پڑیں گے مگر یہاں ترجمہ میں اثر باقی نہ رہ پائے گا۔ توضیحی الفاظ ناگوار بھی محسوس ہو سکتے ہیں اور تصریح میں ہلکے رنگ کے شوخ ہو جانے کا بھی اندیشہ رہے گا۔

9. نثر مقفی میں نظم کی طرح کسی قدر بے ترتیبی کا جواز ہے کیونکہ عبارت کی خوبی اس کو غیر محسوس کر دیتی ہے۔ ترجمہ میں اگر عبارت سادہ ہے تو بے ترتیبی کا جواز نہیں۔ نیز بعض مواقع پر قافیہ اور بندش کے لئے غیر انسب لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن مجید کا ترجمہ ایک عظیم ذمہ داری ہے اس لئے ناچار غیر انسب لفظ ہی لانا پڑے گا تاوقتیکہ انسب لفظ مل جائے۔

10. سادہ عبارت میں علامہ فراہی کے نزدیک صرف انسب لفظ ہی خوبی پیدا کر سکتا ہے چنانچہ انھوں نے لم يلد و لم يولد کا ترجمہ کیا ''نہ کسی کا باپ، نہ کسی کا بیٹا'' یہ سمجھنا کہ یہ تو ترجمہ ہوا ليس هو بِأبٍ لِاَحدٍ و لابَابنٍ اور لم يلد کا ترجمہ کچھ اور ہونا چاہئے۔ کیونکہ عربی میں یہ پہلا فقرہ نہایت بھدا ہے۔ فراہی کہتے ہیں کہ ترجمہ میں کیا ہم وہی عیب پیدا کر دیں جو دور کیا گیا تھا؟ یہاں پہلا ہی طرز انسب ہے کیونکہ اردو میں یلد مذکر کا ترجمہ ہو سکے۔

11. قاضی صبغۃ اللہ ،مفتی محمد سعید، مفتی محمود، مولوی ناصر الدین (تفسیر فیض الکریم کے ساتھ طبع ہوا 1277ھ سے طباعت شروع ہوئی)

12. عبدالصمد (تفسیر وہابی در چار جلد کے ساتھ کیا گیا)

13. محمد باقر فضل اللہ خیر آبادی (مخطوط آغا حیدر حسن مرحوم کے کتب خانہ میں موجود ہے)

14. سر سید احمد خاں (تفسیر القرآن کے ساتھ نا تمام شائع ہوا)

15. نواب محمد حسین قلی خاں (1302ھ میں مطبع حسینی اثنا عشری، لکھنؤ سے شائع ہوا)

16. محمد احتشام الدین مراد آبادی (ترجمہ تفسیر ''اکسیر اعظم'' کے ساتھ متعدد جلدوں میں شائع ہوا)

17. عبدالحق حقانی (تفسیر ''فتح المنان رتفسیر حقانی'' کے ساتھ متعدد بار شائع ہوا)

18. فتح محمد تائب (تفسیر خلاصۃ التفاسیر کے ساتھ کئی مرتبہ شائع ہوا)

19. ملا فتح اللہ کاشانی (1312ھ میں آگرہ سے شائع ہوا، شیعہ فکر کی نمائندگی ملتی ہے)

20. سید امیر علی ملیح آبادی (مطبع نولکشور، لکھنؤ سے عظیم تفسیر مواہب الرحمٰن کے ساتھ تحت اللفظ اور رواں دو ترجموں کے ساتھ شائع ہوا)

21. حافظ ڈپٹی نذیر احمد (حواشی کے ساتھ 1317ھ میں شائع ہوا) حکیم الامت اشرف علی تھانوی نے ترجمہ اور حواشی میں درستگی کے لئے ''اصلاح ترجمہ دہلویہ'' لکھا۔

22. عاشق الٰہی میرٹھی (1320ھ میں طبع ہوا)

23. غواب وقار نواز جنگ وحید الزماں (حواشی کے ساتھ 1323ھ میں مطبع القرآن والسنۃ، امرتسر سے طبع ہوا)

24. انشاء اللہ (اخبار ''وطن'' میں تفسیر کے ساتھ شائع ہوا)

25. فتح محمد جالندھری (ترجمہ مختلف مطابع سے متعدد بار طبع ہوا)

26. سید فرمان علی شیعی (تفسیر ''کلام اللہ ترجمہ فرمان علی'' کے ساتھ 1326ھ میں لکھنؤ کے مطبع نظامی سے طبع ہوا)

27. مولوی محمد احسن تعلقدار (تفسیر ''احسن التفاسیر'' کے ساتھ 1327ھ میں افضل المطابع سے شائع ہوا)

28. ترجمہ مرزا حیرت دہلوی (کرزن پریس سے طبع ہوا، حضرت تھانوی نے ''اصلاح ترجمہ مرزا حیرت'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا)

29. ڈاکٹر عبدالحکیم (مترجم کے حواشی، جو تفسیر القرآن بالقرآن کے نام سے موسوم ہے کے ساتھ مطبع عزیزی، کرنال، سے طبع ہوا مترجم کسی زمانہ میں قادیانی بھی رہ چکے تھے)

30. اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن (پہلی مرتبہ 1330ھ میں مطبع نعیمی، مراد آباد، سے شائع ہوا)

31. حکیم الامت اشرف علی تھانوی (تفسیر ''بیان القرآن'' کے ساتھ طبع ہوا، پھر مکمل بیان القرآن کے ساتھ شائع ہوا تفسیری ترجمہ ہے)

32. محمد علی لاہوری (جماعت احمدیہ کی ترجمان اپنی علیحدہ تفسیر ''بیان القرآن'' کے ساتھ 1340ھ میں مطبع کریمی، لاہور، سے طبع کیا)

33. حواشی وترجمہ قرآن   از شیخ التفسیر احمد علی لاہوری

34. حواشی وترجمہ قرآن   حسین علی نقشبندی

35. القرآن المبین   فہیم الدین احمد صدیقی

36. ترجمہ وحواشی قرآن   خالد سیف اللہ رحمانی

37. شیخ الہند محمود حسن (1327ھ میں ترجمہ شاہ عبد القادر کی زبان کو جدید پیرایہ دینے کی غرض سے ابتداء کی پھر تکمیل اسارت مالٹا کے دوران 1338ھ میں کی۔ مدینہ پریس' بجنور' سے 1342ھ میں نہایت عمدہ کتابت اور مختصر تفسیر کے ساتھ طباعت عمل میں آئی۔ شیخ کے تفسیری حواشی سورہ النساء تک ہیں، باقی حواشی شبیر احمد عثمانی نے لکھے اور حواشی لکھتے وقت اپنے استاد سے کئی مقامات پر اختلاف بھی کیا جو ترجمہ کے ساتھ ساتھ ہی درج ہے)

38. مولانا عبد الباری فرنگی محلی (ترجمہ سلیس، عام فہم اور بامحاورہ ہے تفسیر الطاف الرحمٰن کے ساتھ الطاف الرحمٰن قدوائی نے ترتیب دے کر 1243ھ میں ابتدائی پارے شائع کیے)

39. خواجہ حسن نظامی دہلوی (خواجہ صاحب نے دو ترجمے کیے پہلے ترجمہ میں یہ اہتمام فرمایا کہ متن قرآن کے نیچے شاہ رفیع الدین دہلوی کا تحت اللفظ ترجمہ رکھا، اس کے نیچے اپنا ترجمہ جس میں قرآن کے مفہوم کو عام فہم بنانے کی غرض سے قوسین میں ضروری رواں تشریحیں ہیں، زبان ایسی کہ قاری کھو جائے، ملا واحدی کے اہتمام سے چھپا، دوسرا تحت اللفظ اور ترتیلی متن قرآن اور ترجمہ کے متعلقہ الفاظ کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں اعراب کے ساتھ درج کر دیا۔ ترتیلی ترجمہ کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں)

40. مولوی فیروز الدین (حواشی موسوم بہ ''تسہیل القرآن'' کے ساتھ فیروز سنز، لاہور، سے کئی بار طبع ہو چکا ہے۔ ترجمہ سلیس اور عام فہم ہے)

41. محمد جوناگڈھی (''تفسیر محمدی'' ترجمہ تفسیر ابن کثیر کے ساتھ 1347ھ تا 1352ھ تک شائع ہوتا رہا)

42. ابو الکلام آزاد (''ترجمان القرآن'' کے نام سے ضروری حواشی کے ساتھ سورہ ''مؤمنون'' تک دو جلدیں طبع ہوئیں پھر غلام رسول مہر نے مختلف مقامات سے آیتوں کا ترجمہ لیا اور ''باقیات ترجمان القرآن'' کے نام سے اکٹھا کیا اور طبع کر دیا۔ محمد عبدہ نے از سر نو باقی تحریرات سے ترجمہ اور تفسیر حواشی نقل کیے اور ایک ضخیم جلد میں شائع کیے)

43. میر محمد اسحاق (ترجمہ تحت اللفظ اور مترجم قادیانی، سن ترجمہ وطباعت نامعلوم)

44. مطیع الرحمٰن خادم (مختلف تراجم سامنے رکھ کر مترجم نے اپنے سمجھے مطالب کو نظم کا لباس پہنا دیا۔ شاعرانہ بے اعتدالیوں اور مروجہ اسلوب سے الگ۔ طباعت آگرہ کے مطبع مفید عام میں ہوئی)

45. عبدالماجد دریابادی (''تفسیر ماجدی'' کے ساتھ 1363ھ میں طبع ہوا۔ مترجم نے اگر چہ لکھا ہے کہ اردو ترجمہ 75 فیصد حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی نقل ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ ترجمہ بالکل سپاٹ بے مزہ اردو میں لکھا گیا ہے جس سے اسلوب قرآن کی عظمت متاثر ہوئی ہے، ممکن ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خوف وخشیت کا نتیجہ ہو۔ حواشی البتہ بے حد مفید اگر چہ بعض مقامات پر جو باتیں حضرت تھانوی سے منسوب کی گئی ہیں، حضرت تھانوی کی اپنی تحریر میں ان کے برخلاف صراحتیں ملتی ہیں ترجمہ وحواشی کا دوسرا ایڈیشن تحت الطبع ہے)

46. خواجہ عبدالحی فاروقی ترجمہ درس قرآن میں دو ترجمے ہیں: ایک تحت اللفظ اور دوسرا بامحاورہ وعام فہم۔

47. سید ابوالاعلیٰ مودودی (مترجم کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے ساتھ اقساط میں طبع ہوا، پھر ایک ساتھ کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ زبان سلیس، شگفتہ اور رواں قرآن مجید کی الوہی شان کلام مترجم کے پیش نظر تھی اس لئے انھوں نے مفہوم قرآن کی ترجمانی کا طریقہ اپنایا)

48. احمد سعید دہلوی مترجم نے قرآن کریم کی خطیبانہ شان جلالت زبان کی ترجمہ کے لئے خطیبانہ انداز کو اپنایا۔ ترجمہ صحیح فصیح اور پر اثر ہے، ترجمہ کا نام ''کشف الرحمٰن'' اور تفسیر کا ''تفسیر القرآن وتسہیل القرآن'' جو یکجا دو جلدوں میں 1379ھ میں اپنی بکڈپو، اردو بازار، دہلی سے شائع ہوئے۔

49. امین احسن اصلاحی مترجم کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کے ساتھ طبع ہوا۔

6.6 قرآن مجید کے اردو تراجم

1. اردو زبان میں اب تک کی تحقیق کے مطابق شاہ مراداللہ انصاری کے ترجمہ پارہ عم کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ انہوں نے 1184ھ میں ''تفسیر مرادیہ'' کے ساتھ یہ ترجمہ کیا تھا، اس کے متعدد ایڈیشن مختلف مطابع سے شائع ہوئے۔

2. شاہ عبدالقادر محدث دہلوی۔ نے جو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند تھے مکمل قرآن کے ترجمے کی ضرورت محسوس کی یہ ترجمہ پہلی مرتبہ 27/جمادی الاولیٰ 1245ھ میں شائع ہوا اور باوجود قدامت زبان کے مختلف مطابع سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس ترجمہ میں عربی الفاظ کے ترجمہ میں اردو کے ٹکسالی اور برمحل الفاظ اختیار کیے گئے کہ ان سے بہتر ملنا بظاہر ممکن نہیں تھا۔ ترجمہ کے تحت اللفظ ہونے کے باوجود اغلاق سے مکمل پاک ہے۔ ہر لفظ کا ترجمہ اس کے نیچے ہونے اور عبارت کے بامحاورہ اور عام فہم رہنے کا کمال صرف اسی ترجمہ میں ملتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اردو زبان کے قواعد اور روزمرہ پر عبور کے لئے اپنے صاحبزادوں کو خواجہ میر درد کے پاس بھیجا کرتے تھے۔

3. شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے فرزند ثانی تھے۔ انھوں نے بھی اپنے بعض تلامذہ (سید نجف علی) کے اصرار پر یہ ترجمہ کیا جو تحت اللفظ رکھنے کے لزوم کے باوجود ایک مخصوص معنی میں سہولت اور مطلب خیزی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ شاہ رفیع الدین کا یہ ترجمہ پہلی مرتبہ 1265ھ شاہ عبدالقادر کے فوائد موضح القرآن سے کلکتہ میں طبع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک اس کے مختلف مطابع سے کئی ایڈیشن شائع ہوتے جا رہے ہیں۔

4. چوتھا اردو ترجمہ جان گل کرسٹ کی نگرانی میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی جانب سے علماء کی ایک جماعت کے جس میں مولوی امانت اللہ، میر بہادر علی، مولوی فضل علی اور حافظ غوث علی شامل تھے تفویض کیا گیا۔ زبان کی اصلاح، درستگی، سلاست و روانی کی ذمہ داری کاظم علی صاحب کے سپرد کی گئی۔ 1219ھ میں اس کی تکمیل ہوئی مگر نامعلوم اسباب کی بناء پر یہ طباعت سے محروم رہا۔

5. شاہ عالم مغل بادشاہ کی ایماء پر حکیم شریف خاں (متوفی 1222ھ) نے قرآن مجید کے نئے اردو ترجمے کا آغاز و تکمیل کی۔ اس کا مخطوط خاندان شریفی میں محفوظ ہے چونکہ اس کی طباعت کی نوبت نہیں آ پائی۔ مولوی عبدالحق کی رائے نقل کرنا مناسب ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ اس ترجمہ کی زبان شاہ عبدالقادر کی زبان کے مقابلہ میں زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی کے بجائے اردو زبان کی تراکیب کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ ترجمہ کی ضرورت کے ماتحت کہیں کہیں ایک آدھ لفظ بڑھا دیا گیا ہے۔

6. شاہ رؤف احمد مجددی نے 1239ھ سے لے کر 1248ھ تک ''تفسیر رؤفی'' کے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی کیا۔ یہ ترجمہ تفسیر کے ساتھ مخلوط ہے اور زبان پرانی۔ مطبع فتح الکریم سے 1305ھ میں اس کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا۔ ترجمہ میں صحت معنی اور تفسیر میں اشاری و احسانی رنگ نمایاں ہیں۔ کاش کوئی صاحب ہمت اٹھے اور اس ترجمہ و تفسیر کو از سر نو کتابت اور تصحیح سے بچتے ہوئے عکسی طباعت کر دے۔

7. سید بابا قادری حیدرآبادی کا یہ ترجمہ دکنی اردو کے قدیم تراجم میں شمار کیا جاتا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ توضیحی الفاظ بھی...... تفسیر شامل کر دیے گئے ہیں۔ 1247ھ میں سات کی محنت شاقہ کے بعد یہ ترجمہ مکمل ہو پایا۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔ ترجمہ کا نام مترجم نے ''فوائد بہیہ'' رکھا۔

8. مولوی عبدالسلام نے ''زاد آخرت'' کے نام سے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ 1244ھ سے لے کر 1259ھ کے درمیان کیا جو مطبع نولکشور لکھنو سے 1285ھ میں عبدالسلام صاحب کی تفسیر ''زاد الآخرۃ'' کے ساتھ شائع ہوا۔ اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ترجمہ منظوم ہونے کے باوجود شاعرانہ بے اعتدالیوں سے پاک ہے اور اب تک کسی مقام پر کوئی لغزش محققین نے نہیں پائی۔

9. نواب قطب الدین خاں تلمیذ شاہ محمد اسحٰق و مؤلف ''مظاہر حق'' (شرح مشکوۃ المصابیح) نے 1276ھ میں سورہ احزاب سے قرآن کا اردو ترجمہ کرنے اور ایک متوازن تفسیر بنام ''جامع التفاسیر'' لکھنے کا عزم کیا لیکن سورہ طارق کے ترجمہ و تفسیر ہی کی تھی کہ ملک الموت آ پہنچے۔ بعد کی سورتوں کا ترجمہ نواب صاحب تلمیذ مولوی عبدالقادر نے کیا۔ ''جامع التفاسیر'' 1282ھ میں مطبع نظامی کانپور سے طبع ہوئی۔

10. قرآن مجید کا ایک ترجمہ مدراس میں بھی ہوا۔ ترجمہ وتفسیر کا نام ''فیض الکریم'' ہے اور مترجم چار: قاضی صبغۃ اللہ، مفتی محمد سعید، مفتی محمود اور مولانا ناصر الدین، اول الذکر دو علماء کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں اور آخر الذکر دو علماء کے ترجمہ ہنوز تشنۂ طباعت ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ ترجمہ کے آغاز و تکمیل میں ایک سو سال لگے۔ ترجمہ وتفسیر کی زبان قدیم ہے۔ مدراس و دکن کی زبان کا رنگ نمایاں ہے۔ اس ترجمہ وتفسیر کا ناتمام ایڈیشن مطبع عزیزی اور مطبع فیض الکریم حیدر آباد سے 1313ھ میں شائع ہوا۔ یہ جنوبی ہند کے مشہور خاندان نوائط کا ہندوستانی مسلمانوں کے لئے گراں قدر عطیہ ہے۔

11. محمد باقر فضل اللہ خیر آبادی نے بھی قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا۔ زبان کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تیرھویں صدی ہجری کے تیسرے یا چوتھے دہے میں کیا گیا ہوگا۔ اس کا نسخہ آغا حیدر حسن مرحوم (حیدر آباد) کے کتب میں پایا جاتا ہے۔ ترجمہ قرآن کے متن کے نیچے سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔

12. سر سید احمد خاں نے اپنی ''تفسیر القرآن'' کے لئے سورہ بنی اسرائیل بلکہ سورہ انبیاء تک ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ سلیس و رواں اور عام فہم و سہل ہونے میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ 1297ھ تا 1313ھ تک یہ ترجمہ تفسیر کے ساتھ شائع ہوتا رہا حال میں خدا بخش لائبریری نے اس کا عکسی ایڈیشن اہتمام سے شائع کیا۔ ترجمہ کی صحت کا اندزہ مولوی محمد علی بچھرایونی کی ناتمام کتاب البرهان علی تجهیل من قال برأیه فی القرآن کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ سر سید احمد خاں کے مدّاح الطاف حسین حالی بھی یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ ''سر سید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں''۔

13. نواب محمد حسین قلی خاں نے اپنا ترجمہ قرآن پرانی اردو میں کیا ہے۔ اور توضیحی عبارت میں شیعی عقائد و نظریات کو پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ مطبع حسینی اثناء عشری (لکھنو) سے 1302ھ میں طبع ہوا ہے۔

14. مولوی محمد احتشام الدین مرادآبادی نے اپنی تفسیر ''اکسیر اعظم'' کے لئے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا جو جلد وار تفسیر کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ بارہویں جلد جو سورہ ''طٰہٰ'' پر ختم ہوئی 1316ھ میں شائع ہوئی۔

15. مولوی عبد الحق حقانی نے قرآن مجید کا ترجمہ با محاورہ، سلیس اور مطلب خیز اردو میں کیا۔ یہ ابتداء میں تفسیر کے ساتھ بڑی تقطیع میں 8 جلدوں میں شائع ہوا۔ پھر ناقدین کے لئے ہر غلطی کی نشاندہی پر انعام دینے کا اعلان بھی کیا گیا۔ تفسیر میں پہلی جلد مقدمہ کے لئے مختص کر دی گئی۔

16. مولوی فتح محمد تائب شاگرد علامہ عبد الحی فرنگی محلی نے بھی بدلتے حالات دیکھ کر ایک صحیح و فصیح ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ ترجمہ مولوی فتح تائب ہی کی تفسیر ''خلاصہ التفاسیر'' کے ساتھ ساتھ آٹھ مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

17. ملا فتح اللہ کاشانی کے اردو ترجمہ قرآن کی زبان صاف اور سلیس ہے۔ مترجم شیعی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ترجمہ مطبع اعجاز محمدی، اکبر آباد (آگرہ) سے 1312ھ میں بڑی تقطیع کی ایک ضخیم جلد میں طبع ہوا۔

18. مولانا سید امیر علی ملیح آبادی میاں صاحب سید نذیر حسین کے ایک ممتاز شاگرد تھے جو ہدایہ کی اردو شرح ''عین الہدایہ'' ''التعقیب علی التقریب'' اور فتاوی عالمگیری کے اردو ترجمہ کے لئے مشہور تھے۔ مطبع نولکشور میں تصحیح کی خدمت پر مامور تھے۔ منشی صاحب ہی کی خواہش پر سید امیر علی ملیح آبادی نے اردو میں عظیم الشان اور ضخیم ترین تفسیر تحریر فرمائی جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئے گا۔ تفسیری ضرورت ہی کے ناطے سید امیر علی نے قرآن مجید کے دو ترجمے کیے: ایک تحت اللفظ اور دوسرا مطلب خیز، میری مجال نہیں کہ میں ان دونوں ترجموں کی خصوصیات بتا سکوں۔

19. ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے جن کا شمار اساطین اردو ادب میں کیا جاتا ہے، سلیس، شستہ، شگفتہ اور بامحاورہ اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ترجمہ میں محاورات کے بوجھ نے اس کی صحت اور سلاست میں جابجا شکوک پیدا کر دیے۔ علماء کے توجہ دلانے کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد اپنے ترجمہ کے ایڈیشن پر ایڈیشن چھپتے دیکھتے رہے۔ ان کو عربی اور اردو پر غیر معمولی گرفت حاصل تھی شاید اسی ناز نے ان کو ترجمہ پر نظر ثانی سے روک رکھا۔ مولوی اشرف علی تھانوی نے ڈپٹی صاحب کی توجہ بعض مقامات پر مبذول کرانے اور قارئین کو متنبہ کرنے کی غرض سے ''اصلاح ترجمہ دہلویہ'' کے نام 44 صفحات پر مشتمل ایک رسالہ لکھا جس میں ترجمہ اور حواشی کی لغزشات کی نشاندہی فرمائی۔

20. مولانا وحید الزماں نے جو صحاح خمسہ کے تراجم اور لغات الحدیث کی تصنیف اور ''کنز العمال'' کی تصحیح کے لئے خاصے مشہور ہیں قرآن مجید کا ترجمہ بھی اردو زبان میں کیا ہے جو ان کے تفسیری حواشی ''تفسیر وحیدی'' کے ساتھ 1323ھ میں چھپ چکا ہے۔ زبان سلیس، بامحاورہ اور مطلب خیز ہے اور حواشی مختصر مگر پر مغز۔

21. مولوی فتح محمد جالندھری اپنی عربی اور اردو صلاحیت اور غیر جانبدارانہ مسلک کے لئے مشہور تھے۔ ان کی تصنیف ''مصباح القواعد'' نصاب میں شامل ہونے کے باعث معروف تھی جس میں انھوں نے اردو کے قواعد بہت جامعیت سے سلاست سے جمع کر دیے تھے۔ ان کا قرآن مجید کا ترجمہ بھی سلیس اور عام فہم ہے اگرچہ بعض ناقدین نے اس کی زبان کو گنجلک اور مغلق بتایا ہے۔ اپنی صحت اور معنویت کے لحاظ سے علماء نے بالعموم اس کو قابل اعتماد بتایا ہے۔

22. سید فرمان علی صاحب نے جو ایک شیعہ عالم تھے قرآن مجید کا ترجمہ کیا جو شیعہ حضرات میں بڑا مقبول ہوا۔ ترجمہ کی زبان صاف اور سلیس ہے ترجمہ کے حواشی بھی دیے گئے ہیں۔ اس کا تیسرا ایڈیشن 1365ھ میں شائع ہوا۔

23. اعلی حضرت احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے اصحاب کے اصرار پر ''کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن'' کے نام سے املاء کرایا اور نظر ثانی کے بعد اس کی طباعت و اشاعت 1330ھ میں عمل میں آئی۔ اردو ترجمہ میں قرآنی آیات، احادیث نبویہ، اقوال صحابہ، اقوال مفسرین متبحرین کے استحضار کے تناظر میں املاء کرایا گیا۔ جو اتنا وسیع مطالعہ رکھتا ہو وہی اس ترجمہ کی قدر جان سکتا ہے۔ ترجمہ کے بعض مقامات پر اعتراضات بھی کیے گئے ہیں لیکن ان مقامات کی بابت معتبر تفسیریں دیکھی جائیں تو چند مقامات کے سوا اکثر اعتراضات پادر ہوا ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ میں نحوی و صرفی، اسلوب قرآنی اور تحت اللفظ ہونے کی رعایات بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ مترجم پر اللہ کے جلال اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ مترجم نے صحت و ادب پر سلاست کو قربان کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

24. مشہور اہل حدیث عالم مولوی ثناء اللہ امرتسری نے ردقادیانیت وردنیچریت کے تناظر میں جب ''تفسیر ثنائی'' قلم بند کی تو اس کے ساتھ ہی اپنا تفسیری ترجمہ بھی لکھ دیا جو بظاہر ایک خوش آئند طریق تھا۔ یہ تفسیری ترجمہ تفسیر کے ساتھ سات جلدوں میں خود مترجم کے اہتمام سے 1325ھ میں مطبع اہل حدیث، امرتسر، سے طبع ہوا۔

25. حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی نے اپنی تفسیر بیان القرآن تحریر کرتے وقت ایک ایسے ترجمہ کی ضرورت محسوس کی جو تحت اللفظ ہونے کے ساتھ ساتھ مطلب خیز، سلیس، رواں اور عام فہم ہو۔ طریقہ ثنائی تفسیری ترجمہ کا اختیار کیا جس سے اشکالات کا امکان ہی زائل ہو جائے۔ ترجمہ کی طباعت کے دوران جو نقد کیا گیا یا تجاویز دی گئیں ان پر حضرت تھانوی نے خوش دلی سے غور کیا اور شکریہ کے ساتھ نقد و تجاویز کا بڑا حصہ قبول کیا اور ضروری ترمیمات کیں، حضرت تھانوی کا موقف تھا کہ شہر دہلی کے محاورے الگ ہیں، شہر لکھنو کے الگ اور بہار و جنوبی ہند کے الگ۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کلام اللہ کی شان و شوکت کے اعجاز کی بقدر وسعت ترجمانی کی جا سکے۔ محاوروں کے تکلف سے ترجمہ میں تصنع پیدا ہو جاتا ہے جو کلام اللہ کے ترجمہ کو زیب نہیں دیتا۔ یہ ترجمہ تفسیر کے ساتھ مطبع مجتبائی سے 1326ھ میں 12 جلدوں میں شائع ہوا اور ثناء اللہ امرتسری نے اپنے تفسیری ترجمہ کے خیال کو حضرت تھانوی کے اپنانے پر نہایت خوشی کا اظہار کیا کہ اتنا بڑا عالم بھی اس طرز کو مفید سمجھتا ہے۔

26. شیخ الہند (شیخ الکل) مولانا محمود حسن نے شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمہ کی تجدید بلحاظ زبان و بیان کی ضرورت محسوس کی۔ آغاز اگرچہ 1327ھ میں ہو چکا تھا لیکن مشاغل علمی و احسانی و درسی و سیاسی بار بار مانع ہو رہے تھے۔ تحریک ریشمی رومال بعض کمزور قلب لوگوں کے سبب آشکار ہو گئی۔ شیخ الہند (بلکہ شیخ الکل) محمود حسن کو قید کر لیا گیا، بحیرہ روم کا جزیرہ مالٹا ان کی اسارت کے لئے چنا گیا۔ زمانہ اسارت میں مولانا محمود حسن نے ترجمہ کے کام کو پورا کر دیا۔ شیخ الہند نے اس ترجمہ کے ساتھ نہایت ایجاز سے سورہ نساء تک حواشی بھی تحریر فرمائے۔ اس ترجمہ پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے نظر ثانی کی اور بعض مقامات پر اپنے اختلاف کو بھی ظاہر کر دیا۔ سورۂ نساء کے بعد کے حواشی شبیر احمد عثمانی کی یادگار ہیں یہ ترجمہ مع فوائد مدینہ پریس، بجنور، سے 1342ھ میں طبع ہوا۔ اللہ سبحانہ اس کے خطاط کو بھی جزائے خیر دے جس نے عربی متن اور اردو ترجمہ و حواشی میں اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ خط کا حسن کسی کو بھی قرآن مجید، اردو ترجمہ اور فوائد کے مطالعہ کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ترجمہ نہایت صاف و بے تعقید ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث، شیخ الہند محمود حسن اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام اس کی صحت کی ضمانت ہیں۔

27. خواجہ حسن نظامی دہلوی نے قرآن کے ترجمہ کے لئے ایک نیا طریقہ پسند فرمایا۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کا تحت اللفظ ترجمہ متن قرآن کے نیچے نقل کیا اور اس کے نیچے ان کا اپنا ترجمہ۔ قرآن کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے قوسین میں لمبی لمبی تشریحی عبارتیں اپنی دلکش انشاء میں لکھ دیں۔ غالباً اسی وجہ سے انھوں نے ترجمہ کے بجائے ''عام فہم تفسیر'' کے نام سے اسے موسوم کیا۔ زبان ایسی رواں اور سہل کہ کم پڑھا لکھا آدمی بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے خواجہ صاحب نے ایک اور ترجمہ ''ترتیلی اردو ترجمہ'' کے نام سے کیا ہے جس میں لفظی ترجمہ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ متن قرآن اور ترجمہ کے الفاظ کو اعراب کے ساتھ علیحدہ علیحدہ خانوں میں درج کیا ہے تاکہ قاری صحت تلفظ کے ساتھ ترجمہ کی عبارت پڑھ سکیں۔

28. مولانا ابوالکلام کا اردو ترجمہ قرآن ''ترجمان القرآن'' کے نام سے موسوم ہے۔ ابتداء میں یہ ترجمہ 2 جلدوں میں سورہ فاتحہ سے سورہ مومنون تک طبع ہوا تھا۔ پہلی جلد 1350ھ میں جید پریس دہلی میں اور دوسری جلد 1355ھ میں مدینہ پریس 'بجنور' میں چھپی، کتابت، طباعت اور کاغذ معیاری۔ اس ترجمہ کی متعدد خصوصیات میں حسب ذیل اہم ہیں۔

1. ترجمہ نہایت مطلب خیز، زبان ادبی رفعتوں کو چھوتی ہوئی اور طرز شاہانہ۔

2. اشکالات کا تدارک ترجمہ ہی میں کرلیا گیا۔

3. دوسرے تراجم کی نسبت اس ترجمہ میں حاکمانہ انداز زیادہ نمایاں ہے جو کلام اللہ کی جلالت کی عکاسی کرتا ہے۔

4. یہ قرآن کے الفاظ کا ترجمہ نہیں بلکہ اپنی دانست میں مفہوم و مراد ربانی کو قاری کے دل میں جاگزین کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔

5. حواشی صرف ضرورۃً دیے گئے ہیں چنانچہ حواشی کی حیثیت ذیلی ہے۔

جدید تراجم میں عبید اللہ سندھی، مولانا احمد علی لاہوری، خواجہ عبدالحی فاروقی، محمد حنیف ندوی، مولانا ابو محمد مصلح، مولانا امین احسن اصلاحی، علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، سید غلام رسول سعیدی، پیر کرم شاہ ازہری، علامہ محمد طاہر قادری نے مختلف مقاصد اور پہلو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اپنے وسعت ظرف علم کے تحت ترجمہ معانی القرآن کئے ہیں جن کے تعارف و تبصرہ کے لئے اس درسی کتاب میں گنجائش پیدا کرنا دشوار ہے لہٰذا ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

6.7 اردو تفسیر کے مناہج

اردو تفاسیر میں بھی مفسرین برصغیر نے مختلف مناہج اپنائے۔

1. نقلی / روایتی / ماثور
2. عقلی / بالرای
3. عقل و نقل کا امتزاج
4. فقہی
5. احسانی / اشاری، اعتباری
6. سیاسی
7. فکری
8. آزاد

بلاک:2 حدیث

فہرست

اکائی 7 : تعارف حدیث

اکائی کے اجزاء

7.1 مقصد

اسلامی شریعت کا دوسرا اہم سرچشمہ قرآن مجید کے بعد حدیث ہے، اس اکائی میں حدیث کا معنی ومفہوم، اس کی ضرورت واہمیت، قانونی حیثیت، نیز ان کی تعداد اور احادیث کے مضامین پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی؛ تاکہ طلبہ ان اہم اور بنیادی معلومات سے آگاہ ہوسکیں۔

7.2 تمہید

قرآن مجید آخری آسمانی کتاب ہے، جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کی گئی، اس کتاب کی تشریح وتفسیر خود اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے ذمہ رکھی چنانچہ قرآن میں ہے:

"وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ"[النحل:44]

(اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے؛ تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح وتوضیح کرو، جو ان کے لیے اتاری گئی ہے، اور تاکہ لوگ خود بھی غور وفکر کریں)

اور یہ بھی واضح کردیا کہ اس کی تشریح وتفسیر میں یہ نبی اپنی مرضی سے کام نہیں لیتے ہیں:

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى"[النجم:4-3]

(وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے)

اس لئے اس نبی کی فرمانبرداری واطاعت شعاری کو واجب قرار دیا گیا، اور ہر طرح کی نافرمانی وحکم عدولی سے منع کیا گیا:

" وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا"[الحشر:7]

(جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روکے اس سے رک جاؤ)

گویا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب اور حدیث وسنت اس کی تشریح وتفسیر ہے، یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید؛ اللہ کے کلام کی حیثیت سے اپنی عظمت اور استناد میں بے مثال ہے اور احادیث اپنی وسعت وجامعیت اور شرح ووضاحت کے لحاظ سے اس کے بعد ہے؛ اس لئے ان دونوں میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرکے دین وشریعت کی تعبیر وتشریح، فہم اور تفہیم ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ امام اوزاعیؒ، مکحول اور یحی بن کثیرؒ وغیرہ کہا کرتے تھے کہ سنت کو جتنی ضرورت کتاب اللہ کی ہے، کتاب اللہ کو اس سے زیادہ سنت کی ضرورت ہے۔

7.3 حدیث کا لغوی معنی

''حدیث'' عربی زبان کا لفظ ہے، یہ لفظ خود قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، عربی لغت کے اعتبار سے اس کے دو معنی آتے ہیں:

(1) کلام اور بات چیت، اللہ تعالیٰ کے ارشاد: "فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ"[الطور : 34] میں یہی معنی مراد لئے گئے ہیں۔

(2) حدیث کا ایک معنی ''جدید'' کے بھی ہیں، یہ لفظ ''قدیم'' کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، یعنی نئی بات یا نئی چیز، چوں کہ قرآن مجید اللہ تعالٰی کا کلام ہے، اور اس حیثیت سے وہ قدیم ہے، اور حدیث کے الفاظ چوں کہ رسول اکرم ﷺ کے ہوتے ہیں اس لئے وہ قرآن کے مقابلہ میں جدید ہیں۔

واضح رہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے کلام کو ''حدیث'' سے تعبیر کیا ہے، روایات میں آتا ہے کہ صحابی رسول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ: قیامت کے روز آپ کی شفاعت کے حق دار کون لوگ ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: حدیث کے تئیں تمہاری دلچسپی کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ تم سے پہلے اس حدیث کے بارے میں کوئی اور نہیں سوال کرے گا:

''لقد ظننت یا ابا ھریرہ أن لا یسئلنی عن ھذا الحدیث أحد أول منک، لما رأیت من حرصک علی الحدیث'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر:99)

7.4 حدیث کا اصطلاحی مفہوم

محدثین کی اصطلاح میں ''حدیث'' رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کہتے ہیں۔

''قول'' سے مراد حضور ﷺ کا کلام ہے، جیسے کہ ہم حدیث کی کتابوں میں [illegible] رسول پڑھتے ہیں، ''إنما الأعمال بالنیات'' (اعمال کا دارومدار نیت پر ہے)۔

''فعل'' سے مراد وہ کام یا عمل جو رسول اللہ ﷺ نے بذات خود انجام دیا ہو، جیسے آپ کا طریقۂ وضو، جسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے تفصیل سے نقل کیا ہے، پس عبادات یا زندگی کے دیگر شعبوں سے متعلق آپ ﷺ کا کوئی بھی عمل ہو وہ حدیث کے دائرہ میں آتا ہے۔

''تقریر'' سے مراد یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی موجودگی میں کوئی بات کہی گئی ہو یا کوئی کام کیا گیا ہو، یا یہ کہ کسی بات یا کام کی خبر آپ ﷺ کو دی گئی ہو، اور آپ ﷺ نے اس کو منع نہ کیا ہو، کیوں کہ کسی ناجائز اور غلط بات پر آپ ﷺ چشم پوشی سے کام نہیں لے سکتے، جیسے عربوں میں پہلے سے عقد مضاربت (بٹائی پر معاملہ) کا چلن تھا، آپ ﷺ نے اس پر نکیر نہیں کی، اسی طرح ملک حبشہ کے ایک وفد نے حضور ﷺ کی موجودگی میں مسجد نبوی میں کھیل کود کا مظاہرہ کیا، مگر انہیں منع نہیں کیا گیا۔

بعض محدثین نے حدیث کے دائرہ کو اور بھی وسیع رکھا ہے، ان کے مطابق حدیث کی تعریف اس طرح ہے کہ: جو کچھ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نقل کیا جائے، خواہ وہ آپ کا قول ہو یا فعل، تقریر ہو یا آپ کی جبلی واخلاقی صفات، نیز ان کا تعلق نبی بنائے جانے کے پہلے سے ہو یا بعد سے، وہ سب حدیث کے دائرہ میں آتے ہیں۔

اسی طرح بعض علماء جیسے علامہ طیبی نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ساتھ صحابہ اور تابعین کے اقوال وافعال کو بھی حدیث میں شامل کیا ہے، مگر بیشتر محدثین ان کے درمیان فرق کرتے ہیں اور یہی واجح اور درست ہے۔

7.5 حدیث اور دیگر مترادف اصطلاحات

''حدیث'' کے ہم معنی اور بھی الفاظ اور اصطلاحات ہیں، خود محدثین نے بکثرت انہیں استعمال کیا ہے، جیسے سنت، خبر اور اثر وغیرہ، ذیل میں ان کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

7.5.1 سنت

عربی لغت کے اعتبار سے لفظ سنت کا معنی طریقہ اور چال ڈھال کے ہیں، خواہ وہ اچھا ہو یا برا، خود آپ ﷺ نے اس معنی میں استعمال کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''من سنّ سنة حسنة ''یعنی (جس نے اچھا طریقہ رائج کیا)؛ اسی طرح فرمایا: ''من سنّ سنة سيئة '' (جس نے بُرا طریقہ جاری کیا)۔

سنت کی یہ اصطلاح حدیث، فقہ اور اصول فقہ تینوں فنون میں رائج ہے، البتہ ہر فن کے ماہرین نے اپنے موضوع اور رجحانات کے اعتبار سے اس کی تعریف کی ہے: چنانچہ سنت کے چند اہم استعمالات یہ ہیں:

1. سنت کی اصطلاح بدعت کے مقابلے میں بولی جاتی ہے۔
2. احکام شریعت میں جو حکم واجب سے کمتر ہو، فقہاء اس کے لیے سنت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔
3. بسا اوقات سنت کا استعمال صحابہ کے طریقہ پر بھی کیا جاتا ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين'' تم پر میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کی پیروی لازم ہے۔
4. حدیث کے مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، گویا کہ سنت کی بھی وہی تعریف ہے جو حدیث کی ہے۔ علم حدیث کی اصطلاح میں یہی معنی ہے۔

7.5.2 خبر

عربی لغت کے اعتبار سے اس کے معنی اطلاع دینے کے ہیں، اور خبر میں سچ اور جھوٹ دونوں کا امکان ہوتا ہے، محدثین کی اصطلاح میں خبر کی بھی وہی تعریف کی جاتی ہے جو حدیث کی ہے، یعنی جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا جائے وہ حدیث ہے، خواہ قول وفعل ہو یا تقریر، یا جبلی واخلاقی صفات ہوں۔ البتہ اس میں جمہور محدثین نے صحابہ اور تابعین کے اقوال وافعال کو بھی شامل کیا ہے۔

حدیث وخبر کے باہم ربط یا فرق کے سلسلہ میں علماء کے چار اقوال ہیں:

1. خبر اور حدیث مترادف ہیں، اور ان کا اطلاق یکساں طور پر مرفوع، موقوف اور مقطوع ہر قسم کی روایتوں پر ہوتا ہے، یہ جمہور محدثین کا قول ہے۔
2. جو روایت حضور ﷺ سے مروی ہو وہ حدیث ہے اور جو قول دیگر حضرات کی طرف منسوب ہو وہ خبر ہے۔
3. ہر حدیث خبر ہے، مگر ہر خبر کے لئے حدیث ہونا ضروری نہیں ہے، اسے منطق کی اصطلاح میں یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ خبر اور حدیث میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔

4. آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور کے قول کے لئے حدیث کا لفظ استعمال کیا جائے تو اسے مطلق نہیں استعمال کیا جائے گا، جب کہ ''خبر'' کو بلا کسی قید کے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

7.5.3 اثر

عربی زبان میں کسی شئے کے باقی ماندہ حصے یا نقش قدم کو ''اثر'' کہتے ہیں، اسی طرح نقل در نقل کی جانے والی خبر کو بھی اثر کہا جاتا ہے۔

محدثین کے ہاں مرفوع وموقوف اور مقطوع روایت کو اثر کہا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ابو جعفر الطحاوی (م 321ھ) نے اپنی کتاب کا نام ''شرح معانی الآثار'' رکھا ہے اور اس میں ہر طرح کی روایات کو ذکر کیا ہے۔

فقہاء خراسان حدیث اور اثر میں فرق برتتے ہیں؛ چنانچہ ابو قاسم الفورانی کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دیگر حضرات کی طرف منسوب باتوں کو اثر کہا جائے گا، جیسے کہ صحابہ وتابعین کے اقوال، اور جو بات آپ ﷺ کی جانب منسوب ہو اسے خبر کہتے ہیں، گویا کہ حدیث مرفوع کو خبر اور موقوف ومقطوع کو اثر کہا جاتا ہے۔

7.6 حجیت واہمیت

سنت کی دینی ضرورت واہمیت اور تشریعی وقانونی حیثیت کے جاننے کا نام دراصل ''حجیت حدیث'' ہے۔

قرآن مجید کی صراحت کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی کی ذات گرامی وہ ہے جو تن تنہا حاکم ہے، اور ساری مخلوق اس کے تابع ہے ''ان الحکم الا للہ'' [یوسف:40] اور اللہ تعالیٰ کے اس ''حکم'' سے آگہی کے بنیادی طور پر دو ذریعے ہیں، قرآن مجید اور حدیث رسول ﷺ۔ اس بات کو خود ذات باری نے مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے، اور بہ زبان رسالت بھی واضح کر دیا گیا ہے، ذیل میں حجیت حدیث پر قرآن وحدیث اور دیگر شرعی دلیلوں کی روشنی میں گفتگو کی جائے گی۔

7.6.1 حجیت حدیث اور قرآن مجید

قرآن نے مختلف پیرائے میں رسول اللہ ﷺ کے مقام اور ان کی کہی ہوئی باتوں کی ضرورت اور آئینی حیثیت کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے، جس سے حدیث وسنت کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، بنیادی طور پر اس بابت قرآن میں پانچ اسلوب اختیار کئے گئے ہیں:

الف: وہ آیتیں جو آپ ﷺ پر ایمان لانے کو دین کا اہم ترین جزء قرار دیتی ہیں، کہ اس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوسکتی، اور آپ ﷺ پر ایمان لانے کا مطلب محض رسالت کا اقرار نہیں ہے؛ بلکہ ان تمام چیزوں کی تصدیق ہے جو آپ ﷺ نے عطاء کی ہیں، اسی طرح وہ آیتیں بھی اس میں شامل ہیں، جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کی اتباع نہ کرنا یا آپ ﷺ کے حکم پر راضی نہ ہونا خود ایمان کے منافی ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ آمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِیَ أَنـزَلَ مِن قَبْلُ وَمَن يَكْفُرْ بِاللّهِ وَمَلاَئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيْداً"[النساء:136]

(اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے، اور اس کتاب پر بھی جو وہ اُس سے قبل نازل کر چکا ہے، اور جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور پیغمبروں اور قیامت کے دن کا انکار کرتا ہے وہ گمراہی میں بہت دور جا پڑتا ہے)

"فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِیْ أَنزَلْنَا وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيْرٌ" [التغابن:8]

(تو اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اس نور پر بھی جو ہم نے نازل کیا ہے اور اللہ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے)

"فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُوْا فِیْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا"[النساء:65]

(سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے، جب تک یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہو آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کریں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں، اور اس کو پورا پورا تسلیم کرلیں)

ب: بعض وہ آیتیں ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذمہ قرآن مجید کی تشریح وتفسیر اور اس کے معانی ورموز کی وضاحت بھی رکھی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ ہی کی بیان کردہ تعبیر وتفسیر دراصل معتبر ہے، گویا کہ آپ ﷺ نے اپنے قول وعمل اور خاموش رضامندی (تقریر) سے قرآن مجید کی جو تشریح وتفسیر کی ہے وہ حجت ہے۔

مندرجہ ذیل آیتیں اسی نکتہ پر روشنی ڈالتی ہیں:

"وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ" [النحل:44]

(اور ہم نے آپ پر یہ نصیحت نامہ اتارا ہے تاکہ تشریح وتوضیح سے کھول کر لوگوں پر ظاہر کردیں جو کچھ ان کے پاس بھیجا گیا ہے، اور تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیا کریں)

"لَقَدْ مَنَّ اللّهُ عَلَى الْمُؤمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُواْ مِن قَبْلُ لَفِیْ ضَلالٍ مُّبِيْنٍ" [آل عمران:164]

(حقیقت میں اللہ نے بڑا احسان کیا مسلمانوں پر جب انہی میں سے ایک پیغمبر ان میں بھیجا، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور بے شک یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے)

ج: قرآن مجید نے حجیت حدیث کے بیان کے لیے ایک اور اسلوب اختیار کیا ہے؛ چنانچہ چند آیتیں وہ ہیں، جن میں آپ ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کو مستقل واجب قرار دیا گیا ہے، اور اس سے روگردانی کو کفر اور ہلاکت کا سبب بتایا گیا ہے:

"قُلْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَالرَّسُولَ فإِن تَوَلَّوْاْ فَإِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبُّ الْكَافِرِينَ" (آل عمران:32)

(آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اس پر بھی اگر وہ روگردانی کریں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں رکھتا)

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً"[النساء:59]

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے میں سے اہل اختیار کی، پھر اگر تم میں باہم اختلاف ہو جائے کسی چیز میں تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا لیا کرو، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی خوشتر ہے)

اس آیت کے سلسلہ میں علامہ ابن القیمؒ نے ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے کہ ''الرسول'' کے ساتھ مستقل ''أطیعوا'' کا صیغہ ہے، یہ بتانے کے لئے کہ رسول کی اطاعت مستقل طور پر واجب ہے، اور اسے قرآن پر پیش کئے بغیر ہی تسلیم کر لیا جائے۔

"وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءتْ مَصِيرًا"[النساء:115]

(اور جو کوئی بعد اس کے کہ اس پر راہ ہدایت کھل چکی ہے رسول کی مخالفت کرے گا، اور مؤمنین کے راستہ کے علاوہ کسی اور راستہ کی پیروی کرے گا تو ہم اسے پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھرتا ہے اور اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے)

" فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ"[نور:63]

(پس چاہئے کہ جو پیغمبر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ ڈریں اس بات سے کہ کسی آزمائش اور فتنہ میں نہ مبتلا ہو جائیں یا ان کو دکھ بھرا عذاب پکڑ لے)

"وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا "[الحشر:7]

(اور رسول جو کچھ تمہیں دیں وہ لے لو، اور جس چیز سے وہ تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ)

د: قرآن مجید نے اہل ایمان کو رسول کی اطاعت کی دعوت دیتے ہوئے ایک اور طرز اختیار کیا ہے، چنانچہ بعض آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اُسوہ ونمونہ بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لئے ان سے صادر ہونے والے تمام افعال میں اتباع واجب ہے، اسی ضمن میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ اللہ کی محبت کے لئے آپ ﷺ کی پیروی لازم ہے۔

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا"[الاحزاب:21]

(درحقیقت تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے، یعنی اس کے لئے جو ڈرتا ہو اللہ اور آخرت سے اور ذکر الٰہی کثرت سے کرتا ہو)

مختلف مفسرین اور محدثین نے ''رسول کے نمونہ'' ہونے کا مطلب ان کی اقتداء کرنا، ان کے طریقے کی پیروی کرنا، اور ان کے قول وفعل میں ان کی مخالفت سے گریز کرنا بتایا ہے۔

"قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"[آل عمران:31]

(آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اللہ بہت زیادہ بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے)

ھ: قرآن مجید نے اس بات کی بھی صراحت کردی ہے کہ آپ ﷺ کے ارشادات اصل میں وحی پر مبنی ہوتے ہیں، وہ اپنی خواہش نفس سے باتیں نہیں بناتے ہیں:

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى"[النجم: 3 - 2]

(اور وہ نہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں، وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے)

بہت سے علماء نے اس آیت سے قرآن وحدیث دونوں کے وحی ہونے پر استدلال کیا ہے، اور یہ بات درست بھی معلوم ہوتی ہے، چوں کہ یہاں ''ینطق'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے جس کے معنی بولنے کے ہیں، اور اس کا دائرہ عام ہے اگر محض قرآن مجید مراد لیا جاتا تو ''یتلو'' کی تعبیر زیادہ مناسب ہوتی۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت واتباع اور حدیث کی حجیت اور اہمیت کا ثبوت ملتا ہے:

"يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ" [الأعراف:157]

(وہ نبی انہیں نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور انہیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں جائز بتاتا ہے اور ان پر گندی چیزیں حرام رکھتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے، اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے)

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی پانچ ذمہ داریاں بتائی گئی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بہ مقابلہ قرآن مجید احادیث میں ان امور کی بابت زیادہ تفصیلات دستیاب ہیں، بعض محققین کے مطابق کم وبیش پانچ ہزار احادیث ان ہی سے متعلق ملتی ہیں، یہ خود اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور روزمرہ کے اعمال وحی پر مبنی ہیں۔

احادیث سے ثابت شدہ احکام کے وحی ہونے پر خود قرآن مجید کی شہادتیں موجود ہیں، مثال کے طور پر مدنی زندگی میں قبلہ سے پہلے سولہ سترہ ماہ آپ ﷺ کا رخ بیت المقدس کی طرف رہا، پھر قرآن نے اس رخ کو منسوخ کر کے بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا، اور یہ آیت نازل ہوئی:

"وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ"
[البقرہ:142]

(جس قبلہ پر آپ تھے اسے تو ہم نے اس لئے رکھا تا کہ ہم پہچان لیں رسول کی اتباع کرنے والوں کو، الٹے پاؤں واپس جانے والوں سے)

یہاں اللہ تعالیٰ نے قبلہ اول کے حکم کی نسبت خود اپنی طرف فرمائی ہے، حالاں کہ قرآن میں کہیں بھی بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم موجود نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم "وحی غیر متلو" کی صورت میں نازل ہوا تھا۔

7.6.2 حجیت حدیث اور سنت نبوی ﷺ

اللہ تعالیٰ نے بہ زبان رسالت بھی احادیث کی ضرورت واہمیت کو واضح کر دیا ہے، اور واقعہ یہ ہے احادیث میں ایک بڑا حصہ وہ ہے جو اس مضمون سے متعلق ہے، بعض محدثین وعلماء نے خاص اسی موضوع پر بڑی تفصیل کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، اور بہت سی ایسی روایات کو یکجا کر دیا ہے، چنانچہ امام ابن ماجہ کا مقدمہ سنن خود اسی موضوع پر ہے، اس سلسلہ کی چند روایات حسب ذیل ہیں:

- أن رسول الله ﷺ قال: ألا انى أوتيت الكتاب ومثله معه، ألا يوشك رجل شبعان على أريكته يقول: عليكم بهذاالقرآن، فماوجدتم فيه من حلال فاحلوه، وما وجدتم فيه من حرام فحرموه، وإن ماحرم رسول الله كما حرم الله" (سنن ابن ماجه، حدیث نمبر:12، نیز دیکھئے: سنن ترمذی، حدیث نمبر:2663)

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سن لو کہ مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اسی کے مثل دوسری چیز بھی عطا کی گئی ہے، سن لو کہ بہت جلد ایسا ہو گا کہ ایک شخص شکم سیر، مسند نشین ہو کر کہے گا کہ: تم صرف قرآن کو مضبوطی سے پکڑ لو، اس میں تم جو چیز حلال پاؤ صرف اس کو حلال سمجھو اور جو چیز اس میں حرام پاؤ صرف اسے حرام سمجھو، حالاں کہ جن چیزوں کو رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے، وہ ایسے ہی ہیں جیسے کہ اللہ نے انہیں حرام قرار دیا ہو)۔

اس حدیث سے درج ذیل باتیں سمجھ میں آتی ہیں:

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت دراصل خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، جس طرح آپ ﷺ پر قرآن مجید نازل کیا گیا ہے، اسی طرح دوسری چیزیں یعنی احادیث بھی وحی کی گئی ہیں۔

حجیت حدیث کا انکار ایک فتنہ ہے، جس کی سنگینی کے تئیں رسول اللہ ﷺ نے امت کو پیشگی خبردار کر دیا تھا۔

- سنن ترمذی اور ابوداؤد میں ''انھا مثل القرآن واکثر'' کی تعبیر ہے، یعنی آپ ﷺ کے احکامات قرآن کے مثل یا اس سے زیادہ ہیں، اس سے حدیث کی حجیت نہایت واضح ہو جاتی ہے۔
- قال رسول الله ﷺ: ترکت فیکم أمرین، لن تضلوا ما تمسکتم بهما: کتاب الله وسنة نبیه، (مستدرک حاکم، حدیث نمبر:171/1,318)

  (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں: جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے، اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت (حاکم نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے)
- صحابی رسول عبداللہ بن عمرو ذکر کرتے ہیں کہ وہ جو بھی رسول اللہ ﷺ سے سنتے تھے، یاد کرنے کی غرض سے لکھ لیا کرتے تھے، مگر قریش نے مجھے اس سے منع کیا، اور کہا: کہ تم ہر چیز جو رسول اللہ ﷺ سے سنتے ہو لکھ لیتے ہو، حالاں کہ رسول اللہ ﷺ بھی ایک انسان ہیں جو ناراضگی اور خوشی کی حالت میں بات کرتے ہیں؛ چنانچہ میں لکھنے سے رک گیا اور اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

  ''اکتب فوالذی نفسی بیده ماخرج منه (وأشار بیده إلی فمه) إلا حق'' (سنن ابی داود ،حدیث نمبر:3646، مستدرک حاکم حدیث نمبر:953]

  (تم لکھ لیا کرو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اس سے (آپ ﷺ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) ہمیشہ حق بات ہی نکلتی ہے)۔
- جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ خطبہ دیا اور فرمایا:

  ''فان خیر الحدیث کتاب الله تعالیٰ وخیر الهدی هدی محمد ﷺ، وشر الأمور محدثاتها، وکل محدثة بدعة وکل بدعة ضلاله'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر:867)

  (بہترین کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بہترین طریقہ حضرت محمد ﷺ کا طریقہ ہے، سب سے برے وہ نئے کام ہیں جو دین میں ایجاد کیے گئے ہوں اور دین میں ہر نئی پیدا کی ہوئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے)۔

7.6.3 حدیث دین وشریعت کی ناگریز ضرورت

قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے، اور اس میں دنیا وآخرت سے متعلق اصولی ہدایات ذکر کی گئی ہیں، اس طرح دین کے بہت سے احکام اجمالی طور پر ذکر کردیے گئے ہیں، مگر ان کی تفصیل وتشریح کی ذمہ داری رسول خدا ﷺ کو سونپی گئی ہے، اللہ تعالیٰ فرمایا:

''اور ہم نے آپ پر یہ نصیحت نامہ اتارا ہے، تاکہ آپ لوگوں پر (ان مضامین کو اپنی تشریح وتوضیح کے ساتھ) ظاہر کردیں جو کچھ ان کے پاس بھیجا گیا ہے'' [النحل:44]

اور حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ تفصیلات کے بغیر دین کے ایک رکن کو بھی انجام دینا دشوار ہوگا؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے کم وبیش اسّی مقامات پر نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے، مگر نمار کا آغاز کہاں سے اور کیسے ہوگا؟ اس کے اجزاء ترکیبی کیا ہیں؟ اس کی ہیئت کیا ہے؟ بعض وہ ارکان نماز جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے، مگر ان کی ترتیب کیا ہوگی؟ ان امور سے متعلق ہدایات قرآن مجید میں دستیاب نہیں ہیں۔

اسی طرح زکات کی فرضیت قرآن نے ذکر کی ہے۔[البقرہ:43]، مگر زکات کی اہمیت کیا ہے؟ کن لوگوں پر فرض ہے؟ کس حال میں فرض ہے؟ اس کی مقدار کیا ہے؟ کن چیزوں میں فرض ہے؟ اور اس کی فرضیت کی کیا شرط ہے؟ ان کے بابت قرآن خاموش نظر آتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے چوری کی سزا کے طور پر ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے۔[المائدہ:38] مگر ہاتھ مونڈھے سے کاٹا جائے گا یا کہنی یا پہنچے کے جوڑ سے؟ کتنے مال کی چوری پر یہ سزا نافذ کی جائے گی؟ کون اس سزا کو نافذ کرے گا؟ یہ اور اس جیسے بہت سے سوالات میں جن کا جواب قرآن میں دستیاب نہیں۔

غرض یہ کہ قرآن مجید میں اس جیسی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ان میں رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ تفصیلات کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، کیوں کہ حدیث ہی کے ذریعہ ان احکام کی روح اور ان کی مجسم تصویر اور عملی شکل معلوم ہوتی ہے، ورنہ وہ قرآنی احکام نا قابل عمل بن کر رہ جائیں گے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن کے احکام پر عمل کرنے کے لئے حدیث کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے، اسی لئے امام اوزاعیؒ نے بہت صحیح کہا ہے کہ: ''سنت کو جتنی ضرورت کتاب اللہ کی ہے، کتاب اللہ کو اس سے زیادہ سنت کی ضرورت ہے''۔

ممتاز محقق علامہ سید سلیمان ندوی نے قرآن وحدیث کے باہم رشتے کو بڑے خوبصورت اور تمثیلی اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی، یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء وجوارح تک خون پہنچا کر ہر آن ان کے لئے تازہ زندگی کا سامان بہم پہنچاتی ہے''۔ (تدوین حدیث، از مناظر احسن گیلانی)

7.6.4 اجماع امت

کتاب اللہ کے بعد سنت کے حجت اور دلیل شرعی ہونے پر تمام امت کا اتفاق اور اجماع ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ اور دیگر محققین نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے، خود ائمہ اربعہ اور دیگر علماء اسلام سے اس بات کی صراحت ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کے قول کی اتباع کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

7.7 اصول حدیث

رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو روز قیامت تک محفوظ رکھنے کے لئے مختلف فنون وجود میں لائے گئے، اور اس دقت وباریک بینی کے ساتھ اصول وقواعد وضع کئے گئے کہ پوری انسانی تاریخ اور دیگر مذاہب اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔

تمام علوم حدیث کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (1) علم روایۃ الحدیث (2) علم درایۃ الحدیث، ان میں سے پہلا فن آپ ﷺ کے اقوال وافعال اور احوال کو نقل کرتا ہے اور ان سے بحث کرتا ہے، اور دوسرے فن کی دو جہتیں ہیں:

الف: علم اصول حدیث۔

ب: علم فقہ الحدیث، ''اصول حدیث'' وہ علم ہے؛ جس میں روایت کی سند سے بحث کی جاتی ہے کہ وہ صحیح ہے یا ضعیف، خبر واحد ہے یا متواتر، متصل ہے یا منقطع، اسی طرح راویوں کے حالات کہ وہ ثقہ ہیں یا مجروح، اسے فن مصطلح الحدیث سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور ''علم فقہ الحدیث'' وہ علم ہے جس میں احادیث سے مستنبط احکام اور استنباط کا طریقہ کار ذکر کیا جاتا ہے۔

7.7.1 تدوین اصول حدیث (پہلی اور دوسری صدی ہجری)

فن اصول حدیث کے اصول وقواعد بھی دیگر فنون کی طرح گاہ گاہ جمع ہوتے رہے، اور ایک مدت کے بعد اسے مستقل فن کا درجہ حاصل ہو گیا، روایات کو پرکھنے اور ان کو قبول ورد کرنے کے ضمن میں بہت سے صحابہ کرام اور تابعین کے طرز عمل سے ہی دراصل اس فن کا آغاز ہوتا ہے، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے قبول خبر میں احتیاط سے کام لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روایت میں جانچ پڑتال کا طریقہ وضع کیا، اور جب انہیں شک ہوتا تو خبر واحد کو قبول کرنے میں توقف کرتے، روایات کو قبول کرنے کے لئے گواہی بھی طلب کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت قبول کرنے میں چھان پھٹک سے کام لیتے؛ بلکہ بسا اوقات روایت کرنے والے سے حلف کا مطالبہ کرتے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کو قرآن پر رکھ کر دیکھتیں، اگر اس سے ہم آہنگی پائی جاتی تو قبول کرتیں، ورنہ رد کر دیا کرتیں، چوں کہ صحابہ کا دور بہت سے فتنوں، اخلاقی گراوٹ اور فریب کاری وغیرہ سے پاک تھا، نیز صحابہ خود روایت حدیث میں حددرجہ احتیاط برتا کرتے تھے، اسی طرح تمام صحابہ عدول اور تابعین محترم تھے، اس لئے جرح وتعدیل کے اصول وقواعد باضابطہ وضع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی؛ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے سانحہ سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اہل بدعت اور فتنہ گروں نے احادیث گڑھنا شروع کر دیا، تو اہل علم کو خطرہ کا احساس ہوا اس طرح حدیث کے سلسلہ میں اسناد اور راویوں کے حال پر خوب توجہ دی جانے لگی، اسی دور میں یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ ''إنما هذه الأحاديث دين، فانظروا عمن تأخذون دينكم'' (بلاشبہ یہ احادیث دین ہی تو ہیں، سو تمہیں ضرور جاننا چاہیے کہ تم کس سے اخذ کر رہے ہو) چنانچہ صحابہ میں سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے رجال کے بارے میں اظہار خیال کیا، اور تابعین میں سے سعید ابن المسیب، عامر الشعبی اور ابن سیرین نے رجال کی تحقیق کے اس انداز کو آگے بڑھایا۔ دوسری صدی ہجری میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے خدمت حدیث کی ذمہ داری اپنے سر لی، اور تدوین حدیث پر خصوصی توجہ دی، چنانچہ امام محمد بن شہاب الزہری (متوفی: 125ھ) کو احادیث کی جمع وتنقیح پر مامور کیا گیا، تو انہوں نے بہت سے اصول وقواعد وضع کئے، اسی وجہ سے بعض علماء نے انہیں علم اصول حدیث کا موجد قرار دیا ہے، اسی طرح امام شافعیؒ (متوفی: 204ھ) نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں متعدد اہم اصول وقواعد ذکر کئے ہیں۔

7.7.2 تدوین اصول حدیث۔ تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد

تیسری صدی ہجری تدوین علوم کے لئے سنہری دور کہلاتی ہے، اس دور میں علوم حدیث کی مختلف قسمیں مستقل طور پر وجود پذیر ہوئیں، اور حدیث وخبر کے قبول ورد کے جن قواعد کا آغاز صحابہ کے دور میں ہوا تھا، وہ اس عہد تک پہنچتے پہنچتے مرتب اصول وضوابط کی صورت اختیار کر گئے۔

گویا کہ تیسری صدی ہجری میں علماء اسلام نے فن اصول حدیث کی تدوین اور اس کے مباحث پر تحریری کام شروع کیا۔

چنانچہ امام علی بن مدینی (متوفی: 234ھ) نے سب سے پہلے اس فن پر تصنیفی کام کیا، مگر ان کی یہ کتاب دستیاب نہیں ہے۔

اسی عہد سے امام بخاری (متوفی: 256ھ) کا بھی تعلق ہے، آپ نے روایت حدیث کے مختلف صیغے اور زیادت ثقہ، متابعات جیسے فنی مباحث پر گفتگو کی ہے۔

امام مسلم (متوفی: 261ھ) نے صحیح مسلم کا مقدمہ تحریر فرمایا جو فن اصول حدیث کا متن ہے، آپ نے روایت حدیث کے آداب، جرح وغیبت میں فرق، سند کی اہمیت وضرورت، رُوات حدیث کے طبقات جیسے موضوعات پر فاضلانہ گفتگو کی، امام ترمذیؒ (متوفی: 279ھ) نے جامع ترمذی کے دیباچہ ''العلل الصغیر'' میں روایت بالمعنی، جرح وتعدیل، محدثین کے مراتب، ضعیف روایت کی قبول کی شرطیں وغیرہ جیسے مسائل سے بحث کیا ہے، اسی طرح امام ابوداؤد (متوفی: 275ھ) نے اپنے کتابچہ ''رسالہ الی اہل مکۃ'' میں بہت سے اصول وقواعد کو بیان کیا ہے۔

اس فن میں جس شخص کو اولین مرتب کا شرف حاصل ہوا وہ چوتھی صدی ہجری کے مصنف قاضی ابومحمد الرامہرمزی (متوفی: 365ھ) ہیں، انہوں نے ''المحدث الفاصل بین الراوی والواعی'' کے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی، اس کتاب میں مصطلحات اور آداب روایت حدیث کو ذکر کیا، مگر یہ مباحث باہم ضم تھے۔

ان کے بعد حاکم نیساپوری (متوفی: 405ھ) نے ''معرفۃ علوم الحدیث'' کے نام سے ایک کتاب تحریر فرمائی، حدیث کی انواع واقسام کو بڑے اہتمام سے ذکر کیا، ابتدائی مدونین کی تفصیلات جمع کر دیں، اس موضوع کی سابقہ کتابوں سے بھی استفادہ کیا، ان کے بعد خطیب بغدادی (متوفی: 463ھ) کا زمانہ آیا، انہوں نے دوعمدہ کتابیں تصنیف کیں'' الکفایۃ فی معرفۃ علم الروایۃ ''اور''الجامع لا خلاق الراوی وآداب السامع ''یہ دونوں طبع ہوچکی ہیں، اس کے بعد قاضی عیاض مالکی (متوفی: 544ھ) کا دور آتا ہے، انہوں نے''الالماع إلی معرفۃ أصول الروایۃ وتقیید السماع ''کے نام سے ایک گراں قدر کتاب تحریر کی، یہ بھی چھپ چکی ہے، البتہ یہ کتاب رامہرمزی کی المحدث الفاصل سے بہت ملتی جلتی ہے۔

امام ابوعمرو عثمان بن الصلاح (متوفی: 643ھ) نے اس جہت میں نمایاں کامیابی حاصل کی، اور 'معرفۃ علوم الحدیث' کے نام سے ایک شہرہ آفاق کتاب تحریر کی، جو مقدمہ ابن صلاح کے نام سے بھی جانی جاتی ہے، مؤلف نے اس میں علوم حدیث کے بعض انواع واقسام کا اضافہ کیا، اور آپ سے پیش تر مؤلفین کی کتابوں میں جو مباحث بکھرے ہوئے تھے انہیں بھی یکجا کر دیا۔

گویا کہ اصول حدیث کے معمار اول امام علی بن مدینی ہیں، اور ان کے بعد یہ فن مسلسل نشو ونما پاتا رہا، یہاں تک کہ ابن صلاح کا دور آیا، آپ نے اسے ارتقاء کی بلندی تک پہنچا دیا، یہی وجہ ہے کہ کم وبیش دو درجن کتابیں ایسی ہیں جو مقدمہ ابن صلاح کے زیر اثر لکھی گئی ہیں، جن میں بعض شرح ہیں، بعض مختصر، بعض منظوم اور خود اصول حدیث پر لکھی گئی معروف کتابوں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔

7.8 تعداد حدیث

رسول اللہ ﷺ سے نقل کی گئی روایات اور احادیث مختلف کتابوں میں جمع کر دی گئی ہیں، اور اپنے حجم کے لحاظ سے یہ کتابیں مختصر بھی ہیں، اور ضخیم بھی، مگر متعینہ طور پر تمام احادیث کی تعداد جاننا نہایت مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی تمام احادیث کو اکھٹا کرنے کا دعوی کسی کے لئے بھی درست نہیں ہے بعض، معاصر علماء نے اگر چہ کوشش شروع کی ہے کہ کوئی ایسا ذخیرۂ احادیث مرتب کیا جائے، جس میں آپ ﷺ کی طرف منسوب تمام مستند روایات یکجا کر دی جائیں، مگر ابھی تک ایسی کوئی کامیاب کوشش منظر عام پر نہیں آسکی ہے۔

محدثین سے احادیث کی مختلف تعداد نقل کی گئی ہے؛ چنانچہ امام احمد فرماتے تھے کہ انہیں سات لاکھ احادیث زبانی یاد ہیں، ایک اور جلیل القدر محدث امام ابوزرعہ نے بھی اپنی یاد کردہ احادیث کی تعداد اتنی ہی بتائی ہے، امام بخاری نے اپنے تئیں بتایا ہے کہ انہیں ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ ضعیف روایات زبانی یاد ہیں، امام مسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے تین لاکھ احادیث سے انتخاب کر کے اپنی کتاب ''صحیح مسلم'' مرتب کی ہے، اسی طرح اسحاق بن راہویہ نے اپنی یادداشت سے ستر ہزار احادیث املا کرایا تھا، کہا جاتا ہے کہ امام ابوداؤد کو پچاس ہزار روایتیں زبان زد تھیں۔

اسی طرح نویں صدی ہجری کے معروف محدث علامہ سیوطیؒ کے متعلق نقل کیا جاتا ہے کہ انہیں دو لاکھ سے زائد روایتیں یاد تھیں، نیز اور روایات اگر ان کے ہاتھ لگتیں تو وہ انہیں بھی یاد کر لیتے۔ دوسری جانب جب ہم حدیث کی کتابوں پر نظر ڈالتے ہیں تو بمقابلہ ان اعداد وشمار کے یہ ذخیرہ ناقص محسوس ہوتا ہے، ذیل میں چند مشہور کتب حدیث میں درج شدہ احادیث کی تعداد ذکر کی جارہی ہے:

کتب تسعہ: یعنی حدیث کی وہ نو مشہور کتابیں، جو تمام کتب حدیث میں خاص سمجھی جاتی ہیں اور جن سے بہ کثرت فائدہ اٹھایا جاتا ہے صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، سنن دارمی اور مسند احمد بن حنبل، ان میں درج شدہ احادیث کی تعداد: 62,937 ہے، جب کہ یہ تعداد بار بار ذکر کی گئی روایات کو بھی شامل ہے، اور اگر ان مکرر روایات کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو، 16290 روایتیں باقی رہ جاتی ہیں۔

اسی طرح حدیث کی ایک اور اہم کتاب صحیح ابن خزیمہ ہے، اس میں موجود روایات کی تعداد 3079 ہے، ظاہر ہے اس کتاب کی بہت سی روایتیں اوپر ذکر کردہ کتابوں میں بھی موجود ہیں، البتہ اس کتاب کی وہ روایات جو پچھلی نو کتابوں میں نہیں پائی جاتی ہیں؛ ان کی تعداد 296 ہے۔

اسی طرح صحیح ابن حبان کی روایات 7491 ہیں، مگر ایسی روایتیں جو کتب تسعہ میں نہیں ملتی ہیں ان کی تعداد 531 ہے، گویا کہ حدیث کی ان گیارہ مشہور اور اہل علم کے درمیان رائج کتابوں کی روایتیں، مکرّرات کو حذف کئے جانے کے بعد 17117 ہیں، ان کے علاوہ بھی احادیث کی بہت ضخیم کتابیں مدوّن کی گئی ہیں، جیسے مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، سنن الکبری للبیہقی، مسند بقی بن مخلد، اور جامع السنن والمسانید لابن کثیر وغیرہ۔

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ابتدائی دور میں محدثین کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ''حدیث'' کو اس کے وسیع ترمعنی میں استعمال کیا کرتے تھے، یعنی اس سے جہاں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب باتوں کو مراد لیتے وہیں صحابہ اور تابعین کے اقوال وفتاوی بھی مراد لئے جاتے تھے، اسی طرح ایک ہی روایت اگر دو یا اس سے زیادہ صحابہ سے مروی ہوتو اسے مختلف حدیث شمار کرتے، گویا کہ ائمہ حدیث سے جو سات لاکھ یا اس طرح کے اعداد نقل کئے گئے ہیں، ان میں مسند روایتیں بھی ہیں اور صحابہ وتابعین کے اقوال وفتاوی بھی، اسی طرح مکرر روایات بھی ہیں۔

محض رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب صحیح روایات کی تعداد کے بارے میں محدثین کے مختلف اندازے ہیں، امام سفیان ثوریؒ اور احمد بن حنبل وغیرہ کا رجحان ہے کہ یہ 4,400 ہیں، معروف محدث اسحاق بن راہویہ کے مطابق ان کی تعداد سات ہزار سے کچھ زائد ہے۔

7.9 مضامین حدیث

حدیث ایک کشادہ اور وسیع فن ہے، اور خود اس سے کئی فن وجود میں آئے ہیں، اگر حدیث کی تمام شاخوں کو سامنے رکھ کر ان کا مقصد دیکھا جائے تو وہ محض دو چیزیں ہیں:

تأسّی وتشریع: تأسّی سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو اپنے لئے اسوہ ونمونہ بنالیا جائے، اور آپ ﷺ کی تعلیمات کو نشان راہ، اور تشریع کا مطلب یہ ہے کہ دستور وقانون سازی میں احادیث کو بنیادی سرچشمہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے، گویا کہ اسلامی آئین ودستور کے بنیادی طور پر دو ہی سرچشمے ہیں، قرآن اور احادیث۔

اوپر ذکر کئے گئے مقاصد کو پیش نظر رکھنے سے اس بات کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے کہ احادیث کا دائرہ بہت کشادہ ہے اور اس میں عملی وعلمی زندگی کے ہر گوشہ کے لئے راہنمائی کا سامان مہیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اجمالی طور پر ان موضوعات کی نشاندہی یوں فرمائی ہے: ''ایمان کی ستر سے کچھ زائد یا ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جن میں سب سے افضل توحید، یعنی لا إلـٰه إلا اللّٰـه کا اقرار ہے، اور جس کا ادنیٰ درجہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے، اور حیاء ایمان کی ایک شاخ ہے''۔

علامہ حافظ ابن حجرؒ نے ان تمام ابواب دین کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ: یہ تمام شاخیں بنیادی طور پر دل، زبان اور بدن کے اعمال سے متعلق ہیں، چنانچہ ''اعمال قلب'' میں ایمان وعقیدہ اور نیت وغیرہ شامل ہے، اس کے تحت احادیث میں 22 خصلتیں ذکر کی گئی ہیں۔ زبان کے اعمال میں سات خصلتیں ہیں، جیسے زبان سے توحید کا اقرار، تلاوت قرآن مجید، نیکی کی تبلیغ اور ذکر واستغفار وغیرہ، اور بدن کے اعمال مجموعی طور پر 38 خصلتوں پر مشتمل ہیں، جو انفرادی، خاندانی، اجتماعی اور سیاسی دائرے تک

وسیع ہیں، اس طرح ایمان کی یہ کل 69 شاخیں ہوئیں، ضمنی حیثیت سے جو خصلتیں ذکر کی گئی ہیں، ان میں سے بعض کو دو بھی شمار کیا جا سکتا ہے، گویا کہ اس طرح یہ 69 یا 79 شاخیں ہو جاتی ہیں، واضح رہے کہ احادیث میں یہ دونوں تعداد ذکر کی گئی ہیں۔

علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں ان ہی شاخوں کو یکجا کر کے تالیف کیا ہے۔

کتب حدیث کی ایک قسم ''جامع'' کہلاتی ہے، اور اس سے مراد وہ کتابیں ہوتی ہیں جن میں تمام ابواب دین سے متعلق احادیث جمع کر دی گئی ہوں، جیسے کہ جامع صحیح بخاری، جامع صحیح مسلم، اور جامع ترمذی وغیرہ، ان کتابوں کے مؤلفین نے احادیث کو آٹھ اساسی مضامین پر تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

عقائد — عقائد و ایمانیات سے متعلق احادیث کا مجموعہ۔

احکام — عملی زندگی سے متعلق فقہی احکام و مسائل۔

سِیَر — آں حضور ﷺ کی سیرت اور غزوات سے متعلق تفصیلات پر مشتمل ہے۔

آداب — معاشرتی زندگی سے متعلق اخلاق و آداب کا ذکر ہے۔

تفسیر — قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے متعلق جو تفسیر آپ ﷺ نے کی ہے، ان کا ذکر۔

مناقب — افراد و قبائلی اور بعض علاقوں کے فضائل۔

فتن — مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی پیشن گوئی۔

اشراط — قیامت کی آمد سے قبل رونما ہونے والی علامات۔

گویا کہ ان کتابوں سے بھی احادیث کے مضامین کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، اور ان پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ احادیث دین کا وہ اہم ترین سرچشمہ ہے جو کہ تمام شعبہائے حیات پر مشتمل ہے۔

قرآن مجید کے بعد حدیث رسول اللہ ﷺ شریعت کا دوسرا اہم ترین سرچشمہ ہے، اور ان سے رہتی دنیا تک انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی وابستہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ذخیرۂ احادیث میں زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق تعلیمات ملتی ہیں، حدیث کے مضامین پر مختلف انداز سے اہل علم نے روشنی ڈالی ہے، بعض حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کہ: ایمان کی ستر سے زائد شاخیں ہیں (صحیح مسلم، حدیث نمبر: 58) کو بنیاد بنایا ہے، اور تمام ذخیرۂ احادیث کو ان شاخوں پر تقسیم کر دیا ہے، امام بیہقی کی کتاب ''شعب الایمان'' اس سلسلہ میں بہت شہرت رکھتی ہے، اسی طرح ابو عبداللہ الحلیمی کی ''کتاب المنہاج'' بھی قابل ذکر ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے ایمان کے ان تمام شعبوں کو تین مرکزی عنوانات کے تحت جمع کر دیا ہے، دل، زبان اور بدن کے اعمال۔ اسی طرح بعض اہل علم نے مضامین حدیث کو حسب ذیل جلی عنوانات کے تحت جمع کیا ہے:

ایمان: — ایمان کی اہمیت و ضرورت، ارکان ایمان، ایمان کی شاخیں، وہ چیزیں جن سے ایمان جاتا رہتا ہے وغیرہ۔

علم: — علم و علماء کی فضیلت، علماء کی ذمہ داری اور ادب علم وغیرہ۔

پچھلی امتوں کا ذکر: — انسانیت کا آغاز، انبیاء کرام اور ان کے قصص و واقعات وغیرہ

رسول اللہ ﷺ کی سیرت: بعثت وہجرت کی تفصیلات، آپ ﷺ کے اخلاق واوصاف، معجزات، نیز آپ کی نجی زندگی سے متعلق معلومات، اولاد و ازواج مطہرات کا ذکر۔

قرآنی وحی: وحی کی کیفیت، قرآن مجید کی فضیلت، تفسیر اوراس کے حقوق وغیرہ۔

عبادات: مختلف عبادتیں اوران سے متعلق احکام ومسائل وغیرہ کا ذکر۔

عائلی قوانین: نکاح وطلاق، ظہار، میراث، اوردیگر عائلی قوانین کی تفصیلات اور حدود وتعزیرات کا بیان۔

مالی معاملات: خرید وفروخت، شرکت وتجارت، رباء اور دیگر مالی معاملات سے متعلق ہدایات۔

تدبیریں: سیاسی امور، عدالتی نظام اور بین ملکی وقومی تعلقات وغیرہ۔

اخلاق وآداب: فرد وسماج کے تئیں حقوق وواجبات، تہذیب واخلاق وغیرہ۔

جہاد ودعوت: جہاد کی فضیلت وضرورت، دعوت دین کا اسلوب، شاہان عالم کے نام دعوتی خطوط۔

معاشرتی اخلاق: لباس وپوشاک اور زیب وزینت سے متعلق فرمودات وغیرہ۔

7.10 خلاصہ

''حدیث'' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی بات چیت یا جدید کے ہیں، محدثین کی اصطلاح میں رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل اور تقریر کو حدیث کہتے ہیں، حدیث کے ہم معنی اور بھی مترادف اصطلاحات ہیں، جیسے: سنت، خبر اور اثر۔ حدیث اسلامی شریعت کا قرآن مجید کے بعد دوسرا اہم ترین سرچشمہ ہے، اسے نظر انداز کر کے دین وشریعت سے آگہی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالی نے بذات خود حدیث وسنت کی حجیت اور ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے، اور بزبان رسالت بھی اس کی وضاحت کی گئی۔

حدیث دین وشریعت کی ناگزیر ضرورت ہے، اس کے بغیر خود قرآن مجید کو سمجھنا اوراس میں بیان کردہ احکام پرعمل کرنا ناممکن ہے۔

حدیث کی خدمت کے لئے محدثین نے مختلف فنون کو وجود بخشا، ان میں فن اصول حدیث نمایاں حیثیت کا حامل ہے، اس کی بھی کئی شاخیں ہیں، اصول حدیث کا آغاز بھی صحابہ ہی کے عہد میں ہو چکا تھا؛ مگر اس کا باضابطہ آغاز تیسری صدی ہجری میں امام علی بن مدینی کے ہاتھوں ہوا، انہوں نے مستقل ایک کتاب تالیف کی، مگر وہ اب دستیاب نہیں ہے، اصول حدیث پر اس کے بعد جو اہم کتابیں تالیف کی گئیں وہ اس طرح ہیں:

قاضی ابو محمد رامہرمزی کی ''المحدث الفاصل''، حاکم نیساپوری کی ''معرفۃ علوم الحدیث''، خطیب بغدادی کی ''الکفایۃ'' اور ''الجامع لأخلاق الراوی'' اور ابن صلاح کی ''معرفۃ علوم الحدیث'' وغیرہ۔

احادیث کی تعداد کے حوالہ سے محدثین کے کئی اقوال ہیں، مگر تحدید کے ساتھ کوئی بات کہنا مشکل ہے، حدیث کی نومشہور کتابیں یہ ہیں: صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مؤطا امام مالک، مسند احمد بن حنبل اور سنن دارمی، بعض معاصرین کے اعداد وشمار کے مطابق ان میں مجموعی طور پر 62937 حدیثیں ہیں، اوران سے مکررات کو حذف کر دیا

جائے تو 16290 روایتیں باقی رہ جاتی ہیں، اسی طرح صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کو بھی شامل کرلیا جائے تو تکرار کو ختم کرنے کے بعد ان گیارہ کتابوں کی کل احادیث 17117 ہوتی ہیں۔

حدیث کے مضامین بہت پھیلے ہوتے ہیں؛ بلکہ تمام شعبہائے حیات کا احاطہ کرتے ہیں بعض کتابیں اس طرز پر لکھی گئی ہیں کہ دین کے تمام ابواب کو شامل کرلیا جائے، انہی ''جوامع'' کہتے ہیں، جیسے جامع صحیح بخاری ومسلم وغیرہ، ان مؤلفین نے اوپر ذکر کئے گئے جلی عنوانات کے تحت احادیث جمع کی ہیں۔

7.11 نمونے کے امتحانی سوالات

1. حدیث کے لغوی واصطلاحی معنی ومفہوم پر روشنی ڈالئے۔
2. حدیث وخبر کے فرق کو واضح کیجئے۔
3. حدیث کی حجیت اور شرعی ضرورت پر روشنی ڈالئے۔
4. فن اصول حدیث کا نشو ونما کب ہوا؟ نیز اس فن کی دو کتابوں کا ذکر مؤلف کے نام کے ساتھ کیجئے۔
5. مضامین حدیث پر گفتگو کیجئے۔

7.12 مطالعہ کی معاون کتابیں

1. تاریخ حدیث ومحدثین — محمد محمد ابوزہو — ترجمہ: غلام احمد حریری
2. حجیت سنت — عبدالغنی عبدالخالق — ترجمہ: محمد رضی الاسلام ندوی
3. موسوعۃ علوم الحدیث الشریف — ترتیب: وزارۃ الاوقاف مصر
4. آسان اصول حدیث — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
5. تاریخ تدوین حدیث — مولانا عبدالرشید نعمانی

اکائی 8 : تدوین حدیث

اکائی کے اجزاء

8.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو تدوین حدیث اور مختلف ادوار میں کتابتِ حدیث پر کی گئی تحریری کاوشوں سے آگاہ کرنا ہے، نیز وضع حدیث کے اسباب اور فن حدیث کی بعض شاخوں، جیسے: اسماء الرجال اور اصول جرح وتعدیل سے واقف کرانا ہے۔

8.2 تمہید

حدیث اسلامی شریعت کا دوسرا اہم ترین سرچشمہ ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر بعض فتنہ پردازوں نے اس ذخیرہ کو مشتبہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بے بنیاد دعوی کیا ہے کہ ذخیرۂ احادیث غیر مستند روایات اور گھڑی ہوئی باتوں پر مشتمل ہے، اسی لئے وہ نا قابلِ اعتبار ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعد دنیا میں اس سے زیادہ محفوظ اور معتبر کوئی مجموعہ نہیں، محدثین کرام نے روزِ اول ہی سے ایسے اصول وقواعد مدون کئے کہ آپ ﷺ کی طرف من گھڑت باتوں کو منسوب کیا جانا ناممکن ہوگیا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ عہدِ رسالت ہی سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ حدیثوں کو زبانی یاد کرنے کے ساتھ ساتھ تحریری صورت میں بھی محفوظ کرلیا جائے۔

8.3 کتابتِ حدیث

عرب کی قوم رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ہزاروں برس پہلے سے اپنا کام تحریر وکتابت کے بجائے حافظہ سے چلانے کی خوگر تھی، وہ پشت ہا پشت سے اپنے نسب نامے، جنگی کارنامے، خطبے، لمبے لمبے قصیدے زبانی یاد رکھتے تھے اور انہیں اس پر فخر بھی تھا، ان کی یہ عادت اسلام کے بعد بھی تقریباً ایک صدی تک جاری رہی۔ تاہم اسلام کی آمد کے بعد نزول قرآن کا جب سلسلہ شروع ہوا تو آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جس وقت کوئی آیت اترتی اسی وقت لوگوں کو یاد کرادیتے اور کسی کاتب کو بلا کر لکھوادیتے، اس کی دو بنیادی وجہ تھی، ایک تو یہ کہ قرآن مجید تمام تر معجزہ ہے، اس کا لفظ لفظ وحی الٰہی ہے؛ اس لئے الفاظ وتعبیر میں ردوبدل کی سرے سے گنجائش نہ تھی، نیز اس کی تلاوت کرنے اور فرائض ونوافل میں اسے پڑھنے کا بھی حکم تھا، دوسرے یہ کہ پچھلی آسمانی کتابوں کا جو حشر ہوا تھا وہ بھی پیش نظر تھا، اس لئے حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ کتابتِ قرآن کا بھی اہتمام کیا گیا۔

آغازِ اسلام میں حدیثیں نہیں لکھی جاتی تھیں؛ بلکہ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے صاف طور پر اس سے منع کردیا تھا:

> ''مجھ سے کچھ نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھ لیا ہے تو اسے مٹادے؛ البتہ مجھ سے حدیثیں بیان کرو اس میں کچھ حرج نہیں اور جس نے میرے متعلق قصداً جھوٹ کہا اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں تلاش لے'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: 3004)

واضح ہو کہ محدثین کے نزدیک اس قول کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف درست نہیں ہے؛ بلکہ یہ ابوسعید خدری کا کلام ہے، اور اگر اسے صحیح تسلیم کربھی لیا جائے تو اس حکم کا تعلق ابتداء اسلام سے ہوگا؛ کیوں کہ بعد میں خود رسول اللہ ﷺ نے اجازت بھی دی اور اس کا اہتمام بھی فرمایا، اس ممانعت کی حسب ذیل وجوہات ہوسکتی ہیں:

حدیث کا معاملہ کسی قدر قرآن سے مختلف تھا؛ کیوں کہ حدیث معجزہ نہ تھی، اس کے الفاظ کے بجائے معنی ومفہوم آپ ﷺ کے قلب پر وارد ہوتے اور آپ ﷺ انہیں اپنے الفاظ میں ڈھال کر پیش کر دیتے، اور بسا اوقات ایک ہی بات کو مخاطب کی رعایت کرتے ہوئے مختلف اسلوب میں بیان فرماتے، اسی وجہ سے احادیث کی باضابطہ تلاوت کا حکم نہیں دیا گیا؛ البتہ صحابہ حدیثیں زبانی یاد کر لیا کرتے تھے، اور اپنی عملی زندگی کو اس کی روشنی میں ڈھالتے بھی تھے، گویا صحابہ کی جماعت احادیث کی امین کی تھی اور آئینہ دار بھی۔ اسی طرح یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا ایک بڑا حصہ عملی زندگی سے متعلق تھا، جیسے نماز کے مسائل، حج کا طریقہ کار وغیرہ۔ اور اصول یہ ہے کہ عملی چیزیں لکھوانے کی بہ نسبت عملی طور پر کر کے دکھلانے اور پھر لوگوں سے اس کے مطابق عمل کروانے سے زیادہ ذہن نشیں ہوتی ہیں، اس لئے بھی آپ ﷺ نے ابتداء میں حدیثوں کی حفاظت کے لئے اسی طریقہ کو اپنایا۔

ممانعت کی ایک مناسب وجہ یہ بھی تھی کہ دعوت اسلامی کا آغاز تھا اور یہ امی لوگ نئے نئے قرآن سے آشنا ہوئے تھے، تو اندیشہ تھا کہ وہ کلامِ الٰہی اور کلام رسول کو باہم خلط ملط نہ کر دیں۔ لیکن بعد کو جب لوگ قرآن مجید کے مزاج و مذاق سے آشنا ہو گئے اور اس بات کا اندیشہ بالکل جاتا رہا کہ قرآن کے ساتھ احادیث کے الفاظ مل جائیں گے تو پھر کتابتِ حدیث کی اجازت دے دی گئی۔

8.3.1 کتابت کی اجازت

بہت سی روایات میں ذکر ہے کہ حدیثوں کو لکھنے کی اجازت دی گئی، ذیل میں چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1. حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اجازت سے روایت کروں، اگر آپ پسند فرمائیں تو میرا ارادہ ہے کہ دل کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے لکھنے کی مدد لوں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میری حدیث ہو تو دل کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بھی مدد لو'' (سنن دارمی: 1/126)
2. حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاری مسجد نبوی میں بیٹھا کرتے تھے اور احادیث سنتے تھے، وہ انہیں پسند آتیں؛ لیکن یاد نہیں رہتی تھیں، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ سے یاد نہ رہنے کی شکایت کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو'' اور آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے لکھنے کا اشارہ کیا۔ (سنن ترمذی، حدیث نمبر: 2666)
3. حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: ہم آپ سے بہت سی باتیں سنتے ہیں، کیا ہم انہیں لکھ لیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: لکھ لیا کرو، کوئی حرج نہیں (تدریب الراوی از سیوطی: 286)
4. حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ خطبہ دیا، یہ سن کر ایک یمنی شخص ابوشاہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ سب احکام مجھے لکھ دیجیے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوشاہ کے لئے لکھ دو'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر: 122)
5. حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علم کو قید کر لو، میں نے پوچھا: علم کی قید کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اسے لکھنا'' (مستدرک حاکم، حدیث نمبر: 362)
6. رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ نے بھی احادیث لکھنے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرما دی۔ (مقدمہ صحیفہ ہمام بن منبہ: از ڈاکٹر محمد حمید اللہ: ۳۳)

8.4 عہد نبوی کا تحریری سرمایہ

نزول قرآن کے آغاز پر جوں جوں وقت گذرتا گیا اور اصحاب رسول ﷺ ''کلام اللہ'' اور ''جوامع الکلم'' کے فرق سے آشنا اور ان کے مزاج و مذاق سے آگاہ ہوتے رہے، تو اب قرآن مجید کے ساتھ ساتھ حدیث کو بھی لکھنے کی اجازت دے دی گئی، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف احادیث لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی؛ بلکہ کئی نوشتے خود تحریر کروائے، امام ابن عبد البر نے اپنی کتاب ''جامع بیان فضل العلم وأهله'' میں تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، اسی طرح خطیب بغدادی نے ''التقييد'' اور ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے ''دراسات في الحديث النبوي'' میں عہد نبوی اور دور صحابہ کے بیشتر تحریری ذخیروں کا ذکر کیا ہے، ذیل میں چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

(1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے سال قبیلہ خزاعہ کے لوگوں نے قبیلۂ لیث کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، جب اس واقعہ کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو دی گئی، تو آپ ﷺ نے اپنی سواری پر سوار ہو کر ایک تفصیلی خطبہ دیا، جس میں حدود حرم کی عظمت اور قتل کے سلسلہ میں دیت وقصاص کا بیان تھا، خطبہ سے فراغت ہوئی تو یمن کے ایک صاحب حضرت ابوشاہ نے برسر محفل درخواست کی کہ یہ خطبہ میرے لئے لکھوا دیا جائے، آپ ﷺ نے درخواست منظور کی اور حکم دیا: ''اكتبوا لأبي شاه'' (ابوشاہ کے لئے خطبہ لکھ دیا جائے)۔ [صحيح بخاری، باب كتابة العلم، حدیث نمبر:112]

(2) عمرو بن حزم کا مجموعۂ حدیث: رسول اللہ ﷺ نے ۱۰ھ میں عمرو بن حزم کو نجران کا گورنر بنا کر بھیجا، اس وقت ان کی عمر ۱۷ سال تھی، جب یہ مدینہ سے جانے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ایک نوشتہ حوالہ کیا، جس میں ''فرائض، سنن اور خون بہا کے احکام'' درج تھے؛ چنانچہ وہ اہل یمن کو باضابطہ پڑھ کر سنایا گیا۔ (سنن نسائی، حدیث نمبر: 4853) امام ابن شہاب زہری کا بیان ہے کہ یہ کتاب چمڑے پر تحریر تھی، اور خود زہری نے بہ چشم خود اسے پڑھا ہے، حدیث کی بیشتر کتابوں میں اس نسخہ سے جستہ جستہ حدیثیں نقل کی گئی ہیں، جیسے موطا امام مالک، سنن بیہقی، سنن نسائی، مسند احمد بن حنبل اور سنن دارقطنی وغیرہ، امام حاکم نے ''المستدرک'' کی صرف کتاب الزکاۃ میں اس نسخہ سے 63 حدیثیں نقل کی ہیں۔

(3) ''کتاب الصدقہ'': ایک دستاویز تھی، جس میں زکاۃ وصدقات اور عُشر سے متعلق ہدایات آپ ﷺ نے قلم بند کروائی تھی، اسے اپنے عاملوں کی طرف روانہ کرنا چاہتے تھے، مگر اس سے پہلے ہی رحلت فرما گئے، یہ کتاب رسول اللہ ﷺ کی تلوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھی، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اور ان کے بعد خلیفہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل کیا۔ اس نوشتہ سے مختلف محدثین جیسے ابوداؤد اور ترمذی نے حدیثیں نقل کی ہیں، (سنن ابو داؤد، كتاب الزكاة، حدیث نمبر: 1567، سنن ترمذی، كتاب الزكاة) اسی طرح مصنف ابن أبی شیبہ، سنن دارمی اور سنن دارقطنی میں بھی متعدد حدیثیں مروی ہیں۔

(4) زرعی پیداوار سے متعلق نوشتہ: رسول اللہ ﷺ نے یمن کے حارث بن عبد کلال، معافر اور ہمدان کے نام یہ تحریر لکھی تھی، جس میں زرعی پیداوار کی بابت زکاۃ کے احکام درج تھے۔ (سنن دار قطنی، كتاب الزكاة)

(5) امام ابوجعفر بن محمد بن علی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار کے دستہ میں ایک صحیفہ رکھا ہوا ملا، جس میں کئی حدیثیں درج تھیں، جیسے کہ وہ شخص لعنت زدہ ہے جس نے کسی نابینا کو گمراہ کیا۔ (جامع بیان العلم لابن عبد البر، حدیث نمبر: 393)

(6) ''حضرموت'' کے شہزادے وائل بن حجر مدینہ آ کر مشرف بہ اسلام ہوئے، چند ایام دیار رسول اللہ ﷺ میں قیام کیا، واپس جانے لگے تو آں حضور ﷺ نے ایک صحیفہ لکھوا کر ان کے حوالے کیا، جس میں نماز، روزہ، شراب اور سود وغیرہ سے متعلق احکام درج تھے۔ (معجم الصغیر للطبرانی)

(7) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل یمن کو حضور ﷺ نے مختلف قسم کے احکام ایک رسالہ کی شکل میں لکھوا کر بھیجا تھا، دارمی میں وہ روایت اس طرح نقل کی گئی ہے:

> ''رسول اللہ ﷺ نے یمن والوں کو یہ لکھوا کر بھیجا کہ قرآن مجید کو پاک آدمی کے سوا کوئی نہ چھوئے اور نکاح سے پہلے طلاق نہیں دی جاسکتی اور جب تک غلام خریدا نہ جائے اس کو آزاد کرنے کے کوئی معنی نہیں''

یہ تو بعض نوشتوں کا ذکر تھا، مگر آپ ﷺ کا تحریری سرمایہ بہت پھیلا ہوا ہے، احادیث کے علاوہ بھی مختلف تحریری دستاویزات کا ثبوت ملتا ہے، جیسے میثاق مدینہ ودیگر قبائل کے ساتھ طے شدہ معاہدے، صلح حدیبیہ کا معاہدہ نامہ، مدینہ منورہ کی مردم شماری کے کاغذات، شاہان عالم اور فرمارواؤں کے نام خطوط، دعوت نامے، امان نامے، عمال کے لئے ہدایات اور جاگیر وقطائع کے فرامین، جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے اندازے کے مطابق پونے تین سو ایسے مکتوبات نبوی کا ذکر ملتا ہے، معروف محدث حافظ شمس الدین محمد بن علی دمشقی حنفی (متوفی: 953ھ) نے ان معاہدات اور دستاویزات کو اپنی کتاب ''إعلام السائلین عن کتب سید المرسلین'' میں یکجا کر دیا ہے۔

8.4.1 عہد رسالت میں صحابہ کے بعض نوشتے

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حدیث لکھنے کی اجازت حاصل ہونے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی طرف خوب توجہ دی، یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت ہی میں احادیث کے کئی مجموعے تیار ہو چکے تھے، جن میں کم وبیش دس ہزار سے زیادہ حدیثیں تحریری شکل میں لکھی جا چکی تھیں، مولانا مناظر حسن گیلانی کے بقول:

> ''دنیا کو یہ سن کر حیرت ہوگی؛ لیکن کیا کیا جائے واقعہ یہی ہے کہ دس ہزار نہیں؛ بلکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد میں حدیثیں عہد نبوت اور عہد صحابہ میں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں''

گویا کہ خود عہد رسالت میں کتابت حدیث کی سرگرمی زوروں پر تھی۔ ذیل میں اس عہد کے اہم نوشتوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

(1) الصحیفہ الصادقہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ایک صحابی رسول ہیں، آپ کو دربار رسالت سے براہ راست نہ صرف اجازت بلکہ حکم تھا کہ حدیثیں لکھا کریں، مسند احمد کی روایت ہے:

''میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا وہ سب کچھ جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں، میں نے عرض کیا کہ خوشی وغصہ دونوں حالتوں کی بات کو لکھ سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، کیوں کہ میں ان سب حالات میں حق کے سوا کچھ نہیں بولتا''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''مجھ سے زیادہ حدیث رسول اللہ ﷺ کا کوئی عالم نہیں، بجز عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے؛ کیوں کہ وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے اور دل سے یاد رکھتے تھے، اور میں صرف یاد رکھتا تھا، لکھتا نہ تھا'' (صحیح بخاری، باب کتابة العلم، حدیث نمبر: 113)

گویا کہ کتابت حدیث کا صحابہ میں سب سے زیادہ اہتمام عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ سے منسوب ہر بات قید تحریر میں لایا کرتے، یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ یہ مجموعہ ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کرگیا، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ خود اسے ''صادقہ'' کے نام سے موسوم کرتے تھے، اور اسے اپنا قیمتی سرمایہ قرار دیتے تھے، آپ کی وفات کے بعد یہ صحیفہ ان کے پوتے شعیب بن محمد بن عبداللہ کے پاس منتقل ہوا اور شعیب سے اس نسخہ کو ان کے صاحبزادے عمرو نے روایت کیا ہے۔

''الصحیفة الصادقة'' میں حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد رہی ہوگی؛ کیوں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات کی تعداد 5374 ہے اور خود ان کا اعتراف ہے کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایتیں ان سے زیادہ ہیں؛ لہٰذا یقینی طور پر اس صحیفہ صادقہ میں پانچ ہزار تین سو چوہتر (5374) سے زائد روایتیں رہی ہوں گی۔

(2) صحیفہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں دس سال رہنے اور خدمت کرنے کا خوب موقع ملا، نیز آپ کو سنن واحادیث سے بھی خوب شغف رہا؛ چنانچہ آپ کا شمار ان چند لوگوں میں ہے جن سے بکثرت حدیثیں نقل کی گئی ہیں، محدثین نے ان کی روایت کردہ حدیثوں کی تعداد 1286 ذکر کی ہے، آپ خود بھی احادیث لکھا کرتے تھے، اور اپنے عزیزوں کو بھی اس کی تاکید کرتے، یہی وجہ تھی کہ طالبان علم آپ کی تحریری یادداشت سے حدیثیں نقل کیا کرتے تھے، معتبر روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اپنی روایات کو قلم بند کررکھا تھا، مستدرک حاکم میں ہلال بن سعید کا یہ قول موجود ہے:

''ہم جب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے زیادہ پوچھ گچھ کرنے لگتے تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے: یہ ہیں وہ حدیثیں جو آں حضرت ﷺ سے میں سنی ہیں، اور ان کو لکھا اور لکھ کر حضور ﷺ کے سامنے پیش کرچکا ہوں'' (مستدرک حاکم، حدیث نمبر: 6452)

اس مجموعہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اسے قلم بند کئے جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کرکے توثیق بھی کرالی گئی تھی، نیز یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عہد رسالت ہی میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی صادقہ کے علاوہ ہزار سے زیادہ احادیث پر مشتمل یہ تحریری مجموعہ بھی تیار کیا جاچکا تھا۔

(3) صحیفہ جابر بن عبداللہ:

آپ کا شمار بھی بکثرت روایت کرنے والے صحابہ میں ہوتا ہے، ابن جوزی نے ان کی روایتوں کی تعداد 1506 ذکر کی ہے، اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ آپ کی روایات بھی قلم بند کی جا چکی تھیں؛ چنانچہ حج کے موضوع پر آپ کی ایک کتاب کا ذکر حافظ ابن حبان اور ذہبی نے کیا ہے، معاصر عرب عالم ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری نے بعض حوالوں سے نقل کیا ہے کہ یہ صحیفہ کتب خانہ شہید علی ترکی میں اب بھی محفوظ ہے۔

(4) صحیفہ علی بن ابی طالب:

عہد رسالت کے نوشتوں میں صحیفہ علی بن ابی طالب بھی ہے، جس کے متعلق صحیح بخاری میں خود ان کا بیان یوں نقل کیا گیا ہے:

''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے بجز قرآن اور جو کچھ اس صحیفہ میں درج ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا''
(صحیح البخاری، حدیث نمبر: 3179)

اس صحیفہ میں حرم مدینہ کی حدود اور حرمت، عہد شکنی کی مذمت، خون بہا، اسیروں کی رہائی جیسے کئی اہم مسائل سے متعلق نبوی ہدایات موجود تھیں، امام بخاری نے کم و بیش دس ابواب میں اسی صحیفہ سے احادیث نقل کی ہیں۔

(5) صحیفہ رافع بن خدیج:

آپ عہد رسالت ہی سے احادیث لکھا کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ بہت سی احادیث تحریری شکل میں آپ کے پاس موجود تھیں، امام احمد بن حنبل نے اس مجموعہ سے بعض روایات نقل کی ہیں، (مسند احمد، حدیث نمبر: 17272) صحیح مسلم میں اسی صحیفہ سے یہ روایت لی گئی ہے کہ:

''مدینہ ایک حرم ہے، جسے رسول اللہ ﷺ نے حرم قرار دیا ہے اور یہ ہمارے پاس ایک خولانی چمڑے پر لکھا ہوا ہے'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر: 1361)

ان حضرات کے علاوہ اور بھی صحابہ کے نوشتے موجود ہیں، خاص طور پر جو عہد رسالت ہی میں لکھے گئے تھے، ذیل میں صرف ان کے نام ذکر کئے جا رہے ہیں:

(6) صحیفہ عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ

(7) صحیفہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

(8) صحیفہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

(9) صحیفہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

8.5 تدوین حدیث

''تدوین'' یہ عربی کا لفظ ہے، جس کا معنی ہے بکھری ہوئی اور مختلف جگہوں پر پھیلی ہوئی چیزوں کو یکجا کر دینا، فارسی زبان میں اس کے مترادف کے طور پر ''دیوان'' استعمال کیا جاتا ہے، اور اردو میں بھی دیوان اسی معنی میں بولا جاتا ہے، جیسے کہ شعراء کے دیوان وغیرہ، اور تدوین اپنے اصطلاحی معنی کے اعتبار سے وہی ہے جسے ہم تصنیف و تالیف سے تعبیر کرتے ہیں۔

تدوین حدیث سے مراد یہ ہے کہ مختلف نوشتوں اور صحیفوں میں بکھری ہوئی احادیث کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے، واضح ہو کہ تدوین حدیث کا یہ عمل بنیادی طور پر حسب ذیل چار مرحلوں سے گزرا ہے:

(1) متفرق طور پر احادیث کو قلم بند کرنا، جیسے چمڑے، ہڈی، لکڑی کے تختے اور کاغذ پر۔

(2) کسی ایک شخصی صحیفہ میں متعدد روایات کو جمع کرنا، جیسے مختلف صحابہ نے اپنے نوشتے تیار کیے تھے۔

(3) احادیث کو کسی خاص ترتیب کے بغیر ہی کتابی شکل میں جمع کر دینا، جیسے کہ ابن شہاب زہری وغیرہ نے کیا۔

(4) احادیث کو کسی خاص ترتیب کے ساتھ ایک کتاب میں جمع کرنا، جیسے کہ امام مالک کی مؤطا وغیرہ۔

8.5.1 تدوین حدیث کا باضابطہ آغاز

یوں تو حدیثیں مختلف انداز میں عہدِ رسالت ہی سے قلم بند کی جا رہی تھیں؛ مگر اب بھی بہت سی حدیثیں تحریری شکل میں نہیں آپائی تھیں، دوسری طرف تشویش ناک بات یہ تھی کہ صحابہ کرام جو کہ ان حدیثوں کے امین تھے، روز بروز اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور اس طرح خورشید نبوت سے کسب نور کرنے والے ستارے غروب ہوتے جا رہے تھے، نیز رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ مدینہ منورہ سے نکل کر مختلف شہروں میں جا بسے تھے اور ان علاقوں میں حدیث و سنت کی بزم آراستہ کی تھی، گویا کہ حدیث کے یہ زندہ دیوان خود ایک جگہ دستیاب نہیں تھے۔

انصاف پرور اور بیدار مغز خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ 99ھ میں سریر آرائے خلافت ہوئے، آپ کی نگاہ بصیرت نے محسوس کر لیا کہ علوم شریعت اور حدیث و سنت کا جو سرمایہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اسے باضابطہ تحریری شکل میں اگر جمع نہ کیا جائے، یا صحیفوں اور نوشتوں کی صورت میں بکھرے ہوئے سرمایہ کو یکجا نہ کیا جائے تو یہ امانت ضائع ہو جائے گی، اس لئے آپ نے تمام ممالک کے علماء اور اربابِ حکومت کے نام سرکاری فرمان بھیجا کہ حدیث نبوی کو تلاش کر کے جمع کیا جائے۔

8.6 پہلی صدی ہجری کی تصنیفات

پہلی صدی ہجری میں جو تصنیفات وجود میں آئی ہیں، اس کے پسِ پشت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی تحریک کارفرما تھی، اور یہی وجہ تھی کہ بہت کم عرصہ میں بڑا وقیع علمی کام وجود میں آیا اور وقت کے اساطین علم نے اسے انجام دیا۔

مدینہ منورہ چونکہ اسلام کا علمی دار السلطنت تھا، اس لئے آپ نے بطور خاص مدینہ کے قاضی ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو تحریر کیا کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ کی جو حدیث و سنت، یا جو روایت حضرت عائشہ کے دونوں ممتاز شاگرد عمرہ بنت عبد الرحمٰن اور قاسم بن محمد

سے ملے اسے لکھ لیں، کیوں کہ مجھے علم کے مٹ جانے اور اہل علم کے گذر جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ قاضی ابوبکر نے امیر المؤمنین کے حکم کی تعمیل میں احادیث جمع کیں اور متعدد کتابیں لکھیں، مگر قبل اس کے کہ وہ کتابیں ان کی خدمت میں پہنچتیں خلیفہ وفات پا گئے۔

تدوین کی اس سرگرمی میں جو لوگ پیش پیش رہے، ان میں ایک نمایاں نام حجاز کے نامور عالم امام محمد بن شہاب زہری کا بھی ہے، خلیفہ کی تحریک پر آپ اس جانب متوجہ ہوئے اور ان کے خواب کو ان کی زندگی ہی میں شرمندۂ تعبیر کر دکھایا، اور حدیث کی ایک کتاب مرتب کر کے پیش کی، عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی وفات سے پہلے اس کے قلمی نسخے تیار کرا کر اسلامی سلطنت کے مختلف گوشوں میں روانہ کر دیا۔

اسی دور میں، چند اور اہم کام بھی ہوئے؛ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور ان کے علوم کے امین عروہ بن زبیر نے سیرت پر دو کتابیں لکھیں، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد سعید بن جبیر نے اپنے استاذ کی احادیث کو تحریری شکل میں جمع کر دیا، اسی عہد میں ایک اور قابل ذکر کام امام شعبی نے انجام دیا، یہ امام التابعین ہیں اور خود حدیث کے بلند پایہ عالم ہیں، کم وبیش پانچ سو صحابہ کو پایا تھا، ان کے ممتاز تلامذہ میں امام ابوحنیفہ کا شمار ہوتا ہے؛ چنانچہ آپ نے نہ صرف احادیث لکھیں اور جمع کیں؛ بلکہ سب سے پہلے احادیث کو موضوعات اور ابواب کی ترتیب پر جمع کیا۔ ملک شام کے ممتاز عالم مکحول تھے، ابن ندیم نے ان کی تصنیفات میں ''کتاب السنن'' کا ذکر کیا ہے، گویا کہ یہ بھی اسی دور کی تالیف ہے، نیز سالم بن عبداللہ نے بھی خلیفہ کی خاص تاکید پر ''صدقات'' کے متعلق روایات جمع کی تھیں۔

اس طرح حدیث کی باضابطہ تدوین کا آغاز حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تحریک پر پہلی صدی ہجری میں ہوا اور اسلامی سلطنت کے تمام ممتاز علماء نے اپنی استطاعت کے بقدر اس میں حصہ لیا، مگر بطور خاص ابوبکر بن عمرو بن حزم، امام ابن شہاب زہری، مکحول اور امام شعبی نے کلیدی کردار ادا کیا۔

چنانچہ پہلی صدی ہجری میں جو حدیث کی کتابیں وجود میں آئیں وہ حسب ذیل ہیں:

1. امام زہری کے متعدد دفاتر؛ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: زہری کے علمی دفاتر سرکاری خزانے سے سواریوں پر بار کر کے لائے گئے
2. ابوبکر بن عمرو بن حزم کی کتابیں
3. امام شعبی کی کتابیں، بطور خاص طلاق سے متعلق مجموعہ
4. سالم بن عبداللہ کا صدقات سے متعلق کتابچہ
5. امام مکحول کی کتاب السنن
6. عروۃ بن زبیر کی سیرت پر دو کتابیں
7. عبداللہ بن عباس کی احادیث کا مجموعہ، جسے سعید بن جبیر نے مرتب کیا۔

8.7 موضوع روایت۔ایک تعارف

موضوع عربی زبان کا لفظ ہے اور ''وَضَعَ'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی پھینکنا یا گرانا ہے، محدثین نے مختلف پیرائے میں اس کی تعریف کی ہے، معاصر عرب عالم ڈاکٹر عمر فلاتہ نے ان تمام کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان الفاظ میں ''موضوع'' کا تعارف کرایا ہے: موضوع وہ ''روایت ہے جو من گھڑت وخودساختہ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت جھوٹ پر مبنی ہو، خواہ یہ نسبت جان بوجھ کر کی گئی ہو یا ناواقفیت میں''۔ واضح ہو کہ اس میں قول، فعل، تقریر تینوں کو شامل کیا گیا ہے۔

حدیث گھڑنے والا اکثر الفاظ اور اس کی سند دونوں اپنی طرف سے بناتا ہے اور بسا اوقات اس من گھڑت بات کے لئے کسی معتبر سند کو تلاش کر لیتا ہے۔ وضع حدیث سخت گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''میری طرف جھوٹ بات منسوب کرنا عام لوگوں کی طرف منسوب کرنے جیسا نہیں ہے؛ بلکہ جس نے ہماری طرف من گھڑت بات منسوب کی تو اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں تلاش کر لے''
>
> (مقدمة الكامل لابن عدى :1/17)

یہی وجہ ہے کہ علماء کے ایک گروہ نے وضع حدیث کو جائز سمجھنے والے اور جان بوجھ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف کسی بے بنیاد بات کو منسوب کرنے والے کو اسلام سے خارج قرار دیا ہے، نیز واضع حدیث اگر توبہ کر لے تب بھی اس کی روایات کو جمہور محدثین نے ہمیشہ کے لئے ناقابل قبول قرار دیا ہے۔

8.7.1 وضع حدیث کا آغاز

رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا اثر تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ جماعت امانت وصدق گوئی کی آئینہ دار اور ایمان ویقین کا شاہکار تھی، اس لئے آں حضور ﷺ کی طرف غلط بات منسوب کرنا ان کے لئے ناممکن تھا، یہی وجہ ہے کہ عہد نبوت میں کسی موضوع روایت کا ذکر نہیں ملتا ہے، آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے دور میں اصلاح وتزکیہ، جہادی سرگرمی اور فتنوں کی سرکوبی زوروں پر تھی، خاص طور پر روایت کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر کی محتاط روش اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ناقدانہ اسلوب روایت سازی کی حوصلہ شکنی کے لئے کافی تھا؛ چنانچہ ایسے حالات میں کسی کو حدیث وضع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

محدثین کے مطابق حدیثیں وضع کرنے کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری عہد میں ہوا، عبداللہ بن سباء اور اس کے ہمنواؤں نے گویا اس کی تخم اول رکھی اور فتنہ سامانی کا سہارا لیا، بعض دیگر محققین کا خیال ہے کہ وضعِ حدیث کا آغاز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت 36-41ھ سے ہوا۔

8.8 وضع حدیث کے محرّکات

حدیثیں وضع کرنے کے کئی اسباب رہے، جیسے سیاسی مفادات، گروہی اختلافات، خواہشات کی پیروی، بادشاہوں کی خوشنودی حاصل کرنا وغیرہ، محدثین نے بڑی باریک بینی اور تحقیق وجستجو کے بعد ان محرکات کی نشاندہی کی ہے، حافظ ابن حجر کا یہ چشم کشا اقتباس ان پر روشنی ڈالتا ہے:

وضع کرنے والے کے لئے وضعِ حدیث کا باعث یا تو بے دینی جیسے زنادقہ، یا جہالت کا غلبہ ہے جیسے بعض عبادت گزار، یا عصبیت وغلو پسندی ہے، جیسے بعض مقلدین، یا بعض ارباب حکومت کی قربت یا نفس پروری یا شہرت کے خاطر انوکھی بات کرنا ہے۔
ذیل میں ان اسباب پر گفتگو کی جارہی ہے:

(1) گروہی وسیاسی اختلافات

حدیثیں وضع کرنے کا بنیادی محرّک اور اوّلین سبب مسلمانوں کا باہمی اختلاف تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اختلاف رونما ہوا، ان کی شہادت نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے موقع سے کئی گروہ پیدا ہوگئے، ایک طرف خوارج تھے جو حضرت علی رضی اللہ کو کافر گردانتے تھے، دوسری طرف روافض تھے جو ان کے معصوم ہونے کا دعوی کرتے تھے، چنانچہ ہر گروہ نے اپنی حیثیت منوانے اور اپنے موقف کی تائید میں احادیث وضع کرنا شروع کردیا۔

(2) اسلام دشمن عناصر کی ریشہ دوانیاں

اسلامی حکومت کا دائرہ جوں جوں بڑھتا گیا اور مختلف قوموں اور ملکوں کے باشندگان اسلام کے زیر اثر آتے رہے، تو بعض لوگ باوجود اسلام کو ناپسند کرنے کے، علمی وفکری اور ثقافتی دسیسہ کاری کی نیت سے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اس کے دائرہ میں چلے آئے، مگر انہوں نے فتنہ پردازی کے لئے کوئی موقع فروگذاشت نہ کیا، محدثین نے انہیں زندیق/زنادقہ سے تعبیر کیا ہے، علماء نے ان لوگوں کا خوب علمی تعاقب کیا اور رطب ویابس اور کھرے وکھوٹے کی نشاندہی کر کے ان کی وضع کردہ روایات کو واضح کردیا۔

(3) تعصب وگروہ بندی

تعصب کے مختلف رنگ وآہنگ رہے ہیں، فکر وعقیدہ کے لئے تعصب، فروعی مسائل کے تئیں تعصب، حتی کہ رنگ ونسل اور زبان وجغرافیائی حدود کے حوالے سے تعصب، جب کہ شریعت نے غلو پسندی اور تعصب وتنگ نظری کو ناپسند کیا ہے اور کشادہ نظری وفراخ دلی کی دعوت دی ہے، مگر موضوع روایات کا ایک بڑا حصہ ان اسباب کی وجہ کر وجود میں آیا ہے، چنانچہ اپنے نقطۂ نظر کی تائید، یا اپنی پسندیدہ شخصیات کی فضیلت بیان کرنے کے لئے موضوع روایتوں کا سہارا لیا گیا۔

(4) ترغیب وترہیب

صوفیاء، عبادت گزار اور جاہل لوگوں نے بھی حدیثیں وضع کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے، یہ لوگ نیک نیتی اور بھلے مقصد کے تحت من گھڑت باتیں رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کردیتے، جیسے کسی نیک عمل پر ابھارنے یا کسی گناہ سے باز رکھنے کے لئے، اور بزعم خود اسے اچھا کام سمجھتے تھے، جب کہ آمیزش سے وہ اس چشمہ صافی کو آلودہ کررہے تھے، حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں سے بہت زیادہ نقصان ہوا ہے؛ کیوں کہ ان کی روایات کو عام لوگ ان کی ظاہری شکل وصورت کو دیکھ کر بلا تردد قبول کرلیا کرتے تھے۔

(5) دنیاوی اغراض کے خاطر وضعِ حدیث

قصہ گوئی ایک فن ہے، پچھلے زمانے میں لوگوں کی تفریح کا اہم ذریعہ اور سنانے والے کے لئے کسبِ معاش کا طریقہ ہوتا، ان لوگوں نے بھی حدیث وضع کرنے میں بڑا کردار نبھایا ہے، امام احمد بن حنبلؒ اور یحیٰ بن معین نے ان کے کذب ودجل پر بعض واقعات بھی نقل کئے ہیں، علامہ سیوطیؒ نے ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کے پیش نظر مستقل ایک کتاب "تحذير الخواص في أكاذيب القصّاص" کے نام سے تحریر کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج جو اسرائیلی روایات کا خوب چلن ہے، اور بے استناد روایتوں نے تقریروں سے لے کر کتابوں تک میں جگہ پالی ہے، وہ بیشتر ان ہی قصہ گو حضرات اور بے بصیرت نام نہاد صوفیاء کی کرشمہ سازی ہے۔

اس جیسا ایک اور گروہ تھا، اس نے بھی دنیوی خواہشات کی تکمیل اور دربارشاہی میں بلند مقام ومرتبہ حاصل کرنے کے لئے جھوٹی حدیثیں بیان کیں، یہ دراصل "علماءِ سوء" تھے، اس سلسلہ میں غیاث ابن ابراہیم کے واقعہ کو محدثین نے بطور مثال ذکر کیا ہے، اس شخص کی خلیفہ مہدی کے دربار میں آمد و رفت تھی، خلیفہ کبوتروں کا شوقین تھا، لہٰذا مہدی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک صحیح روایت میں اس نے ایک لفظ کا اضافہ کرکے پیش کیا، جس سے کبوتر بازی کا جواز مہیا ہوتا تھا، خلیفہ مہدی نے کبوتروں کو ذبح کروادیا، کیوں کہ وہ ہی وضع حدیث کا سبب بنے تھے۔

8.8.1 موضوع روایتوں پر کتابیں

1. تذكرة الموضوعات از محمد بن طاہر مقدسی (متوفی: 507ھ)۔
   اس میں مرایات کو حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے۔
2. الموضوعات من الأحاديث المرفوعات، ازابوعبداللہ حسین بن ابراہیم جوزقانی (متوفی: 543ھ)۔
3. الموضوعات، ازابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی (متوفی: 597ھ)۔
   موضوع روایتوں کا سب سے بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے، اپنی ترتیب کے اعتبار سے بھی آسان ہے، مگر ابن الجوزی سے حکم لگانے میں بہت سی جگہ کوتاہی بھی ہوئی ہے؛ چنانچہ آپ نے بہت سی صحیح وحسن روایتوں کو بھی موضوع قرار دے دیا ہے۔
4. المصنوع في معرفة الحديث الموضوع، از مُلا علی قاری الحنفی (متوفی: 1516ھ)۔
5. الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة، ازابوعبداللہ محمد بن علی شوکانی (متوفی: 1255ھ)۔

8.9 اسناد حدیث

ہر حدیث دو چیزوں سے مل کر بنتی ہے، سند اور متن، سند کے مترادف کے طور پر "اسناد" بھی استعمال کیا جاتا ہے، محدثین کے نزدیک اس کے ہم مثل ایک اور لفظ "مسند" بھی رائج ہے، ذیل میں ان تینوں کے لغوی واصطلاحی معنی ذکر کئے جارہے ہیں:

"اسناد" عربی لغت کے اعتبار سے اس کا معنی ہے: ٹیک لگانا۔

اور محدثین کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے: کسی بات کو اس کے کہنے والے کی طرف منسوب کرنا۔

''سند'' اس کے لغوی معنی ہیں، جس پر بھروسہ کیا جائے، یا جس کا سہارا لیا جائے، جیسے دیوار پر تکیہ کرنا۔

محدثین کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے: حدیث روایت کرنے والے افراد کا وہ سلسلہ جو متن تک پہنچے۔

''مُسْنَدْ'' کے معنی ہیں کسی چیز کو دوسری چیز کی طرف منسوب کرنا اور محدثین کے نزدیک اس سے حسب ذیل مختلف چیزیں مراد لی گئی ہیں: جیسے

1. سند۔
2. وہ حدیث جس کی سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہو، درمیان میں کوئی خلا یا فاصلہ نہ ہو، امام بخاری نے اپنی کتاب کا مکمل نام اس طرح رکھا ہے: ''الجامع المسند الصحیح '' یہاں مسند اسی لئے درج کیا گیا ہے کہ اس کتاب کی جو مستقل روایات ہیں، ان کی سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے۔
3. وہ کتاب جس میں احادیث کو موضوعات کے بجائے صحابہ کی ترتیب پر یکجا کیا گیا ہو، یعنی ایک صحابی سے روایت کردہ تمام حدیثوں کو اس کے نام کے تحت ذکر کر دیا جائے، جیسے امام احمد بن حنبلؒ کی ''مسند'' ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سند یا، اسناد وہ مبارک سلسلہ اور ذریعہ ہے، جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور معمولات ہم تک پہنچے ہیں، سند دراصل اس امت کا معجزہ ہے، اور یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں صرف مسلمانوں کا یہ امتیاز ہے کہ وہ اپنے نبی کی ہر بات اور زندگی کے تمام حالات سے بخوبی واقف ہیں، نیز ان میں سے ہر خبر نہایت باوثوق افراد کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔

8.9.1 سند کی اہمیت

سند؛ یعنی وہ ذریعہ جس کے توسط سے ہم تک یہ دین پہنچا ہے، اس کی اہمیت اور ضرورت کی طرف خود رسول اللہ ﷺ نے اشارہ فرما دیا تھا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

> ''تم لوگ (ہم سے) سنتے ہو اور پھر تم سے سنا جائے گا، اور جنھوں نے تم لوگوں سے (یہ احادیث) سنی ہوں گی ،لوگ ان سے بھی سنیں گے'' (سنن ابوداؤد، کتاب العلم، حدیث نمبر: 3659)

گویا کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث روایت کرنے والوں کے چار طبقات کی نشاندہی کی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہی اصل میں روایت حدیث کا دور سمجھا جاتا ہے۔

محدثین نے سند کو بنیادی اہمیت دی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی روایت بغیر سند کے ہو تو اس کو کوئی حیثیت نہیں دی جاتی ہے، محدثین کے حسب ذیل اقوال سے سند کی ضرورت کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

امام محمد بن سیرین فرماتے تھے: سند تو اصل میں دین کا حصہ ہے، اور اگر سند نہ ہوتی تو ہر کس و ناکس جو دل میں آتا کہہ دیتا۔
آپ ہی سے یہ بات بھی نقل کی گئی ہے کہ یہ "علم" دراصل دین ہے، تو خوب دیکھ لو کہ تم کس سے دین حاصل کررہے ہو۔

امام سفیان ثوریؒ کہا کرتے تھے: سند تو مؤمن کا ہتھیار ہے، اور جب اس کے ہاتھ میں ہتھیار ہی نہ ہو تو وہ کیوں کر مقابلہ کر پائے گا، ایک محدث ابوبکر محمد بن احمد نے کہا: اللہ تعالی نے اس امت کو بطور خاص تین چیزوں سے نوازا ہے، جو پچھلی قوموں کو حاصل نہیں تھیں، ان میں سرفہرست اسناد کو ذکر کیا۔

معروف محدث امام ابن شہاب زہری کی مجلس میں ایک صاحب اسحاق بن اُبی فروہ یکے بعد دیگرے چند احادیث نقل کرنے لگے، اور بار بار کہتے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابن شہاب زہری اس روش سے خفا ہوگئے، اور کہا: اے اُبوفروہ کے لڑکے! اللہ تجھے ہلاک کرے، کس چیز نے تم میں اتنی جرأت بے جا پیدا کردی ہے؟ تم اپنی حدیثوں کو سند کے ساتھ کیوں نہیں بیان کرتے ہو؟ جو روایتیں تم نے ابھی نقل کی ہیں یہ بے نکیل و بے لگام (یعنی بے سند) ہیں۔

گویا کہ پہلی صدی ہجری سے اس بات کا خوب اہتمام کیا گیا کہ حدیث مستند ہو اور باوثوق سند سے نقل کی جائے، اور جو روایات ان واسطوں سے خالی ہوتیں ان کو قابل اعتناء نہیں سمجھا جاتا۔

8.9.2 اسناد حدیث کا آغاز

غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ دین خود بھی اپنے آغاز ہی سے سند پر مبنی ہے، چنانچہ امت نے صحابہ کے ذریعہ دین کو پایا اور صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے دین حاصل کیا اور آپ ﷺ نے بذریعہ وحی اللہ رب العزت سے کسب دین کیا۔

احادیث کے حوالہ سے ہر دور میں خوب احتیاط برتی گئی، اس طور پر کہ حدیث بیان کرنے والے کی ایمان داری، دیانت وصدق گوئی، نیز تقوی و پرہیزگاری پر خاص نگاہ رکھی گئی، اور اس کا اہتمام صحابہ ہی کے دور سے کیا جاتا رہا اور غالباً اس کی وجہ قرآن مجید کی یہ ہدایت رہی ہو کہ:

یاایھاالذین آمنوا ان جاء کم فاسق بنبإ فتبینوا [الحجرات:6]
(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو)

گویا کہ کسی خبر کو قبول کرنے سے پہلے اسے پرکھ لیا جائے اور اس کے بارے میں تحقیق وتفتیش کرلی جائے، محدثین نے ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس جانب توجہ کی، اور احادیث کو سننے وقبول کرنے میں محتاط روش اختیار کی، اس بابت یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے:

ایک عمر دراز خاتون حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور بحیثیت دادی وراثت میں اپنے لئے حصہ طلب کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہارے لئے نہ قرآن مجید میں کوئی ہدایت پاتا ہوں اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں، نیز مزید تحقیق کے لئے آپ نے لوگوں سے بھی دریافت کیا، اسی مجلس میں صحابیٔ رسول حضرت مغیرہ تھے، انہوں نے بتایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی اس مجلس میں حاضر تھا، جب آپ نے دادی کے لئے وراثت میں چھٹا حصہ مقرر کیا تھا۔ حضرت ابوبکر

رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے، جس نے اس حدیث کو سنا ہو؟ تو محمد بن مسلمہ نے گواہی دی کہ ہاں، ان کے علم میں بھی یہ بات ہے، پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کے لئے وراثت کا فیصلہ کیا۔

اس واقعہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مغیرہ کے بیان کئے جانے کے بعد از راہ احتیاط دوسرے صحابہ سے بھی دریافت کیا، تاکہ کسی طرح کی بھول چوک کا امکان باقی نہ رہ جائے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی اس بابت بے لچک اور سخت رویہ اختیار کیا، جب تک حدیث کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف پایۂ ثبوت تک نہ پہنچ جاتی اسے قبول نہ کرتے، بلکہ بسا اوقات اگر شک ہوتا تو تنہا شخص کی روایت کو قبول ہی نہ کرتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس رویہ کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے:

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں انصار کی ایک مجلس میں بیٹھا تھا، دریں اثناء ابوموسی نمودار ہوئے اور ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار عیاں تھے، مجلس والوں سے کہا: میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہونے کے لئے تین بار اجازت طلب کی، کوئی جواب نہ ملا تو میں لوٹنے لگا، اسی دوران عمر باہر آئے، اور کہا: کیوں واپس جارہے ہو؟ میں نے بتایا کہ تین بار ہم نے اجازت طلب کی، مگر جواب نہ ملا، اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جب تم کسی کے دروازہ پر تین مرتبہ اجازت طلب کرچکو اور اجازت نہ مل پائے تو لوٹ جاؤ، تو عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو سن کر کہا: بخدا! تمہیں اس پر کوئی گواہ پیش کرنا ہوگا، پھر ابوموسیٰ لوگوں سے مخاطب ہوئے اور سوال کیا، کیا تم میں سے کسی نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے؟ اہل مجلس میں سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: تمہارے ساتھ ہم میں سے سب سے کم عمر شخص ہی جائے گا۔ ابوسعید کہتے ہیں: میں سب سے کم عمر تھا، میں گیا اور جاکر گواہی دی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جاکر انہوں نے یہ بات کہی۔ حافظ ابن حجر نے بڑی اہم بات اسی واقعہ کے ساتھ درج کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری سے مزید یہ بھی کہا تھا کہ: دیکھو میں تم پر کذبِ بیان کی تہمت نہیں لگاتا، مگر میرا منشاء یہ ہے کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف باتیں منسوب کرنے میں بیجا جرأت کا مظاہرہ نہ کرنے لگیں۔

اس واقعہ سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں، ایک تو روایت حدیث اور سند حدیث کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریقہ کار، دوسرے یہ کہ باوجودیکہ صحابہ سب کے سب قابل اعتماد اور امانت دار تھے، مگر گواہی کا طلب کرنا اس لئے ہوتا؛ تاکہ آگے چل کر لوگ حدیث کے سلسلہ میں بے احتیاطی نہ برتنے لگیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اسی طریقہ پر گامزن رہے، بلکہ آپ نے ایک مختلف اسلوب اختیار کیا، اس طرز پر کہ جو کوئی آپ سے حدیث نقل کرتا، آپ اس سے اس بات پر قسم لیتے کہ اس نے واقعی یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے، یا کسی سند و واسطہ سے نقل کررہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں، ایک صاحب بشیر بن کعب عدوی آئے، اور حدیثیں بیان کرنے لگے، بار بار کہتے جاتے ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ انہیں نظرانداز کرنے لگے اور بے التفاتی برتی، تو بشیر کہہ پڑے: یہ کیا بات ہے کہ میں آپ سے حدیثیں بیان کررہا ہوں اور آپ نہیں سن رہے ہیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ

نے کہا: ایک وقت تھا جب ہم کسی کو "قال رسول الله ﷺ" کہتے ہوئے سنتے تو اس کی جانب لپک کر متوجہ ہو جاتے، مگر جب لوگ سچ اور جھوٹ سب کچھ نقل کرنے لگے، تو ہم نے یہ اصول بنا لیا کہ وہی احادیث لوگوں سے سنیں گے، جن سے ہمیں پہلے سے آگہی ہو۔

مذکورہ واقعات سے بخوبی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حدیث کی روایت میں احتیاط اور سند کے تئیں تحقیق وتفتیش کا آغاز بالکل ابتدائی دور میں ہو چکا تھا، اور یہ مزاج اتنا عام ہوا کہ تمام صحابہ اس کے پابند رہے، اگرچہ ابتدائی دور میں امانت ودیانت داری عام تھی، تاہم آگے چل کر لوگ حدیث کی روایت اور نسبت میں بے احتیاطی کا شکار نہ ہو جائیں اور یہ ذخیرۂ حدیث مشتبہ ہو کر نہ رہ جائے، اس لئے اس طریقہ کو اپنایا گیا۔

8.9.3 تحقیق سند کا دوسرا دور

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد صحابہ اور تابعین نے اس عمل کو باضابطگی عطا کی اور چند اصول مقرر کئے اور روایت حدیث میں بے حد احتیاط اور تحقیق سند میں مزید سختی برتی۔ حسب ذیل اقوال سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

امام محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں: پہلے پہل حدیثوں کی سند کے تئیں دریافت نہیں کیا جاتا تھا، مگر جب فتنہ پیش آیا، تو کہا جانے لگا اس حدیث کی سند یعنی تمام راویوں کے نام ذکر کئے جائیں، پھر اس سند میں اہل سنت راوی ہوتے تو حدیث قبول کر لی جاتی، اور اگر اہل بدعت ہوتے تو ان کی حدیثیں چھوڑ دی جاتیں۔ امام ابن سیرین کے طریقۂ کار کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ وہ حدیثوں پر غور کرتے، اور سند کی تحقیق بھی کرتے، پھر کسی روایت کو تسلیم کرتے۔

امام شعبیؒ سے ربیع بن خثیم نے ایک حدیث بیان کی کہ: جس نے اس بات کا اقرار کیا کہ "اللہ کے سوا کوئی عبادت کا سزاوار نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور اسی کے لئے ساری بادشاہت اور تمام تعریفیں ہیں، تو اسے اللہ کی طرف سے یہ اجر دیا جائے گا"۔ امام شعبی نے کہا: تم سے کس نے یہ حدیث بیان کی؟ انہوں نے جواب دیا: عمرو بن میمونؒ نے، شعبیؒ نے محمد بن میمونؒ سے باضابطہ ملاقات کی اور پوچھا: فلاں حدیث تم سے کس نے روایت کی؟ عمرو نے کہا: صحابی رسول ابوایوب رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں کس درجہ سختی برتی جانے لگی تھی۔

حدیث کے مختلف مراکز مدینہ، مکہ، شام اور دیگر علاقوں میں آباد ہو چکے تھے، اور ہر جگہ اس طریقۂ کار کو اپنا لیا گیا تھا، مگر ملک شام میں اس جانب کسی قدر بے توجہی پائی جاتی تھی؛ چنانچہ امام ابن شہاب زہریؒ نے اہل شام کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا: میں یہ کیا دیکھتا ہوں کہ تمہاری حدیثیں بے نکیل و بے لگام (یعنی بے سند) ہیں، جب کہ ہمارے ہاں اہل علم نے آغاز ہی سے سند کو ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

گویا کہ صحابہ کے ابتدائی دور ہی سے ہر حدیث کو سند کے ساتھ ذکر کیا جاتا تھا، بلا سند حدیثیں قبول نہیں کی جاتی تھیں، مگر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا حادثہ پیش آیا، ایک فتنہ پرور گروہ پوری قوت کے ساتھ نمودار ہوا، اور حدیث میں کذب بیانی کے امکانات ظاہر ہوئے، تو صحابہ اور تابعین نے روایت حدیث اور تحقیق سند میں خوب سختی برتی، اور یہ اصول وضع کیا گیا کہ حدیث بلا سند تسلیم نہ کی جائے، اہل سنت راویوں ہی سے روایات قبول کی جائیں، اہل بدعت کی روایتوں کو رد کر دیا جائے، اس طرح جوں جوں وقت گذرتا گیا، یہ طریقۂ کار ضروری سمجھا گیا، اور مزید اصول وقواعد لکھے گئے۔

8.10 فن اسماء الرجال

حدیث کو روایت کرنے اور اس کے قبول کیے جانے کے لئے ''سند'' کی شرط ابتداء ہی سے لگا دی گئی تھی، اور جوں جوں عہد نبوت سے فاصلہ بڑھتا گیا، ہر حدیث کی سند میں افراد کا اضافہ ہوتا گیا، اب ضرورت اس بات کی پیش آئی کہ حدیثوں کو نقل کرنے والے ان راویوں کے حالات جمع کیے جائیں، اسی طرح یہ بات بھی قابل لحاظ تھی کہ مختلف فتنے اور گمراہ فرقے جنم لے رہے تھے، اور وہ مکر و فریب کے ذریعہ بدعات و خرافات کی تبلیغ و اشاعت میں لگے ہوئے تھے، اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں یہ فتنہ پرور گروہ اپنے مقاصد کے لئے غلط باتیں گڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کردے؛ اس لئے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ تمام راویوں کے حالات جمع کر لئے جائیں، اور اس کی روشنی میں روایات کی درجہ بندی ممکن ہو سکے۔

چنانچہ یہ فن ''اسماء الرجال'' وجود میں لایا گیا، گویا کہ یہ راویان حدیث کی سوانح عمری یا تاریخ ہے اور کم و بیش پانچ لاکھ راویان حدیث کے حالات اس کے ذریعہ محفوظ کر لئے گئے، اس طور پر کہ ان کے نام و نسب، ملک و قبیلہ، علم و فضل، اساتذہ و شاگردان، دیانت و تقویٰ، اخلاق و عادات، مروت و بے مروتی، ذکاوت و حفظ، ثقاہت و ضعف اور پیدائش و وفات سے متعلق تمام تفصیلات بڑی دقت و باریک بینی کے ساتھ جمع کی گئیں، حقیقت یہ کہ آج کے ا[illegible]ی یافتہ دور میں بھی حکومتیں اپنے شہریوں کے حالات اور ان کی تفصیلات اس انداز میں جمع کرنے سے قاصر ہیں، نیز پوری [illegible]خ میں کوئی قوم یا کوئی مذہب اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، یہی وجہ ہے کہ معروف مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر نے کھل کر اس بات کا اعتراف کیا ہے:

> ''کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری اور نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح ''اسماء الرجال'' کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ افراد کا حال معلوم ہو سکتا ہے''۔

8.10.1 فن اسماء الرجال کا آغاز

علم اسماء الرجال کی ضرورت چوں کہ سند حدیث کے طویل ہونے اور راویان حدیث کے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل جانے کی وجہ سے پیش آئی ہے، اس لئے اس موضوع پر تالیف کا آغاز بھی تاخیر سے ہوا، بعض محققین کے مطابق اس موضوع پر دوسری صدی ہجری کے نصف سے تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا ہے، اس سے پہلے کسی کتاب کا ذکر نہیں ملتا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ راویوں کے حالات پر گفتگو شروع ہی سے کی جاتی رہی، اور ان کی تفصیلات کو سینہ بہ سینہ لوگ منتقل کرتے رہے، یہی وجہ ہے کہ دوسری صدی ہجری کے نصف سے پہلے کے جو راوی ہیں، جیسے ہزاروں صحابہ اور کبار تابعین وغیرہ، ان سب کے حالات بھی بڑی تفصیل سے کتابوں میں دستیاب ہیں، بہر حال فن اسماء الرجال پر جو بالکل ابتدائی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(1) کتاب التاریخ: از امام لیث بن سعد (متوفی 175ھ) اب تک کی تحقیق کے مطابق علم اسماء الرجال پر یہ سب سے قدیم کتاب ہے۔

(2) التاریخ: از امام عبداللہ بن مبارک (متوفی: 181ھ)۔

(3) امام ولید بن مسلم (متوفی: 195ھ) کی کتاب جس کا تذکرہ امام ذہبی نے کیا ہے۔

یہ بات آچکی ہے کہ یہ فن پہلے ہی سے موجود تھا، چنانچہ جو حضرات تحقیق سند، اور راویوں کے حالات پر گہری نگاہ رکھتے تھے، ان میں ایک نمایاں نام امام محمد بن سیرین (متوفی:110ھ) کا ہے، معروف محدث علی بن مدینی فرماتے ہیں: ''ابن سیرین حدیث پر گہری نگاہ رکھتے تھے، اور سند کے راویوں کی خوب تحقیق وتفتیش کیا کرتے تھے، اور اس جہت میں ان سے پہلے کوئی شخصیت نظر نہیں آتی ہے۔ ان کے بعد ایوب (متوفی:131ھ)، پھر ابن عون (متوفی:150) اور پھر شعبہ (متوفی:160ھ) ہیں، اور ان کے بعد راویان حدیث پر یحی بن سعید القطان (متوفی 198ھ) اور عبد الرحمن بن مہدی (متوفی 198ھ) نے گفتگو کی ہے۔ آخر الذکر دونوں ہی علم اسماء الرجال کے بلند پایہ امام شمار کئے جاتے ہیں، اور ہزاروں راویوں کے حالات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں، اس فن میں ان کے اقوال کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی ابتدائی عہد میں امام شعبی (متوفی:103ھ) بھی گزرے ہیں، علامہ ذہبی نے ان کے تئیں یہ بات لکھی ہے کہ صحابہ کے دور کے بعد سب سے پہلے انہوں نے راویوں کے بارے میں جرح کا کام کیا، اور فن اسماء الرجال کا گویا ان سے ہی آغاز ہوتا ہے، اس کے بعد تسلسل کے ساتھ محدثین اور حفاظ نے اس جانب توجہ کی اور اس فن کی آبیاری کرتے رہے ہیں۔

8.10.2 اسماء الرجال کی چند اہم کتابیں

اس موضوع پر جو کتابیں تصنیف کی گئیں، ان میں مختلف اسلوب اختیار کیے گئے ہیں، بعض وہ ہیں جو صرف صحابہ وصحابیات کے حالات پر ہیں، بعض وہ ہیں جو صرف ثقہ راویوں کے حالات سے بحث کرتی ہیں، اور بعض وہ ہیں جن میں محض ضعیف اور مجروح راویوں کے حالات جمع کیے گئے ہیں، اور کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن میں حدیث کی خاص کتاب کے راویوں کو زیر بحث لایا گیا ہے اور چند کتابوں میں ہر طرح کے راویوں کے حالات جمع کردیئے گئے ہیں، ذیل میں چند کتابوں کا ذکر کیا جارہا ہے:

(1) تاریخ الرواۃ: امام یحی بن معین (متوفی:233ھ) کی تالیف ہے، یعنی تیسری صدی ہجری کے آغاز ہی میں یہ کتاب لکھی گئی، حدیث کے راویوں کے حالات اس میں جمع کیے گئے ہیں، تمام راویوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر رکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب مخطوط کی شکل میں تھی، مگر ماضی قریب میں ڈاکٹر احمد نور سیف کی تحقیق کے ساتھ ''یحی بن معین وکتابہ التاریخ'' کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔

(2) التاریخ الکبیر: امام محمد بن اسماعیل البخاری (متوفی:256ھ): یہ کتاب بھی مختلف قسم کے راویوں کے حالات پر مشتمل ہے، مؤلف نے تمام ناموں کو حروف تہجی کی ترتیب پر جمع کردیا ہے۔ اور دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے 8 جلدوں میں طبع ہوچکی ہے۔ امام بخاری ہی کی فن اسماء الرجال پر دو اور کتابیں بھی ہیں، ''التاریخ الاوسط'' اور ''التاریخ الصغیر'' اول الذکر کا غالبا اب تک سراغ نہیں ملا ہے۔ واضح ہو کہ عالم عرب کے بعض کتب خانوں نے التاریخ الصغیر ہی کو التاریخ الاوسط کے نام سے شائع کردیا ہے؛ البتہ التاریخ الصغیر بہت پہلے ہندوستان سے طبع ہوچکی ہے۔

(3) تہذیب الکمال فی اسماء الرجال: علم رجال اور جرح وتعدیل کے مشہور امام حافظ جمال الدین ابوالحجاج یوسف بن عبد الرحمن مزی (متوفی:742) کی یہ تالیف ہے، یہ کتاب اصل میں الکمال فی اسماء الرجال، نامی کتاب کی تہذیب ہے، مزی کی اس کتاب میں حدیث کی چھ متداول کتابوں کے راویوں کے حالات جمع کیے گئے ہیں، اس کتاب میں بھی تمام راویوں کو حروف تہجی کی ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے۔ خواتین راویات کا تذکرہ مستقل طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ عالم عرب کے معاصر محقق ڈاکٹر بشار عواد معروف کی تحقیق سے یہ کتاب 36 رجلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔

(4) **تقریب التهذیب** : علامہ ابن حجر عسقلانیؒ (متوفی:852ھ) کی ترتیب کردہ ہے، یہ کتاب ایک جلد میں ہے، مگر یہ تہذیب الکمال جیسی وقیع کتاب کا عطر ہے اور اس فن کی نفیس وعمدہ کتاب ہے، معروف محدث شیخ محمد عوامہ کی تحقیق سے طبع ہوچکی ہے۔

8.10.3 صحابہ کے حالات پر اہم چند کتابیں

1. **الاستیعاب** ، از ابن عبدالبر (متوفی:463ھ) مطبوع
2. **اسد الغابة فی معرفة الصحابة** : از ابن الاثیر جزری (متوفی:۶۳۰ھ) مطبوع
3. **الاصابة فی تمییز الصحابة** : از حافظ ابن حجر (متوفی:۸۵۲ھ) مطبوع

8.11 اصول جرح وتعدیل

حدیث کے روایت کرنے والوں کی تعداد کم وبیش پانچ لاکھ ہے، مگر وہ سب تقویٰ وپاکیزگی، فہم وفراست، امانت ودیانت اور حفظ وذکاوت میں یکساں درجہ کے نہیں تھے، ان میں بعض ثقہ وبا اعتماد تھے، اور بعض ضعیف وکمزور، بعض تو عدالت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے تھے، اور بعضے اس سے محروم، اور اصول یہ ہے کہ جس حدیث کے روایت کرنے والے ثقہ اور عادل ہوں، ان کی روایت کو قبول کیا جاتا ہے، اور جس کو روایت کرنے والے ضعیف یا تہمت کے شکار ہوں، تو ان کی روایت کو قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسے اصول وقواعد ایجاد کئے جائیں جن سے ان راویوں کی درجہ بندی کی جاسکے، اور ایسی فہرست تیار کردی جائے کہ جس میں با اعتماد راویوں کی بھی نشاندہی ہو اور کمزور ومجروح راویوں کو بھی نامزد کردیا جائے؛ چنانچہ اسی لئے یہ فن ''اصول جرح وتعدیل'' وجود میں لایا گیا۔

8.11.1 لغوی تعریف

یہ دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں، ''جرح'' کے لغوی معنی زخمی کرنا، عیب لگانا یا توہین کرنا ہے۔ اور تعدیل ''عدل'' سے بنا ہے، عدل کے معنیٰ انصاف کے ہیں، اور تعدیل سے مراد تزکیہ ہے۔

8.11.2 اصطلاحی تعریف

علم ''اصول جرح وتعدیل'' کی محدثین نے متعدد تعریفیں کی ہیں، ان میں سے ایک واضح اور جامع تعریف یہ ہے:

وہ علم جس کا تعلق راویوں کی درجہ بندی سے ہو، اس طور پر کہ محدثین کی ایجاد کردہ اصطلاحات اور تعبیرات کے ذریعہ راویوں کو ضعیف یا ثقہ یا عادل ومجروح قرار دیا جائے۔

تو گویا کہ اس علم میں جہاں راویوں کی خوبیوں؛ جیسے تقوی وپرہیزگاری، حفظ وامانت داری، ذہانت وذکاوت اور قوت حفظ وادائیگی سے بحث کی جاتی ہے، اسی طرح ان کے عیب، جیسے راویوں کی کذب بیانی، نسیان وغفلت شعاری اور فسق وفجور سے بھی بحث ہوتی ہے۔

8.11.3 جرح وتعدیل کا شرعی ثبوت

حدیث کے راویوں کی مختلف کیفیتوں کو بیان کرنا اوران کے ثقہ یا ضعیف ہونے کا حکم لگانا قرآن وحدیث سے ثابت ہے ،واضح ہو کہ اس کا مقصد کسی کی عیب جوئی یا مدح سرائی نہیں ہے ؛ بلکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث وسنت کی صیانت مقصود ہے۔

اس بابت قرآن مجید کی اس آیت سے رہنمائی ملتی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ [حجرات:6]

(اے ایمان والوں !اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو، ورنہ ایسا نہ ہو کہ نا سمجھی میں کسی قوم پر چڑھ دوڑو اور پھر کل کو اپنے کیے پر پشیماں ہو)

گویا کہ اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ ہر کس و نا کس کی خبریوں ہی تسلیم نہ کرلی جائے ، بلکہ خبر دینے والے،اور روایت کرنے والے کی تحقیق کرلی جائے۔

خود رسول اللہ ﷺ نے بھی بعض افراد پر جرح کیا ہے،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسی طرح کا ایک واقعہ نقل کرتی ہیں:

''ایک صاحب نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی ،آپ ﷺ نے اجازت دے دی، جب ان پر نظر پڑی تو فرمایا: فلاں قبیلہ کا یہ بہت ہی برا آدمی ہے۔مگر جب وہ آبیٹھے،تو آپ ﷺ نے ان کے ساتھ بھلا سلوک کیا اور خوش گفتاری سے پیش آئے''۔

اس حدیث سے لوگوں پر جرح وتنقید کی اجازت معلوم ہوتی ہے،امام نووی نے اس روایت کے بارے میں مزید وضاحت کی ہے کہ یہ شخص بظاہر اسلام قبول کر چکا تھا،مگر اس کا دل مطمئن نہیں تھا، چنانچہ اس سے کسی طرح کا دھوکہ نہ ہو اس لئے آپ ﷺ نے لوگوں پر اسے آشکارا کردیا۔

ایک بزرگ ابوتراب النخشی نے امام احمد بن حنبل کو جرح کرتے ہوئے سنا تو کہنے لگے:اے امام!علماء کی غیبت کرنے سے گریز کیجئے ،امام احمد بن حنبل نے جواب دیا: تمہارا برا ہو، یہ غیبت نہیں ہے یہ تو دین کے تئیں ہمدردی اور بہی خواہی ہے۔

گویا کہ جرح وتعدیل کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہے اور یہ ایک شرعی ذمہ داری ہے،اس کا مقصد حدیث وسنت کو ہر طرح کی آمیزش سے بچانا ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جرح وتعدیل بہت ہی نازک کام ہے،کسی عادل اور منصف راوی کو کمزور،اور کمزور وفاسق کو با اعتماد اور منصف قرار دے دیا جائے ،تو یہ بیک وقت ظلم و نا انصافی بھی ہوگی ،اور حدیث وسنت کے تئیں خیانت وبد دیانتی بھی،اور ظاہر ہے یہ دونوں سخت گناہ کے کام ہیں۔

8.11.4 فن جرح وتعدیل کا آغاز

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ نے حدیثوں کو جمع کرنے کا خوب اہتمام کیا، وہ باہم حدیثیں سنتے اور سناتے اوران کی ترویج واشاعت کی فکر کرتے، ان کے دوش بدوش تابعین بھی اس کام کو انجام دیتے، گویا کہ پہلی صدی ہجری کے اختتام تک حدیثیں زیادہ تر صحابہ اور کبار تابعین کے ہاتھوں گشت کرتی رہیں، عام طور پر جھوٹے، کذب بیانی کرنے والے راویوں کا گزر اس زمانہ میں نہ تھا، بجز حارث اعور، مختار کذاب اوران کے بعض ہمنواؤں کے، چنانچہ بعض صحابہ سے بھی روایت کو قبول کرنے، اسی طرح راویوں پر جرح وتعدیل کرنے کا ثبوت ملتا ہے، ان میں خاص طور پر عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہم کے نام قابل ذکر ہیں۔ مگر جیسے جیسے پہلی صدی ہجری ختم ہوئی اور دوسری صدی ہجری کا آغاز ہوا، تو تابعین کے درمیانی طبقہ میں ضعیف راویوں کی ایک جماعت پیدا ہوئی، جو احادیث کے بیان کرنے میں غلطی کا ارتکاب کر جاتی، جیسے یہ لوگ صحابہ یا کبار تابعین کے قول کو رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب کر دیتے، یا براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کرنے لگتے، نیز حدیثوں کے حفظ اور ادائیگی میں غلطیاں کرتے۔ مگر جب تابعین کا آخری دور آیا (یعنی 150ھ) تو ضعیف راویوں کی تعداد بڑھتی گئی، اب محدثین نے راویوں کی نشاندہی کے لئے ان پر جرح وتعدیل شروع کی، اس دور میں کئی اہل علم کے نام تاریخ نے محفوظ کئے ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے جابر جعفی کے بارے میں کہا: ''میں نے اس سے بڑا جھوٹا کسی کو نہیں پایا''۔ اعمش نے بھی راویوں کے ایک گروہ کی تضعیف اور ایک کی توثیق کی ہے۔ شعبہ کو اس فن میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ امام مالک نے بھی راویوں پر کلام کیا اور بہت سے ضعیف راویوں کی نشاندہی کی۔

یہی وہ حالات تھے جن میں علم جرح وتعدیل کی نشو ونما ہوئی، چنانچہ محققین کے مطابق فن اسماء الرجال اور علم جرح وتعدیل دونوں کا آغاز دوش بدوش ہوا، گویا کہ جرح وتعدیل کا فن پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی ہجری کے آغاز پر باضابطہ وجود میں آیا۔

8.11.5 ائمہ جرح وتعدیل کی تعداد:

جرح وتعدیل میں علمی گہرائی، وسعت مطالعہ، راویوں کی تمام حدیثوں پر نگاہ اور بیدار مغزی کی ضرورت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں اہل علم کی تعداد بہ نسبت حدیث کے دوسرے میدانوں کے کم نظر آتی ہے۔ عام محدثین کی تعداد اگر ہزاروں میں ہے تو اس میدان کے رجال کار کی تعداد چند سو میں محدود ہے۔ ائمہ نے ایسے اہل علم کی ایک فہرست تیار کر دی ہے، جنھوں نے راویوں کی درجہ بندی کے لئے مختلف اصول وقواعد وضع کئے ہیں اور ان کو ثقہ یا ضعیف قرار دینے کیلئے پیمانے متعین کئے ہیں۔ واضح ہو کہ انہیں ہی ائمہ جرح وتعدیل کہا جاتا ہے، علامہ ذہبی کا اس موضوع پر بڑا وقیع علمی کام ہے، چنانچہ آپ نے آٹھویں صدی تک کے ائمہ جرح وتعدیل کے نام ایک کتاب ''ذكر من يعتمد قوله في الجرح والتعديل'' میں جمع کر دئے ہیں، آپ کی تحقیق کے مطابق یہ آئمہ وناقدین 715 ہیں۔ یہ تعداد صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور اس کے بعد سے آٹھویں صدی تک کے ائمہ کی ہے، ان میں 7/صحابہ کرام، 21/تابعین اور 47/تبع تابعین کا ذکر کیا گیا ہے۔

ائمہ جرح وتعدیل کے حالات زندگی یا ان کے محض ذکر پر جو اہم کتابیں تالیف کی گئی ہیں، ان میں سے چند اس طرح ہیں:

1. مقدمة الجرح والتعديل ، از ابن ابی حاتم
2. مقدمة الكامل ، مقدمہ از عبداللہ بن عدی الجرجانی
3. ذكر من يعتمد قوله في الجرح والتعديل ، از ذہبی
4. الاعلان بالتوبيخ لمن ذم التاريخ ، از سخاوی

یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جرح وتعدیل کے جو امام گزرے ہیں ان سب کی خدمات یا ان کا کلام اپنے حجم اور کمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہے، بعض وہ ہیں جنہوں نے بیشتر حدیث کے راویوں پر کلام کیا، اور بعض نے محض دو چار پر، چنانچہ ان ائمہ کو حسب ذیل تین دائروں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1. وہ لوگ جنہوں نے حدیث کے اکثر راویوں پر کلام کیا ہے۔ جیسے: ابن معین اور ابو حاتم الرازی۔
2. وہ لوگ جنہوں نے بہت سے راویوں پر گفتگو کی ہے، جیسے: امام مالک اور شعبہ وغیرہ۔
3. وہ لوگ جنہوں نے دو چار راویوں پر گفتگو کی ہے، جیسے: امام ابوحنیفہؒ، امام شافعی اور سفیان ابن عیینہ وغیرہ۔

8.11.6 جرح وتعدیل کے بارہ مراتب

حافظ ابن حجرؒ نے جرح وتعدیل کے قواعد اور محدثین کی تعبیرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے راویوں کے بارہ مراتب وضع کئے ہیں ، جرح وتعدیل کے لئے ان سے آگہی ضروری ہے، تقریب التہذیب سے وہ مراتب پیش ہیں:

پہلا مرتبہ: صحابی ہونا (یہ توثیق کا سب سے اعلیٰ رتبہ ہے، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بلاشبہ عادل ہیں)۔

دوسرا مرتبہ: اس میں وہ رواۃ ہیں جن کی تعدیل ائمہ جرح وتعدیل نے تاکید کے ساتھ کی ہے؛ خواہ صیغۂ اسم تفضیل استعمال کیا ہو، جیسے: ''أوثق الناس'' یا کسی خوبی پر مبنی صفت کو دوبار استعمال کیا ہو، جیسے ''ثقة ، ثقة'' یا معنیٰ مکرر استعمال کیا ہو، جیسے ''ثقة حافظ''۔

تیسرا مرتبہ: اس میں وہ رواۃ ہیں جو مرتبۂ ثالثہ سے کچھ کم رتبہ ہیں، ان کے لئے ابن حجر نے تقریب میں ''صدوق'' یا ''لا بأس به'' یا ''ليس به بأس'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

چوتھا مرتبہ: اس میں وہ رواۃ ہیں جو مرتبہ رابعہ سے کچھ کم رتبہ ہیں، ان کے لئے ''صدوق سيئ الحفظ'' یا ''صدوق يهم'' یا ''صدوق له أوهام'' یا ''صدوق يخطئ'' یا ''صدوق تغير بآخره'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں، نیز وہ تمام رواۃ بھی اسی رتبہ میں ہیں جن پر بدعقیدہ ہونے کا الزام ہے، مثلاً شیعہ ہونا، قدری ہونا، ناصبی ہونا، مرجیٔ ہونا یا جہمی ہونا وغیرہ۔

چھٹا مرتبہ: اس میں وہ رواۃ ہیں جن سے بہت کم احادیث مروی ہیں اور ان کے بارے میں کوئی ایسی جرح ثابت نہیں جس کی وجہ سے ان کی حدیث کو متروک قرار دیا جائے، ان کے لئے اگر کوئی متابع ہے تو ''مقبول'' ورنہ ''لين الحديث'' کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

ساتواں مرتبہ :اس میں وہ رواۃ ہیں جن سے روایت کرنے والے تو ایک سے زائد تلامذہ ہیں، مگر کسی امام نے ان کی توثیق نہیں کی، ان کے لئے "مستور" یا "مجھول الحال" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

آٹھواں مرتبہ: اس میں وہ رواۃ ہیں جن کی توثیق نہیں کی گئی ہے؛ تضعیف کی گئی ہے، اگرچہ وہ تضعیف مبہم ہو، ان کے لئے "ضعیف" استعمال کیا جاتا ہے۔

نواں مرتبہ :اس میں وہ رواۃ ہیں جن سے روایت کرنے والا صرف ایک ہی شاگرد ہے اور کسی امام نے ان کی توثیق نہیں کی، ان کے لئے "مجھول" استعمال کیا گیا ہے۔

دسواں مرتبہ :اس میں وہ رواۃ ہیں جن کی کسی نے بھی توثیق نہیں کی اور ان کی نہایت سخت تضعیف کی گئی ہے، ان کے لئے "متروک" یا "متروک الحدیث" یا "واھی الحدیث" یا "ساقط" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

گیارہواں مرتبہ :اس میں وہ رواۃ ہیں جن پر جھوٹ کی تہمت ہو، بایں وجہ کہ ان کی روایت شریعت کے قواعد معلومہ کے خلاف ہے یا لوگوں کے ساتھ بات چیت میں ان کا جھوٹ ثابت ہو چکا ہے۔

بارہواں مرتبہ :اس میں وہ رواۃ ہیں جن کے متعلق کذب اور وضع کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

8.11.7 اصول جرح وتعدیل کی چند مشہور کتابیں

1. قاعدة فی الجرح والتعدیل ،ازعلامہ تاج الدین سبکی۔
2. الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل ،ازعلامہ عبدالحی لکھنوی
3. ضوابط الجرح والتعدیل ،ازشیخ عبدالعزیز عبداللطیف
4. جرح الرواۃ وتعدیلھم الأسس ولضوابط،از ڈاکٹر محمود عیدان

8.12 خلاصہ

حدیث وسنت چوں کہ اسلام کا قرآن کے بعد دوسرا سب سے اہم ترین سرچشمہ ہے؛ اس لئے فتنہ پردازوں نے اسے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے مستشرقین اور مغرب زدہ مشرق کے اصحاب دانش نے یہ بے معنی بات کہنی شروع کی کہ سارا ذخیرہ احادیث غیر مستند اور نا قابل اعتبار ہے، ان کے زعم کے مطابق حدیثیں ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذرنے کے بعد تحریری شکل میں لائی گئیں، مگر ظاہر ہے یہ ان کا وہم اور بے بنیاد خیال ہے؛ کیوں کہ اس بات کے ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ عہد رسالت ہی میں کتابت حدیث کا آغاز ہو چکا تھا؛ چنانچہ کئی صحیفے اور نوشتے ایسے ہیں جو خود رسول اللہ ﷺ نے براہ راست تحریر کروائے، ابوشاہ یمنی کے لئے پورا خطبہ قید تحریر میں لایا گیا ،عمرو بن حزم کا مجموعہ حدیث جس میں اہل یمن کے لئے ہدایات تھیں، کتاب الصدقہ، زرعی پیداوار سے متعلق نوشتہ، وائل بن حجر کے ساتھ احکام کی تفصیلات یمن روانہ کی گئیں وغیرہ، یہ وہ نوشتے ہیں جو خود آں حضور ﷺ نے تیار کروائے، اس کے علاوہ عہد صحابہ میں کم وبیش 10 رصحابہ کے صحیفے وجود میں آچکے تھے، مولانا مناظر احسن گیلانی کے مطابق دس ہزار سے زیادہ حدیثیں خود عہد رسالت میں تحریری شکل میں جمع ہو چکی تھیں۔ تدوین کے معنی ہیں بکھری ہوئی اور متفرق چیزوں کو یکجا کر دینا اور "تدوین حدیث" سے مراد یہ ہے

کہ مختلف نوشتوں اور صحیفوں میں بکھری ہوئی حدیثوں کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے۔ اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے تو تدوین حدیث کا آغاز عہد رسالت ہی میں ہو چکا تھا، مگر باضابطگی کے ساتھ اس کی ابتداء حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی خلافت کے سال (99ھ) میں ہوئی، آپ نے پوری اسلامی سلطنت میں فرمان بھیجا کہ احادیث رسول کو تلاش کر کے جمع کیا جائے، اس تحریک کے نتیجہ میں حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ کتابی شکل میں مدوّن ہو گیا؛ چنانچہ پہلی صدی ہجری میں حدیث وسیرت پر آٹھ کتابیں تصنیف کر لی گئیں، خاص طور پر محمد بن شہاب زہری نے اس کام کو خوب تقویت پہنچائی، اسلامی تاریخ میں جب فتنوں نے جنم لینا شروع کیا تو اس کا اثر حدیثوں پر بھی ہوا، تحقیق کے مطابق فتنہ کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں ہوا، عبد اللہ بن سبا اور اس کے ہمنواؤں نے اس کی تخم اول رکھی، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلافات کی شدت نے اور بھی فتنہ پردازوں کو موقع فراہم کیا؛ چنانچہ یہاں سے ''وضع حدیث'' کا سلسلہ شروع ہوا، ''وضع حدیث'' سے مراد یہ ہے کہ وہ روایت جو من گھڑت اور خود ساختہ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت جھوٹ پر مبنی ہو، حدیثیں وضع کرنے کے مختلف اسباب رہے، زنادقہ نے اسلام کی شبیہ خراب کرنے کے لئے حدیثیں گڑھیں، اسی طرح سیاسی مفادات کا حصول، مسلکی وگروہی تعصب، صوفیاء کی طرف سے ترغیب وترہیب کا مقصد، نیز دنیاوی اغراض کے خاطر بھی لوگوں نے اس گناہ کا ارتکاب کیا۔

حدیث دراصل دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے، سند اور متن، سند سے مراد حدیث نقل کرنے والے افراد کا وہ سلسلہ ہے جو متن حدیث تک پہنچتا ہے، سند کی بہت زیادہ اہمیت ہے؛ بلکہ کسی حدیث کے قبول ورد کرنے میں سند ہی کو معیار بنایا جاتا ہے، کسی حدیث کو بیان کرنے والے سے سند کی تحقیق عہد صحابہ ہی سے کی جاتی تھی، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور فتنہ کے ظہور کے بعد صحابہ اور تابعین نے باضابطگی کے ساتھ اس جانب توجہ کی، اور خوب سختی برتی، جوں جوں عہد نبوت سے فاصلہ بڑھتا گیا سند کے واسطے بھی بڑھتے گئے، اب ضرورت اس بات کی پیش آئی کہ روایت کرنے والے ان لوگوں کے حالات قلم بند کر لئے جائیں؛ چنانچہ اس کے لئے ''فن اسماء الرجال'' کی بنیاد رکھی گئی، اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب امام لیث بن سعد (متوفی: 175ھ) کی ''کتاب التاریخ'' ہے، امام یحیی بن سعید القطان (متوفی: 198ھ)، عبد الرحمن بن مہدی (متوفی: 198ھ) بطور خاص اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں، نیز امام بخاری کی ''التاریخ الکبیر''، ''التاریخ الأوسط''، ''التاریخ الصغیر'' اور حافظ یوسف بن عبد الرحمن ''مزی کی تہذیب الکمال وغیرہ اس فن کی ممتاز تالیفات سمجھی جاتی ہیں۔ حدیث کے روایت کرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے، مگر وہ سب تقوی وپاکیزگی، فہم وفراست، امانت ودیانت میں یکساں درجہ کے نہیں ہیں، ان میں کچھ عادل وثقہ ہیں تو کچھ ضعیف ومجروح، اور اصول یہ ہے کہ جس حدیث کے روایت کرنے والے ثقہ وعادل ہوں ان کی روایت قبول کی جاتی ہے، اور اگر ضعیف ومجروح ہوں تو ان کی روایت ناقابل قبول ہوتی ہے؛ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان راویوں کی درجہ بندی کی جائے؛ چنانچہ اسی لئے فن جرح وتعدیل وجود میں لایا گیا، اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے: وہ علم جس کا تعلق راویوں کی درجہ بندی سے ہو اس طور پر کہ محدثین کی ایجاد کردہ اصطلاحات اور خاص تعبیرات سے ان کے ضعیف وثقہ یا عادل ومجروح ہونے کا فیصلہ کیا جائے، اس فن کا آغاز باضابطہ طور پر دوسری صدی ہجری کے آغاز پر ہوا ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں 7 لوگ جرح وتعدیل کے کام سے خاص مناسبت رکھتے تھے، اور مجموعی طور پر اس فن پر گفتگو کرنے والے محدثین کی تعداد 715 ہے۔

8.13 نمونے کے امتحانی سوالات

درج سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے:

1- کتابت حدیث کی اجازت کب دی گئی، نیز کن اسباب کی بناء پر ابتداء اسلام میں اس سے منع کیا گیا تھا؟

2- تدوین حدیث کی مراد بیان کرتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالئے۔

3- وضع حدیث کے محرکات شمار کراتے ہوئے، اس موضوع کی دو کتابوں کا تعارف تحریر کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے:

1- عہد نبوی کے تحریری نوشتوں پر ایک نوٹ قلم بند کیجیے۔

2- سند کی اہمیت پر محدثین کے اقوال کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے علم الرجال کی دو کتابوں کا تعارف کرائیے۔

3- اصول جرح و تعدیل سے کون سا فن مراد ہے اور اس کا آغاز کب ہوا؟

8.14 فرہنگ

فروگذاشت	: بھول چوک
زندیق	: بے دین
متداول	: عام، رائج
متروک	: چھوڑا ہوا
نسیان	: بھول
صیانت	: حفاظت
آمیزش	: ملاوٹ
ترویج	: رواج دینا

8.15 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. حدیث اور محدثین — ڈاکٹر محمد ابوزہو — ترجمہ: غلام احمد جریری
2. موسوعۃ علوم الحدیث — وزارۃ الاوقاف مصر

اکائی : 9 روایت حدیث

اکائی کے اجزاء

9.1 مقصد

9.2 تمہید

9.3 راویان حدیث۔صحابہ

9.4 مکثرین صحابہ

9.4.1 حضرت ابو ہریرہؓ

9.4.2 حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

9.4.3 حضرت انس بن مالکؓ

9.4.4 سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

9.4.5 حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

9.4.6 حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما

9.4.7 حضرت ابو سعید خدریؓ

9.5 محدث تابعین

9.5.1 سعید بن المسیب (متوفی:96ھ)

9.5.2 عروہ بن زبیر (متوفی:94ھ)

9.5.3 ابن شہاب زہریؒ (متوفی:124ھ)

9.5.4 عطا بن ابی رباحؒ (متوفی:114ھ)

9.5.5 عمر بن عبدالعزیزؒ (متوفی:101ھ)

9.5.6 حسن بصریؒ (متوفی:110ھ)

9.5.7 سالم بن عبداللہ (متوفی:106ھ)

9.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ حدیث کی نشرواشاعت میں صحابہ کرام کی خدمات سے آگاہ ہوں گے، نیز تابعین میں جوحضرات حدیث کے حوالے سے نمایاں مقام رکھتے ہیں ان سے واقفیت حاصل کریں گے، اسی طرح روایت حدیث کے مختلف اسلوب کی جانکاری بھی انہیں حاصل ہوگی۔

9.2 تمہید

حدیث وسنت کی جوامانت آج امت کے ہاتھوں میں موجود ہے، اس کی حفاظت اور نشرواشاعت میں سب سے نمایاں اور کلیدی کردار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت نے ادا کیا، یہ حضرات رسول اللہ ﷺ سے وابستہ تمام معلومات بڑی باریک بینی اور دیانت وامانت کے ساتھ محفوظ کرتے؛ چنانچہ ان کو اپنے عمل اور قلم وقرطاس کے ذریعہ اگلی آنے والی نسلوں کے لئے اس طور پر محفوظ کردیا کہ فتنہ پرور افراد کو دسیسہ کاری کا موقع نہ مل سکا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین کا دور آتا ہے، ان حضرات نے بھی بڑی تن دہی اور محنت وجستجو کے ساتھ اس کاز کو آگے بڑھایا، اور تابعین میں کئی بلند قامت محدثین پیدا ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ابتدائی

دونوں عہد میں حدیث کی جو خدمت اور آبیاری کی گئی؛ اسی وجہ سے آج یہ ذخیرہ محفوظ ہے، اور اسلامی شریعت کا ہر گوشہ نبوی ہدایات سے بہرہ ور ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی صحابہ ؓ وتابعین کی اہمیت وفضیلت کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''وہ انسان خوش نصیب ہے، جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا'' (سنن ترمذی، حدیث نمبر:3862)

آپ ﷺ نے فرمایا:

''سب سے بہترین زمانہ میرا ہے پھر وہ جو میرے بعد کا ہے، پھر وہ جو اس کے بعد کا ہے'' (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر: 32411، صحیح بخاری: 2651)۔

9.3 راویان حدیث۔ صحابہ

صحابۂ کرام ؓ نے براہ راست حدیثوں کو رسول اللہ ﷺ سے سنا اور احکام دین کو سیکھا، اور ان کے ذریعہ تابعین تک حدیثیں پہنچیں، گویا سند حدیث کا آغاز دراصل صحابۂ کرام ؓ سے ہوتا ہے، اور حدیث کو ابتداء روایت کرنے والے صحابہ ؓ ہی تھے۔

وہ مبارک نفوس جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت پائی اور صحابی/ صحابیہ کے لقب سے نوازے گئے، متعینہ طور پر ان کی تعداد ذکر کرنا مشکل ہے، مختلف اہل علم نے اندازہ وتخمینہ کی بنیاد پر بعض اعداد وشمار ذکر کئے ہیں، مگر انہیں قطعی سمجھنا دشوار ہے؛ اس لئے کہ صحابۂ کرام ؓ مختلف خطوں اور علاقوں میں آباد تھے؛ لہٰذا ان کے اعداد وشمار باضابطگی کے ساتھ نہیں جمع کئے جاسکے، مشہور قول کے مطابق ابوزرعہ رازی کہتے ہیں: ''آپ ﷺ کی وفات کے وقت تک جن لوگوں نے آپ ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ سے حدیثیں سنیں ان کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تھی''، علامہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب ''الاستیعاب'' میں 4223 صحابہ کا ذکر کیا ہے، اور ''اسد الغابہ'' میں ایسے 7703 صحابہ ؓ کے حالات لکھے گئے ہیں، ابن الجوزی نے صحابہ کی جو فہرست ان کی مرویات کے ساتھ دی ہے، ان کی تعداد 1060 ہے، ان میں سے 500 ایسے صحابہ ہیں جن میں سے ہر ایک نے ایک ایک حدیث نقل کی ہے، اور 32 ایسے ہیں جنہوں نے دو دو حدیثیں روایت کی ہیں، 60 تا 80 وہ حضرات تھے جن کی روایتوں کی تعداد 3 سے 30 تک پہنچتی ہے۔

9.3.1 صحابی کی تعریف

محدثین نے مختلف اسلوب میں صحابہ کی تعریف کی ہے، مگر سب سے مناسب یہ تعریف سمجھی جاتی ہے:

''صحابی اس شخص کو کہتے ہیں، جس نے بحالت ایمان رسول اللہ ﷺ کو دیکھا یا آپ کی صحبت کو پایا ہو، اور اس کی موت ایمان پر ہوئی ہو''۔

اس تعریف کی رو سے وہ تمام لوگ ''صحابی'' کہلائیں گے، جنہوں نے بحالت ایمان رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو، یا نابینا ہونے کی وجہ کر دیکھ تو نہ پائے ہوں، مگر آپ ﷺ کی صحبت پائی ہو، خواہ ان لوگوں نے کم عرصہ آپ کے ساتھ گزارا ہو یا زیادہ، اسی طرح انہوں نے کوئی روایت نقل کی ہو یا نہ کی ہو، بہر حال وہ سب صحابی کہلائیں گے۔

9.3.2 صحابی کی پہچان

کسی شخص کا صحابی ہونا مختلف چیزوں سے ثابت ہوتا ہے، جو حسب ذیل ہیں:

1. امت کے تواتر سے معلوم ہو کہ فلاں شخص صحابی ہے، جیسے حضرت ابوبکر وعمر، عثمان وعلی اور عشرۂ مبشرہ۔
2. تواتر سے کم تر درجہ کی روایت سے کسی شخص کا صحابی ہونا معلوم ہو، جیسے ضمام بن ثعلبہ اور عکاشہ بن محصن۔
3. کوئی معروف صحابی کسی شخص کے بارے میں گواہی دے کہ وہ صحابی ہے، جیسے کہ ابوموسیٰ اشعری نے حممہ بن ابی حممہ کے بارے میں شہادت دی تھی کہ وہ صحابی ہیں۔
4. کسی شخص کا بذات خود یہ دعویٰ کرنا کہ وہ صحابی ہے، بشرطیکہ اس نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا ہو، نیز اس کی ثقاہت وعدالت بھی ثابت ہو۔
5. کوئی تابعی کسی شخص کے بارے میں کہے کہ وہ صحابی ہے؛ البتہ اس میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا جائے گا کہ اس شخص نے عہد رسالت کو پایا ہے یا نہیں۔

9.3.3 صحابہ کے طبقات۔ تعداد روایات کے اعتبار سے

جن صحابہ ﷺ نے رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں نقل کی ہیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، صحیح طور پر ان کی تعیین نہیں کی جاسکتی ہے ؛ اس لئے محدثین نے مجموعی طور پر ان صحابہ کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے، مکثرین، متوسّطین اور مقلّین ۔مکثرین سے مراد: وہ صحابہ وصحابیات ہیں، جن کی روایتوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے، ایسے سات حضرات ہیں، جن کے نام اور حدیثوں کی تعداد اس طرح ہے:

حضرت ابو ہریرہ ﷺ	5374
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما	2630
حضرت انس بن مالک ﷺ	2286
حضرت عائشہ صدیقہؓ	2210
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما	1660
حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما	1540
حضرت ابوسعید خدری ﷺ	1170

اور بعض وہ صحابہ ہیں جن کی روایتیں سو سے زائد اور ہزار سے کم ہیں، جیسے حضرت ام سلمہ، سہل بن سعد، عبادۃ بن صامت، ابوالدرداء، ابوبکر صدیق اور عثمان بن عفان ﷺ وغیرہ۔ انہیں ''متوسطین یا مقسطین'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بعض وہ حضرات

ہیں جن کی روایتیں کئی دہوں پر مشتمل ہیں، مگر سو سے کم ہیں؛ جیسے کہ زید بن ارقم، سلمہ بن اکوع، وائل بن حجر، زبیر بن عوام وغیرہ۔ یہ لوگ ''مقلین'' کہلاتے ہیں، ظاہر ہے ان دونوں طبقات کے صحابہ کے نام شمار کرنا مشکل ہوگا۔

9.4 مکثرین صحابہ

جیسا کہ ذکر کیا گیا صحابہ میں جن سے ہزار سے زائد روایتیں نقل کی گئی ہیں ان کی تعداد سات ہے، اور یہ مکثرین کہلاتے ہیں، ذیل میں ان حضرات کا تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے:

9.4.1 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

اسم گرامی عبدالرحمٰن بن صخر ہے، ایک روز رسول اللہ ﷺ نے انہیں ہاتھ میں بلی اٹھائے دیکھا تو فرمایا: ''یا ابا ہریرۃ'' اسی وقت سے آپ کی کنیت ابو ہریرہ پڑگئی، محرم 7 ھ میں اسلام قبول کیا، قبیلہ ازد کی شاخ بنو دوس بن عدنان بن عبداللہ سے تعلق رکھتے تھے۔

حدیث وسنت سے آپ کو خاص شغف تھا، خود رسول اللہ ﷺ نے یادداشت اور قوت حافظہ کی دعا سے نوازا تھا۔ اسی وجہ سے محدثین نے آپ کا ذکر صحابہ ﷺ میں سب سے بڑے حافظ حدیث کی حیثیت سے کیا ہے، چنانچہ آپ سے استفادہ کنندگان کی فہرست بہت طویل ہے، امام بخاری فرماتے ہیں: ''آٹھ سو سے زیادہ لوگوں نے آپ سے حدیثیں نقل کی ہیں''۔ ان میں بہت سے فاضل صحابہ کرام بھی شامل ہیں جیسے عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، ابوایوب انصاری، زید بن ثابت، جابر بن عبداللہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ اور تابعین میں سے اکثر ممتاز حضرات آپ کے شاگرد رہے ہیں، جیسے سعید بن مسیّب، سالم بن عبداللہ بن عمر، محمد بن سیرین، نافع مولی ابن عمر، عکرمہ اور مجاہد وغیرہ، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بھی طویل عمر پائی، بلکہ آپ کی وفات کے بعد 47 سال تک بقید حیات رہے، 57 ہجری میں بعمر 78 سال وفات پائی۔

حضرت ابو ہریرہ ﷺ کو حدیث وسنت سے جو شغف تھا اس کا اندازہ حسب ذیل تفصیلات سے لگایا جاسکتا ہے:

1. ہمہ دم رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر رہتے۔ ابو ہریرہ ﷺ فرماتے تھے: تم لوگ کہتے ہو کہ ابو ہریرہ حدیثیں بہت روایت کرتا ہے، تو سن لو، حقیقت یہ ہے کہ میں ایک تنگ دست آدمی تھا، حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے سوا مجھے کوئی کام نہ تھا، مہاجرین بازار میں کاروبار کرتے تھے، اور انصار اپنے مال کی حفاظت میں سرگرداں رہتے، اور میں حضور ﷺ کی مجلس میں حاضر رہتا، ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا:

> ''کون ہے جو میرے بات ختم کرنے تک چادر پھیلائے اور پھر اسے سمیٹ لے اور پھر اس کے بعد اس سنی ہوئی بات کو وہ کبھی نہیں بھولے گا، بعض روایتوں میں ہے کہ کوئی بھی بات نہیں بھولے گا، ابو ہریرہ ﷺ بیان کرتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے سلسلہ کلام ختم کیا تو میں نے چادر سمیٹ لی، اور اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس کے بعد میں کسی بات کو نہیں بھولا'' (صحيح البخاري حدیث نمبر: 2047)

2. حدیثوں سے حد درجہ شغف رکھتے، ایک موقع سے حضرت ابو ہریرہ ﷛ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ: روز قیامت آپ کی شفاعت کا حقدار سب سے زیادہ کون ہوگا؟ حضور ﷺ نے جواب دیا:

''میرا خیال تھا کہ تم سے پہلے کوئی شخص مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گا؛ اس لئے کہ تم حدیثوں سے بہت دلچسپی اور شغف رکھتے ہو'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر:99)

3. حدیثیں زبانی یاد کرنے کا اہتمام کرتے۔ ابو ہریرہ ﷛ خود کہتے ہیں کہ

''میں نے رات کے تین حصے کر لئے تھے، ایک تہائی میں نماز پڑھتا، ایک تہائی میں سوتا اور ایک تہائی میں رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں یاد کرتا'' (الجامع لاخلاق الراوی و آداب السامع: 2/464)

مذکورہ بالا روایتوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابو ہریرہ ﷛ کس درجہ حدیث سے دلچسپی رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ آپ ﷺ کی صحبت میں انہیں زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا، مگر آپ کی حدیثوں کی تعداد تمام صحابہ میں زیادہ ہے، چنانچہ آپ کی کل روایتیں 5374 ہیں، جن میں سے 325 روایتیں امام بخاری و مسلم نے روایت کی ہیں۔

اس کثرت روایت کی بنیاد پر اسلام دشمن عناصر نے حضرت ابو ہریرہ پر انگشت نمائی کی ہے، ان کی شبیہ مسخ کرنے کے ساتھ ساتھ پورے ذخیرۂ حدیث کو مشتبہ کرنے کی نازیبا کوشش کی ہے، اور بعض ناسمجھ مسلمان بھی ان بے بنیاد باتوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ ﷛ نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں چار سال سے کچھ زائد عرصہ گزارا ہے، اس شان کے ساتھ کہ شاذ و نادر ہی الگ ہوئے، صبح شام آپ ﷺ کی مجلس میں رہا کرتے، سفر و حضر میں ساتھ ہوتے، اگر ان ۵۳۷۴ حدیثوں کو چار سال یعنی 1440 دنوں پر تقسیم کیا جائے، تو یومیہ تین سے کچھ زائد اور چار سے کم حدیثوں کا تناسب بنتا ہے، ظاہر ہے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔

اسی طرح حدیث کی نو مشہور کتابوں کتب ستہ، مؤطا امام مالک، مسند احمد اور سنن دارمی میں ابو ہریرہ ﷛ کی روایتیں 8960 ہیں اور ان میں سے اگر مکرر روایتوں کو حذف کر دیا جائے، تو محض 1475 حدیثیں رہ جاتی ہیں، واضح رہے کہ یہ وہ روایتیں ہیں جنہیں ابو ہریرہ ﷛ کے بشمول دوسرے صحابہ ﷛ نے بھی روایت کیا ہے، گویا کہ وہ تنہا ان کے راوی نہیں ہیں، اور اگر ان میں سے صرف ان روایتوں کو الگ کر لیا جائے جو ابو ہریرہ ﷛ نے تنہا روایت کی ہیں تو ان روایتوں کی تعداد محض 42 تک پہنچتی ہے۔ گویا کہ حضرت ابو ہریرہ ﷛ کی حدیثوں کو تنقید کا نشانہ بنانا محض بے بنیاد بات ہے اور اس حد تک بات واضح ہو جانے کے باوجود کسی بھی انصاف پسند، صاحب عقل اور باشعور انسان کا حضرت ابو ہریرہ ﷛ کی روایتوں کو شک کی نظر سے دیکھنا یا ان کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانا محض کوتاہ عقلی اور تعصب و تنگ نظری کی دلیل ہے اور بغض و عناد کا ثبوت اور احادیث رسول ﷺ سے بے اعتمادی کا اظہار ہے۔

9.4.2 حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

حضرت عمر بن خطاب ﷛ کے صاحب زادے اور رسول اللہ ﷺ کے برادر نسبتی ہیں، بچپن ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا، اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار تھے، حدیث کی نشر و اشاعت میں بھی پیش پیش رہے، آپ نے حضرت عمر ﷛، اپنی ہمشیرہ ام المؤمنین حضرت حفصہ

،حضرت ابوبکر،عثمان،علی ،ابن مسعود،ام المؤمنین عائشہ،اورزید بن ثابت ﷺ وغیرہ سے حدیث روایت کی ہے، نیز آپ کے شاگر د وں کی بھی بہت لمبی فہرست ہے،جن میں خاص طور پر صحابہ میں سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، جابر وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ،اور تابعین میں سے نافع ،آپ کے چاروں صاحبزادے ،نیز عروہ بن زبیر،سعید بن المسیب ،طاؤس ،عطاء،عکرمہ اور مجاہد وغیرہ نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

حدیث سے اعتناء کا یہ عالم تھا کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں: ''ابن عمر ﷺ پر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے حوالے سے کوئی بات پوشیدہ نہ تھی''، زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ ''عبداللہ جو کچھ سنتے اسے یاد کرلیتے۔ جب حضور ﷺ انتقال کر گئے تو عبداللہ دوسروں سے آپ ﷺ کے ارشادات اور عمل کے بارے میں دریافت کرتے''۔امام ابن شہاب زہری کا خود معمول تھا کہ آپ کی رائے کے مقابلہ میں کسی رائے کو خاطر میں نہ لاتے۔عبداللہ بن عمر فتاویٰ کے باب میں بھی شہرت رکھتے تھے،لوگوں کے وفد حاضر خدمت ہو کر دینی مسائل دریافت کیا کرتے۔73ھ میں بعمر 85 سال وفات پائی،ابن عمر ﷺ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد 60 سال تک زندہ رہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ کی حدیثوں کی تعداد 2630 ہے،اس لئے آپ کثیر الروایہ صحابہ میں شمار ہوتے ہیں،اس کثرت روایت کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

1. آپ بچپن ہی میں اسلام لے آئے ،اس لئے آپ ﷺ کی صحبت خوب پائی ، نیز پابندی سے رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں شرکت کرتے۔ ذہانت وذکاوت کی وجہ کر حضور ﷺ کے منظور نظر تھے،بہت سی دفعہ رسول اللہ ﷺ کے سوالات کے جواب میں بزرگ صحابہ پر بازی لے جاتے ،نیز اتباع سنت کا ایسا جذبہ تھا کہ بعض طبعی چیزوں میں بھی آپ ﷺ کی نقل واتباع کرتے ۔اورآپ ﷺ کی عدم موجودگی میں دیگر صحابہ سے حدیث وسنت کے تئیں دریافت کیا کرتے تھے۔
2. ابن عمر ﷺ چوں کہ رسول اللہ ﷺ کے برادر نسبتی تھے ،تو اس قرابت کی وجہ کر درون خانہ کے حالات سے بھی آگہی ہوتی ،اور ملنے جلنے وآمد ورفت میں کوئی مانع نہ ہوتا۔
3. آپ نے اپنے ذوق وشوق کا دائرہ کار ربانیت اورتعلیم وتربیت ہی تک محدود رکھا،سیاست وجہاں بانی سے کنارہ کش رہے ،اس علمی انہماک کی وجہ سے بھی آپ کو حدیث سننے اور روایت کرنے کا خوب موقع ملا۔

9.4.3 حضرت انس بن مالک

ہجرت سے 10 سال قبل پیدائے ،جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ کی والدہ ام سلیم خدمت میں حاضر ہوئیں اورعرض کیا: یارسول اللہ! انصار کے مرد وخواتین نے آپ کی خدمت میں تحفے ونذرانے پیش کئے ہیں،اور میرے پاس پیش کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے،سوائے اس لڑکے کے،اسے ہماری طرف سے قبول کرلیں ؛ تاکہ یہ آپ کی خدمت کیا کرے ،چنانچہ دس سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہے،اور وہ محض خادم ہی نہیں تھے، بلکہ آپ ﷺ کے اخلاق وکردار، رفتار وگفتار کے امین اور رازدار بھی تھے،خانوادۂ نبوت میں پروان چڑھے اور شب وروز کے معمولات کو بہ چشم خود دیکھا،سنت کے ایسے پابند

تھے کہ حضرت ابو ہریرہ ؓ یوں کہا کرتے تھے: رسول اللہ ﷺ سے ملتی جلتی نماز انس ؓ سے زیادہ کسی کی نہیں دیکھی۔ آپ ؓ نے 93ھ میں وفات پائی۔

آپ ؓ نے کئی صحابہ سے استفادہ کیا، جیسے کہ ابو بکر، عمر، عثمان، عبد اللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابن عمر اور عبادہ بن ثابت ؓ وغیرہ، اسی طرح آپ سے حدیثیں نقل کرنے والوں کی تعداد بھی بہت ہے، جیسے کہ ابن شہاب زہری، حسن بصری، قتادہ، مالک بن دینار، ضحاک، ثابت البنانی اور ابان بن صالح وغیرہ۔ آپ کی روایات کی تعداد 2286 ہے۔ ان میں سے بخاری و مسلم میں 168 روایتیں نقل کی گئی ہیں۔

9.4.4 سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

حضرت ابو بکر ؓ کی صاحب زادی اور رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ ہیں، حرم رسول ﷺ میں ہونے کی وجہ سے حدیث وسنت سے گہری انسیت رکھتی تھیں، آپ علوم قرآن وحدیث، فقہ وسیرت، عربی اشعار، قبائل کی تاریخ، انساب اور ادب وفصاحت میں نابغۂ روزگار شمار ہوتی تھیں۔ آپ کے علم وفضل کا اعتراف تمام صحابہ کو تھا، ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں: ہم صحابہ جب کسی مسئلہ میں پریشان ہوتے تو ام المؤمنین عائشہؓ سے دریافت کر لیتے، اور ان کے پاس اس بارے میں ضرور معلومات ہوتیں۔ عروہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو طب، شعر اور فقہ میں عائشہؓ سے بڑھ کر نہیں دیکھا، حاکم نے درست کہا ہے کہ: شریعت اسلامی کا ایک چوتھائی حصہ حضرت عائشہؓ کے ذریعہ محفوظ ہوا اور امت تک پہنچا۔

آپ کا شمار بکثرت روایت کرنے والے صحابہ میں ہوتا ہے، علامہ ابن حزم کے مطابق آپ کی حدیثوں کی تعداد 2210 ہے، مگر مسند الامام احمد بن حنبل میں ''مسند عائشہ'' کے تحت 2403 روایتیں درج کی گئی ہیں، گویا کہ حضرت انس کی روایتوں سے زیادہ آپ کی روایتوں کی تعداد ہے۔ اسی طرح صرف کتب ستہ میں حضرت عائشہ کی 2082 روایتیں ملتی ہیں، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مکثرین صحابہ میں حضرت ابو ہریرہ کے بعد آپ ہی کی روایتیں دوسرے نمبر پر آتی ہیں۔ بخاری ومسلم میں مجموعی طور پر 297 حدیثیں آپ کی درج کی گئی ہیں۔ حضرت عائشہ اس حیثیت سے بھی ممتاز تھیں کہ علم نقد روایت میں آپ کا مقام بہت بلند تھا؛ بلکہ شاید ہی کوئی آپ کا ہم پلہ ہو؛ چنانچہ کم وبیش چالیس حدیثوں پر آپ نے استدراک کیا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرت عائشہ کے اخیر میں ان احادیث کو ایڈٹ کر کے شائع کر دیا ہے۔

آپ سے روایت کرنے والوں کی بھی بڑی تعداد ہے، اور اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ عرصہ تک باحیات رہیں، چنانچہ بڑے وکم عمر صحابہ، کبار وصغار تابعین کو آپ سے استفادہ کا خوب موقع ملا، بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق حضرت عائشہؓ کے شاگردوں کی تعداد دو سو سے زیادہ تھی، ان میں 38 خواتین بھی تھیں، باضابطہ آپ کا درس حدیث ہوا کرتا تھا، لڑکے، عورتیں، بچے اور وہ مرد جن سے پردہ نہ ہوتا، ان کے حجرے میں آجاتے، اور باقی لوگ مسجد نبوی میں بیٹھتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پردے کی اُوٹ سے درس دیتیں، حدیثیں نقل کرنے کے ساتھ آپ بطور خاص شاگردوں کی زبان، طرز ادا اور الفاظ کی صحت پر بھی توجہ دیتیں، دوسرے یہ کہ طبعی ذہانت وذکاوت اور رسول اللہ ﷺ سے بے تکلفی کی وجہ سے آپ کو حدیث وسنت کا

بڑا ذخیرہ یاد تھا۔ حضرت ابوبکر و عمر، ابوہریرہ، عروہ بن زبیر ؓ وغیرہ نے آپ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے۔ اور تابعین میں مسروق، سعید بن المسیب، شعبی اور مجاہد جیسے جلیل القدر اہل علم آپ کے شاگرد رہے ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں عروہ بن زبیر اس حیثیت سے نمایاں ہیں کہ ان کی بیشتر روایتیں حضرت عائشہ ہی سے ہیں، چنانچہ ان کی روایتوں کی کل تعداد [illegible] ہے جن میں سے 1050 حضرت عائشہ سے نقل کرتے ہیں۔ 57ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

9.4.5 حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب نام ہے، رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی اور ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث کے بھانجے تھے۔ قرابت اور کم سن ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے گھر آمد و رفت رہتی، خود بھی تعلیم کا ذوق و شوق رکھتے تھے، غالباً اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ایک موقع پر انہیں دعاء دی تھی، ”اے اللہ! ان کو دین کا فہم اور تفسیر قرآن میں بصیرت عطاء فرما“۔ آپ کا شمار بھی بکثرت روایت کرنے والوں میں ہوتا ہے؛ چنانچہ روایتوں کی تعداد 1660 ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت آپ کی عمر 12 سال تھی، مگر آپ نے دیگر صحابہ سے استفادہ کیا، وہ نقل کرتے ہیں کہ: بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کسی شخص کے بارے میں مجھے پتہ چلتا کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث یاد ہے؛ چنانچہ جب میں ان کے گھر کے دروازہ پر پہنچتا تو معلوم ہوتا کہ وہ سو رہے ہیں، میں اسی حالت میں اپنی چادر کو تکیہ بنائے، اس کے دروازہ کے سامنے لیٹ جاتا، ہوا کے جھونکے آتے اور مجھ پر گرد و غبار ڈال جاتے، گھر کا مالک باہر نکل کر دیکھتا تو کہتا: اے رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی! کیسے تشریف لانا ہوا؟ آپ نے مجھے کیوں نہ بلا لیا ہوتا، میں اس کے جواب میں کہتا کہ، نہیں مجھے ہی آنا چاہیے تھا، میں آپ سے ایک حدیث کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابن عباس کو حدیث رسول سے کس قدر والہانہ لگاؤ تھا۔

آپ کی روایتوں میں سے 95 کو بخاری و مسلم نے مشترکہ طور پر روایت کیا ہے، اور تنہا بخاری میں آپ کی 120 اور مسلم میں 49 روایتیں ہیں۔

9.4.6 حضرت جابر بن عبداللہ ؓ

آپ کا نام و نسب جابر بن عبداللہ انصاری ؓ ہے۔ بہ کثرت روایت کرنے والوں میں شمار ہوتا ہے، چنانچہ آپ کی روایتوں کی تعداد 1540 ذکر کی جاتی ہے۔ بخاری و مسلم نے مشترکہ طور پر 60 حدیثیں نقل کی ہیں، اور تنہا بخاری میں 26 اور مسلم میں 26 روایتیں ملتی ہیں، رسول اللہ ﷺ کے علاوہ حضرت ابوبکر و عمر اور علی ؓ سے حدیثیں روایت کیں، نیز آپ سے استفادہ کرنے والوں میں تین صاحبزادے نیز سعید بن المسیب، عمرو بن دینارؒ اور حسن بصریؒ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے، حضرت جابر رسول اللہ ﷺ کے بعد 64 سال تک زندہ رہے، 78ھ میں وفات پائی۔

9.4.7 حضرت ابوسعید خدری ؓ

آپ کا نام و نسب سعید بن مالک بن سنان خدری انصاری خزرجی ہے، آپ کا شمار بھی مکثرین صحابہ میں ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ سے براہ راست حدیثیں سنی ہیں، نیز کئی صحابہ سے بھی استفادہ کیا ہے، جیسے کہ جابر، زید بن ثابت، ابن عباس، انس، ابن عمر اور

ابن زبیر ؓ وغیرہ۔ اور آپ کے شاگردوں کی فہرست میں سعید بن المسیب، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ، عطاء بن یسار اور دیگر حضرات کا ذکر ملتا ہے۔ آپ کی کل 1170 روایات ہیں، جن میں سے 46 روایتیں ایسی ہیں جن کو بخاری ومسلم نے مشترکہ طور پر نقل کیا ہے، اور امام بخاری نے 16 اور امام مسلم نے 52 احادیث روایت کی ہیں۔ 74ھ میں آپ ؓ نے وفات پائی۔

9.5 محدث تابعین

صحابہ کرام ؓ کے بعد کا طبقہ تابعین کہلاتا ہے، اس طبقہ نے بھی قرآن وحدیث کی خوب خدمت کی اور اس امانت کو امت تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا، بعض روایتوں کے مطابق خود رسول اللہ ﷺ نے اس طبقہ کی نشاندہی بھی کی تھی اور اس کی فضیلت بھی ذکر کی، حدیث میں ہے: ''طوبی لمن رأنی وطوبی لمن رأی من رآنی'' (مستدرک حاکم، حدیث نمبر 6994) اس شخص کے لئے خوشخبری ہے جس نے مجھے دیکھا اور اس شخص کے لئے خوشخبری ہے جس نے مجھے دیکھنے والوں کو دیکھا۔ گویا کہ جن لوگوں نے صحابہ کی صحبت پائی یا ان سے ملاقات کی وہ بھی خاص مقام کے حامل ہیں، اسی طبقہ کو اصطلاح میں تابعین کا طبقہ کہا جاتا ہے۔

عام محدثین کے مطابق تابعی وہ ہے جو کسی صحابی سے ایمان کی حالت میں ملا ہو اور ایمان ہی پر اس کی موت واقع ہوئی ہو۔

اس تعریف کی رو سے وہ سب لوگ تابعی کہلائیں گے؛ جنہیں کسی صحابی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہو، خواہ صحابی کی صحبت میں انہیں رہنے کا موقع میسر نہ آیا ہو، اسی بنیاد پر محدثین نے اعمش کو تابعی شمار کیا ہے، انہوں نے حضرت انس ؓ کو دیکھا ضرور ہے، مگر ان سے کوئی حدیث نہیں سنی ہے، واضح رہے کہ بعض محدثین نے تابعی ہونے کے لئے صحبت اور باشعور عمر کی شرط لگائی ہے، یعنی تابعی ہونے کے لئے محض ملاقات کافی نہیں سمجھا ہے؛ بلکہ صحبت یا روایت کا ثبوت ضروری قرار دیا ہے، اسی طرح سے بے شعوری کی عمر میں ملاقات کا اعتبار بھی نہیں کیا ہے، مگر زیادہ درست پہلی بات ہے، جو کہ اکثر محدثین کا رجحان ہے۔

تابعین کی تعداد یقینی طور پر بتانا مشکل ہے، چوں کہ صحابہ مختلف علاقوں میں آباد تھے، اور خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ لوگ دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل گئے تھے، حتی کہ یہ مقدس کاروان ہندوستان، چین اور افریقہ کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، لہذا ان کے صحبت یافتہ اور ملنے جلنے والے اہل ایمان کی تعداد بیان کرنا حقیقت میں ناممکن ہے، طبقۂ تابعین میں سے جن حضرات نے شہرت پائی اور خاص طور سے حدیث وسنت کے لئے مختلف شہروں میں مرکز توجہ بنے رہے ان کا ذکر ذیل میں اجمالی طور پر کیا جاتا ہے، ابن سعد نے الطبقات الکبری میں اور دیگر فن رجال کے مؤلفین نے بہت سے تابعین کا ذکر کیا ہے، ان میں سے چند اس طرح ہیں:

تابعین مدینہ منورہ

تابعین کے نام	تاریخ وفات
سعید بن المسیبؒ	94ھ

عروہ بن زبیرؒ	94ھ
ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشامؒ	94ھ
عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہؒ	99ھ
سالم بن عبداللہ بن عمرؒ	106ھ
سلیمان بن یسارؒ	93ھ
قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ	112ھ
نافع مولیٰ ابن عمرؒ	117ھ
محمد بن شہاب زہریؒ	124ھ
ابوالزناد	130ھ

تابعین مکہ

تابعین کے نام	سنہ وفات
عکرمہ مولیٰ ابن عباسؒ	105ھ
عطاء بن ابی رباحؒ	115ھ
ابوالزبیر محمد بن مسلمؒ	128ھ

تابعین کوفہ

تابعین کے نام	سنہ وفات
ابراہیم نخعیؒ	96ھ
علقمہ بن قیسؒ	62ھ
شعبی عامر بن شرحبیلؒ	104ھ

تابعین بصرہ

تابعین کے نام	سنہ وفات
حسن بصریؒ	110ھ

محمد بن سیرینؒ	110ھ
قتادہ ابن دعامہؒ	117ھ

تابعین مصر

تابعین کے نام	سنہ وفات
ابوالخیر مرثد بن عبداللہ الیزنیؒ	90ھ
یزید بن ابی حبیبؒ	128ھ

تابعین شام

تابعین کے نام	سنہ وفات
عمر بن عبدالعزیزؒ	101ھ
مکحولؒ	118ھ
طاؤس بن کیسان یمانیؒ	106ھ
وہب بن منبہؒ	110ھ

9.5.1 سعید بن المسیب (متوفی:94ھ)

مکمل نام: سعید بن مسیّب بن حزن مخزومی۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں دو سال بعد پیدا ہوئے، والد اور دادا صحابی تھے، تابعین میں علم وفضل کے لحاظ سے امامت کے درجہ پر فائز تھے، کم عمری میں حضرت عمرؓ کو دیکھا ہے، مگر ان سے روایت کرنا ثابت نہیں ہے؛ البتہ حضرت عثمان، علی، زید بن ثابت، ابوموسیٰ، ابن عباس، ابوہریرہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ وغیرہ سے حدیثیں نقل کی ہیں، خود آپ سے روایت کرنے والوں کی بہت لمبی فہرست ہے، حدیث سے شغف کا یہ عالم تھا کہ خود بیان کرتے ہیں کہ: میں بسا اوقات صرف ایک حدیث سننے کے لئے طویل مسافت طئے کرتا، کئی روز صبح وشام کا سفر طئے کر کے حدیث سنتا۔ امام علی بن مدینی کہتے ہیں: میں نے تابعین کے درمیان سعید ابن المسیبؒ سے بڑھ کر کسی کو صاحب علم وفضل نہیں پایا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں صحابہ کی موجودگی کے باوجود سعید بن مسیبؒ فتوی دیا کرتے تھے۔ 94ھ میں آپ نے وفات پائی۔

9.5.2 عروہ بن زبیر (متوفی: 94ھ)

مکمل نام: عروہ بن زبیر بن عوام اسدی قرشی۔

حضرت عمرؓ کی خلافت کے اخیر دور میں آپ کی پیدائش ہوئی، خانوادہ رسول اللہ ﷺ سے قرابت تھی، چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہؓ آپ کی خالہ تھیں، خود والد گرامی، والدہ اور بھائی صحابی تھے۔

آپ نے والد زبیر اور بھائی عبداللہ بن زبیرؓ اور والدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما سے حدیثیں سنی ہیں، خاص طور پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ممتاز شاگردوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے، آپ کی حدیثیں 1999 ہے، جن میں سے 1050 روایتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنی ہوئی ہیں، اس بات سے ان کے علم حدیث سے شغف کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کثرت استفادہ کا بھی۔

9.5.3 ابن شہاب زہریؒ (متوفی: 124ھ)

نام ونسب: محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن شہاب قرشی زہری مدنیؒ۔

''زہری'' کے نام سے آپ نے شہرت پائی، اور پردادا کی طرف نسبت کرتے ہوئے ''ابن شہاب'' سے بھی جانے جاتے ہیں، 58ھ میں پیدا ہوئے، حضرت انس بن مالکؓ، سہل بن سعدؓ، سائب بن یزیدؓ ودیگر صحابہ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، آپ نے ان حضرات سے بہت سی روایتیں سنی ہیں، حدیث سے خاص دلچسپی رکھتے تھے، اسی وجہ سے علامہ ابن حجر نے انہیں حافظ حدیث کے لقب سے نوازا ہے، عمر بن دینار کہتے ہیں: میں نے زہری سے بہتر حدیث روایت کرنے والا نہیں دیکھا۔ لیث بن سعدؒ کہا کرتے تھے: میں نے ابن شہابؒ سے بڑھ کر جامع اور صاحب علم نہیں دیکھا، گویا کہ محدثین آپ کی امامت، کثرت حفظ، ضبط حدیث، اور ثقاہت وامامت پر متفق ہیں، ابن شہابؒ کی روایتوں کی تعداد 2200 ہے، آپ کا معمول یہ تھا کہ جو حدیث سنتے اسے قلم بند بھی کر لیتے، خاص طور پر خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے آپ کو جمع وتدوین حدیث پر مامور کیا تھا، اس طرح گویا آپ نے تدوین حدیث میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔

9.5.4 عطاء بن ابی رباحؒ (متوفی: 114ھ)

نام ونسب: ابومحمد عطاء بن ابی رباح اسلمی۔

یمن سے آپ کا تعلق تھا اور مکہ میں نشو ونما پائی، متعدد صحابہ سے کسب فیض کیا ہے، جن میں سرفہرست ان حضرات کے نام ہیں: عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عمرو بن عاص، عبداللہ بن زبیر، معاویہ، اسامہ بن زید، جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، ابوہریرہ، اور ام المومنین عائشہؓ۔ نیز ان سے روایت کرنے والوں میں امام اوزاعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، لیث بن سعد، عمرو بن دینار، قتادہ، ایوب سختیانی اور اعمش جیسے جلیل القدر حضرات ہیں، عطا بن ابی رباح حفاظ حدیث میں شمار ہوتے ہیں، حافظ ابن حجر نے بلند القاب کے ساتھ آپ کا ذکر کیا ہے، حافظ ذہبی نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الحفاظ'' میں انہیں پہلے طبقہ میں شمار کیا ہے، واضح ہو کہ مکہ کے مدرسہ حدیث میں آپ نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

9.5.5 عمر بن عبدالعزیزؒ (متوفی: 101ھ)

نام ونسب: عمر بن عبدالعزیزؒ بن مروان بن حکم بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس اموی۔

مادری نسبت کے لحاظ سے حضرت عمر بن خطاب ﷺ سے رشتہ تھا؛ چنانچہ آپ کی والدہ حضرت عمر ﷺ کے فرزند عاصم کی صاحبزادی تھیں، پیدائش یزید کے عہد میں ہوئی، بچپن والد عبدالعزیز کے ساتھ مصر میں گزارا، اور غالبا ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، جب ہوش سنبھالا تو والد نے انہیں اعلی تعلیم کے لئے مدینہ منورہ روانہ کیا، جو اس عہد میں علم وعلماء کا مرکز تھا، معروف محدث صالح بن کیسان کی نگرانی میں تعلیم وتربیت پائی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے متعدد صحابہ اور کبار تابعین سے حدیث نبوی کا درس لیا، جس کی وجہ سے ان میں حدیث سے شغف، اس کی تدوین وحفاظت کی فکر اور علماء سے محبت وتعلق کا جذبہ پروان چڑھا، اور حدیث وسنت کی ایسی خدمت کی کہ تاریخ میں شاید ہی ان سے زیادہ کسی حکمراں کا یہ نصیب رہا ہو۔ آپ نے مندرجہ ذیل صحابہ وتابعین سے استفادہ کیا:

صحابہ: انس بن مالک، سائب بن یزید، یوسف بن عبداللہ بن سلام، خولہ بنت حکیم وغیرہ ﷺ۔

تابعین: سعید بن المسیب، عروہ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، ربیع بن سیرہ وغیرہ رحمہم اللہ۔

آپ اپنے مقام ومرتبہ اور حدیث سے شغف کی بنیاد پر خود بھی طلبۂ حدیث کے لئے مرکز توجہ بنے رہے، چنانچہ آپ سے استفادہ کنندگان کی بڑی فہرست ہے، جن میں تابعین اور تبع تابعین شامل ہیں، قابل ذکر چند شاگردوں کے نام اس طرح ہیں، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم، محمد بن مسلم بن شہاب زہری، یحی انصاری، محمد بن منکدر، حمید الطّویل وغیرہ۔

تمام محدثین اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نہایت ثقہ اور عظیم حافظ حدیث تھے، مجاہد کا قول ہے کہ: ہم انہیں تعلیم دینے آئے تھے مگر شاگرد بن کر کسب فیض کرنے لگے۔ امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہ آپ کو امام وقت گردانتے تھے، یہ بات پچھلی اکائی میں گذر چکی ہے کہ تدوین حدیث کا باضابطگی کے ساتھ آغاز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ذریعہ ہوا، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ کی تحقیق کے مطابق آپ نے تمام صوبوں کے گورنروں کے نام ایک سرکاری فرمان بھیجا، جس کا مضمون یہ تھا کہ: مجھے یہ خوف دامن گیر ہے کہ اگر حدیث کی حفاظت نہ کی گئی تو اس کا بڑا حصہ علماء کے ساتھ دفن ہوجائے گا؛ اس لئے حدیثوں کو تلاش وجستجو کر کے لکھ لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اگر اس جانب توجہ نہ کی ہوتی تو حدیث وسنت کا بڑا حصہ ضائع ہوجاتا، خدمت حدیث کے ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ نے دور افتادہ ممالک میں حدیث کی ترویج واشاعت کے لئے علماء روانہ کئے، جیسے کہ حضرت ابن عمر ﷺ کے شاگرد اور ان کے علوم کے امین نافعؒ کو تعلیم حدیث کے لئے مصر بھیجا تھا۔

9.5.6 حسن بصریؒ (متوفی: 110ھ)

نام ونسب: حسن بن یسار، ابوسعید کنیت ہے۔

ان کے والدین غلام تھے، حضرت عمر ﷺ کے آخری عہد خلافت یعنی 21ھ میں پیدا ہوئے، ان کی خوش بختی تھی کہ ام المومنین

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما بھی پائی، حسن کی والدہ گھر کے کام کاج میں مشغول ہوتیں، اور یہ شیر خوار بچہ اگر رونے لگتا تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بہلانے کے لئے اپنی چھاتی منہ میں دے دیتیں، اس طرح گویا ان سے رضاعت کا شرف بھی حاصل ہے، ازواج مطہرات کے گھر چوں کہ باہم ملے ہوئے تھے، اس لئے دیگر ازواج مطہرات کے یہاں بھی آمد ورفت رہتی تھی، کم وبیش تیرہ چودہ سال کی عمر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

حسن بصریؒ نے عہد صحابہ کو اچھی طرح پایا، خانوادۂ نبوت میں تعلیم وتربیت حاصل کی، علوم نبوت کے مرکز مدینہ منورہ میں نشو ونما پائی اور ایسے خدا رسیدہ بزرگوں کی صحبت میں رہے جو نبوی اخلاق وتعلیمات کے آئینہ دار تھے، چنانچہ آپ کی شخصیت کی تعمیر میں ان عناصر نے نمایاں کردار ادا کیا، مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ کو تقریباً تین سو صحابہ کرام سے ملاقات کا شرف حاصل ہے، جن میں ستر بدری صحابہ بھی شامل ہیں، حدیث ان لوگوں سے حاصل کی جو صحابہ میں روایت حدیث کے مستقل مدرسے شمار کیے جاتے ہیں، چنانچہ اس ضمن میں مندرجہ ذیل صحابہ کے نام ذکر کئے جاتے ہیں:

حضرت عثمان، علی، ابوموسی اشعری، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن العاص، انس بن مالک، جابر، معقل بن یسار، ابوبکرہ، عمران بن حصین ﷺ وغیرہ۔ حضرت عمر، ابو ہریرہ، ابی بن کعب اور اسد بن عبادہ ﷺ سے براہ راست تو استفادہ نہیں کر سکے؛ البتہ بالواسطہ ان سے حدیثیں نقل کی ہیں، آپ کے علم وفضل کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ ذہبی نے فرمایا: وہ علامہ اور علم کے بحر زخار تھے۔ حسن بصری کی مجلسِ حدیث کئی شہروں میں آراستہ ہوتی رہی، مدینہ منورہ میں آپ کے گرد طالبان حدیث کا ہجوم ہوتا، مکہ جو کہ حدیث نبوی کا دوسرا عالمی مرکز تھا، وہاں بھی آپ کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا، جب آپ وہاں تشریف لے گئے تو وہاں کی مسند حدیث پر آپ کو بٹھایا گیا، مجاہد، عطا اور طاؤس جیسے ممتاز اہل علم نے زانوئے تلمذ تہ کیے اور حدیثیں سنیں۔

آپ کے مشہور شاگردوں میں حسب ذیل افراد کا ذکر کیا جاتا ہے:

حمید الطویل، یزید بن ابی مریم، ایوب، قتادہ، بکر بن عبداللہ، جریر بن حازم، ابوالاشہب، ربیع، سعید جریری، سماک بن حرب، خالد الحذاء، عطاء بن سائب، یعلی بن زیاد، یونس بن عبید، سعید بن ہلال، مجاہد، عطاء اور طاؤس وغیرہ۔

حسن بصری حدیثوں کو روایت بالمعنی کیا کرتے تھے، یعنی صرف معنی ومفہوم کی ادائیگی کو کافی سمجھتے تھے، روایت کردہ الفاظ کو ضروری نہیں گردانتے۔ محدثین نے ان کی روایتوں کے بڑے حصے کو ''مرسل'' کے دائرہ میں رکھا ہے۔

9.5.7 سالم بن عبداللہ (متوفی:106ھ)

نام ونسب: سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب، کنیت ابو عبداللہ تھی، حضرت عمر کے پوتے تھے، اور آپ کی والدہ ایران کے شاہی خاندان کی فرد تھیں، فضل وکمال میں اپنے والد عبداللہ کے نقش قدم پر تھے، مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمر کے نقش اول عبداللہ اور نقش ثانی سالم تھے، وقت کے اساطین سے حدیث حاصل کی، ان کے والد عبداللہ خود محدث صحابہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے، چنانچہ آپ نے زیادہ تر اپنے والد ہی سے خوشہ چینی کی ہے، نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابوایوب انصاری

رضی اللہ عنہ، اور رافع بن خدیج و دیگر صحابہ سے بھی استفادہ کیا ہے، اسی طرح تابعین سے بھی حدیثیں سنی ہیں، آپ کے شاگردوں میں بھی علم حدیث کے آفتاب و ماہتاب نظر آتے ہیں، جیسے کہ عمرو بن دینار، امام زہری، صالح بن کیسان، موسی بن عقبہ، حمید الطّویل، عبید اللہ بن عمرو بن حفص، عاصم بن عبد اللہ، عبد اللہ بن ابی بکر، ابو قلابہ حربی و دیگر۔ تمام محدثین اور علماء؛ حدیث وفقہ میں آپ کی امامت کے معترف ہیں۔

9.5.8 علقمہ بن قیسؒ (متوفی: 62ھ)

نام ونسب: علقمہ بن قیس بن عبد اللہ نخعی، کنیت ابوشبلی ہے، رسول اللہ ﷺ کے عہد میں پیدا ہوئے، مگر رسول اللہ ﷺ کی صحبت نہیں پائی، مگر آپ نے عہد رسالت اور عہد صحابہ کو پایا، ممتاز صحابہ سے استفادہ کیا، چنانچہ حضرت عمر بن خطاب، عثمان، علی، حذیفہ بن یمان، سلمان فارسی، ابو مسعود بدری، ابو درداء انصاری، جیسے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم سے خوشہ چینی کی ہے، اور خاص طور پر عبد اللہ بن مسعود ﷺ کے ممتاز تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں، بلکہ آپ کی پوری تعلیم وتربیت ان ہی کے زیر سایہ ہوئی۔

9.5.9 عامر بن شراحیل شعبی (متوفی: 104)

نام ونسب: عامر بن شراحیل، کنیت ابو عمر اور شعبی قبیلہ کی نسبت ہے، نام سے زیادہ اسی نسبت سے آپ پہچانے جاتے ہیں۔ 20/19 ہجری میں پیدا ہوئے، جب شعور کی عمر کو پہنچے تو اس وقت صحابہ کرام کی بہت بڑی جماعت موجود تھی، انہیں تقریباً پانچ سو صحابہ کو دیکھنے کا شرف حاصل رہا ہے اور ان میں سے 48 سے کسب فیض کیا ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ- جو حدیث وسنت کے اہم ترین ستون سمجھے جاتے تھے- کی خدمت میں باضابطہ آٹھ دس ماہ رہ کر خوب استفادہ کیا، اس تعلیم وتربیت نے آپ کو علمی افق پر آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن کر دیا، حدیث وسنت کے جلیل القدر حافظ بلکہ امام بن کر ابھرے، آپ نے صحابہ میں جن حضرات سے استفادہ کیا تھا، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

حضرت علی، ام المؤمنین حضرت عائشہ، حضرت سعد بن اُبی وقاص، زید بن ثابت، ابو ہریرہ، عبادہ بن صامت، ابو مسعود الانصاری، ابو موسی اشعری، جابر بن عبد اللہ، براء بن عازب، نعمان بن بشیر، حسین بن علی، زید بن ارقم، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس، ابن زبیر، ام سلمہ، ام ہانی، میمونہ بنت حارث اور دیگر صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم، اور تابعین کی فہرست اس کے سوا ہے۔

شعبی نے حدیثوں کی تلاش میں ملکوں ملکوں کی خاک چھانی ہے، بڑی مشقت و جان سوزی کے ساتھ شہروں شہروں کے سفر کئے ہیں، دور دراز کے علاقوں کے محدثین سے حدیثیں سنیں اور محفوظ کی ہیں، اس علمی سیاحت کی وجہ سے ان کی حدیثوں کا ذخیرہ بہت کشادہ اور علم کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا، ذہبی نے خود ان کا بیان نقل کیا ہے کہ: میں نے بیس سال کے عرصے میں کسی سے کوئی ایسی نئی حدیث نہیں سنی ہے؛ جس سے میں بیان کرنے والے سے زیادہ واقف نہ رہا ہوں- حدیث کی روایت کے سلسلہ میں آپ نے خود اپنے اصول وضع کئے تھے؛ چنانچہ اسی شخص سے روایت کرتے جس میں بہ یک وقت عقل و دانش اور زہد وتقوی کا امتزاج ہو، آپ کا خیال تھا کہ تنہا عقل یا تنہا تقوی رکھنے والا علم کی حقیقت کو نہیں پا سکتا ہے، حدیث کے الفاظ کے بجائے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے روایت

کرنے کو وہ درست سمجھتے تھے۔ ان کے مقام کا یہ عالم تھا کہ حدیث کے تین ممتاز گہوارے تھے، حجاز، بصرہ اور کوفہ، مگر ان تینوں جگہوں پر آپ سے بلند قامت کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، اسی طرح یہ شرف بہت کم لوگوں کو ملا کہ صحابہ کی موجودگی میں منصب افتاء پر فائز ہوں، مگر شعبی وہ خوش نصیب تابعی اور محدث تھے جو اس عہد میں بھی فتوی دیا کرتے تھے، آپ کوفہ کے قاضی بھی تھے۔

9.5.10 امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت (80-150ھ)

نام ونسب: نعمان بن ثابت بن نعمان بن المرزبان اور کنیت ابوحنیفہ ہے، آپ کے پوتے اسماعیل بن حماد بیان کرتے ہیں کہ: ''ہم فارسی النسل ہیں اور ہمارے باپ دادا سب آزاد لوگ تھے اور بخدا ہم کبھی غلامی کے دور سے نہیں گذرے''۔ 80ھ میں آپ کی پیدائش کوفہ میں ہوئی، یہ شہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور ۱۷ھ میں منظم بنیاد پر آباد کیا گیا تھا، معروف محدث عجلی نے 1500 صحابہ کا ذکر کیا ہے؛ جنہوں نے کوفہ میں قیام کیا اور ان میں 70 بدری صحابہ بھی شامل ہیں، خود امام بخاری کا بیان ہے کہ : میں شمار نہیں کرسکتا کہ کتنی بار حدیث حاصل کرنے کے لئے کوفہ گیا ہوں۔ گویا کہ امام ابوحنیفہ نے ایک ایسے شہر میں آنکھیں کھولیں جو حدیث وسنت اور علم وفقہ کا گہوارہ تھا، اہل کوفہ کے اسی مقام کے پیش نظر ان کے فقہی رجحانات کو محدثین اور علماء نے بڑی اہمیت دی ہے، ممتاز محدث امام محمد بن عیسی ترمذی نے اپنی کتاب سنن الترمذی میں کم وبیش تمام ہی ابواب کے تحت ان حضرات کے قول اور رجحان کو بڑے اہتمام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

صحیح قول کے مطابق امام ابوحنیفہؒ کو تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے؛ چنانچہ آپ نے چار صحابہ کرام کا دور پایا ہے، اور ان کی روایت حاصل ہے، بصرہ میں حضرت انس بن مالک ﷛، کوفہ میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفی، مدینہ منورہ میں حضرت سہل بن سعد ساعدی اور مکہ مکرمہ میں حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہؓ موجود تھے، خاص طور پر حضرت انس ﷛ کو بار بار دیکھا ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے تو ان سے روایت کرنا بھی قبول کیا ہے، بہرحال امام ابوحنیفہؒ نے صحابہ کو دیکھا ضرور ہے، جس کی وجہ کر ان کا تابعی ہونا طئے ہے، البتہ صحابہ سے روایت حدیث کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فقہ وحدیث کا علم قتادہ، عطاء ابن رباح، نافع مولی ابن عمر اور حماد بن ابی سلیمان جیسے بلند قامت اور ممتاز تابعین ومحدثین سے حاصل کیا، خاص طور پر حماد کی خدمت میں طویل عرصہ تک رہے، اور ان کے علوم کے ایسے امین بنے کہ حماد کے بعد ان کے جانشین اور کوفہ میں مسند درس کے وارث آپ ہی بنائے گئے، امام ابوحنیفہ کی فقہ وحدیث میں امامت تسلیم شدہ ہے؛ چنانچہ اکثر محدثین اس کا اعتراف کرتے ہیں، امام ابوداؤد سجستانی (مؤلف سنن) کہا کرتے تھے: اللہ تعالی مالک پر رحمت نازل کرے، وہ اپنے وقت کے امام تھے، شافعی پر رحمت نازل فرمائے، وہ اپنے وقت کے امام تھے، ابوحنیفہ پر رحمت نازل کرے وہ اپنے وقت کے امام تھے۔

فن جرح وتعدیل کے امام یحی بن معین سے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو دوبار کہا: وہ تو ثقہ ہیں، ثقہ ہیں۔ آپ کے ثقہ اور بااعتماد ہونے کی یہ خود بہت بڑی دلیل ہے کہ اس عہد کے ممتاز محدثین نے آپ سے حدیثیں نقل کی ہیں، چنانچہ امام سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، حماد بن زید، ہشیم، وکیع اور جعفر بن عون جیسے بلند قامت محدثین واہل علم نے آپ سے خوشہ چینی کی ہے۔

9.7.1 مدینہ منورہ

اس شہر کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی ہجرت گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے، نیز یہ وحی کی نزول گاہ اور صحابہ کی تربیت گاہ بھی رہا ہے اور اسلام کا اولین مرکز بھی، چنانچہ آپ ﷺ کے بیشتر ارشادات یہیں سنے گئے اور یہیں سے نقل کئے گئے، مدینہ کی یہ مرکزیت آپ کی وفات کے بعد بھی طویل عرصہ تک باقی رہی، خلافت راشدہ کا دارالسلطنت یہی شہر تھا اور بہت سے بزرگ صحابہ کی اقامت گاہ بھی، ان وجوہات کی بناء پر مدینہ منورہ حدیث کی اولین درسگاہ اور بین الاقوامی دانش گاہ کی حیثیت اختیار کر گیا، چنانچہ یہاں کئی اصحاب علم وفضل پیدا ہوئے جنہیں قرآن اور حدیث وسنت کی حفظ وروایت کے لئے شہرت حاصل ہوئی، ان میں سے چند اس طرح ہیں:

حضرت ابو ہریرہ ؓ: انہوں نے گویا کہ ارشاداتِ رسول ﷺ ومعمولات کو جمع ومحفوظ کرنے کے لئے خود کو وقف کر رکھا تھا، دربارِ رسالت سے ایسی وابستگی رکھی کہ پوری جماعت صحابہ میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے، اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ کہا کرتے تھے کہ: اے ابو ہریرہ! آپ ہم میں سب سے زیادہ دربارِ رسالت سے وابستگی رکھتے اور رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کو بھی ہم سے زیادہ یاد رکھتے ہیں''۔ یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ کی روایتوں کی تعداد آپ سے فروتر ہے، آپ کے تلامذہ کی تعداد خود آٹھ سو سے متجاوز ہے، جن میں بزرگ صحابہ بھی ہیں اور تابعین بھی، ابن عباس، ابن عمر، انس، واثلہ بن اسقع، جابر بن عبد اللہ جیسے جلیل القدر صحابہ نے آپ سے روایت کی ہے۔ اور تابعین میں مروان بن حکم، سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، محمد بن سیرین، عبد الرحمٰن بن ہرمز، عطاء بن ابی رباح اور عطاء بن یسار وغیرہ۔ 57ھ میں وفات پائی، آپ نے 5374 روایتیں نقل کی ہیں، تعداد حدیث کے لحاظ سے صحابہ میں سب سے پہلے نمبر پر آپ ہی کا نام آتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: مدینہ منورہ کے محدثین میں ایک نمایاں نام آپ کا بھی ہے، حفظ وروایت حدیث اور سنت کی تلاش وجستجو آپ کا طرۂ امتیاز تھا، اتباع سنت کا ایسا جذبہ کہ راہ چلتے تو آپ ﷺ کی گذرگاہ کو اپناتے، نماز کے لئے ان مقامات اور مسجدوں کی تلاش رہتی جہاں آپ ﷺ نے نماز ادا فرمائی تھی، ان جگہوں اور درخت کے سایوں میں بطور خاص بیٹھتے جہاں آپ ﷺ کو تشریف رکھتے دیکھا تھا، حتی کہ ایسے درختوں اور پودوں کی آبیاری کرتے، گویا کہ آپ ﷺ کے نقوش کی صدفی صد پیروی کی کوشش کرتے، آپ نے بہت سے ممتاز صحابہ سے استفادہ کیا ہے، نیز آپ سے روایت کرنے والوں میں صحابہ اور کبار تابعین بھی شامل ہیں اور بطور خاص صاحبزادے سالم اور نافع نے سب سے زیادہ روایتیں نقل کی ہیں، کل 2630 حدیثیں آپ سے نقل کی گئی ہیں۔

ان دونوں حضرات کے علاوہ دارالحدیث مدینہ منورہ کے ممتاز محدثین میں ان لوگوں کا شمار ہوتا تھا: ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ابو سعید خدری، ابوبکر وعمر، علی ؓ (کوفہ کی رہائش اختیار کرنے سے پہلے) اور زید بن ثابت ودیگر، ان اصحاب علم وفضل کے تربیت یافتہ اور خوشہ چیں تابعین نے بھی حدیث وسنت کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور مدینہ منورہ کی اس بین الاقوامی درس گاہ کو چار چاند لگائے، ان میں سے مندرجہ ذیل تابعین خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

سعید بن المسیب، محمد بن شہاب زہری، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود، سالم بن عبد اللہ بن عمر، قاسم بن محمد بن ابی بکر، نافع مولی بن عمر ودیگر۔

9.7.2 مکہ مکرمہ

مکہ میں اسلامی چہل پہل کا باضابطہ آغاز فتح مکہ کے بعد ہوا، رسول اللہ ﷺ نے وہاں حضرت معاذ بن جبل ؓ کو مستقل معلم کی حیثیت سے مقرر کیا، قرآن مجید کی تعلیم وتدریس اور دینی احکام ومسائل کی تفہیم آپ کے ذریعہ ہوئی، معاذ بن جبل ؓ صحابہ میں حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم شمار کئے جاتے تھے، آپ سے حضرت عمر ؓ، ابن عباس ؓ اور خود آپ کے صاحبزادے نے روایت کی ہے، چنانچہ آپ کے ہاتھوں مکہ کے درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی۔ آگے چل کر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مکہ منتقل ہوگئے اور یہاں کی مسند درس کو رونق بخشی، آپ کی وجہ کر حدیث وسنت کے حوالے سے مکہ کی خوب شہرت ہوئی، ابن عباس نے کم سنی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست تو بہت کم حدیثیں سنی ہیں، علامہ ابن قیم کی تحقیق کے مطابق یہ کم وبیش 20 روایتیں ہیں اور بعض علماء کا رجحان یہ ہے کہ 25 روایتیں، البتہ بقیہ حدیثیں آپ نے صحابہ کے ذریعہ سنی ہیں، آپ کے علم وفضل کے تمام ہی معترف تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں: ''جو لوگ اب بچ گئے ہیں، ان میں سنت سے آگہی سب سے زیادہ ابن عباس کو ہے'' حضرت عمر ؓ آپ کی بہت قدر کرتے تھے اور اپنی مجلس میں شریک رکھتے۔

بچپن ہی سے ابن عباس حدیثوں سے شغف رکھتے تھے، آپ نے اپنے والد حضرت عباس، والدہ ماجدہ، بھائی فضل، خالہ میمونہ، خلفاء اربعہ (ابوبکر وعمر، عثمان وعلی) عبدالرحمن بن عوف، معاذ بن جبل، ابوذر غفاری، ابی بن کعب اور ابو ہریرہ ودیگر حضرات سے روایت کی ہے اور ان سے نقل کرنے والوں میں عبداللہ بن عمر، ثعلبہ بن حکم، ابوطفیل وغیرہ ہیں، نیز تابعین میں سے سعید بن المسیب اور ابو امامہ بن سہیل اور عبداللہ بن حارث بن نوفل وغیرہ ہیں۔ روایتوں کی تعداد 1660 ہے، آپ کی زیرنگرانی مکہ مکرمہ میں جو افراد تیار ہوئے ان میں مشہور ترین لوگ یہ ہیں، مجاہد، عکرمہ مولی ابن عباس ؓ، عطاء بن ابی رباح ودیگر تابعین۔

حقیقت یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ یہ دونوں حدیث کے دو اہم ترین مراکز تھے، جہاں لوگ جوق در جوق آتے اور قرآن وحدیث کے منبع صافی سے سیراب ہوتے اور خاص طور پر حج کا موسم علمی سرگرمیوں کے لئے بہت ہی موزوں سمجھا جاتا تھا، گویا کہ یہ علماء ومحدثین کی سالانہ عالمی کانفرس ہوتی، باہم حدیثیں نقل کی جاتیں، رواتِ حدیث کے حالات پر بحث کی جاتی، مختلف علاقوں کی سند کی چھان بین کی جاتی، اس طرح حدیث وسنت کی یہ امانت گوشہ گوشہ تک پہنچتی۔

9.7.3 کوفہ

مکہ سے اسلام کا آغاز ہوا، مدینہ منورہ سرزمین وحی ٹھہری، مگر بہت جلد ایک اور شہر کی بنیاد پڑی، جو اسلامی علوم وفنون کی ترویج واشاعت کا مرکز بن گیا، وہ ہے شہر کوفہ۔ 17 ھ میں حضرت عمر بن الخطاب ؓ کے حکم سے یہ شہر تعمیر کیا گیا، اسلامی تاریخ میں یہ وہ پہلا شہر ہے جو باضابطہ آباد کیا گیا، اور اس کی بنیاد رکھنے میں جغرافیائی، طبعی اور موسمیاتی امور کا حد درجہ خیال رکھا گیا تھا، صحابۂ کرام ؓ اور ممتاز علماء بطور خاص وہاں آباد کئے گئے، اور اسے اپنے محل وقوع کی وجہ کر اسلامی فوج کا بہت بڑا مرکز بنا دیا گیا، مدرسہ کوفہ کے صدر مدرس حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ تھے، حضرت عمر ؓ نے انہیں روانہ کرتے ہوئے اہل کوفہ کے نام یہ لکھا تھا کہ ''ابن

مسعود کی خود ہمیں بھی یہاں ضرورت ہے، لیکن ایثار سے کام لیتے ہوئے میں انہیں تمہاری تعلیم و تربیت کے لئے بھیج رہا ہوں''۔ آپ نے یہاں ایک عرصہ تک قیام کیا، اور اہل کوفہ کی ہمہ جہت تعلیم و تربیت میں مصروف رہے، یہ محنت بارآور ہوئی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نو آباد شہر میں بہت جلد ہی چار ہزار علماء و محدثین پیدا ہو گئے۔ حضرت علیؓ جب کوفہ میں داخل ہوئے، اور وہاں کی علمی سرگرمیوں کو دیکھا تو بے ساختہ بول پڑے: اللہ تعالیٰ ابن مسعود کا بھلا کرے، انہوں نے تو اس بستی کو علم سے بھر دیا۔ ان کے علاوہ کم و بیش پندرہ سو صحابہ کرام یہاں جلوہ گر تھے، جن میں 70 صحابہ بدری ﷺ تھے۔

مدرسۂ کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ کے ذریعہ تربیت پانے والے چند ممتاز محدثین اور علماء کے اسماء گرامی یہ ہیں:

1. مسروق بن اجدع ہمدانی
2. عبیدہ بن عمرو سلمانی
3. ابو الاسود بن یزید نخعی
4. شریح بن حارث کندی
5. ابراہیم بن یزید نخعی (فقیہ عراق)
6. سعید بن جبیر
7. عامر بن شراحیل شعبی
8. علقمہ بن قیس

آپ کی روایتوں کی تعداد 868 ہے، اور ان میں سے صحیح بخاری و مسلم میں 120 روایتیں نقل کی گئی ہیں۔

مدرسہ کوفہ کی رونق اور بھی دوبالا ہو گئی جب حضرت علی ﷺ نے وہاں قیام کا فیصلہ کیا، آپ کو ابتداء ہی سے رسول اللہ ﷺ کی صحبت و قربت حاصل رہی، حدیث و سنت سے خاص دلچسپی تھی، لوگوں میں سنن سے سب سے زیادہ باخبر علی ﷺ تھے۔ حضرت علی ﷺ نے رسول اللہ ﷺ سے بہت سی روایتیں نقل کی ہیں، مگر بعض لوگوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے محدثین نے عام طور پر صرف ان روایتوں کو لیا ہے جو یا تو اہل بیت نے ان سے سنی ہیں یا ابن مسعود ﷺ کے شاگردوں نے۔ آپ کی طرف منسوب روایتوں کی تعداد 586 ہے، جن میں سے 66 بخاری میں پائی جاتی ہیں۔

ان دونوں حضرات کے علاوہ حسب ذیل صحابہ بھی کوفہ میں علمی مقام رکھتے تھے:

سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، خباب بن ارت، سلمان فارسی، حذیفہ بن یمان، عمار بن یاسر، ابوموسیٰ اشعری، براء بن عازب ﷺ، میسرہ بن شعبہ، نعمان بن بشیر، ابو الطفیل، اور ابو جحیفہ ﷺ وغیرہ۔ کوفہ کے علمی مقام و مرتبہ کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں 35، ایسے اہل علم بھی تھے جو صحابہ ﷺ کی موجودگی میں ارباب فتویٰ سمجھے جاتے تھے، جب کہ ان کا تعلق طبقۂ تابعین سے تھا۔

9.7.4 بصرہ

صحابہ کرام ﷺ کا ایک قافلہ یہاں بھی جلوہ گر ہوا، اور اس طرح اس شہر میں بھی نبوی ہدایات وتعلیمات کے چراغ روشن کئے گئے۔ حضرت انس بن مالک ﷺ دارالحدیث بصرہ کے سرخیل تھے، آپ کی تعلیم وتربیت گہوارۂ نبوت میں ہوئی، دس سال تک ایک عزیز اور خادم کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہے، صبح وشام کے معمولات بہ چشم خود دیکھا، اتباع سنت کا جذبہ ایسا تھا کہ ابو ہریرہ ﷺ کہتے ہیں: میں نے انس ﷺ سے زیادہ کسی کو رسول اللہ ﷺ سے ملتی جلتی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ حضور کی وفات کے بعد انس بن مالک 80 سال تک باحیات رہے، اس لئے آپ کے استفادہ کنندگان کی فہرست بہت طویل ہے، محدثین کے یہاں ان میں سے بطور خاص ان حضرات نے شہرت پائی: عمران بن حصین، حسن بصری، ثابت البنانی، سلیمان تیمی اور آپ کے صاحبزادگان موسی، نضر، ابوبکر وغیرہ۔ آپ کی روایتیں 2286 ہیں، نیز بخاری ومسلم نے باتفاق 186 روایتیں نقل کی ہیں، نیز ان کے علاوہ 83 محض بخاری اور 71 محض مسلم میں ہیں۔

آپ کے علاوہ حسب ذیل صحابہ کرام بھی بصرہ میں سکونت پذیر تھے:

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت علیؓ نے آپ کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا تھا، عتبہ بن غزوان، عمران بن حصین معقل بن یسار، عبدالرحمن بن سمرہ، ابو برزہ الاسلمی، ابوبکرہ، عبداللہ بن شخیر، جاریہ بن قدامہ۔

9.7.5 شام

اسلامی فتوحات کی تاریخ میں شام کی فتح سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، یہ خطہ زراعتی وافرادی ہر دو طرح کی قوت سے مالا مال تھا، چنانچہ فتح شام کے بعد بکثرت لوگوں نے دین حق کو قبول کیا اور ان کی تعلیم وتربیت کے لئے بڑے پیمانے پر ممتاز صحابہ کرام کو بھیجا گیا، اس قافلۂ علم وفضل کے سالار حضرت معاذ بن جبل ﷺ مقرر کئے گئے، آپ کو اس سے پیشتر خود رسول اللہ ﷺ نے یمن کا معلم بنا کر بھیجا تھا، نیز آپ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد وہاں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری بھی حضرت معاذ ﷺ ہی کو سونپی تھی؛ چنانچہ اس علمی مقام ومرتبہ کے پیش نظر فتح شام کے بعد حضرت عمر ﷺ نے انہیں لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لئے شام روانہ کیا۔ وہاں باضابطہ آپ کی مسند درس آراستہ ہوتی، اور آپ کے گرد طالبان شوق کا جمگھٹا ہوتا۔ ابومسلم خولانی کہتے ہیں: جب میں حمص کی مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کم وبیش 32 ادھیڑ عمر صحابہ موجود ہیں، اور ان میں ایک حسین نوجوان بھی ہے، جو خاموش بیٹھا ہوتا، مگر جب لوگوں کو کسی بات کا شبہ گزرتا تو اس کی جانب متوجہ ہوتے اور اس سے دریافت کرتے، میں نے اپنے ہم نشیں سے پوچھا یہ کون ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ معاذ بن جبلؓ ہیں۔ شہر بن حوشب کہتے ہیں: جب صحابہ باہم گفتگو کرتے، اور ان کے درمیان معاذ بن جبلؓ بھی موجود ہوتے، تو یہ لوگ معاذ کے علمی مقام ومرتبہ کے پیش نظر ان کی طرف دیکھا کرتے۔

محدثین شام میں عبادہ بن ثابت کا نام بھی بہت اہمیت رکھتا ہے، اس درسگاہ کی آبیاری میں آپ نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس سے قبل آپ جمع وتدوین قرآن کی خدمت میں بھی پیش پیش رہے، یزید بن معاویہ نے حضرت عمر کے نام خط لکھا تھا، اور گزارش کی تھی کہ اہل شام کی تعلیم وتربیت کے لئے چند اصحاب کو روانہ کردیں، حضرت عمر ﷺ نے تین اہل علم کو بھیجا تھا جن میں سے

ایک عبادہ بن صامت بھی ہیں ۔ یہ محدثین صحابہ میں سے تھے، آپ کے شاگردوں میں کئی صحابہ کے نام ملتے ہیں، جیسے کہ حضرت انس، جابر، ابوامامہ اور فضالہ ابن عبید وغیرہ، نیز تابعین کی بہت تفصیلی فہرست ہے، جن میں سے نمایاں نام یہ ہیں: ابوادریس خولانی، ابومسلم خولانی، اور آپ کے صاحبزادگان — ولید، عبداللہ اور داؤد — آپ سے 180 حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔

دیارشام کے اساطین حدیث میں حضرت ابودرداء کا بھی شمار ہوتا ہے، یہ صحابہ میں بلند پایہ محدث وفقیہ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے سہ رکنی وفد میں حضرت معاذ اور عبادہ بن صامت کے علاوہ یہ تیسرے فرد کی حیثیت سے شامل تھے، دمشق کے قاضی مقرر کئے گئے، آپ سے 179 حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔

مذکورہ صدر صحابہ کے علاوہ حضرت ابوذر غفاری، عبدالرحمن بن غنم، فضل بن عباس اور شرحبیل بن حسنہ وغیرہ نے بھی دیار شام میں خدمت حدیث کا کام انجام دیا ہے۔ اس درسگاہ سے تربیت پانے والے ہزاروں تابعین ہیں، جن میں سے قابل ذکر ابوادریس خولانی، ابومسلم خولانی، قبس بن ذویب، مکحول بن ابی مسلم، اور رجا بن حیوہ ہیں۔

9.7.6 مصر

یہ ملک اپنی تاریخ اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا، جب یہ علاقہ اسلام کے زیرنگیں آیا تو مصر کے اکثر باشندگان حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، ان کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے اور دینی پیرہن سے آراستہ کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ صحابۂ کرامؓ کی خدمات حاصل کی جائیں؛ چنانچہ بعض صحابہ بحکم خلیفہ اور بعضے از خود مصر کی طرف متوجہ ہوئے، اور وہاں جابسے، بعض محققین کے مطابق مصر میں سکونت پذیر صحابہ کرام کی تعداد 140 سے کچھ زائد ہے۔ اس مقدس کارواں کے سرخیل حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص تھے، آپ کے والد گرامی کو امیر معاویہ نے مصر کا گورنر نامزد کیا تھا؛ اس لئے آپ بھی والد کے ساتھ وہیں سکونت پذیر ہوگئے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما حفاظ حدیث میں سرفہرست تھے، بڑی دلچسپی ودلجمعی کے ساتھ حدیثوں کو یاد اور قلم بند بھی کرتے، یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ میں کثرت روایت کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ حدیثوں کا ایک بڑا مجموعہ آپ نے تیار کیا تھا، جسے الصادقۃ کے نام سے موسوم کیا کرتے، مصر میں عبداللہ بن عمرو نے باضابطہ درس حدیث کا اہتمام کیا، آپ کی روایتوں کی تعداد 722 ہے۔

محدثین مصر میں ایک اہم نام حضرت عقبہ بن عامر الجہنی کا بھی ہے، آپ سے کئی صحابہؓ نے روایتیں نقل کی ہیں، جیسے کہ ابن عباس، ابوامامہ۔ اور تابعین نے بھی استفادہ کیا ہے، جیسے کہ ابوادریس خولانی اور ابوالخیر وغیرہ، آپ کی طرف منسوب 55 روایتیں ہیں، اسی طرح صحابہ میں خارجہ بن حذافہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عبداللہ بن حارث، ابوبصرہ غفاری، ابوسعد الخیر اور معاذ بن انس الجہنی کے فیض علم سے بھی باشندگان بصرہ بہرہ ور ہوتے رہے۔

9.7.7 مدائن

فتح مدائن کے بعد کئی صحابہ نے وہاں کا رخ کیا، بلکہ اسلامی لشکر کے بعض سپاہی وہیں سکونت پذیر ہوگئے، مدائن کے نامور محدثین کی حیثیت سے حضرت حذیفہ بن یمان اور سلمان فارسی کا ذکر آتا ہے، یہ دونوں ہی جلیل القدر صحابہ تھے، حذیفہ رسول اللہ ﷺ

کے راز دار شمار کئے جاتے تھے، مستقبل میں پیش آنے والے فتنے اور علامات قیامت سے آپ کو گہری واقفیت تھی، شہر مدائن میں جمعہ اور دیگر مناسبتوں سے لوگ آپ کو سنا کرتے تھے، سو سے کچھ زائد حدیثیں آپ کی طرف منسوب ہیں۔

مدرسہ مدائن کی شہرت حضرت سلمان فارسی ؓ سے بھی ہے، فتح مدائن کے بعد آپ نے یہیں رہائش اختیار کر لی، اس موقع سے وہ تیس ہزار نفوس پر مشتمل لشکر کے سپہ سالار تھے، 60 سے کچھ زیادہ روایتیں آپ نے نقل کی ہیں۔

9.8 روایت حدیث کا طرز

رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو سننے اور نقل کرنے کے مختلف اسلوب محدثین کے درمیان رائج رہے ہیں، ان پر نگاہ ڈالنے سے محدثین کرام کی حدیث وسنت کے تئیں محتاط روش، دقت اور باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے، اور بلاشبہ پوری انسانی تاریخ میں یہ اہتمام صرف اور صرف حدیثوں کے لئے کیا گیا، ذیل میں روایت حدیث کے طریقوں پر گفتگو کی جارہی ہے۔

1. سماع: اس سے مراد اخذ حدیث کا وہ اسلوب ہے جس میں استاذ حدیث پڑھے اور شاگرد سنے، یہ سب سے بہتر اور قابل اعتماد طریقہ ہے، اس صورت میں شاگرد حدثنا، اُخبرنا، اور سمعت کے صیغے استعمال کرتا ہے۔

2. قرأت: شاگرد اپنے حافظہ یا کتاب سے پڑھے اور استاذ سنے، اسے محدثین کی اصطلاح میں القراءۃ علی الشیخ کہا جاتا ہے۔

اس صورت میں ''أخبرنی''، ''أنبانی'' اور ''قرأت علیه'' جیسے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک روایت حدیث کا یہ طریقہ سب سے بہتر ہے؛ کیوں کہ اس میں غلطی ہونے کا کم امکان ہوتا ہے۔

3. اجازت: استاذ اپنے شاگرد کو زبانی یا لکھ کر روایت حدیث کی اجازت دے، خواہ شاگرد نے استاذ سے وہ روایتیں سنی ہوں یا نہیں، واضح رہے کہ اجازت کی خود کئی قسمیں ہیں۔

4. مناولہ: استاذ اپنی روایت کردہ حدیثوں کا مجموعہ شاگرد کو دے، البتہ روایت کرنے کی صریح اجازت نہ دی ہو، تب بھی شاگرد کیلئے ان حدیثوں کو اپنے استاذ کی طرف منسوب کر کے نقل کرنا جائز ہے، اس صورت میں ''ناولنی'' کا صیغہ استعمال کرنا ہوگا، حدثنی و اُخبرنی کہنا جائز نہیں ہے۔

5. حکایۃ: استاد حدیثیں بطور خط لکھ کر یا کسی سے لکھا کر شاگرد کو بھیجے، عام طور پر محدثین نے اس صورت میں روایت کرنے کے لئے صریح اجازت کی شرط نہیں لگائی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ شاگرد کو اس تحریر کی شناخت ہو، کہ وہ اس کے شیخ کا خط ہے یا اس بات کا علم ہو کہ انہوں نے کسی سے لکھوایا ہے، واضح رہے کہ اس صورت میں روایت حدیث کے لئے یہ صیغے استعمال کئے جائیں گے: ''کاتبنی، کتب الی، أرسل الی، أجازنی کتابة، أجازنی بالکتابة'' البتہ ''أخبرنی'' یا ''حدثنی'' کا استعمال درست نہیں ہوگا،

6. اعلام: شیخ اپنے شاگرد کو محض بتائے کہ فلاں کتاب یا حدیث میری روایت کردہ (یا مسموعات) میں سے ہے، مگر بہ صراحت اس کی روایت کی اجازت نہ دے، بیشتر محدثین نے اس شکل میں بھی شاگرد کے لئے روایت حدیث کو جائز قرار دیا ہے، اور

10.3.1 امام مالک (متوفی:971ھ):

نام ونسب: اسم گرامی مالک، کنیت ابوعبداللہ اورنسب مالک بن انس بن مالک بن ابوعامر اصبحی ہے، ''امام دارالہجرۃ'' کے لقب سے نوازے گئے۔ صحیح قول کے مطابق 93ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے۔ یمن کے آخری شاہی خاندان ''حمیر'' کی شاخ ''اصبح'' سے تعلق رکھتے تھے، بعد کو یہ شاخ مدینہ میں سکونت پذیر ہوگئی، پردادا ابوعامر نے اسلام قبول کیا، اسی طرح دادا مالک بن ابی عامر تابعی تھے بلکہ کتب ستہ کے اہم راویوں میں یہ شامل ہیں۔

گویا کہ اس خاندان کو حدیث وسنت سے خوب شغف تھا، اور امام مالک اس روایت کے امین تھے، خود آپ نے جس شہر میں آنکھ کھولی وہ علم وفضل کا خزینہ دار تھا، نیز یہ شہر عہد نبوی کے بعد بھی 25,24 برس تک اسلامی حکومت کا دارالسلطنت رہا۔

تعلیم وتربیت: آپ نے لڑکپن ہی سے علم حاصل کرنا شروع کردیا تھا، مدینہ کے محدث حضرت نافع کی مجلسوں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے، اورفن تجوید وقراءت کی تربیت اور سند ابورد یم نافع بن عبدالرحمٰن (متوفی :129ھ) سے حاصل کی اور فقہ میں خاص طور پر ربیعہ الرأی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ربیعہ مدینہ کے ممتاز تابعین میں تھے، مسجد نبوی ﷺ میں درس دیتے تھے، مدینہ جو کہ خود علم وفقہ کا مرکز تھا، مگر آپ وہاں کے نامور مفتی شمار کئے جاتے تھے، خطیب بغدادی نے آپ کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ: وہ فقیہ، عالم اور فقہ وحدیث دونوں کے حافظ تھے، گویا کہ امام مالک کا فقہی مزاج ومذاق امام ربیعہ الرأی کے زیر تربیت پروان چڑھا۔

شیوخ واساتذہ: وہ حضرات جن سے امام مالک نے حدیثیں نقل کی ہیں، ان کی فہرست طویل ہے، مگر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امام صاحب ہر کس وناکس سے روایت نہیں کیا کرتے تھے، خود ان کا بیان ہے کہ ''مدینہ میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا مانگی جاتی تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا، لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا، کیوں کہ وہ صرف متقی اور زاہد تھے، اور حدیث وروایت اور فتوی کا کام صرف زہد وتقویٰ اور سادگی سے نہیں چلتا ہے، اس کے لئے پرہیزگاری کے ساتھ علم وفہم اور پختگی کی ضرورت ہوتی ہے''۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ امام نے بنیادی طور پر مدینہ ہی کے محدثین سے خوشہ چینی کی ہے، اور نہ ہی کبھی آپ نے حدیث کے لئے دیگر ملکوں وشہروں کا سفر کیا ہے؛ چنانچہ شاہ ولی اللہ کی تحقیق کے مطابق آپ نے جن اساتذہ سے اپنی کتاب مؤطاء میں روایت کی ہے ان کی تعداد 75 ہے، اور بعض محققین نے 94 تک ذکر کی ہے، مگر یہ تعداد محض موطاء کے اساتذہ وشیوخ کی ہے، جب کہ امام مالک کی روایت کردہ تمام احادیث کی تعداد دس ہزار ہے، لہٰذا آپ کے اساتذہ کی تعداد بھی 94 کے سوا ہے۔ آپ کے اساتذہ کی فہرست میں بیرون مدینہ کے بھی بعض شیوخ کا ذکر ملتا ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مطابق ان کی تعداد چھ ہے اور بعض دیگر محققین نے نو تک شمار کئے ہیں، البتہ ان حضرات سے آپ نے مدینہ ہی میں استفادہ کیا ہے۔

شاگرد واستفادہ کنندگان: مدینہ منورہ کی مرکزیت اور امام مالک کی بلند قامت شخصیت کا اثر تھا کہ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑی ہے، علامہ ذہبی کے یہ قول: امام مالک سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے۔ آپ کے

شاگردوں کی تعداد 1300 تک ذکر کی گئی ہے، ان میں سے چند کے سوا تمام ہی فن حدیث وفقہ کے آفتاب و ماہتاب کی حیثیت سے چمکے، اسی طرح ان سب کے حالات نام بنام محفوظ ہیں، غالباً کوئی بھی مجہول نہیں ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے آپ کے شاگرد دنیائے اسلام کے تمام ہی گوشوں سے تعلق رکھتے تھے، حجاز سے لیکر افریقہ واندلس تک ان کا دائرہ وسیع تھا۔ اور چوتھی بات یہ ہے کہ آپ سے استفادہ کنندگان میں حکمران وسلاطین، تابعین وائمہ مجتہدین، مفسرین ومحدثین، فقہاء وارباب قضاء، شعراء واہل ادب، صوفیاء اور فلاسفہ سب دوش بہ دوش نظر آتے ہیں؛ چنانچہ یہ چار پہلو ایسے ہیں جو آپ کو دیگر ائمہ ومحدثین کے مقابلہ میں ممتاز کرتے ہیں۔

اہل علم کی نظر میں: امام مالکؒ کی حدیث وفقہ میں امامت پر گویا پوری امت کا اجماع ہے، تمام ہی اہل علم آپ کے تئیں رطب اللسان ہیں، یحیٰ بن معین کہتے ہیں: ''مالک اقلیم حدیث کے بادشاہ ہیں''۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہا کرتے تھے: روئے زمین پر مالک سے زیادہ حدیث وسنت کا کوئی امین نہیں ہے''۔ سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ: ہم لوگ مالک کے سامنے کیا ہیں، ہم تو ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں''۔ یحیٰ بن سعید قطان فرماتے ہیں کہ: ''مالک اس امت کے لئے رحمت تھے۔ امام شافعی کہا کرتے تھے: امام مالک علماء میں ستارہ ہیں''۔

تصنیفات: امام مالک کا تعلق دوسری صدی ہجری سے ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ عہد تصنیف وتالیف کے لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے، چنانچہ امام موصوف کے قلم سے بھی کئی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، واضح رہے کہ آپ کی طرف منسوب کتابیں دو طرح کی ہیں، بعض تو وہ ہیں جو آپ نے بذات خود تحریر کی ہیں، اور بعضے وہ ہیں جو آپ کے شاگردوں کے ذریعہ مرتب کی گئی ہیں، ذیل میں ان میں سے چند کتابوں کا مختصر تعارف ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) **الموطا**: اس پر اگلی سطروں میں تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

(2) **رسالة مالک الی الرشید**: یہ دراصل خلیفہ ہارون رشید کے نام امام مالک کا ایک نوشتہ ہے، مختلف دینی واخلاقی پندونصائح پر مشتمل ہے، اور خلیفہ کو اس میں مخاطب کیا گیا ہے۔ ابن ندیم نے ''الفہرست'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ خط چھپ چکا ہے، اور اردو میں بھی اس کا ترجمہ کئی برس پہلے لاہور سے شائع کیا گیا ہے۔

(3) **المدونہ**: یہ فقہی مسائل واجتہادات کا بڑا مجموعہ ہے، آپ کے شاگرد عبدالرحمٰن بن قاسم (متوفی 191ھ) نے امام ہی کی زندگی انہیں یکجا کردیا تھا، یہ کتاب چھپ چکی ہے، اور بازار میں دستیاب بھی ہے۔

(4) **کتاب المجالسات عن مالک**: امام مالک کے شاگرد رشید ابن وہب نے آپ کے مجلسی افادات کو یکجا کردیا ہے، جو زیادہ تر حدیث وآثار اور اخلاق وتربیت سے متعلق علمی وفکری نکات پر مشتمل ہیں۔

(5) **کتاب الماثور عن مالک فی أحکام القرآن**: کتاب براہ راست امام کی تالیف نہیں ہے، بلکہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور مفسر ابو محمد مکی بن ابی طالب اندلسی (متوفی: 437ھ) نے تفسیر قرآن کے حوالے سے امام مالک کی تفسیری روایات کو یکجا کردیا ہے۔ یہ زیادہ تر آیات احکام پر مشتمل ہے۔

7. کتاب سوالات احمد   8. کتاب اولاد الصحابۃ

9. کتاب المخضرمین   10. کتاب حدیث عمرو بن شعیب

11. کتاب اوہام المحدثین   12. کتاب طبقات التابعین

صحیح مسلم: اس کتاب کو اتنی شہرت ملی کہ امام مسلم کے دیگر علمی کارناموں کو تاریکی میں کر دیا، اور صحت و استناد کے لحاظ سے صحیح بخاری کے دوش بہ دوش لا کھڑا کیا اور دونوں کا نام ایک ساتھ لیا جانے لگا۔

امام مسلم نے اس کتاب کے آغاز میں نہایت نفیس علمی مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں اصول حدیث، جرح و تعدیل اور ضعیف راویوں سے روایت کرنے کا حکم، وضع حدیث کی شناخت وغیرہ جیسے اہم امور پر روشنی ڈالی ہے۔ اصل کتاب بھی اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ کر بڑی اہمیت رکھتی ہے، صحیح مسلم میں روایت حدیث کے سلسلہ میں امام مسلم نے بڑی سخت شرط لگائی ہے، چنانچہ جس حدیث کی سند میں امام مسلم سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک ہر دور اور طبقے میں کم از کم دو راوی ہوتے ہیں اسی حدیث کو آپ کتاب میں درج کرتے ہیں، اسی طرح صرف ان روایتوں کا انتخاب کیا ہے، جن کی صحت پر اس دور کے علماء کا گویا اتفاق تھا، آپ کے ہاں الفاظ حدیث کے تئیں بہت باریکی پائی جاتی ہے۔ معمولی فرق کا لحاظ رکھتے ہیں، صحیح مسلم میں کم و بیش چار ہزار حدیثیں روایت کی گئی ہیں، غرض یہ کہ یہ کتاب حدیث و فن حدیث کا عظیم شاہکار ہے۔

10.3.6 امام ابوداؤد

نام و نسب: سلمان بن اشعث بن اسحٰق بن بشیر، کنیت ابوداؤد اور لقب سجستانی ہے۔ قبیلہ ازد سے نسبی تعلق تھا، 203ھ میں پیدا ہوئے، خراسان کا مشہور علاقہ سجستان آپ کا وطن ہے، جو سندھ اور ہرات کے درمیان قندھار کے قریب واقع ہے، بعد کو بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں ان کا انتقال 275ھ میں ہوا۔

اساتذہ: امام ابوداؤد ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں ائمہ حدیث اور ناقدین فن سے براہ راست استفادہ کا موقع ملا، حدیث کی تلاش میں آپ نے مختلف ممالک کے سفر بھی کئے، چنانچہ بغداد، حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام جزیرہ، نیشاپور، مرو اور اصفہان وغیرہ کے محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے ادب تہ کئے، اس وجہ کر آپ کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بھی خوب ہے، حافظ ابن حجر کے مطابق امام ابوداؤد کے اساتذہ تین سو کے قریب ہیں، ان میں امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، ابوثور، یحیٰ بن معین، طیالسی، ابوبکر ابن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، قتیبہ ابن سعید، محمد بن منکدر، سعید بن منصور، اور سلیمان بن حرب جیسے علماء حدیث اور ائمہ جرح و تعدیل شامل ہیں۔

شاگرد: آپ سے استفادہ کنندگان کا دائرہ بہت کشادہ ہے؛ چنانچہ امام ترمذی و نسائی جیسے جلیل القدر محدثین کو بھی آپ سے تلمذ حاصل ہے۔ اسی طرح ابوبکر بن ابوداؤد، احمد بن عمر لؤلؤی، ابوسعید احمد بن محمد اعرابی، ابوبکر محمد بن عبدالرزاق بن داسہ، ابوعیسیٰ اسحٰق بن موسیٰ رملی وغیرہ آپ کے مشہور تلامذہ میں ہیں۔

اہل علم کی نظر میں: ابوحاتم کہتے ہیں کہ: وہ حفظ کے اعتبار سے دنیا کے اماموں میں سے ایک امام تھے۔محمد بن یسین ہروی کا قول ہے کہ: وہ احادیث نبوی کے حافظ وواقف کار بھی تھے، اوران کی اسناد وعلل کے ماہر بھی۔محمد بن مخلد کا ارشاد ہے: ابوداؤد کے معاصرین اور اہل زمانہ ان کی امامت فن کے معترف تھے۔امام نووی نے بہت درست کہا ہے کہ: علماء اسلام ابوداؤد کی مدح وستائش، علم حدیث پر ان کی گرفت اور ذہن رسا پر متفق ہیں۔

تصنیف وتالیف: امام ابوداؤد نے اپنے پیچھے بہت بڑا علمی سرمایہ چھوڑا ہے، اور ان کی تالیفات اپنے موضوع کی عمدہ اور مستند سمجھی جاتی ہیں، تذکرہ نگاروں نے چودہ نام شمار کروائے ہیں، جن میں سے چند نام حسب ذیل ہیں:

1. السنن
2. كتاب المراسيل
3. كتاب الناسخ والمنسوخ
4. كتاب المسائل
5. كتاب الرد على اهل القدر
6. كتاب الدعاء

السنن لابی داؤد:

فن حدیث کی یہ معرکۃ الآراء کتاب ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے حدیث کی امہات الکتب اور صحاح ستہ میں شمار کیا گیا ہے، اس کتاب میں صرف احکام ومسائل سے متعلق روایتیں جمع کی گئی ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے، وہ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں نہیں ہے، اور اس طرز واسلوب کی بنیاد بھی گویا کہ آپ ہی نے رکھی۔ 241ھ سے قبل یہ کتاب منصۂ شہود پر آ چکی تھی، امام ابوداؤد نے سنن کو امام احمد کے سامنے پیش کیا تو انہوں پسندیدگی کا اظہار کیا اور تعریف کی۔امام خطابی فرماتے ہیں: ''سنن ابوداؤد ایک عمدہ اور نفیس کتاب ہے، دینی علوم میں ایسی بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی ہے''۔علامہ زاہد حسین الکوثری کا ارشاد ہے کہ: حلال وحرام سے متعلق احادیث احکام کے لئے یہ نہایت مفید اور نفع بخش کتاب ہے۔

10.3.7 امام ترمذیؒ

نام ونسب: محمد بن عیسی بن سورہ، کنیت ابوعیسی ہے، صغانیان کے مشہور شہر ترمذ سے آپ کا تعلق ہے، جو کہ مردم خیز سرزمین خراسان کا حصہ ہے۔ 209ھ میں پیدا ہوئے، ستر سال کی عمر پائی اور 279ھ میں ترمذ ہی میں وفات پائی اور یہیں دفن کئے گئے۔

اساتذہ: امام ترمذی نے جس خطہ میں آنکھ کھولی، وہ ارباب کمال اور علم وفن کا گہوارہ تھا، چہار دانگ عالم میں اس کی شہرت تھی، امام بخاریؒ جیسے محدث اسی خاک سے اٹھے تھے، جس کی وجہ کر تشنگان علم یہاں کھنچ کھنچ کر آنے لگے تھے، چنانچہ طبعی طور پر امام ترمذی کی ابتدائی تعلیم یہیں انجام پائی، ہاں علم کی تشنگی نے آپ کو حدیث کے دیگر عالمی مراکز تک بھی پہنچایا، حافظ ابن حجر کے مطابق: ''امام ترمذی نے متعدد شہروں کا سفر کیا، اور خراسان وعراق، اور حجاز کے ارباب کمال سے حدیث سنی''۔آپ کے اساتذہ بے شمار ہیں، ان میں امام بخاری، مسلم، ابوکریب، محمد بن بشار، قتیبہ بن سعید، ابومصعب، عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی جیسے جلیل القدر محدثین کے نام ملتے ہیں۔

شاگرد: آپ تصنیف وتالیف کے ساتھ درس حدیث کا بھی خوب اہتمام کیا کرتے، بخارا میں آپ کی مجلس حدیث آراستہ ہوتی ،آپ کے ممتاز شاگردوں میں حسب ذیل کا نام آتا ہے:

ابو حامد احمد بن عبداللہ بن داؤد مروزی، ہشیم بن کلیب، مکحول بن فضل، محمد بن محبوب، محمد بن مکی بن نوح اور محمد بن سفیان بن النظر وغیرہ۔

اہل علم کی نظر میں: ابن حبان لکھتے ہیں: ''امام ترمذی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حدیثوں کا ذخیرہ جمع کیا، اس پر تصنیف کی اور انہیں حفظ کیا''۔ علامہ ذہبی فرماتے ہیں: ''امام بخاری کے بعد ملک خراسان میں ترمذی سے بڑا نہ کوئی محدث تھا، اور نہ ہی کوئی ورع وتقوی میں ان جیسا کا حقیقی جانشیں''۔ خود امام بخاریؒ کو اپنے اس لائق ترین شاگرد پر ناز تھا، اور اس طرح ان کی ستائش کی کہ: ''تم نے مجھ سے جتنا فائدہ حاصل کیا ہے۔ اس سے زیادہ میں نے تم سے حاصل کیا ہے''۔

تصنیف وتالیف: امام ترمذی نے اس جانب بھی توجہ کی، اور کئی بلند پایہ کتابیں آپ کے قلم سے منظر عام پر آئیں، تذکرہ نگاروں کے مطابق آپ کی طرف منسوب کتابیں اس طرح ہیں:

1. جامع الترمذی
2. كتاب العلل الصغر
3. كتاب العلل الكبير
4. كتاب الشمائل النبوية
5. كتاب الاسماء والكنى
6. كتاب التاريخ
7. كتاب الزهد

جامع الترمذی: یہ ایک بے نظیر فقہ وحدیث کی جامع ترین کتاب ہے، صحاح ستہ میں اسے تمام محدثین نے شمار کیا ہے۔ شیخ الاسلام اسماعیل ہروی کہا کرتے تھے کہ: سنن ترمذی، بخاری اور مسلم سے زیادہ فائدہ بخش ہے، علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ: امام ترمذی نے جامع الترمذی کو تالیف کے بعد خراسان، حجاز، مصر اور شام کے علماء کے پاس پیش کیا، اور ان تمام علماء نے اسے پسند کیا، تب اس کی عمومی اشاعت فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جامع ترمذی فقہی مزاج و مذاق پیدا کرنے کے لئے بہت مفید کتاب ہے، اور فقہ وحدیث کا بہترین سنگم ہے۔

10.3.8 امام نسائی

نام ونسب: احمد بن شعیب بن علی بن سنان، کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے۔ 214یا215ھ میں پیدا ہوئے، خراسان کا مشہور شہر ''نساء'' آپ کی جائے پیدائش ہے، بعد میں مصر منتقل ہو گئے، اور یہیں سکونت اختیار کرلی، بعمر 88 سال 303ھ میں وفات پائی۔

اساتذہ: آپ نے ابتدائی تعلیم خراسان ہی میں پائی، البتہ مختلف ملکوں کے سفر بھی کئے، حجاز، بغداد، عراق، مصر اور شام کے محدثین سے استفادہ کیا۔ آپ کے اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے، ان میں سے چند مشہور نام یہ ہیں، امام بخاری، ابوداؤد، قتیبہ بن سعید، محمد بن بشار، اسحٰق بن راہویہ، محمد بن غیلان، محمد بن نصر مروزی۔

شاگرد: امام نسائی کا تعلق چوں کہ تیسری صدی ہجری سے تھا، اور یہ دور علم حدیث کے فروغ کا ہے، ہر طرف مراکز حدیث قائم ہو چکے تھے، اور طالبان حدیث کو گویا کہ ممتاز محدثین کی تلاش ہوتی تھی، اس لئے امام نسائی طلبہ کے لئے مرکز توجہ بنے رہے، اس لئے استفادہ کنندگان کا دائرہ بھی بہت کشادہ ہو گیا تھا، آپ کے چند مشہور شاگرد یہ حضرات ہیں:

ابو بکر احمد بن محمد بن اسحٰق معروف بہ ابن سنی، ابراہیم بن محمد بن صالح، ابوالقاسم طبرانی، محمد بن قاسم اندلسی، محمد بن معاویہ، امام ابوجعفر طحاوی، ابوعوانہ، اور خود آپ کے صاحبزاے عبدالکریم وغیرہ۔

اہل علم کی نظر میں: امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ: ''امام نسائی اپنے دور کے تمام علمائے حدیث میں یکتا اور سب سے زیادہ بہتر و برتر تھے'' ابن یونس کہتے ہیں کہ: ''وہ نہایت ثقہ ثابت ہیں''۔ امام سیوطی نے آپ کو ممتاز حفاظ حدیث میں سے ایک شمار کیا ہے، دارقطنی اور حاکم جیسے ائمہ حدیث کا رجحان یہ ہے کہ: وہ اپنے معاصرین میں صحیح وسقیم روایت اور رجال کے حوالے سے سب سے زیادہ واقف کار تھے۔

تصنیف وتالیف:

1. السنن الکبری
2. السنن الصغری (المجتبی)
3. خصائص علی
4. فضائل الصحابة
5. کتاب الضعفاء والمتروکین
6. اسماء الرواۃ والتمییز بینهم

سنن نسائی: اس نام سے مؤلف کی دو کتابیں ہیں، البتہ کتب ستہ میں سنن صغری کو شامل کیا جاتا ہے، اور یہ آپ کی اہم ترین کتاب شمار کی جاتی ہے، دراصل آپ نے پہلے پہل ایک بہت تفصیلی اور جامع کتاب السنن الکبری کے نام سے تحریر کی تھی، مگر امیر رملہ کی خواہش پر اس میں سے صحیح حدیثوں کا انتخاب الگ جمع کر دیا گیا، جسے المجتبی یا السنن الصغری کہا جاتا ہے۔ بعض محدثین نے اسے ترتیب میں بخاری ومسلم کے بعد تیسرے نمبر پر رکھا ہے، اس کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ مؤلف حدیث میں پائی جانے والی علت اور کجی کی گرفت بھی کرتے ہیں، اور اس کی نشاندہی بھی، اس طرح ایک ہی حدیث سے مختلف مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

10.3.9 امام ابن ماجہ

نام ونسب: محمد بن یزید بن عبداللہ، اور کنیت ابوعبداللہ ہے، ربعی وقزوینی نسبت رکھتے تھے، اول الذکر قبیلۂ ربیعہ کے ساتھ موالات کا رشتہ رکھنے کی وجہ سے ہے اور دوسری نسبت علاقہ سے ہے۔

قزوین کے رہنے والے تھے، اصفہان کے مشہور شہروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش 209ھ میں ہوئی اور انتقال 21 رمضان 373ھ میں ہوا۔

اساتذہ: قزوین چوں کہ خود مردم خیز شہر تھا، اس لئے ابتدا میں آپ نے حصول علم کے لئے وہاں کے ارباب علم کے خرمن فیض سے وابستگی اختیار کی، پھر علم کی تشنگی اور حدیث کی تلاش وجستجو نے آپ کو دیگر مراکز علم کی طرف بھی متوجہ کیا، چنانچہ خراسان، عراق،

مصر، شام، ری، بصرہ، کوفہ، بغداد، مکہ اور دمشق تشریف لے گئے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ نے بیرون شہر سفر کا آغاز 22 سال کی عمر میں کیا۔

بہر حال دشت علم کی سیاحی نے آپ کو بہت سے نمایاں اہل علم سے استفادہ کا موقع فراہم کیا، بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے تین سو سے زیادہ شیوخ سے استفادہ کیا ہے۔ ابن ماجہ کے اساتذہ میں امام ذہلی، محمد بن بشار اور محمد بن مثنی سرفہرست ہیں۔ اسی طرح علی بن محمد طنافسی اور ابوبکر بن ابی شیبہ کی مجلس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ دیگر شیوخ میں ہشام بن عمار، یونس بن عبدالاعلی اور محمد بن مصفی کا ذکر ملتا ہے۔

شاگرد: امام ابن ماجہ سے کسب فیض کرنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

علی بن ابراہیم، سلیمان بن یزید، محمد بن عیسی ابوبکر حامد ابہری، سعدون، ابراہیم بن دینار، اسحٰق بن محمد قزوینی۔

اہل علم کی نظر میں: ابن ماجہ کے علمی مقام و مرتبہ کا اعتراف تمام ہی محدثین کو ہے حافظ ابویعلی حنبلی فرماتے ہیں: وہ ایک بلند پایہ معتبر، اور لائق حجت محدث تھے، ان کی عظمت وثقاہت پر اتفاق ہے'' ان کو فن حدیث سے پوری واقفیت تھی، اور وہ اس کے جلیل القدر حافظ تھے، علامہ ابن الجوزی نے ان الفاظ میں آپ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے: وہ حدیث و تاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے، علامہ ابن حجر کا ارشاد ہے: وہ السنن کے مؤلف، حافظ حدیث اور اس فن کے امام تھے۔

تصنیف: امام ابن ماجہ نے اپنے پیچھے تین نہایت علمی و وقیع اور یادگار کتابیں چھوڑی ہیں۔

(1) تفسیر: اس کتاب کا ذکر علامہ ابن کثیر اور سیوطی نے بڑے اہتمام کے ساتھ کیا ہے اور تعریف و توصیف بھی کی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ابن جریر کے طرز پر تفسیر قرآن میں زیادہ تر احادیث و آثار صحابہ و تابعین پر اعتماد کیا گیا ہے، نیز یہ روایتیں اور آثار سند کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں۔

(2) تاریخ: امام ابن ماجہ کو تاریخ سے گہری دلچسپی تھی، چنانچہ آپ نے اس موضوع پر بھی قلم اٹھایا، اس کتاب میں اسلامی ممالک کی تاریخ کے ساتھ ساتھ راویان حدیث کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی جس کی وجہ کر وہ طالبان حدیث کے لئے اہمیت کی حامل تھی، مگر اب اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے، گویا کہ مفقود کے حکم میں ہے۔

السنن: یہی وہ مبارک کتاب ہے جس نے امام ابن ماجہ کے تذکرے کو زندہ جاوید بنا دیا ہے، اور حقیقت میں یہ آپ کا سب سے اہم علمی کارنامہ ہے، سنن ابن ماجہ فقہی ترتیب کے مطابق مرتب کی گئی ہے، نہایت جامع ہے، حدیث کے تکرار سے اجتناب کیا گیا ہے، ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سی ایسی حدیثیں مل جاتی ہیں، جو بقیہ پانچ معتبر کتابوں میں نہیں دستیاب ہوتی ہیں، سنن ابن ماجہ کا سرمایہ افتخار یہ ہے کہ اس میں 5 ثلاثی حدیثیں ہیں۔

حدیث کی پانچ معتبر کتابوں کے ساتھ بحیثیت چھٹی کتاب کے سب سے پہلے امام ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی (متوفی 507ھ) نے سنن ابن ماجہ کا اضافہ کیا تھا۔ اس کتاب میں 32 جلی عنوانات ہیں، اور پندرہ سو ابواب، نیز مجموعی طور پر چار ہزار حدیثیں ہیں۔

10.3.10 امام ابو یعلی موصلی

نام ونسب: احمد بن علی بن مثنی بن یحی، اور ابو یعلی کنیت ہے، 220ھ میں اپنے وطن موصل میں پیدا ہوئے، خاندانی تعلق قبیلہ بنی تمیم سے تھا، اس لئے تمیمی نسبت رکھتے تھے، موصل دجلہ وفرات کا درمیانی علاقہ ہے۔

اساتذہ: آپ کو وقت کے ممتاز محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، نیز دیگر علاقوں کے سفر بھی کئے، طلب حدیث کے لئے 15 برس کی عمر اور بعض کے مطابق 18 برس کی عمر سے سفر کا آغاز کیا، اس زمانے کے دستور کے مطابق مختلف مراکز حدیث کے مستند اور معتبر محدثین کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے۔

آپ کے اساتذہ میں چند مشہور بزرگ یہ ہیں:

امام احمد بن حنبل، احمد بن حاتم، خلیفہ بن خیاط، علی بن جعد، یحی بن معین، غسان بن لیث۔

شاگرد: بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں: ابوبکر بن مقری، حمزہ بن محمد کتانی اور نصر بن احمد مرجی۔

اہل علم کی نظر میں: ابو یعلی کا نام محدثین کی فہرست میں نمایاں حیثیت سے لکھا جاتا ہے، اور آپ کے علمی مقام وتبحر کے سبھی معترف ہیں، ابن عماد حنبلی نے کہا ہے ''وہ ثقہ اور متقن تھے''، ابو علی لکھتے ہیں: ان سے بہت کم حدیثیں پوشیدہ رہیں'' علامہ ابن کثیر کا قول ہے: وہ اپنے مرویات میں ثقہ وعادل اور احادیث میں حافظ وضابط تھے۔

تصنیف وتالیف: ابو یعلی ایک باکمال محدث ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب مصنف بھی تھے، تاریخ نے آپ کے قلم سے دو کتابیں محفوظ کی ہیں:

(1) المعجم: اس میں حدیثوں کو آپ نے شیوخ کی ترتیب پر جمع کیا ہے۔

(2) المسند: مؤلف کی یہ سب سے اہم علمی کاوش سمجھی جاتی ہے۔ حافظ اسماعیل تیمی نے اس کے تئیں یوں لکھا ہے: میں نے کئی مسانید جیسے مسند عدی، اور مسند منیع پڑھی ہیں ان کی حیثیت بمقابلہ مسند ابی یعلی کے نہر کی سی ہے، جب کہ ابی یعلی کی مسند نہروں کے سنگم اور سمندر کی سی ہے۔ مسند ابی یعلی اب طبع ہو چکی ہے۔ ممتاز محدثین جیسے کہ ابن کثیر، محمد بن سلیمان اور علامہ ہیثمی نے مسند ابی یعلی سے استفادہ کیا ہے۔

10.3.11 امام ابو جعفر طحاوی

نام ونسب: احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ، کنیت ابو جعفر اور نسبت ازدی وحجری طحاوی ہے، خاندانی تعلق یمن کے مشہور قبیلہ ازد کی شاخ حجر سے تھا، اسلامی فتوحات کے بعد آپ کے خاندان والوں نے مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ گویا کہ اول الذکر دونوں نسبتیں قبیلہ کی طرف ہیں، اور طحاوی مصر کے ایک گاؤں ''طحا'' کی طرف نسبت ہے۔

مشہور قول کے مطابق 239ھ میں پیدا ہوئے۔ اور 321ھ بروز جمعرات مصر میں وفات پائی۔

اساتذہ: امام طحاوی کے اساتذہ وشیوخ کی فہرست بہت طویل ہے، ممتاز محدثین وفقہاء سے آپ کو استفادہ کا موقع ہاتھ آیا ہے، یہ بات بھی اہم ہے کہ آپ کو صحاح ستہ کے مصنفین کی معاصرت حاصل ہے، نیز آپ امام مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ کے ساتھ بعض شیوخ اور اساتذہ میں بھی شریک ہیں، جیسے کہ ہارون بن سعید، ربیع بن سلیمان، ابوموسی یونس بن عبدالاعلی اور دیگر۔ گویا کہ امام طحاوی کو صحاح ستہ کے مؤلفین کی معاصرت بھی حاصل ہے، نیز بعض اساتذہ کے لحاظ سے ہم درسی بھی۔

امام طحاوی نے ان حضرات کے علاوہ بطور خاص اپنے ماموں اور امام شافعی کے شاگرد خاص مزنی سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، اور دیگر مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

بحیر بن نصر، سلیمان بن شعیب کیسانی، عبدالغنی بن رفاعہ، محمد بن عبدالحکیم، ہارون بن سعید، یونس بن عبدالاعلی، قاضی ابوحازم عبدالمجید، احمد بن عمران۔

شاگرد: امام طحاوی کے علمی مقام ومرتبہ کی وجہ کر وہ طالبان شوق کی دلچسپی کا مرکز بنے رہے، اور اس طرح تلامذہ کا دائرہ بہت کشادہ ہو گیا، بعض اہل علم نے آپ کے شیوخ وتلامذہ پر مشتمل کتابچہ لکھا ہے اور ان کے نام جمع کرنے کی کوشش کی ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن عبدالوارث زجاج، احمد بن قاسم خشاب، ابومحمد حسن بن قاسم مصری، ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، ابوبکر محمد بن ابراہیم مقری، یوسف بن قاسم، ابوسعید عبدالرحمٰن بن احمد مصری، اور آپ کے صاحب زادے علی بن احمد۔

اہل علم کی نظر میں: تمام ہی محدثین اور انصاف پسند اہل علم آپ کے معترف نظر آتے ہیں، ابن ندیم فرماتے ہیں کہ: وہ علم وفضل میں بے مثال اور یکتائے روزگار تھے، علامہ عینی کا ارشاد ہے: امام طحاوی کی امانت وکتابت پر تمام علماء کا اجماع ہے، علم حدیث، علل حدیث اور ناسخ ومنسوخ میں وہ درک رکھتے تھے، اور ان کے بعد کوئی اس جگہ کو پر نہ کرسکا۔ علامہ کوثری لکھتے ہیں: اگر کوئی صاحب انصاف طحاوی اور ان کے معاصرین کی کتابوں کا بغور مطالعہ کرے تو اس فیصلے پر مجبور ہوگا کہ طحاوی قرآن وحدیث سے استنباط احکام اور فقہ میں تمام معاصرین سے زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کا فرمان ہے: ان کی تصانیف ان کی وسعت نظر اور علمی تبحر پر شاہد ہیں۔

تالیفات: امام طحاوی ان اصحاب علم میں تھے جنہوں نے اپنے پیچھے بہت بڑا علمی وتحقیقی سرمایہ چھوڑا ہے، بلکہ اسے کتب خانہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، حقیقت یہ کہ آپ کی تالیفات اپنے فن اور موضوع کی نہایت عمدہ ونفیس اور مستند سمجھی جاتی ہیں۔

اسلامی علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ فن جرح وتعدیل، علم الرجال اور متعارض حدیثوں کی تطبیق میں آپ کو خاص درک تھا۔ امام طحاوی کی تالیفات 30 سے زیادہ ذکر کی گئی ہیں، اور ان میں سے کئی کتابیں متعدد اجزاء اور جلدوں پر مشتمل ہے، چند نام یہ ہیں:

1. شرح معانی الاثار
2. مشکل الآثار
3. مختصر الطحاوی
4. عقیدۃ الطحاوی
5. احکام القرآن
6. اختلاف العلماء

شرح معانی الآثار:

امام طحاوی کی یہ معرکۃ الآراء کتاب شمار کی جاتی ہے، اس میں فن فقہ وحدیث کا امتزاج پایا جاتا ہے، علامہ ابن حزم نے اس کو سنن ابوداؤد اور سنن نسائی کے ہم پایہ قرار دیا ہے۔ یہی رائے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی بھی ہے، اس کتاب میں مؤلف نے بنیادی طور پر دو روایتوں میں پائے جانے والے تضاد کو دور کر کے ہر ایک کا اپنا محل واضح کیا ہے۔ کتاب میں وارد حدیثوں کے طرق، اسناد کی تعداد، راوی کے درجہ کی وضاحت، نیز ناسخ ومنسوخ کی نشاندہی وغیرہ کی گئی، جس کی وجہ کر بہ یک وقت کسی روایت کا پورا حال سمجھا جا سکتا ہے۔

10.4 عہد وسطی کے محدثین

حدیث کی جمع وتدوین کے سلسلہ میں تیسری صدی ہجری کی خدمات نہایت اہم سمجھی جاتی ہیں، مگر اس کے بعد بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا ہے، اور باکمال محدثین کی کوئی کمی نہیں رہی۔ چنانچہ اس دور میں حدیث کی بعض بہت ہی ضخیم کتابیں تحریر کی گئی ہیں، جیسے المعجم الکبیر للطبرانی، اسی طرح احادیث احکام میں امام دارقطنی اور بیہقی کی السنن وجود میں آئی، صحیح روایتوں کو جمع کرنے کا بھی اہتمام رہا، جیسے صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم وغیرہ۔ اس دور کا تحریری سرمایہ اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اس عہد کے مختلف فرقوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، نیز ان کے گمراہ کن نظریات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

10.4.1 امام ابن حبان

نام ونسب: محمد بن حبان بن احمد بن حبان بن معاذ، کنیت ابوحاتم اور لقب ابن حبان تھا۔

عرب کے مشہور قبیلہ تمیم کی شاخ دارم سے نسبی تعلق رکھتے تھے، اس لئے دارمی اور تمیمی نسبت سے مشہور ہوئے۔ بست میں آپ کی پیدائش ہوئی ہے، یہ سیستان کا ایک خطہ ہے، جو ہرات اور غزنین کے درمیان دریائے ہلمند کے کنارے واقع تھا، یہ علاقہ ارباب علم وفضل کا گہوارہ ہوا کرتا تھا۔ ایک اندازہ کے مطابق لگ بھگ 275ھ میں آپ پیدا ہوئے، اور تقریباً اسی سال کی عمر میں 354ھ میں وفات پائی۔

اساتذہ وشیوخ: امام ابن حبان نے حصول علم اور روایت حدیث کے لئے ملکوں ملکوں کے سفر کئے، بے شمار محدثین اور شیوخ سے حدیثیں اخذ کیں، اس لئے ان کی تعداد متعینہ طور پر کہنا مشکل ہے، البتہ خود ان کا بیان ہے کہ ''شاید ہم نے شاس اور اسکندریہ کے درمیان کے دو ہزار بزرگوں سے حدیثیں لکھی ہیں''۔ آپ کے بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوعبدالرحمٰن نسائی، ابویعلی، ابوبکر بن خزیمہ، حسن بن سفیان شیبانی، ابوعوانہ، یعقوب بن اسحٰق، محمد بن یزید دورقی، محمد بن عثمان بن سعد دارمی، حسین بن ادریس ہروی۔

شاگرد: چوں کہ علم حدیث اور جرح وتعدیل میں آپ کو خوب درک تھا، اس لئے طلبہ حدیث بڑے ذوق وشوق سے آپ سے استفادہ کرتے اور دور دراز علاقے سے اخذ حدیث کے لئے کھنچے چلے آتے۔ چنانچہ آپ کے تلامذہ کی بھی فہرست بہت طویل ہے، ان میں سے چند ممتاز اصحاب حدیث کے نام یہ ہیں:

ابوعبداللہ حاکم، ابوعبداللہ بن مندہ اصفہانی، جعفر بن شعیب بن محمد سمرقندی، محمد بن احمد بن منصور بوقزوینی۔ ابوعلی منصور بن عبداللہ، خالد ذہابی وغیرہ۔

اہل علم کی نظر میں: علامہ ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں: ''وہ حافظ وثبت اور امام وحجت تھے''۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ''مختلف شہروں اور ملکوں میں ان کی غیر معمولی شہرت تھی، اور وہ بالاتفاق ائمہ امت میں شمار کے جاتے ہیں''۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام ہی محدثین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ متون واسانید کے عالم اور واقف کار تھے، اور حدیث کے حوالے سے ان کے کارنامے غیر معمولی ہیں، نیز جرح وتعدیل میں ان کی خدمات حیرت انگیز ہیں۔

تصنیفات: امام ابن حبان کثیر التصانیف اہل علم میں سے ہیں، اور ان کی کتابیں اپنے فن میں مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہیں، تذکرہ نگاروں نے کم وبیش 58 کتابیں ذکر کی ہیں، مگر حیف صد حیف یہ علمی ذخیرہ محفوظ نہ رہ سکا اور امت اس عظیم سرمایہ سے محروم ہوگئی۔ امام ابن حبان کی چند کتابوں کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

1. كتاب الصحابة
2. كتاب التابعين
3. كتاب اتباع التابعين
4. كتاب شعب الايمان
5. الهداية الى علم السنن
6. كتاب الفصل بين حدثنا وأخبرنا
7. كتاب الجرح والتعديل
8. كتا ب الثقات
9. كتاب الضعفاء والمجروحين
10. صحيح ابن حبان

صحیح ابن حبان: یہ کتاب امام بن حبان کا اہم علمی کارنامہ ہے، مولف نے اس کا نام التقاسیم والانواع رکھا ہے، البتہ ''صحیح'' کے نام سے بھی یہ مشہور ہوگئی ہے، اس کتاب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ابن حبان نے صحیح روایتوں کے انتخاب کا اہتمام کیا ہے، ظاہر ہے کہ امام بخاری ومسلم کی طرح تو وہ صحت کی تمام شرطوں کا لحاظ نہیں رکھ پائے ہیں، مگر اس کے باوجود کتاب کی حدیثیں عام طور پر صحت کی شرطوں کو پورا کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض محدثین نے اسے سنن ابن ماجہ سے زیادہ صحیح روایتوں کا مجموعہ بتایا ہے۔ اور بعض محققین نے صحیح بخاری ومسلم کے بعد صحیح ابن خزیمہ اور اس کے بعد چوتھے نمبر پر صحیح ابن حبان کو رکھا ہے، گویا کہ سنن اربعہ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ) سے پہلے اس کتاب کو مقام دیا گیا ہے۔ کتاب کی ترتیب بہت گنجلک اور پیچیدہ ہے، البتہ بعد کے محدثین نے اسے مناسب انداز میں از سرنو مرتب کر دیا ہے، یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

کتاب الثقات: یہ علم الرجال کی معرکۃ الآراء کتاب ہے، اس کی اہمیت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اسے فن رجال کی امہات الکتب میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کے بعد لکھی گئی تمام کتابیں ''الثقات'' سے فائدہ اٹھاتی رہی ہیں، کتاب کا موضوع ثقہ وباعتماد راویوں کے حالات جمع کرنا اور راوی حدیث کی حیثیت سے ان کے درجہ کی نشاندہی کرنا ہے، مگر واضح رہے کہ راویوں کے کئی درجات ہیں، اور تمام پر ثقہ کا اطلاق نہیں ہوتا ہے، امام ابن حبان نے اس سلسلہ میں کچھ توسع سے کام لیا ہے، چنانچہ ثقہ راوی سے ان کی مراد یہ ہے کہ وہ راوی جو منکر الحدیث، مجروح اور مدلس نہ ہو، جب کہ محدثین کے ہاں عام طور پر ثقہ کی تعریف میں اتنی

وسعت نہیں پائی جاتی ہے۔ کتاب حروف تہجی کی ترتیب پر ہے، مولف نے صحابہ سے لے کر اپنے عہد تک کے ثقہ راویان حدیث کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے، اور بازار میں دستیاب بھی ہے۔

10.4.2 امام ابوالقاسم طبرانی

نام ونسب: سلیمان بن احمد بن ایوب اور کنیت ابوالقاسم ہے۔ 260ھ میں پیدا ہوئے، اصلی وطن طبریہ ہے، جو کہ اردن کے قریب واقع ہے، اسی نسبت سے طبرانی کہلاتے ہیں۔

اساتذہ: امام طبرانی نے اپنے عہد کے ممتاز محدثین سے استفادہ کیا ہے، اور طلب حدیث کے لئے مختلف علمی مراکز کے سفر بھی کئے، چنانچہ حجاز، یمن، مصر، بغداد، کوفہ، بصرہ اور اصفہان وغیرہ کے محدثین سے سماعت وروایت کی ہے، آپ کے شیوخ کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے، چند حضرات یہ ہیں:

ابوعبدالرحمٰن نسائی، احمد بن انس، بشر بن موسی، حسن بن سہل، علی بن عبدالعزیز بغوی، یحی بن ایوب علاف، ابوسعید بن ہاشم بن مرثد طبرانی۔

شاگرد: آپ کے فیضان علم سے سیراب ہونے والوں کی تعداد تو بے شمار ہے بلکہ خود آپ کے بعض شیوخ بھی اس فہرست میں شامل ہیں، چند نام یہ ہیں:

ابن عقدہ، ابوبکر بن زبدہ، ابواحمد بن عبداللہ بن عدی جرجانی، ابوعمر محمد بن حسین بسطامی، حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ، عبدالرحمٰن بن احمد صفار، ابوبکر، عبدالرحمٰن بن علی ذکوانی۔

اہل علم کی نظر میں: علامہ ابن الجوزی نے اس انداز میں آپ کا تذکرہ کیا ہے: ''امام سلیمان کا حافظہ نہایت قوی تھا''۔ امام ذہبی رقم طراز ہیں: ''وہ ضبط وثقاہت اور صدق وامانت کے ساتھ بلند رتبہ محدث تھے''۔ ابن عماد نے تحریر کیا ہے کہ ''طبرانی ثقہ وصدوق اور حدیثوں کے علل، رجال وابواب کے اچھے واقف کار تھے''۔ گویا کہ تمام ہی محدثین آپ کے علم وفضل اور کمال کے معترف ہیں۔

تصنیفات: امام طبرانی نے اپنے پیچھے باضابطہ ایک کتب خانہ چھوڑا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں آپ کا نام کثیر التألیف شخصیتوں کے زمرے میں کیا جاتا ہے، تذکرہ نگاروں نے تقریباً اسی تألیفات کا ذکر کیا ہے۔ اوران میں بعض تو اپنے موضوع کی انسائیکلوپیڈیا ہیں، ذیل میں چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

1. كتاب الأوائل
2. كتاب التفسير
3. كتاب السنة
4. كتاب عشرة النساء
5. كتاب الدعاء
6. المعجم الكبير
7. المعجم الأوسط
8. المعجم الصغير

کتاب الدعاء : امام طبرانی نے اس میں رسول اللہ ﷺ سے سنی گئی دعائیں جمع کردی ہیں؛ تاکہ لوگ پر تکلف عبارتوں اور سجع وقافیہ بندی سے پر اسلوب سے اجتناب کریں، نیز دعاء کی ہیئت وآداب سے متعلق احادیث وسنن بھی اس میں جمع کردی گئی ہیں۔

المعجم الکبیر : اس کتاب میں مؤلف نے حدیثوں کو صحابہ کی ترتیب پر جمع کیا ہے، یعنی ہر صحابی کی تمام روایتوں کو ایک جگہ ذکر کردیا ہے، خواہ ان کا موضوع باہم مختلف ہو اور صحابۂ کرام کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر رکھے گئے ہیں، محدثین کا خیال ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی معجم ہے اور جب محض ''معجم'' کہا جائے تو اس سے یہی کتاب مراد ہوتی ہے، واضح ہو کہ اس میں حضرت ابو ہریرہ کی مسند شامل نہیں ہے، مؤلف نے اسے مستقل کتاب کی حیثیت سے مرتب کیا ہے۔

المعجم الأوسط : اس کتاب میں مؤلف نے اپنے تقریبا ایک ہزار شیوخ واساتذہ کی صرف ان روایتوں کو جمع کیا ہے، جو صرف کسی ایک کے پاس ہوں، انہیں محدثین کی اصطلاح میں ''افراد'' و''غرائب'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

المعجم الصغیر : اپنے حجم کے اعتبار سے یہ کتاب بہت مختصر ہے، مؤلف نے ہر شیخ کی ایک یا دو روایت کو شیوخ کی ترتیب سے جمع کردیا ہے۔

امام طبرانی کی یہ تینوں ''معاجم ثلاثہ'' تحقیق کے ساتھ چھپ چکی ہیں۔

10.4.3 امام دارقطنی

نام ونسب: علی بن عمر بن احمد بن مہدی، کنیت ابوالحسن اور لقب ''امیر المؤمنین فی الحدیث'' ہے، 306ھ میں بغداد کے ایک محلّہ دارقطن میں پیدا ہوئے اور 385ھ میں وفات پائی۔

اساتذہ: آپ میں بچپن ہی سے علم حدیث سے دلچسپی پائی جاتی تھی؛ اس لئے کم سنی میں طلب حدیث کا آغاز کردیا تھا، جوں جوں بڑے ہوئے یہ ذوق وشوق بھی پروان چڑھتا گیا، بغداد جو کہ خود علم وعلماء کا مرکز تھا، اس کی آغوش میں رہ کر خوب استفادہ کیا، نیز اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لئے کوفہ، بصرہ، واسط، شام اور مصر وغیرہ کا رخ کیا؛ اس لئے آپ کے اساتذہ وشیوخ کی فہرست بھی طویل ہے، چند اہم نام یہ ہیں:

ابوبکر بن ابی داؤد سجستانی، ابن درید، ابن زیاد نیشاپوری، قاضی ابراہیم بن حماد، احمد بن اسحاق بن بہلول، عبداللہ بن ابی حیہ، محمد بن نوح نیساپوری، یحیی بن محمد صاعد، یوسف بن یعقوب نیشاپوری۔

شاگرد: اللہ تعالیٰ نے امام دارقطنی کو باکمال شاگردوں سے نوازا تھا، جنہوں نے آپ کے علم کو زندہ وتابندہ رکھا، چند تلامذہ یہ ہیں:

ابوبکر احمد بن محمد برقانی، ابوبکر بن بشر، ابوحامد اسفرائینی، قاضی ابوالطیب طبری، ابونعیم اصفہانی، حافظ عبدالغنی ازدی بغدادی، ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی۔

اہل علم کی نظر میں: ابوالطیب طاہری کا بیان ہے کہ ''بغداد میں جو بھی حافظ حدیث آتا وہ امام دارقطنی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور اس کے بعد اس کے لئے ان کے علم کی بلندی اور حافظہ میں برتری کا اعتراف کرنا ضروری ہوجاتا''، حافظ ابن کثیر رقم

طراز ہیں کہ ''کم سنی ہی سے دارقطنی اپنے نمایاں اور غیر معمولی حافظہ کے لئے مشہور تھے''، حافظ ہی نے آپ کی فن علل ورجال میں انفرادی شان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''احادیث پر نظر اور علل وانتقاد کے اعتبار سے وہ نہایت عمدہ تھے، اپنے دور میں فن اسماء الرجال، علل اور جرح وتعدیل کے امام اور فن درایت میں مکمل دست گاہ رکھتے تھے''۔

گویا کہ امام دارقطنی علوم حدیث کی مختلف شاخوں میں درک رکھتے تھے، اور بجا طور پر سب آپ کی امامت کے قائل ہیں، اسی وجہ سے دارقطنی کو ان کے زمانے میں امیر المؤمنین فی الحدیث (اقلیم حدیث کے تاجدار) کا خطاب ملا تھا۔

تالیفات: امام دارقطنی نے اسلامی کتب خانے کو نہایت علمی وتحقیقی، مفید اور حسن تالیف کی شاہکار بہت سی کتابوں سے نوازا ہے۔ اور بطور خاص علوم حدیث کی نہایت دقیق جہتوں پر بھرپور انداز میں قلم اٹھایا ہے اور اس کا حق بھی ادا کیا ہے، آپ کی بیشتر تالیفات فن حدیث سے متعلق ہیں، چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

1. السنن
2. علل الحديث
3. كتاب الضعفاء
4. كتاب المؤتلف والمختلف في أسماء الرجال
5. غريب الحديث
6. كتاب الأربعين
7. كتاب التصحيف
8. كتاب الأمالي

العلل: کسی حدیث کی سند یا متن میں علت کی شناخت ونشاندہی نہایت علمی تبحر اور کثرت مطالعہ کا محتاج ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت کم محدثین نے اس جانب توجہ کی ہے، امام دارقطنی گویا کہ اس فن کے امام تھے، آپ کی یہ کتاب اس موضوع کی سب سے جامع اور ہمہ گیر کتاب شمار ہوتی ہے، اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علل سے متعلق پچھلی تمام کتابوں کا عطر جمع کر دیا گیا ہے۔

سنن دارقطنی: حدیث کی جن کتابوں نے محدثین کی نظر میں اعتبار واستناد پایا ہے، ان میں ایک اہم نام دارقطنی کی ''السنن'' کا ہے، اہل علم نے اسے کتب ستہ کے بعد مقبول کتاب کا درجہ دیا ہے اور صدیوں سے اس پر اعتماد کرتے آئے ہیں، اس کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر حدیث کی مختلف سندوں اور طرق کو یکجا کر دیا گیا ہے، جس سے اس پر حکم لگانا آسان ہو جاتا ہے، نیز روایت بالمعنی کی صورت میں پیدا ہونے والے الفاظ کے فرق سے بھی آگہی حاصل ہو جاتی ہے، اسی طرح مؤلف نے حدیثوں پر صحت وضعف کے اعتبار سے حکم بھی لگایا ہے، چوں کہ یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر میں تالیف کی گئی تھی، اس لئے اس کی سب سے مختصر ترین سند یا بالفاظ دیگر اعلیٰ سند ''خماسی'' ہے، یعنی کہ جو روایات مؤلف تک پانچ واسطوں سے پہنچی ہو، یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

10.4.4 امام ابوعبداللہ حاکم

نام ونسب: محمد بن عبد اللہ بن محمد نیساپوری، ابن بیع کنیت اور حاکم لقب ہے، 321ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے اور 405ھ میں وفات پائی۔

اہل علم کی نظر میں: ابن خلکان نے لکھا ہے کہ: وہ اپنے عہد کے یکتائے روزگار اور فن حدیث اور وعظ وخطابت کے تاجدار تھے، آپ نے مختلف علوم میں تصنیف وتالیف کی ہے۔ابن کثیر نے کہا ہے کہ: وہ اہل علم میں سے تھے، مختلف علوم میں مہارت رکھتے تھے، اوران کی شان سبھوں سے مختلف تھی، چھوٹی بڑی کم وبیش تین سو کتابیں لکھی ہیں، جن کی ضخامت دوسو مجلد تک ہوتی ہے۔

تالیف: ابن الجوزی ایک باکمال مؤلف تھے، کم وبیش تین سو کتابیں لکھی ہیں، ان میں اکثر ناپید ہیں، تفسیر، تاریخ، طب اور فقہ کے بشمول حدیث کے موضوعات پر آپ کی کتابیں ہیں، خاص طور پر حدیث آپ کے علم کی جولان گاہ رہی ہے، چند کتابیں یہ ہیں:

1. زادالمسیر فی علم التفسیر
2. الموضوعات
3. العلل المتناهیة فی الاحادیث الواهیة
4. تلبیس ابلیس
5. صیدالخاطر
6. صفة الصفوة
7. الوفا فی فضائل المصطفی
8. ذم الهوی
9. مناقب عمر بن الخطاب
10. مناقب عمر بن عبد العزیز

الموضوعات: یہ کتاب موضوع وبے اصل روایتوں سے نقاب واکرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس طرح مشہور حدیث وضع کرنے والوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے موضوع کی اہم ترین کتاب ہے، اور کوئی طالب علم اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا ہے۔خود محدثین نے اسے پسند کیا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ مؤلف نے بہت سی صحیح وحسن یا ضعیف روایتوں کو موضوع قرار دے دیا ہے۔اگرچہ یہ کوتاہی بہ مقابلہ مکمل کتاب کے کم روایتوں میں پیش آئی ہے، حافظ ابن حجر نے خود یہ لکھا ہے کہ: ابن الجوزی کی کتاب کی اکثر وبیشتر روایتیں موضوع ہیں، اور جن روایتوں کو بنیاد بنا کر ان پر تنقید کی گئی ہے، وہ بہ مقابلہ بقیہ کے بہت کم ہیں۔

10.4.7 امام ابوزکریا نووی

نام ونسب: یحی بن شرف بن مری بن حسن بن حسین، کنیت ابوزکریا اور لقب محی الدین تھا، 631ھ میں ملک شام کے ایک گاؤں ''نوی'' میں پیدا ہوئے۔اس طرف نسبت کرتے ہوئے نووی کہلاتے ہیں۔45 سال کی عمر میں 676ھ میں وفات پائی۔

اساتذۃ: امام نووی بہ یک وقت مختلف علوم میں مہارت اور کمال رکھتے تھے، حدیث اور فقہ آپ کے خاص موضوع تھے، مگر نحووصرف، ادب ولغت اور فلسفہ سے بھی خوب شغف تھا، اور غالبا اس کی ایک اہم وجہ یہ رہی ہوگی کہ آپ نے ہرفن کو اس کے ماہرین سے سیکھا ہے۔چنانچہ آپ کے اساتذہ کی فہرست میں بہت تنوع پایا جاتا ہے، چند معروف ارباب کمال کے نام یہ ہیں:

ابن مالک، شیخ احمد مصری، تقی الدین بن ابوالیسر، جمال الدین بن صیرفی، عبدالعزیز بن محمد انصاری حموی، عبدالغنی علاء الدین، عماد الدین عبدالکریم الخرستانی، شیخ کمال بن احمد۔

شاگرد: آپ کے استفادہ کنندگان میں سے چند مشہور نام یہ ہیں:

قاضی محی الدین مزرعی، خطیب صدرسلیمان جعفری، جبرئیل کردی، شیخ ابوالحجاج مزی، ابن ابی الفتح، شمس الدین بن نقیب، شہاب الدین اربدی۔

اہل علم کی نظر میں: امام نووی نے عمر تو بہت کم پائی، مگر اللہ تعالی نے علم کو بافیض بنایا تھا، تمام ہی اہل علم ان کے علمی مقام ومرتبہ کے معترف نظر آتے ہیں، حدیث وفقہ میں آپ کی کتابوں سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا ہے، علامہ ذہبی نے آپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے خوب لکھا ہے کہ: وہ حدیث اور فنون حدیث کے حافظ وتبحر عالم، رجال واسناد اور صحیح وسقیم حدیثوں کی پرکھ کے ماہر تھے، تاج الدین سبکی نے نووی کو "امام اور شیخ الاسلام" کے لقب سے یاد کیا ہے، اور یہی حال آپ کے اکثر تذکرہ نگاروں کا ہے۔

تالیف: امام نووی کی تالیفات بعض تو وہ ہیں جو مکمل ہوئیں، اور بعضے تشنۂ تکمیل رہ گئیں، حدیث وعلوم حدیث میں جو کتابیں مکمل شکل میں موجود ہیں ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

1. شرح صحیح مسلم: اسے مؤلف نے وفات سے دو سال قبل مکمل کر لیا تھا، یہ کتاب صحیح مسلم کو سمجھنے میں بہت مدد ومعاون سمجھی جاتی ہے۔ صدیوں سے محدثین اس سے استفادہ کرتے آرہے ہیں، آپ کی یہ شرح ہندوستانی نسخہ میں صحیح مسلم کے حاشیہ پر طبع کی گئی ہے۔ عالم عرب سے بھی مختلف انداز میں اس کی کئی بار طباعت عمل میں آتی رہی ہے۔

2. ریاض الصالحین: اصلاح وتزکیہ اور اخلاق وتربیت پر اس سے عمدہ کتاب غالبا کوئی نہ ہو، اللہ تعالی نے اسے قبولیت سے نوازا ہے، دنیا کی سینکڑوں زبانوں میں اس کے ترجمے دستیاب ہیں، حدیثوں کے انتخاب میں بھی امام نووی نے اکثر وبیشتر صحت کا لحاظ رکھا ہے۔

3. الاذکار المنتخبۃ من کلام سید الابرار: مسنون دعاؤں اور صبح وشام ودیگر مناسبتوں کے لئے سنن واذکار کا یہ بہترین مجموعہ ہے اور اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں شاید ہی کسی کتاب کو الاذکار کے برابر مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔

4. التقریب والتیسیر لمعرفۃ سنن البشیر النذیر: یہ کتاب علم اصول حدیث میں لکھی گئی ہے، متقدمین کی کئی کتابوں کا عطر اس میں آگیا ہے، طلبہ حدیث کے یہاں یہ ایک متن کی حیثیت سے مشہور ہے، علامہ سیوطی نے اسی کی شرح کے طور پر تدریب الراوی تالیف کی تھی۔

10.4.8 امام جمال الدین زیلعی

نام ونسب: عبداللہ بن یوسف بن محمد بن ایوب، کنیت ابومحمد اور لقب جمال الدین تھا، زیلع بحر حبشہ کے ساحل پر ایک گاؤں ہے، اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے زیلعی کہلاتے ہیں۔ 762ھ میں آپ نے وفات پائی۔

جن ممتاز اہل علم سے آپ نے استفادہ کیا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں:

ابن عقیل، شہاب احمد بن محمد بن فتوح، شہاب احمد بن محمد بن قیس انصاری، تقی الدین عبدالرزاق لخمی، قاضی علاؤ الدین بن ترکمانی، شیخ محمد بن محمد بن احمد بن عثمان، شارح کنز ابومحمد فخر الدین عثمان بن علی۔

اہل علم کی نظر میں: زیلعی نے جہان علم میں بہت بلند مقام پایا ہے، ابتداء ہی سے انہیں علم سے شغف رہا، اور جب تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوئے تو بڑے علمی کارنامے آپ کے ہاتھوں انجام پائے۔ اسی وجہ کر محدثین نے ان کا خوب اعتراف

کیا ہے، علامہ سیوطی نے ان کو مصر کے حفاظ حدیث اور نقادان فن کے زمرے میں رکھا ہے، اکثر تذکرہ نگاروں نے آپ کو حافظ حدیث کے لقب سے نوازا ہے، علامہ عبدالحی لکھنوی فرماتے ہیں، زیلعی کی تخریج سے فن حدیث اور اس کی جزئیات وفروع میں ان کی وسعت علم ونظر اور اسماء الرجال میں تبحر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا خیال ہے کہ: ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں ابن ہمام نے جو حدیثیں اور فقہ حنفی کے دلائل ذکر کئے ہیں وہ زیادہ تر زیلعی کی تخریج سے ماخوذ ہیں۔

امام زیلعی کا ایک نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ تعصب وتنگ نظری سے پاک تھے اور اس کی جھلک ان کی کتابوں میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے، حافظ ابن حجر نے اسی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: امام زیلعی نہایت حق گو وانصاف پسند تھے۔

تالیف: زیلعی کے علمی انہماک اور طبعی میلان کا اثر تھا کہ ان کے قلم سے کئی علمی وبلند پایہ کتابیں اسلامی کتب خانہ کو ہاتھ آئیں۔ چند کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

1. نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایہ: ہدایہ فقہ حنفی کی اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، اس کے مؤلف مرغینانی نے جابجا بہت سی حدیثوں سے استدلال کیا ہے، امام زیلعی نے اسی کتاب کی حدیثوں کی تخریج نصب الرایہ میں انجام دی ہے، یہ کتاب حسب ذیل گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے:

☆ فقہی ابواب سے متعلق حدیثوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور بشمول فقہ حنفی کے دیگر دبستان فقہ کی دلیلیں بھی اس میں دستیاب ہیں۔

☆ فقہ حنفی کی دلیلوں کا اس سے عمدہ اور ضخیم مجموعہ شاید ہی کوئی اور ہو۔

☆ تخریج حدیث کی یہ باضابطہ اولین کوشش شمار کی جاتی ہے۔

تخریج احادیث الکشاف: علامہ زمخشری معروف مفسر ہیں، ان کی تفسیر قرآن پر کشاف نامی ایک کتاب ہے، امام زیلعی نے اس میں ذکر کی گئی حدیثوں اور آثار صحابہ کی تخریج کی ہے، نیز فنی حیثیت سے ان پر کلام بھی کیا ہے۔ زیلعی کی مذکورہ دونوں کتابیں چھپ چکی ہیں۔

10.5 خلاصہ

حدیث وسنت کا ایک دور وہ تھا جس میں صحابہ وکبار تابعین نے بھرپور انداز میں اس کی تبلیغ واشاعت اور تدوین وحفاظت میں حصہ لیا، پھر اس کے بعد ایک دور کا آغاز ہوتا ہے جو پہلی صدی ہجری سے شروع ہوکر چوتھی صدی ہجری پر ختم ہوتا ہے، یہ دور بہت اہمیت کا حامل ہے، اب حدیث کا یہ سرمایہ سینوں سے نکل کر دفینوں میں باضابطہ محفوظ کیا جانے لگا، ملکوں ملکوں حدیث کی درسگاہیں بنیں، مراکز قائم ہوئے، مصنفین نے مختلف اسلوب میں کتابیں لکھیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ ابتدائی عہد کہلاتا ہے، اس دور کے محدثین کی خدمات اصل میں نقش راہ کی حیثیت رکھتی ہیں، امام مالک جلیل القدر محدث تھے، کہا جاتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے آپ ہی نے کتاب لکھی ہے، مؤطا حدیث کی نہایت اہم کتاب سمجھی جاتی ہے، اسی دور سے امام احمد بن حنبل کا بھی تعلق ہے، آپ کی طرف

منسوب مسند احمد احادیث رسول کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، اور صدیوں سے علماء اس کو مرجع بنائے ہوئے ہیں۔ اس عہد کے محدثین میں امام ابوبکر بن ابی شیبہ کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے، آپ کی تحریر کردہ المصنف حدیثوں اور صحابہ وتابعین کے فتاوی کا انسائیکلو پیڈیا سمجھی جاتی ہے۔ اسی عہد سے امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کا بھی تعلق ہے، ان حضرات کی کتابیں صحیح حدیث وسنت کا بنیادی ماخذ سمجھی جاتی ہیں، اور امت نے صدیوں سے ان پر اعتماد کیا ہے۔ دیگر مشہور محدثین میں ابویعلی موصلی اور امام ابو جعفر طحاوی کا نام بھی آتا ہے، ان کی تالیفات بھی محدثین کی نظر میں قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد سے آٹھویں صدی ہجری تک کا عہد ''عہد وسطی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس دور کے محدثین نے فن حدیث کو اوج کمال تک پہنچایا، چنانچہ امام ابن حبان، طبرانی، دارقطنی، حاکم، بیہقی، نووی، اور امام زیلعی جیسے بلند پایہ ائمہ حدیث اس عہد میں پیدا ہوئے اور اپنی تصنیفات وتالیفات کے ذریعہ اسلامی کتب خانہ کو آباد کیا۔

10.6 نمونے کے امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے:

1. امام مالک کا تعارف کراتے ہوئے، ان کی حدیثی خدمات کا جائزہ لیجئے۔
2. صحاح ستہ سے کونسی کتابیں مراد ہیں؟ یہ وضاحت کرتے ہوئے کسی دو کتاب کے [illegible] نوٹ لکھئے۔
3. امام احمد بن حنبل کی حدیثی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے، المسند کا مختصر تعارف تحریر کیجئے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے:

1. امام حاکم کی مستدرک کا کیا موضوع ہے؟ قلم بند کیجئے۔
2. معاجم ثلاثہ کے مؤلف کون ہیں؟ نیز ان کا مختصر خاکہ تحریر کیجئے۔
3. امام نووی کی خدمت حدیث کے حوالے سے ان کی کسی کتاب پر روشنی ڈالئے۔

10.7 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تذکرۃ المحدثین جلد اول دوم — از — مولانا ضیاء الدین اصلاحی
2. تذکرۃ الحفاظ — از — علامہ ذہبی
3. تاریخ حدیث ومحدثین — از — محمد محمد ابوزہو / ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری
4. تاریخ الحدیث — از — قاضی عبدالصمد سیوہاروی فاضل دیوبند
5. علوم الحدیث — از — ڈاکٹر صبحی صالح / ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری
6. محدثین عظام اور ان کی کتابوں کا تعارف — از — مولانا سلیم اللہ خان

اکائی 11 : حدیث کی کتابیں

اکائی کے اجزاء

11.1 مقصد

11.2 تمہید

11.3 جوامع

11.3.1 جوامع پر چند اہم کتابیں

11.4 مسانید

11.4.1 مسانید پر چند اہم کتابیں

11.5 صحاح

11.6 سنن

11.6.1 سنن پر چند اہم کتابیں

11.7 معاجم

11.8 اجزاء

11.9 شروحات

11.9.1 صحیح بخاری کی شروحات

11.9.2 صحیح مسلم کی شروحات

11.9.3 سنن ابی داؤد کی شروحات

11.9.4 سنن ترمذی کی شروحات

11.9.5 سنن نسائی کی شروحات

11.9.6 سنن ابن ماجہ کی شروحات

11.9.7 مؤطا امام مالک کی شروحات

11.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد حدیث کے موضوع پر مختلف انداز میں لکھی گئی کتابوں سے طلبہ کو متعارف کرانا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اس موضوع پر کتابیں کن کن اسالیب اور انداز سے لکھی گئیں، اس کے لئے کن نئے فنون کو وجود بخشا گیا، اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ کتب حدیث کی تیاری میں اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا گیا؟ تاکہ طلبا ان کتابوں کی اہمیت وضرورت سے واقف ہوسکیں اور ان سے استفادہ کے طریقوں سے آگہی ہوسکے۔

11.2 تمہید

ایک حدیث متواتر کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی اس بندے کو تروتازہ رکھے؛ جس نے میری بات سنی اور اسے دوسرے تک پہنچایا'' اس نبوی دعا اور ترغیب کا اثر تھا کہ ہر دور کے علماء نے حدیثِ نبوی کو اپنے علم وتحقیق کا دائرہ کار بنایا اور مختلف اسلوب اور پیرائے میں حدیث کی خدمت کے لئے نئے علوم وفنون کو وجود بخشا اور اس دین کی حفاظت میں کلیدی کردار ادا کیا، یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہر دور کے ذہین وذکی افراد نے اس علم کو اپنایا اور اس کی نشو ونما میں شریک کار رہوئے۔

تدوین حدیث جس کا آغاز عہد صحابہ ہی سے غیر رسمی طور پر اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور سے باضابطگی کے ساتھ ہو چکا تھا، پورے تسلسل کے ساتھ یہ عمل تیسری صدی کے اختتام تک چلتا رہا اور اب وہ اپنے کمال اور پختگی کو پہنچ چکا تھا، مگر اب بھی ضرورت اس بات کی تھی کہ ان جمع شدہ حدیثوں کو نئے اسلوب اور انداز میں ترتیب دیا جائے، اس لئے محدثین نے اس جہت میں جدو جہد کی اور گوناگوں انداز سے حدیث کی خدمت انجام دی، چنانچہ حدیث کے موضوع اور مضامین کی ترتیب کے لحاظ سے حدیث کی کتابیں کئی قسموں پر مشتمل ہیں، ہر قسم کی اپنی افادیت اور معنویت ہے، ان کے طرز و اسلوب سے آگہی کی بناء پر حدیث کی کتابوں سے فائدہ اٹھانا آسان ہوگا، ذیل میں کتب حدیث کی قسموں پر گفتگو کی جارہی ہے۔

11.3 جوامع

یہ ''جامع'' کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں وہ چیز جو ہمہ جہت ہو، تمام کو شامل ہو۔ جامع یا جوامع حدیث کی ان کتابوں کو کہتے ہیں: جن میں تمام ابواب دین سے متعلق مرفوع حدیثیں جمع کر دی گئی ہوں۔ بعض علماء نے اس کا یوں تعارف کرایا ہے کہ جامع اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو آٹھ قسم کے مضامین پر مشتمل ہو، وہ آٹھ مضامین حسب ذیل ہیں:

عقائد: وہ حدیثیں جن کا تعلق عقیدے سے ہو۔

آداب: کھانے، پینے اور معاشرت سے متعلق آداب۔

تفسیر: وہ حدیثیں جن کا تعلق تفسیرِ قرآن سے ہو۔

احکام: عملی زندگی سے متعلق احادیث یا بالفاظِ دیگر فقہی مسائل سے متعلق حدیثیں۔

فتن واشراط: مستقبل میں پیش آنے والے وہ واقعات جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے وحی کی بنیاد پر پیش گوئی کی ہے، اور علامات قیامت سے متعلق روایتیں۔

زہد ورقاق: تزکیہ نفس سے متعلق حدیثیں

مناقب: صحابہ وصحابیات نیز بعض قبائل اور علاقوں سے متعلق فضائل پر مشتمل روایتیں۔

11.3.1 جوامع پر چند اہم کتابیں

اس طرز پر لکھی گئی کئی کتابیں اسلامی کتب خانے میں موجود ہیں، چند اہم نام اس طرح ہیں:

1. جامع معمر بن راشد الأزدی البصری (متوفی: 153ھ)
2. جامع سفیابن بن سعید الکوفی (متوفی 160ھ)
3. جامع صحیح البخاریؒ، از ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (متوفی: 256ھ)

4. جامع صحیح مسلم ، از ابوالحسین مسلم بن حجاج القشیری (متوفی: 261ھ)

5. جامع ترمذی ، از ابوعیسی محمد بن عیسی بن سورہ ترمذی (متوفی: 279ھ)

11.4 مسانید

''مسند'' کی جمع ہے، یہ اصطلاح بنیادی طور پر دوطرح کی کتابوں کے لئے زیادہ رائج ہے۔

1. وہ کتابیں جس میں حدیث کو سند کے ساتھ ذکر کیا جائے اور وہ سند رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہو، جیسے کہ امام بخاری نے اپنی صحیح کے نام میں ''المسند'' بھی ذکر کیا ہے، اسی طرح مسند الامام ابی حنیفہ یا مسند دارمی اور مسند بقی بن مخلد وغیرہ۔

2. وہ کتاب جس میں ہر صحابی کی حدیث کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہو خواہ ان کا تعلق کسی بھی مضمون سے ہو، پھر اسی طرز پر دوسرے صحابہ کی احادیث کو یکے بعد دیگرے ذکر کیا جائے۔

''مسند'' کتب حدیث کی وہ قسم ہے جس پر محدثین نے بہت زیادہ توجہ دی ہے؛ بلکہ یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ ہر بڑے محدث نے مسند لکھی ہے، علامہ کتانی نے اپنی کتاب ''الرسالۃ المستطرفۃ'' میں 80 مسندوں کے نام شمار کروائے ہیں، اور آخیر میں لکھا ہے کہ ہم نے جن کا ذکر کیا ہے، ان کے سوا اور بھی بہت سی مسانید ہیں۔

مسند کی ترتیب میں الگ الگ اسلوب اختیار کئے گئے ہیں، چنانچہ بعض تو وہ ہیں جن میں تمام صحابہ کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر جمع کر دیئے گئے ہیں، مثلاً ابی بن کعب کے نام کو اسامہ بن زید سے پہلے اور اسامہ کو انس بن مالک سے پہلے رکھا گیا، اور جو نام ''ب'' سے شروع ہوتے ہیں ان کو ''الف'' کے بعد ذکر کیا گیا، اسی طرح اخیر تک۔ دوسرا طرز یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے میں سبقت کا لحاظ رکھا جائے، اس اعتبار سے جو لوگ پہلے ہیں انہیں پہلے اور جو بعد میں ہیں انہیں بعد میں ذکر کیا جائے، یا صحابہ کے مقام اور درجہ میں فرق مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے نام ترتیب دیئے جائیں، جیسے ''عشرہ مبشرہ'' کو سب سے پہلے ذکر کیا جائے، پھر بدری صحابہ کو، پھر صلح حدیبیہ میں شرکت کرنے والے صحابہ کو، اس طرح اخیر میں ان صحابہ کی مسانید ذکر کی جائیں جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت کم سن تھے۔

11.4.1 مسانید پر چند اہم کتابیں

1. مسند الطیالسی : یہ ابوداؤد سلیمان بن ابوداؤد بن جارود الطیالسی (متوفی 204ھ) کی طرف منسوب ہے، مگر اسے ان کے شاگرد یونس بن حبیب عجلی (متوفی: 277ھ) نے جمع کیا ہے، تین سو سے زائد صحابہ اور صحابیات کی مسانید اس میں جمع ہیں، کتاب کی کل حدیثیں 2890 ہیں، عشرہ مبشرہ کی روایتوں سے آغاز کیا ہے، یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے، ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی کی تحقیق سے شائع ہو چکی ہے۔

2. **مسند الحمیدی :** امام بخاری کے استاذ عبداللہ بن زبیر الحمیدی (متوفی: 219ھ) کی تالیف ہے، 181 صحابہ کی مسانید اس میں جمع کردی گئی ہیں، مجموعی طور پر 1300 روایتیں درج کی گئی ہیں، کتاب کا آغاز خلفاء راشدین کی مسانید سے کیا گیا ہے اور اس کے بعد عشرہ مبشرہ میں سے باقی افراد کی مسانید پیش کی گئی ہیں، سوائے حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے؛ اس لئے کہ ان سے کوئی روایت ثابت نہیں ہے، مذکورہ کتاب علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی کی تحقیق سے دو جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔

3. مسند الامام ابوحنیفہ، نامور فقیہ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت (متوفی: 150ھ) کی جانب منسوب ہے، سب سے پہلے اسے آپ کے شاگردوں نے جمع کیا تھا۔ اور ان سب کو معروف محدث ابومحمد عبداللہ بن محمد حارثی بخاری (متوفی: 340ھ) نے ''مسند الامام الأعظم ابی حنیفة النعمان بن ثابت الکوفی'' کے نام سے یکجا کردیا، امام صاحب چوں کہ تابعین میں سے تھے، اس لئے اس کتاب کی حدیثوں کی سند میں رسول اللہ ﷺ تک بہت کم واسطے پائے جاتے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فاضل مولانا لطیف الرحمٰن کی تحقیق سے یہ کتاب 2 رجلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

4. ''**مسند الإمام احمد بن حنبل الشیبانی**'' جلیل القدر محدث امام احمد بن حنبل کی یہ تالیف ہے، حافظ ابن عساکر کی فہرست کے مطابق 1056 صحابہ وصحابیات کی مسانید اس میں جمع کی گئی ہیں، کتاب میں حدیثوں کی تعداد 27647 تک جا پہنچی ہے، مسند احمد کی ترتیب میں کسی خاص طریقۂ کار کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے؛ بلکہ مختلف باتوں کی رعایت کرتے ہوئے مسانید ذکر کی گئی ہیں، چنانچہ آپ نے کتاب کا آغاز عشرہ مبشرہ سے کیا ہے، جن میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر، پھر حضرت عمر اور اس کے بعد حضرت علی کی مسانید کو ذکر کرتے ہوئے بقیہ عشرہ مبشرہ کی مسندوں کو پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب بہت پہلے طبع ہو چکی ہے، مگر ماضی قریب میں شیخ شعیب الارناؤط ودیگر کی تحقیق کے ساتھ 50 جلدوں میں منظر عام پر آ چکی ہے۔

11.5 صحاح

یہ ''صحیح'' کی جمع ہے، اس سے حدیث کی وہ کتابیں مراد لی جاتی ہیں، جن میں مؤلفین نے اپنے اصول وشرائط کو بنیاد بنا کر صرف صحیح روایتیں جمع کرنے کا اہتمام کیا ہو، واضح رہے کہ کتب حدیث کی اس قسم میں بہت سی کتابیں تحریر کی گئیں؛ البتہ ان میں درج شدہ حدیثیں مؤلف کے علم واجتہاد کے اعتبار سے صحیح ہوتی ہیں، واقعتہ ان کا صحیح ہونا ضروری نہیں ہے، مندرجہ ذیل کتابیں ''صحاح'' میں شمار کی جاتی ہیں:

1. **صحیح البخاری :** از ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (متوفی 256ھ) یہ کتاب تمام ابواب دین پر مشتمل ہے، اس کتاب کے ذریعہ مؤلف نے حدیث کی کتابوں کو ایک نئی جہت دی ہے، چوں کہ آپ کے دور تک تقریبا حدیثیں لکھی جا چکی تھیں، مگر ضرورت اس بات کی تھی کہ اس ذخیرۂ حدیث سے چھان پھٹک کر صحیح روایتوں کو یکجا کیا جائے اور واضح رہے کہ امام بخاری کا مقصد محض انتخاب تھا نہ کہ احاطہ، چنانچہ آپ نے یہ کتاب تالیف کی، اس کا مکمل نام یوں ہے ''**الجامع المسند الصحیح المختصر من أمور رسول الله ﷺ وسننه وأیامه**'' کم وبیش تمام ہی محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ روئے زمین پر قرآن مجید کے بعد سب سے صحیح کتاب ہے، امام بخاری نے اس کو ابواب وموضوعات پر ترتیب دیا

ہے،97 مرکزی عنوان ہیں، کتاب ''کیف کان بدء الوحی'' سے شروع اور ''کتاب التوحید'' پر ختم ہوتی ہے، شیخ فواد عبد الباقی کے شمار کے مطابق مکرر روایتوں کے بشمول 7563 حدیثیں اس میں پائی جاتی ہیں، ان میں وہ روایتیں بھی شامل کی گئی ہیں جنھیں بخاری نے بلاسند (یعنی تعلیقا) نقل کیا ہے، بار بار نقل کی گئی روایتوں کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو صحیح بخاری میں 2602 روایتیں رہ جاتی ہیں۔

2. صحیح مسلم : از امام ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم القشیری نیساپوری (متوفی: 261ھ)، امام بخاری کے شاگرد ہیں، علم حدیث میں نہایت بلند مقام رکھتے ہیں، آپ نے بھی صحیح روایتوں کو جمع کرنے کا عزم کیا، اور یہ کتاب تالیف کی، صحیح مسلم میں 54 مرکزی عنوان اور ان کے ذیل میں 1329 ابواب ہیں، واضح رہے کہ امام مسلم نے از خود کتاب اور ابواب کے عناوین نہیں لگائے، بلکہ بعد کے محدثین نے یہ خدمت انجام دی ہے، البتہ انہوں نے احادیث کو ابواب کی ترتیب پر یکجا ذکر کیا ہے ،صحیح مسلم کا آغاز ''کتاب الإیمان'' سے متعلق حدیثوں سے ہوتا ہے اور کتاب التفسیر پر اختتام، اس کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ ایک موضوع سے متعلق تمام روایات ایک ہی جگہ دستیاب ہو جاتی ہیں، جس کی وجہ کر اس سے فائدہ اٹھانا آسان ہوتا ہے، شیخ فؤاد عبدالباقی نے اس کی حدیثوں کی تعداد 3033 ذکر کی ہے۔ محدثین نے صحیح مسلم کی روایتوں کو بحیثیت صحیح قبول کیا ہے۔

3. صحیح ابن خزیمہ : از محمد بن اسحاق بن خزیمہ نیساپوری (متوفی: 311ھ)، یہ کتاب موضوعات کی ترتیب پر ہے، کتاب الوضوء سے آغاز کیا گیا ہے، اس کتاب کی حدیثوں پر بھی محدثین نے عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا ہے جیسے کہ ابن صلاح اور سیوطی نے اس کی روایتوں کو صحیح تسلیم کیا ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی تحقیق سے منظر عام پر آچکی ہے۔

4. صحیح ابن حبان : از ابو حاتم محمد بن حبان البستی (المتوفی: 354ھ)، مؤلف نے اس کا نام ''التقاسیم والأنواع'' رکھا ہے، کتاب کی ترتیب بہت پیچیدہ ہے، انواع واقسام پر ترتیب دی گئی ہے، یعنی کہ اوامر (جن چیزوں کے بجالانے کا شریعت نے حکم دیا ہے) سے متعلق روایتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور ''نواہی'' (جن سے منع کیا گیا ہے) سے متعلق حدیثوں کو ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے، اسی طرح فقہی احکام سے متعلق روایتوں کو ایک جگہ، اس کی حدیثوں کی تعداد 7491 ہے۔

11.6 سنن

یہ ''سنۃ'' کی جمع ہے، کتب حدیث کی اہم قسم ہے، جسے ''سنن'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہ اس کتاب کو کہتے ہیں، جس میں حدیثوں کو فقہی ترتیب پر جمع کیا گیا ہو، یہ کتابیں دین کے اکثر ابواب سے متعلق مضامین کا احاطہ کرتی ہیں، سنن کے مؤلفین مرفوع روایتوں کو جمع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، چوں کہ محدثین کی اصطلاح میں ''سنت'' رسول اللہ ﷺ کی جانب منسوب باتوں کو کہا جاتا ہے، جب کہ صحابہ سے منسوب جو باتیں ذکر کی جاتی ہیں، انہیں اصطلاح میں ''موقوف'' کہتے ہیں، البتہ بعض سنن کی کتابوں میں بھی گاہ گاہ موقوف روایتیں درج کر دی گئی ہیں۔

11.6.1 سنن پر چند اہم کتابیں

سنن کے طرز پر بھی بہت سی کتابیں تالیف کی گئی ہیں، چند اہم کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

(1) السنن لابی داود: از ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (متوفی:275ھ) مؤلف نے اس میں احکام سے متعلق حدیثوں کو جمع کیا ہے، اور اس کتاب کے طریقۂ کار اور سبب تالیف اور انتخاب حدیث کی شرطوں سے متعلق تفصیلات مستقل ایک کتابچہ میں تحریر کر دیا ہے۔ان کا بیان ہے کہ: ''میں نے پانچ لاکھ حدیثوں سے منتخب کر کے یہ مجموعہ تیار کیا ہے، اور اس میں 4800 حدیثیں ذکر کی ہیں'' سنن ابی داؤد میں صحیح کے ساتھ ساتھ حسن اور اس سے کمتر یعنی ضعیف روایتیں بھی ہیں، نیز جن روایتوں میں بہت زیادہ ضعف ہے، مؤلف نے خود ان کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔

(2) سنن الترمذی: از ابوعیسی محمد بن عیسیٰ الترمذی (متوفی:279ھ) یہ احادیث احکام پر بڑی اہم اور مفید کتاب ہے، بعض جہتوں سے یہ دیگر سنن کی کتابوں سے فردتر ہے، اس کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی حدیثوں کو ذکر کرنے کے بعد اس کا درجہ بھی بتا دیتے ہیں، کہ یہ صحیح ہے، حسن ہے یا ضعیف وغیرہ، اس کتاب کا دوسرا نمایاں وصف یہ ہے کہ مؤلف عنوان کے مطابق حدیث ذکر کرنے کے بعد، اس مضمون کی دوسری روایتوں کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں، نیز بعض دیگر صحابہ کی روایت کی بھی نشاندہی کر دیتے ہیں، جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس مضمون کی اور کتنی روایتیں ہیں اور کن کن صحابہ سے مروی ہیں۔مؤلف زیر بحث مسئلہ میں فقہاء کرام کے رجحانات اور مذاہب کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔امام ترمذی نے اس کتاب میں حدیث کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کی شرط نہیں لگائی ہے؛ بلکہ آپ کا منشاء یہ تھا کہ ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا جائے جن پر مختلف فقہاء نے عمل کیا ہے، اسی وجہ سے کتاب میں صحیح وحسن حدیثوں کے ساتھ ساتھ ضعیف روایتیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔

(3) سنن نسائی: از ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی (متوفی:303ھ) اس کتاب کا اصل نام ''المجتبیٰ'' ہے مؤلف نے پہلے ایک بہت تفصیلی کتاب السنن الکبری لکھی، پھر اس میں سے صحیح روایتوں کا انتخاب کر کے الگ جمع کیا اور اسے ''المجتبیٰ'' کا نام دیا، یہی وجہ ہے کہ کتب ستہ میں سب سے کم ضعیف اور مجروح راوی اور روایتیں اسی کتاب میں ہیں، احادیث کو ابواب کی ترتیب پر جمع کیا گیا ہے، اگر حدیث میں کوئی علت ہو تو اسے بھی جا بجا بیان کر دیتے ہیں۔

(4) سنن ابن ماجہ: از ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ (متوفی:272ھ) یہ بھی کتب ستہ میں شمار کی جاتی ہے، مگر ایک زمانہ تک مؤطا مالک کو چھٹویں کتاب کی حیثیت سے شمار کیا جاتا تھا، مؤلف نے کتاب کو ابواب اور فقہی ترتیب میں رکھا ہے، ابتداء میں ایک وقیع مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں حدیث وسنت کی اہمیت اور اتباع کی ضرورت پر حدیثیں جمع کی ہیں، شیخ فواد عبدالباقی کے اعداد وشمار کے مطابق اس میں 4341 روایتیں ہیں، جن میں سے 3002 ایسی روایتیں ہیں جو بقیہ حدیث کی پانچ معتبر کتابوں میں بھی پائی جاتی ہیں، گویا کہ 1339 روایتیں اس میں زائد ہیں، ان حدیثوں کا حال اس طرح ہے: 428 صحیح، 199 حسن اور 613 ضعیف ہیں، جب کہ 99 روایتیں حد درجہ ناقابل اعتبار، ضعیف بلکہ بعضے موضوع بھی ہیں۔

11.7 معاجم

یہ معجم کی جمع ہے، محدثین کی اصطلاح میں معجم اس کتاب کو کہتے ہیں ''جس میں مؤلف اپنے اساتذہ وشیوخ، یا صحابہ کو حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کر کے پھر ان کی حدیثوں کو ذکر کرے، جیسے کہ امام سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی: 320ھ) کی معجم کبیر، جو صحابہ کی ترتیب پر ہے، ان ہی کی معجم اوسط اور معجم صغیر شیوخ اور اساتذہ کی ترتیب پر ہے، اسی طرح حموی کی معجم البلدان شہروں کی ترتیب پر ہے، اس طرز پر لکھی گئی کتابیں حسب ذیل ہیں:

(1) **المعجم الكبير**: از ابوالقاسم سلیمان بن أحمد الطبرانی (متوفی: 320ھ) کی تالیف ہے، اس میں صحابہ کی ترتیب سے حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے، البتہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مسند اس میں شامل نہیں ہے، مؤلف نے اسے مستقل کتاب کی حیثیت سے جمع کیا ہے، معجم کبیر میں کہا جاتا ہے کہ ساٹھ ہزار حدیثیں یکجا کر دی گئی ہیں، یہ دنیا کی سب سے ضخیم معجم ہے، یوں تو معجم کے نام سے بہت سی کتابیں ہیں، مگر جب صرف ''معجم'' کہا جائے تو محدثین کے نزدیک اس سے مراد یہی کتاب ہوتی ہے، یہ معجم چھپ چکی ہے، مگر اس کا مکمل حصہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔

(2) **المعجم الأوسط**: طبرانی ہی کی یہ بھی کتاب ہے، اس میں اساتذہ کی ترتیب پر حدیثیں مرتب کی ہیں، کم وبیش ایک ہزار اساتذہ کی روایتیں جمع کی گئی ہیں، اس کتاب میں تقریباً دس ہزار حدیثیں پائی جاتی ہیں۔

(3) **المعجم الصغير**: اس کے مؤلف بھی طبرانی ہیں، اس کتاب کو بھی آپ نے اساتذہ کی ترتیب پر جمع کیا ہے، اور ہر استاذ سے صرف ایک روایت نقل کی ہے۔

ان معاجم کے علاوہ اور بھی چند معاجم کا ذکر ملتا ہے:

(4) **معجم الصحابة**، از احمد بن علی الهمدانی (متوفی: 398ھ)

(5) **معجم الصحابة**، از ابویعلی أحمد بن علی الموصلی (متوفی: 307ھ)

11.8 اجزاء

یہ ''جزء'' کی جمع ہے، جس کے معنی ایک حصہ یا گوشہ کے ہیں، اس کے مترادف کے طور پر ''صحف'' بھی رائج ہے، محدثین کی اصطلاح میں اجزاء کہتے ہیں: ''حدیث کے ایسے مجموعے کو جس میں کسی ایک مضمون سے متعلق تمام یا بیشتر حدیثیں جمع کر دی گئی ہوں، یا کسی ایک شیخ یا کسی خاص علاقہ کی حدیث جمع کی گئی ہو''، اس طرز پر بھی کئی کتابیں ملتی ہیں، چند اس طرح ہیں:

(1) **جزء رفع اليدين في الصلاة**، از امام محمد بن اسماعیل بخاری، اس میں مؤلف نے نماز میں رفع یدین سے متعلق تمام روایتوں کو جمع کر دیا ہے۔

(2) **جزء القراءة خلف الامام**، امام بخاری ہی کی یہ بھی تالیف ہے، آپ نے اس میں نماز باجماعت میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے سے متعلق حدیثوں کو جمع کر دیا ہے۔

(5) [illegible] ابو معشر عبد الکریم بن عبد الصمد الطبری (متوفی: 178ھ) کی یہ تالیف ہے۔

[illegible] روایتوں کو ذکر کیا ہے جن کو امام ابوحنیفہ نے براہ راست بعض صحابہ سے نقل کیا ہے۔

[illegible] قریب میں یہ مخطوطہ دستیاب ہوا، ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے تحقیق کر کے اسے شائع کیا ہے، یہ دراصل ان [illegible] جو امام بن منبہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہیں، اس میں 140 کے قریب روایتیں ہیں۔

11.8 [illegible]

[illegible] مطلوب طریقے سے جمع کی جاتی رہیں اور اس کے نتیجہ میں پورا ذخیرۂ حدیث قلم بند کر لیا گیا، اب ضرورت اس [illegible] دوسری جہت سے خدمت کی جائے، چونکہ رسول اللہ ﷺ کے الفاظ میں جامعیت ہوا کرتی تھی، اسی طرح [illegible] کے پس منظر سے واقفیت ضروری ہوتی ہے، نیز یہ ان الفاظ میں پیوست معنی و مفہوم، اسرار و رموز کو [illegible] کے لیے محدثین نے کتب حدیث کی شرح کی طرف توجہ کی اور اس طرح شروحات حدیث کا آغاز ہوا۔ جن [illegible] نمایاں طور پر حدیث کی معروف کتابوں یعنی کتب ستہ کو خوب اہمیت دی گئی، اس لئے کہ صحیح حدیثوں [illegible] شعبوں سے متعلق بیشتر احکام و ہدایات ان میں آچکے تھے، نیز پوری دنیا میں ان کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ [illegible] شعبوں اور دین سے متعلق تفصیلات کا انہیں بنیادی سرچشمہ تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ ان کتابوں کی شرح پر [illegible] چند شروحات حدیث کا ذکر کیا جاتا ہے:

[illegible]

1. [illegible] ابو سلیمان احمد بن محمد البستی (متوفی: 388ھ)
2. [illegible] صحیح البخاری، از شمس الدین بن محمد الکرمانی (متوفی 786ھ)
3. [illegible] الجامع الصحیح، از سراج الدین ابوحفص عمر بن علی، معروف بہ ابن ملقن
4. فتح الباری، از حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی: 852ھ)
5. [illegible] القاری، از حافظ بدر الدین ابو محمد حنفی، معروف بہ العینی (متوفی: 855ھ)
6. لامع [illegible] از مولانا رشید احمد گنگوہی
7. فیض الباری، از علامہ محمد انور شاہ کشمیری حنفی (متوفی 1352ھ)

[illegible] علاوہ بھی بخاری کی شروحات ہیں، مگر اوپر ذکر کی گئی تمام ہی کتابیں چھپ چکی ہیں، نیز آخر الذکر دو [illegible] ہیں۔

11.9.2 صحیح مسلم کی شروحات

حدیث کی ایک اہم ترین کتاب صحیح مسلم ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ امت نے قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ جن کتابوں کو اہمیت اور وقعت دی ہے، ان میں بخاری و مسلم سرفہرست ہیں؛ بلکہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری ہی سے ان کی طرف توجہ دی گئی اور پھر آج تک مختلف انداز سے ان کی خدمت کی جا رہی ہے، بعض محققین کے مطابق صرف صحیح مسلم کی کم وبیش پچاس سے زیادہ شروحات لکھی گئی ہیں، ذیل میں چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1. المعلم فی شرح مسلم ،ازعبداللہ محمد بن علی المالکی (متوفی: 536ھ)
2. إکمال المعلم ،از قاضی أبوالفضل عیاض (متوفی 544ھ)
3. شرح مسلم ،از أبوعمرو عثمان بن صلاح (متوفی 643ھ)
4. المنهاج فی شرح صحیح مسلم ،از أبوزکریا یحیٰ بن شرف النووی (676ھ)
5. إکمال الإکمال ،از ابوالروح عیسی بن مسعود المالکی (متوفی 744ھ)
6. فتح الملهم ،از مولانا شبیر احمد عثمانی
7. تکملہ فتح الملهم ،از مولانا محمد تقی عثمانی

11.9.3 سنن أبوداؤد کی شروحات

حدیث کی چھ مشہور کتابوں میں سنن أبوداؤد کا نام بھی ہے، بخاری و مسلم کے بعد غالباً سب سے زیادہ اس کتاب کو اہمیت دی گئی ہے، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ فقہی احکام سے متعلق احادیث کا بڑا ذخیرہ اس میں یکجا کر دیا گیا ہے اور یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ اس کتاب کی کئی شروحات برصغیر ہند کے اہل علم نے لکھی ہیں۔

حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

1. معالم السنن ،از أبوسلیمان حمد بن محمد الخطابی (متوفی: 388ھ)
2. مرقات الصعود ،از حافظ سیوطی (متوفی: 911ھ)
3. فتح الودود ،از ابوالحسن محمد بن عبدالهادی سندی (متوفی:1138ھ)
4. عون المعبود ،از مولانا شمس الحق عظیم آبادی (متوفی 1329ھ)
5. بذل المجهود ،از مولانا خلیل أحمد سہارنپوری (متوفی:1346ھ)

11.9.4 سنن ترمذی کی شروحات

سنن ترمذی جہاں فقہی احکام سے متعلق حدیثوں کا بڑا مجموعہ ہے، وہیں تمام ابواب دین سے متعلق روایتیں بھی اس میں جمع کی گئی ہیں، گویا کہ یہ بیک وقت سنن بھی ہے اور جامع بھی۔ اس لئے اہل علم نے اس سے خوب دلچسپی رکھی، فقہی ذوق پیدا کرنے [illegible] حدیث کے لئے اسے بہت مناسب اور موزوں کتاب قرار دیا ہے، چند شروحات اس طرح ہیں:۔

1. عارضة الأحوذی :ازابوبکر بن العربی المالکی (متوفی:543ھ)
2. شرح ترمذی ،ازحافظ ابوالفرج عبدالرحمٰن ،معروف بہ ابن رجب حنبلی (794ھ)
3. العرف الشذی ،ازمولانا محمدانورشاہ کشمیری (1352ھ)
4. تحفة الأحوذی ،ازمولانا عبدالرحمٰن مبا کپوری (المتوفی:1353ھ)

11.9.5 سنن نسائی کی شروحات

دیگر حدیث کی کتابوں کی طرح اس کتاب کی شروحات بھی کئی لکھی گئی ہیں ، اور بطور خاص برصغیر ہند کے علماء کی 5،6 شروحات ملتی ہیں، چند اس طرح ہیں:

1. الإمعان ،ازعلی بن عبداللہ (متوفی 567ھ)
2. زھری الربی علی المجتبی ،ازابوبکر جلال الدین سیوطی (متوفی:911ھ)
3. حاشیة السندی ،ازنورالدین محمد بن عبدالہادی السندی (متوفی:1138ھ)
4. الفیض السماوی ،ازمولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی:1322ھ)
5. التقریرات الرائعة علی سنن النسائی ،ازمحمد بن حمداللہ التھانوی (متوفی 1296ھ)

11.9.6 سنن ابن ماجہ کی شروحات

1. مصباح الزجاجة ،ازابوبکر جلال الدین سیوطی (متوفی:911ھ)
2. کفایة الحاجة ،ازابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی (متوفی:1183ھ)
3. إنجاح الحاجة ،ازمحمد عبدالغنی المجددی الحنفی (متوفی:1296ھ)
4. مختصر حاشیہ ،ازفخرالحسن گنگوہی (متوفی:1315ھ)
5. نور مصباح الزجاجة ،ازعلی بن سلیمان مالکی (متوفی:1306ھ)

11.9.7 مؤطاامام مالک کی شروحات

1. التمھید ،از یوسف بن عبداللہ،معروف بہ ابن عبدالبرالاندلسی (متوفی: 463ھ)
2. المسوی،از شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی: 1176ھ)
3. اوجز المسالک ،از محمد زکریا کاندھلوی (متوفی: 1402ھ)

11.10 کتب علل

حدیث کی سند یا متن میں اگر کوئی ایسی بات پائی جائے جس سے اس کی صحت پر حرف آتا ہو اگر چہ وہ بظاہر عیب سے محفوظ ہو، تو اسے علت کہتے ہیں، اور کتب علل سے مراد وہ کتاب ہیں'' جن میں ایسی حدیثوں کو جمع کر دیا گیا ہو، جن کی سند پر کلام ہو، یا متن میں کوئی علت پائی جاتی ہو، یہ علوم حدیث کی شاخ بہت نازک اور دقیق سمجھی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں بہت کم اہل علم نے قدم رکھا ہے۔

ان کتابوں کا طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ مؤلف علت پائی جانے والی روایتوں کو جمع کر کے ان پر کلام کرتے ہیں، اور اس سند یا متن میں موجود جو علت ہے اس کی نشاندہی کرتے ہیں، اس موضوع پر حسب ذیل کتابیں اہم سمجھی جاتی ہیں:

(1) کتاب العلل: از امام علی بن مدینی (متوفی: 234ھ)

(2) العلل ومعرفة الرجال: از امام احمد بن حنبلؒ (متوفی: 241ھ)

(3) کتاب العلل: از امام محمد بن اسماعیل بخاری (متوفی: 256ھ)

(4) کتاب العلل: از امام مسلم بن حجاج القشیری (متوفی: 261ھ)

(5) کتاب العلل: از امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازی (متوفی: 327ھ)

(6) العلل: از ابوعلی بن عمر الدارقطنی (متوفی: 385ھ)

(7) العلل الکبیر: از امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (متوفی: 279ھ)

(8) العلل الصغیر: از امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (متوفی: 279ھ)

11.11 کتب تخریج

تخریج حدیث، یہ دراصل علوم حدیث کی عملی تطبیق کا نام ہے، یعنی اصول حدیث کی کتابوں میں جتنے علوم وفنون اور اصول وقواعد پڑھائے جاتے ہیں، ان کی عملی طور پر تطبیق، تخریج حدیث کے ذریعہ عمل آتی ہے، محدثین نے مختلف اسلوب میں تخریج ہے کی تعریف کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''فن تخریج'' ان اصول وقواعد کا نام ہے، جن کے ذریعہ حدیث اوراس کے متابعات اور شواہد تک رسائی آسان ہوجاتی ہے، خواہ وہ روایت حدیث کی بنیادی کتابوں میں ہو یا دوسرے اور تیسرے درجہ کی کتابوں میں، نیز اس فن کے ذریعہ حدیث کے درجہ کا بھی علم ہوتا ہے۔

11.11.1 چند اہم کتب تخریج

اسلامی علوم وفنون پر لکھی گئی بیشتر کتابوں میں حدیث وسنت سے استدلال کیا جاتا ہے، اور جا بجا اسے ذکر کیا جاتا ہے، چنانچہ بعض محدثین نے ایسی کتابوں میں موجود روایتوں کو یکجا کردیا اوران کے حوالے تلاش کر کے ذکر کیے، اسی طرح بسا اوقات ان روایتوں پر حکم لگا کر ان کی درجہ بندی بھی کردی، ایسی ہی چند مشہور کتابوں کو ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

1. نصب الراية لأحاديث الهداية

اس کے مؤلف جمال الدین ابومحمد عبداللہ بن یوسف زیلعی حنفی ہیں، علم حدیث پر آپ گہری نگاہ رکھتے ہیں، حافظ حدیث کے لقب سے جانے جاتے ہیں، 762ھ میں وفات پائی۔

یہ کتاب دراصل فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''ہدایہ'' سے متعلق ہے، علامہ ابوبکر مرغینانی حنفی (593ھ) نے اپنی کتاب ہدایہ میں بہ کثرت حدیثوں سے استدلال کیا ہے، حنفیہ کے بشمول شافعیہ اور دیگر فقہی مذاہب کی دلیل بھی ضمناً ذکر کی ہے، اس طرح ہدایہ میں حدیثوں کی بڑی تعداد جمع ہوگئی، چنانچہ امام زیلعی نے تحقیق وجستجو کے بعد ان روایتوں کے حوالے حدیث کی کتابوں سے نکالے، نیز محدثین کے اقوال کی روشنی میں ان کے درجہ کی نشاندہی کی اور اس طرح یہ کتاب فقہی روایات کا بہت بڑا ذخیرہ بن گئی، زیلعی کے بعد جو بھی محدث تخریج حدیث پر کام کرتا، یہ کتاب اس کے لئے نشان راہ کا درجہ رکھتی، حافظ ابن حجر جیسے جلیل القدر محدث نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے، نصب الرایہ 4 ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

2. الدراية في تخريج أحاديث الهداية

حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی: 852ھ) اس کے مؤلف ہیں، یہ کتاب اصل میں زیلعی کی نصب الرایہ کی تلخیص ہے، گویا کہ مستقل کتاب نہیں ہے، مؤلف نے زیلعی کے ذکر کردہ حوالہ جات پر اعتماد کیا ہے، البتہ زیادہ اختصار کے پیش نظر ابن حجر نے بسا اوقات اہم چیزوں کو بھی حذف کردیا ہے، جس سے کتاب کی نافعیت متاثر ہوئی ہے، یہ کتاب ہندوپاک سے شائع ہونے والے ہدایہ کے حاشیہ پر طبع ہوتی رہی ہے۔

3. التلخيص الحبير في تخريج احاديث الشرح الكبير

فقہ شافعی کی ایک اہم کتاب ''الشرح الکبیر'' ہے، اس کے مؤلف أبوالقاسم عبدالکریم بن محمد الرافعی (المتوفی: 623ھ) ہیں، اس کتاب میں ذکر کردہ احادیث وآثار کی معروف محدث ابن الملقن (متوفی: 804ھ) نے ''البدر المنير'' نامی کتاب میں تخریج کی ہے، چنانچہ ابن حجر (متوفی: 852ھ) نے اس کتاب کی تلخیص کی اور اس کا نام ''التلخيص الحبير'' رکھا اور اپنی سابق الذکر کتاب ''الدراية'' میں جو اسلوب تھا اسی کو یہاں بھی اپنایا ہے، حافظ ابن حجر کی یہ تلخیص بھی چھپ چکی ہے۔

4. المغنی عن حمل الأسفار فی الأسفار فی تخریج ما فی الإحیاء من الأخبار

امام غزالی (متوفی: 505ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں بہت سی حدیثیں اور صحابہ کے اقوال ذکر کیئے گئے ہیں، اس میں صحیح اور ضعیف؛ بلکہ بے اصل ہر طرح کی روایتیں تھیں، ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی تخریج ہو اور درجہ بندی کی جائے، چنانچہ معروف محدث حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی (متوفی: 608ھ) نے یہ خدمت انجام دی، آپ کی تخریج محدثانہ اسلوب کی بہترین مثال ہے۔

ہر حدیث کے حوالے ذکر کرنے کے بعد اس کا حکم بیان کرتے ہیں، یہ کتاب ''احیاء علوم الدین'' کے حاشیہ پر چھپی ہوئی ہے۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ بھی کتب تخریج ہیں، ذیل میں محض ان کے نام ذکر کئے جاتے ہیں۔

5. تخریج احادیث المھذب ، ازمحمد بن موسی حازمی (متوفی: 584ھ)

6. تخریج احادیث الکشاف ، اززیلعی (متوفی: 762ھ)

7. تحفۃ الراوی فی تخریج أحادیث البیضاوی ، ازعبدالرؤف مناوی (متوفی: 1031ھ)

11.12 قوامیس حدیث

''قوامیس'' قاموس کی جمع ہے، اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جو حدیث میں وارد مشکل الفاظ کی لغوی و اصطلاحی تشریح کرتی ہیں، واضح ہو کہ ان کتابوں کو کتب غریب الحدیث سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

حدیث کی کتابوں کی یہ بھی ایک اہم قسم ہے، کئی اہل علم نے اس جانب توجہ کی ہے، اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جب افریقہ و ایشیاء کی مختلف قوموں نے اسلام قبول کیا اور اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر ان خطوں میں داخل ہوا جہاں کے لوگ عربی سے ناآگاہ تھے، تو اسلام کو سمجھنے اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات سے بہرور ہونے میں دقت پیش آنے لگی تھی، علماء نے اس صورت حال کے پیش نظر حدیث کے مشکل الفاظ و تعبیرات کی تشریح کی جانب توجہ کی، بعض محققین کے مطابق دوسری صدی ہجری کے اخیر میں باضابطہ اس جہت میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا۔

11.12.1 قوامیس حدیث پر چند اہم کتابیں

چند اہم تالیفات کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

1. غریب الحدیث ، ازابوعبیدہ معمر تیمی بصری (متوفی: 210ھ) یہ بالکل ابتدائی دور کی کتاب ہے، نیز مؤلف نے اپنے معیار کے لحاظ سے مشکل الفاظ کی تحدید کی ہے، اس لئے یہ کتاب اپنے حجم کے لحاظ سے بہت مختصر ہے۔

2. غریب الحدیث ، ازابوعبداللہ قاسم بن سلام (متوفی: 224ھ) یہ اپنے موضوع کی اہم ترین کتاب شمار ہوتی ہے، مؤلف نے عمر عزیز کے کم و بیش چالیس سال اس میں صرف کئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حدیث کے بیشتر مشکل الفاظ اس میں مل جاتے ہیں۔

3. غریب الحدیث :ازعبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری (متوفی:276ھ) یہ کتاب پچھلی کتاب ہی کے طرز پر لکھی گئی ہے، اس کتاب کی تالیف کے پس پشت مؤلف کا یہ منشاء تھا کہ قاسم بن سلام کی کتاب اور اس کے بعد اب اس باب میں کسی اضافے کی گنجائش باقی نہ رہ جائے، اورحقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں بہت ہی جامع کتاب ہیں۔

4. غریب الحدیث، ازابوسلیمان حمد بن محمد خطابی البستی (متوفی:388ھ) مؤلف خودعلوم حدیث پر دسترس رکھتے ہیں اور اس کتاب میں یہ کوشش کی کہ قاسم بن سلام اور ابن قتیبہ کی نظر سے جو حدیثیں اور مشکل الفاظ رہ گئے تھے، انہیں اس میں جمع کردیا جائے، چنانچہ آپ نے اسلوب بھی انہی دونوں کتابوں کا اختیار کیا، اب یہ تینوں کتابیں فن ''غریب الحدیث'' کی بنیاد سمجھی جاتی ہیں۔

5. النہایة فی غریب الحدیث والأثر ،ازابوالسعادات مبارک بن محمد الشیبانی معروف بہ ابن اثیر (متوفی:606ھ) مؤلف نے اس موضوع کی بیشتر کتابوں کو سامنے رکھ کر، ان میں بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کردیا ہے، اس طرح حدیث کی کئی ضخیم کتابوں اور جلدوں میں موجود مشکل الفاظ ایک جگہ جمع ہوگئے ہیں، مؤلف نے جن کتابوں سے یہ مواد اکھٹا کیا ہے، ان کا حوالہ بھی ذکر کردیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اس فن کی نہایت معتبر اور اہم کتاب کی حیثیت سے مشہور ہوئی ، بلکہ اہل علم کے درمیان اب یہی کتاب زیادہ رائج ہے۔

6. مجمع بحار الانوار فی غریب التنزیل ولطائف الأخبار ،ازمحمد بن طاہر پٹنی (متوفی:986ھ) مؤلف ہندوستانی ہیں، اور یہ کتاب اپنی نوعیت واسلوب کے اعتبار سے بہت ہی فائق ہے، اس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ مؤلف نے نہ صرف مشکل الفاظ ذکر کئے ہیں؛ بلکہ حدیث کی تشریح بھی کی ہے، علامہ انور شاہ کشمیری فن غریب الحدیث کی اسے سب سے اہم کتاب قرار دیتے تھے ۔

11.13 آلی (الیکٹرانک) مکتبے

ٹکنالوجی کی ترقی کے نتیجہ میں کمپوٹر وجود میں آیا اور کمپیوٹر وانٹرنیٹ کے اشتراک سے پوری دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کرگئی اور انسانی زندگی کے تمام گوشے ان سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ پائے، ابتدائی دور میں کمپیوٹر کا استعمال محدود تھا، مگر دھیرے دھیرے اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور اب صورت حال یہ ہے کہ مختلف دائرہ کار میں انسانی کھپت کم ہوگئی ہے، اور ان کی جگہ کمپیوٹر نے لے لی ہے، کمپیوٹر کا استعمال مختلف ضرورتوں کے لئے کیا جانے لگا ہے، جیسے کہ اس میں بہت ہی ضخیم کمیت میں مواد کی ذخیرہ اندوزی کی جاسکتی ہے، محفوظ کردہ مواد کو مختلف اسلوب میں ترتیب دیا جاسکتا ہے اور بہت ہی کم وقت میں اس پھیلے ہوئے مواد میں سے کوئی خاص گوشہ طلب کیا جاسکتا ہے، ہزاروں مجلدات اور لاکھوں صفحات پر مشتمل کتابوں کو ایک چھوٹے سے کمپیوٹر میں محفوظ کرکے حسب سہولت ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، کسی چیز کی تلاش ہو تو سینکڑوں ورق کی صفحہ گردانی اور گھنٹوں جستجو کے بجائے محض چند سیکنڈ درکار ہوتے ہیں، اس طرح ٹیکنالوجی کی ترقی نے علم وتحقیق کے میدان میں بھی انقلاب برپا کردیا ہے۔

11.13.1 آلی مکتبوں کا آغاز

محققین کا خیال ہے کہ 1960ء کے آس پاس کمپیوٹر کو دینی ومذہبی مطالعات کے لئے تاریخ میں پہلی بار استعمال کیا گیا، اس جانب یہودیوں وعیسائیوں نے پیش قدمی کی، حدیث وسنت کے لئے کمپیوٹر کا استعمال بہت بعد میں ہوا ہے، غالباً سب سے پہلے یہ خیال ایک مستشرق کے ذہن میں آیا تھا، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شہر شکاگو میں 1975ء میں ایک بین الاقوامی پروگرام منعقد کیا گیا، جس میں حضرت امام بخاریؒ کی پیدائش پر بارہ صدی گزرنے کی مناسبت سے جشن رکھا گیا تھا، اس موقع سے ایک مستشرق نے مطالعات حدیث کے لئے کمپیوٹر کے استعمال کی تجویز رکھی، معروف ہندوستانی نژاد اسکالر اور محدث ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی بھی اس جشن میں شریک تھے، آپ نے اس مستشرق کے پس پردہ عزائم کو بھانپ لیا، پھر 1977ء تک کمپیوٹر کا استعمال بہ زبان عربی بھی ممکن ہوگیا، چنانچہ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے اس جانب توجہ کی اور اپنے تمام وسائل اور صلاحیت کو اس کاز کے لئے وقف کردیا، انتھک کوشش اور مسلسل جدوجہد کے بعد کامیابی ہاتھ آئی، چنانچہ کمپیوٹر کی مدد سے پہلا علمی وحدیثی منصوبہ پائے تکمیل کو پہنچا، ڈاکٹر اعظمی نے حدیث کی معروف کتاب ''سنن ابن ماجہ'' کی حدیثوں کی بذریعہ کمپیوٹر تخریج انجام دی، نیز کتاب کے اخیر میں بہ شمول حدیث کے دیگر اہم چیزوں کی ہمہ اقسام فہرست تیار کی، اور 1983ء میں سنن ابن ماجہ کا یہ نسخہ منظر عام پر آیا اور اسی منصوبہ کے تحت مزید نو کتابیں بھی منظر عام پر آئیں، جن کے نام اس طرح ہیں، صحیح البخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن دارمی اور مؤطا مالک اور مسند امام احمد بن حنبل، اس طرح حدیث کی یہ نو کتابیں کمپیوٹر میں فنی طریقے سے داخل کی گئیں، اور یہ ممکن ہوسکا کہ بہت ہی کم وقت میں پچاس ہزار سے زائد ذخیرۂ حدیث میں سے کسی بھی حدیث کو تلاش کیا جائے، اور بہ یک لحظہ ان تمام کتابوں میں اس کے حوالے تفصیل کے ساتھ معلوم کرلئے جائیں، بعد میں یہ پروگرام C.D کی شکل میں پیش کیا گیا۔

اس آغاز کے بعد مختلف جہتوں سے اس جانب توجہ کی گئی اور یکے بعد دیگرے بہت سے اہم حدیثی پروگرام منظر عام پر آئے، اب تو ہزاروں حدیث کی کتابیں کمپیوٹر پر آچکی ہیں، نایاب مخطوطات اور نادر مطبوعات کا اکثر وبیشتر حصہ اس پر دستیاب ہے۔

11.13.2 آلی مکتبے، فائدے اور نقصانات

فائدے:

1. وقت کی بچت، یعنی بہت کم وقت میں بہت زیادہ علمی فائدہ۔
2. نادر مخطوطات اور نایاب مطبوعات تک بآسانی رسائی۔
3. کتابوں کی خریداری اور زیرباری سے حفاظت
4. معلومات کی تلاش وجستجو میں تعب وتھکن سے حفاظت۔
5. ہزاروں کتابوں کے لئے مطلوبہ جگہ سے بے نیاز۔
6. پوری دنیا کی علمی کاوشوں اور جدید تحقیقات سے آگہی۔

7. تخریج حدیث کا مشکل کام حد درجہ آسان۔

8. حدیث اوراس کے راویوں پر یکجا کلام۔

9. ہرراوی کے بارے میں مختلف محدثین کی رائے بہ یک نظر۔

10. حدیث کے شواہد اور متابعات کا تفصیل سے ذکر۔

11. ہر روایت کی مختلف سندوں سے متعلق روایوں کا شجرہ اوران کے طبقات کی نشاندہی۔

12. سند میں موجود، ثقہ وضعیف راویوں کی نشاندہی۔

13. کسی مسئلہ پر مختلف کتابوں کو سامنے رکھ کر مقابلے کی سہولت۔

نقصانات:

1. متن حدیث میں غلطیوں کی کثرت، جیسے کہ ایک روایت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لا اصافح النساء'' (میں خواتین سے مصافحہ نہیں کرتا ہوں) مگر ایک آلی مکتبہ میں ابتداء سے ''لا'' رہ گیا تھا، جو بظاہر ایک معمولی غلطی ہے، مگر اس سے حکم شرعی ہی بدل جائے گا۔

2. راویوں کے نام میں غلطی، جیسے ایک راوی ہیں ''حبان بن ہلال'' مگر ایک مکتبہ میں ''حسان بن ہلال'' درج کردیا گیا؛ لہٰذا اس غلطی کی صورت میں اصل راوی تک رسائی نہیں ہوسکتی۔

3. علمی ذوق کی پستی، اگر کوئی اسکالر محض ان آلی مکتبوں پر اعتماد کرنے لگے، تو اس میں علمی ذوق کی کمی پیدا ہوجاتی ہے، کتابوں سے انس، مؤلفین کے طریقۂ کار اوران کی ترتیب سے واقفیت جاتی رہتی ہے۔

4. حوالہ جات میں فرق، جو کتابیں کمپیوٹر مکتبوں میں داخل کی گئی ہیں، ان میں بعض تو مطبوعہ کتابوں کے ہم مثل ہیں، مگر بہت سی کتابوں میں فرق پایا جاتا ہے، چنانچہ اس طرح حدیث نمبر، یا کتاب کی جلد یا صفحات یکسر بدل جاتے ہیں، جس کی بناء پر اصل کتاب سے مراجعہ بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

11.13.3 چند آلی مکتبے

جوامع الکلم آلی مکتبوں نے بہت زیادہ ترقی کرلی ہے، موجودہ وقت میں ''جوامع الکلم'' کے نام سے بازار میں ایک پروگرام دستیاب ہے، جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول ہے، ذیل میں اس کی چند نمایاں خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

1. حدیث کی 1060 کتابوں-مطبوعات ومخطوطات- میں سے اسی لاکھ احادیث وآثار کو اس میں یکجا کردیا گیا ہے۔

2. حدیث کی 345 انتہائی بیش قیمت اور نادر مخطوطات محفوظ کردیے گئے ہیں۔

3. حدیث کی 650 کتابوں کی روایتوں کی سندوں پر صحت وضعف کے لحاظ سے ابتدائی حکم لگا دیا گیا ہے۔

4. علم الرجال کی کتابوں سے 45000 راویان حدیث کے حالات اس میں جمع کر دیے گئے ہیں۔
5. سند کے تمام راویوں کو تہذیب الکمال سے جوڑ دیا گیا ہے؛ تاکہ بنا تلاش کیے ہی ہر راوی کے حالات [illegible]
6. متن کے الفاظ کے معنی ومفہوم سے واقفیت کے لئے ہر لفظ کو عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب [illegible]
7. ہر راوی کی تمام روایتوں کی تعداد اور مختلف اعتبارات سے ان کے اعداد وشمار پہ یک جنبش معلوم [illegible]
8. ہر حدیث کی تفصیلی تخریج، نیز اس کے شواہد ومتابعات کا احاطہ۔
9. ان تمام چیزوں کو نقل کر کے کسی دوسری فائل میں منتقل کرنے، یا ان کی طباعت کی [illegible]

موسوعۃ الحدیث النبوی الشریف

یہ بھی ایک آلی مکتبہ ہے، اس کے دوسرے ایڈیشن میں حدیث کی 30 مشہور کتابیں شامل کی گئی ہیں، جو کہ سیکڑوں [illegible] جیسے کتب ستہ کے علاوہ مسند احمد، موطا امام مالک، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ اور فتح الباری [illegible] واضح رہے کہ یہ مکتبہ صرف حدیث اور علوم حدیث کے لئے خاص ہے۔

مکتبہ شاملہ

آلی مکتبوں میں سب سے مشہور مکتبہ شاملہ ہی ہے، استعمال کے اعتبار سے بھی آسان [illegible] کے لئے دستیاب ہے، اس پروگرام میں علوم اسلامی کی ہمہ اقسام کی کتابیں ہوا کرتی ہیں، آخری ایڈیشن میں صرف حدیث [illegible] کم وبیش 1500 کتابیں ہیں، جو کئی ہزار جلدوں پر مشتمل ہیں۔

شاملہ تیار کرنے والوں نے اب یہ کوشش کی ہے کہ اس میں داخل کردہ کتابیں جلد وصفحات [illegible] سے مطبوعہ نسخوں کے ہم مثل ہوں؛ تاکہ مراجعت اور حوالہ میں دقت نہ پیش آئے۔ اس مکتبہ کی ایک اہم خوبی [illegible] تازہ دم کیا جاتا رہتا ہے، یعنی نئی کتابوں اور علمی وتحقیقی مقالات کو شامل کرنے کا عمل جاری رہتا ہے۔

11.14 خلاصہ

محدثین نے حدیث اور علوم حدیث کی مختلف زاویوں سے خدمت کی ہے، چنانچہ تیسری صدی ہجری تک [illegible] تدوین حدیث کا عمل مکمل ہو چکا تھا، مگر اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ان جمع شدہ روایتوں کو مختلف انداز میں ترتیب دیا جائے؛ تاکہ ان سے فائدہ اٹھانا آسان ہو، اور دوسری طرف مجتہدین اپنے اجتہاد واستنباط کے کام میں یکسوئی محسوس کریں؛ اس لئے محدثین کرام نے متعدد زاویے اور اسلوب سے ان احادیث کو مرتب کرنا شروع کیا؛ چنانچہ حدیث کی کتابوں کی کم وبیش چالیس سے زیادہ قسمیں پائی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر موضوع پر محدثین نے گراں قدر علمی وتحقیقی اور معیاری تالیفات سپرد قلم کی ہیں، جو اپنے آپ میں شاہکار ہیں، کتب حدیث کی ایک اہم صنف جوامع ہے، جو دین کے تمام ابواب پر مشتمل روایتوں کا مجموعہ ہوتی ہے، امام بخاری [illegible]

کی صحیح اور ترمذی کی سنن اس کی بہترین مثال ہے، مسانید میں حدیثیں موضوعات کی ترتیب کے بجائے صحابہ کی ترتیب پر ذکر کی جاتی ہیں، مسند احمد بن حنبل اور مسند ابی یعلی موصلی مشہور ہیں، اس ضمن میں کتب صحاح کو بڑی اہمیت حاصل ہے، حدیث کی کتابوں میں چوں کہ مؤلف اس میں صحیح حدیث کے انتخاب کی کوشش کرتا ہے، صحیح بخاری وصحیح مسلم قرآن مجید کے بعد سب سے صحیح کتابیں شمار کی جاتی ہیں، اگر چہ ان دونوں میں صحیح حدیثوں کا مختصر حصہ آپایا ہے۔ فقہی احکام سے متعلق روایتوں کے مجموعے ''سنن'' کہلاتے ہیں، سنن ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ اس کی نمائندہ کتابیں ہیں۔ کتب معاجم میں حدیث صحابہ یا شیوخ کی ترتیب پر ذکر کی جاتی ہیں، جیسے کہ امام طبرانی کی تینوں معجم۔ محدثین نے خدمت حدیث کے لئے شروحات کی طرف بھی توجہ دی؛ چنانچہ فتح الباری، عمدۃ القاری جیسی بے شمار شرحیں وجود میں آئیں، اس بابت علماء ہند بھی لائق ستائش ہیں کہ حدیث کی کئی کتابوں کی معتبر اور رائج شرح ان کی تحریر کردہ ہیں، جیسے: فیض الباری، بذل المجہود، عون المعبود اور اوجز المسالک وغیرہ۔ علل پر جن کتابوں نے شہرت پائی ان میں نمایاں امام ترمذی اور دارقطنی کی کتابیں ہیں۔ تخریج حدیث دراصل علوم حدیث کی عملی تطبیق کا نام ہے، اس حوالہ سے سب سے اہم کام علامہ زیلعی حنفی کا ہے، یعنی ''نصب الرایہ فی أحادیث الهدایة ''۔ حدیث کے مشکل الفاظ کی شرح اور مراد جاننے کے لئے کتابوں کی ایک مستقل صنف وجود میں لائی گئی، قوامیس یا غریب الحدیث کے نام سے اس موضوع پر النہایۃ لابن اثیر بہت ہی مقبول کتاب شمار کی جاتی ہے۔ آلی (الیکٹرانک) مکتبوں نے علم وتحقیق کے میدان میں انقلاب برپا کیا ہے، اور خاص طور پر حدیث کی تلاش، راویان حدیث کے حالات سے واقفیت اور ہزارہا مطبوعات ومخطوطات تک رسائی اس کے ذریعہ ممکن ہوسکی، جوامع الکلم نامی پروگرام فنی لحاظ سے بہت مفید اور مستحکم سمجھا جاتا ہے، یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ حدیث اور اسلامی کتابوں کے لئے آلی مکتبوں کا عملی طور پر آغاز ایک ہندوستانی نژاد اسکالر اور محدث ڈاکٹر مصطفی اعظمی کے ہاتھوں ہوا۔ آلی مکتبے اپنے دامن میں بہت سے فائدے سموئے ہوئے ہے، مگر اس کے چند نقصانات بھی ہیں، باحثین واسکالرس ان جہتوں کا خیال رکھتے ہوئے اسے استعمال کریں تو مناسب ہوگا۔

11.15 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے:

1. مسانید سے کون سی کتابیں مراد ہیں، اس پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مسند احمد پر تعارفی نوٹ لکھئے۔
2. ''سنن'' سے کن کتابوں کو تعبیر کیا جاتا ہے، یہ بتاتے ہوئے بطور مثال دو کتابوں کا تعارف پیش کیجئے۔
3. کتب تخریج کی تعریف کرتے ہوئے اس موضوع پر امام زیلعی کے کام کا تعارف تحریر کیجئے۔

درج ذیل سوالوں کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے:

1. شروح حدیث کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ یہ بیان کرتے ہوئے کسی تین شرح کے نام لکھئے۔
2. قوامیس حدیث سے کیا مراد ہے؟ اس سے بحث کرتے ہوئے بطور مثال کسی کتاب کا نام اور خصوصیت درج کیجئے۔
3. آلی مکتبوں کے فائدے اور نقصانات تحریر کیجئے۔

11.16 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. موسوعۃ علوم الحدیث الشریف	وزارۃ اوقاف مصر	
2. تاریخ حدیث ومحدثین	ڈاکٹر محمد ابوزہو	ترجمہ: غلام احمد حریری
3. تدوین السنۃ النبویۃ نشأتہ وتطورہ	ڈاکٹر محمد مطر زہرانی	
4. اصول التخریج ودراسۃ الأسانید	ڈاکٹر محمود الطحان	
5. حدیث اور فہم حدیث	مولانا عبداللہ معروفی	
6. علوم الحدیث	صبحی صالح/ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری	

اکائی : 12 اردو زبان میں ہندوستانی علماء کی خدمات حدیث

اکائی کے اجزاء

12.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو مختلف ادوار اور زمانوں میں ہندوستان میں علم حدیث کی صورت حال اور ہندوستانی علماء کی علم حدیث کے میدان میں کوششوں، کاوشوں اور کارناموں سے واقف کرانا ہے۔ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ اردو زبان میں کتب حدیث کے ترجمے، اردو زبان میں حدیث کے مجموعے، اصول حدیث اور فن حدیث پر موجود کتابوں اور دیگر موضوعات حدیث سے متعلق تحریری سرمایہ سے واقف ہوں گے اور ان کا ایک اجمالی نقشہ ان کے سامنے آجائے گا۔

12.2 تمہید

اردو زبان میں جس طرح قرآن کی تفسیریں مختلف انداز سے لکھی گئیں اس طرح اہل علم نے حدیث کو بھی لوگوں تک پہنچانے کے لئے مختلف انداز سے کوششیں انجام دیں۔ اردو زبان میں حدیث اور اس کے علوم سے متعلق ایک کتب خانہ موجود ہے۔ جن میں

کتب احادیث کے ترجمے، مختلف موضوعات پر حدیثوں کے مجموعے، اصول حدیث اور تاریخ وتدوین حدیث اور حجیت وتشریعی حیثیت پر مشتمل کتابیں شامل ہیں۔

12.3 ہندوستان میں علم حدیث کا آغاز

ہندوستان کی سرزمین کو ظہور اسلام کے وقت ہی سے تمام سرزمینوں اور ممالک میں ایک خاص مقام حاصل ہے، آفتاب ہدایت اور علم وادب کی کرنوں نے ہر دور اور ہر زمانے میں اس سرزمین کو روشن کیا اور اس کا فیض دور دور تک پہنچایا۔ علم کی اس روشنی کو باقی رکھنے اور اس میں اضافہ کرنے میں علماء، اولیاء، مختلف سلاطین اور صوفیہ ہر دور اور زمانے میں کوشاں رہے، کہا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں اسلام کی روشنی ہندوستان تک پہنچ گئی تھی۔

ہندوستان میں علم حدیث عہد بہ عہد

صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ کے سفراء اور اسلام کے اولین پیروکار تھے، قرآن وحدیث کا پورا ذخیرہ انہی کے ہاتھوں امت کو ملا، خود اس ملک میں اسلام کی آمد ان برگزیدہ ہستیوں کے ذریعہ ہوئی، تحقیق کے مطابق کم وبیش 25 صحابۂ کرام نے برصغیر ہند میں قدم رکھا اور اس ریگ زار کو لالہ زار میں تبدیل کر دیا، ان میں سے 12 حضرت عمر کے دور خلافت میں، 5 حضرت عثمان، 3 حضرت علی کے دور امارت میں اور 4 حضرت معاویہ کے عہد حکومت میں، نیز ایک یزید بن معاویہ کے دور میں یہاں آئے، اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس خطے میں 15 ھ سے حدیثیں پہنچنا شروع ہوگئی تھیں، مگر ان صحابہ کرام کو جنگی حالات اور مدت قیام کے کم ہونے کی وجہ سے حدیث کی اشاعت کا موقع زیادہ نہیں مل سکا؛ البتہ یہاں اشاعت حدیث کا آغاز پہلی صدی ہجری کی آخری دہائی سے ہوتا ہے، جب کہ سندھ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی، اس کے نتیجہ میں عرب آبادکار بڑی تعداد میں آنے لگے، اور دیبل سے ملتان تک اہم بندرگاہوں اور شہروں میں ان کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں، جن میں منصورہ، ملتان، دیبل، سندان، قصدار اور قندابیل کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور یہ مقامات سندھ میں قرآن وحدیث کے ابتدائی مرکز بن گئے، دور اوّل کے ممتاز محدثین میں موسی بن یعقوب ثقفی، یزید بن ابی کبشہ دمشقی، مفضل بن مہلب بن ابی صفرہ اور ربیع بن صبیح سعدی بصری وغیرہ حضرات کا شمار ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ سندھ پر عربوں کا اقتدار تین صدیوں تک قائم رہا۔

تیسری صدی کے علماء میں ابو محمد رجاء بن سندھی، ان کے بیٹے ابو عبداللہ اور پوتے ابو بکر بلند پایہ محدثین میں شمار ہوتے ہیں، رجاء بن سندھی امام احمد بن حنبل کے ہم عصر ہیں، امام احمد بھی ان سے حدیثیں روایت کرتے ہیں، علم حدیث میں ان کے بلند مرتبے کا یہ عالم تھا کہ حافظ حدیث حاکم ان کو ''رکن من ارکان الحدیث'' لکھتے تھے۔ اس عہد کے نامور محدثین میں احمد بن سندھی بن فروخ بغدادی، عبداللہ بن عدی جرجانی، ابو محمد خلف بن سالم، ابو عبدالملک محمد بن نجیح، ابوالھیثم سہل بن عبدالرحمٰن سندھی اور اس کے علاوہ بیشتر محدثین ہیں۔

ہندوستان میں چوتھی صدی ہجری کا زمانہ بھی علم حدیث کے ارتقاء کے لحاظ سے زرخیز اور زریں عہد تھا، اس عہد میں بھی علم حدیث کے ایسے متوالے پیدا ہوئے جو علم حدیث کی تلاش میں اجنبی ممالک میں زندگی بھر پھرتے رہے تھے، ان ہی بزرگوں میں ایک

ابوالعباس محمد بن عبداللہ دیبلی بھی تھے، وہ زہد وتقوی میں یکتائے روزگار تھے، غربت کی وجہ سے سواری کا نظم نہ ہوا تو پیدل ہی نیشاپور، بصرہ، بغداد، مکہ مکرمہ، مصر، دمشق، بیروت اور حران کی خاک چھانتے رہے، اسی زمانے میں ابوالعباس محمد بن احمد الوراق، ابوالنوارس احمد بن محمد بن حسین سندھی، احمد بن سندھی الحداد، ابونصر فتح بن عبداللہ سندھی جیسے بلند پایہ محدثین، متکلمین اور فقہاء گزرے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری علم دین کے نشر وارتقاء کے لحاظ سے بہت حوصلہ بخش نہیں تھی، اس عہد میں حدیث وتفسیر کے بلند پایہ عالم شیخ محمد اسماعیل لاہوری (متوفی: 448ھ) نے تن تنہا علم دین کا چراغ روشن کیا اور چھٹی صدی ہجری میں کئی نامور اور مایہ ناز محدث پیدا ہوئے، جن میں ابوالحسن علی بن عمر لاہوری، ابوالقاسم محمود بن خلف لاہوری، ابوالفتوح عبدالصمد لاہوری، عمرو بن سعید لاہوری، محمد بن مامون لاہوری جیسے علماء ومحدثین شامل ہیں۔

ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری علم اور علماء کے لحاظ سے زرخیز رہی ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب وسط ایشیا میں ترکوں اور منگولوں نے تباہی وبربادی مچا رکھی تھی۔ ترکستان اور خراسان وغیرہ سے علماء ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے تھے، دہلی اس وقت دارالسلطنت تھا اور دہلی کے تخت پر اس وقت شمس الدین التمش تخت نشیں تھا۔ شمس الدین علم اور علماء کا بڑا قدرداں تھا۔ اس وقت بہت سے علماء ہندوستان آئے، اور یہیں کے ہوکر رہ گئے، لہٰذا ہندوستان علم کا مرکز بن گیا، لیکن علم حدیث کا مرکز نہیں بل کہ فقہ یا تصوف کا۔ ترکستان اور خراسان تیسری صدی میں علم حدیث کے گہوارے تھے، اور صحاح ستہ کے اکثر مصنفین ان ہی مراکز میں پیدا ہوئے تھے؛ لیکن تاتاریوں کی تباہی نے وہاں علم حدیث کی سرگرمیاں سرد کردی تھیں، لہٰذا ان واردین علماء کے پاس حدیث کے بجائے فقہ اور تصوف کا سرمایہ تھا۔ اسی زمانے میں جب سلطان غیاث الدین بلبن دہلی کے تخت پر متمکن تھا، تو عراق اور بغداد کی سرزمین پر ہلاکو اور اس کی فوجوں کے ذریعے آگ اور خون کا کھیل کھیلا جارہا تھا، تو وہاں کے باقی ماندہ علماء بھی اپنے وطن چھوڑ کر ہندوستان آئے، اور سرزمین ہند کو ایک بار پھر کاروان علم کو گلے لگانے کا موقع ملا۔ ان علماء کی محنتوں اور کوششوں سے ہندوستان علم ومعرفت کا جیتا جاگتا مرکز بن گیا۔ مولانا ضیاء الدین برنی کے بیان کے مطابق سلطان علاء الدین خلجی کے دور حکومت (696ھ تا 716ھ) تک ہندوستان میں ایسے بلند پایہ علماء پیدا ہوگئے تھے جو امام غزالی اور امام رازی کے ہم سر سمجھے جانے لگے۔ اس عہد میں علماء کی تعداد کافی تھی، محمد تغلق کے دسترخوان پر دوسو فقہاء موجود رہتے تھے، اور سکندر لودھی کے محل میں رات کو ستر علماء جمع ہوتے تھے، جن سے وہ فقہی مسائل دریافت کرتا تھا؛ لیکن اتنے روشن اور تابناک عہد میں ہندوستان میں علم حدیث کا چراغ زیادہ روشن نہ تھا۔ اس زمانے میں حدیث کی طرف سے علماء کی بے توجہی کی بہت سی وجوہ ہیں؛ لیکن اس دور میں بھی چند ایسے بزرگ ملتے ہیں، جنھوں نے اس ملک میں علم حدیث کی صورت حال کو بہتر اور مضبوط کیا، اور اسی کوشش اور جد وجہد میں اپنی زندگی گزاردی۔ ان علماء میں سرفہرست امام رضی الدین حسن بن محمد صغانی ہیں، وہ 577ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، یمن، حجاز، اور عراق کا سفر کر کے علوم کی تکمیل کی اور بغداد جاکر مسند تدریس پر متمکن ہوئے، اس لئے آپ کے علم کا فیض ہندوستانیوں سے زیادہ باہر کے لوگوں کو پہنچا۔

امام صغانی حدیث، فقہ اور لغت کے جامع مانے جاتے تھے۔ آپ کے شاگرد رشید شرف الدین دمیاطی کہتے ہیں "إنه كان إماما في اللغة والفقه والحديث"۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے صغانی کے تئیں خوب لکھا ہے کہ "شیخ اسماعیل کے بعد یہاں

ڈیڑھ سو برس تک اندھیرا گھپ چھایا رہتا ہے، بالآخر ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانور کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی، الغرض امام صغانی غزنوی لاہوری تنہا محدث ہیں اور مشارق الانوار اس دیار کی تنہا خدمت حدیث ہے جو اس عرصۂ دراز میں انجام کو پہنچی''۔آپ کی متعدد تصانیف ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ''مشارق الانوار'' ہے۔ یہ کتاب بخاری و مسلم سے منتخب دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثوں کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کو اللہ نے اتنی مقبولیت بخشی کہ عرب اور عجم ہر جگہ کے علماء نے اس کو اپنے یہاں نصاب میں داخل کیا اور بے شمار شروحات اور حواشی لکھے گئے۔

نویں صدی ہجری ہندوستان میں علم حدیث کے لئے بہت روشن اور تابناک زمانہ تھا۔نویں صدی ہجری تک جو محدثین گزرے ہیں اور جن کو حدیث سے اشتغال رہا ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (634ھ-725ھ) شرف الدین یحیٰ منیری (661ء-782ء) امیر کبیر سید علی ہمدانی (م 786ھ) وغیرہ، یہ کساد بازاری نویں صدی ہجری تک قائم رہی۔آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں دکن کی بہمنی سلطنت قائم ہوئی۔اس نے علم حدیث کی اشاعت کی طرف توجہ کی۔گجرات کا علاقہ علم حدیث کے لئے ابتدا ہی سے کافی زرخیز رہا۔نویں صدی کے بعد ہندوستان میں نئے سرے سے علم حدیث کا آغاز ہوا۔اور بہت سے محدثین اور علماء اس علم کی خدمت کا شرف حاصل کرتے رہے۔اکبر کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی 990ھ مطابق 1582ء میں پیدا ہوئے۔آپ ایک سربرآوردہ خاندان کے چشم و چراغ تھے، نسلاً ترک تھے، آپ کے جدِّ امجد سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں دہلی آئے۔ابتدائی تعلیم والد بزرگوار سے حاصل کی، ایک سال کی مدت میں حفظ قرآن مجید مکمل کرلیا۔پھر مدرسہ دہلی میں داخل ہوئے، یہاں سے تکمیل کے بعد علماء ماوراء النہر کا رخ کیا اور سات آٹھ برس تک ان سے استفادہ کرتے رہے۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی کے معاصر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی بھی تھے، جن کا پایہ علم حدیث میں بہت تھا۔علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں ''ان کی تعلیم کی بنیاد اتباع سنت پر تھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث اور شمائل کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ مبذول ہوگئی، اور ان کے بعد صوفی محدثوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہندوستان میں قائم ہوگیا''۔گیارہویں صدی کے خاتمے کے بعد جب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا فیض علم جاری تھا، ہندوستان کی سرزمین پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی جامع کمالات ہستی نمودار ہوئی۔انہوں نے فنون اسلامیہ کی از سرنو تجدید کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ان کا اور ان کی اولاد کا فیض آج تک اس برصغیر ہی نہیں پوری دنیا میں جاری ہے۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی: 1052ھ) نے حدیث اور علم حدیث پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف فرمائیں، جس میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

1. أشعة اللمعات
2. جامع البركات منتخب شرح المشكوة
3. رساله اقسام حديث
4. ماثبت بالسنة فى ايام السنة
5. الاكمال فى اسماء الرجال
6. طريق الافادة فى شرح سفر السعادة
7. اسماء الرجال والرواة المذكورين فى المشكوة

بارہویں صدی میں علم حدیث کا یہاں خوب چرچا رہا، ہر طرف درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا بازار گرم تھا، مولانا حکیم عبدالحی حسنی کی کتاب نزہۃ الخواطر کے مطابق بارہویں صدی میں علم حدیث کی خدمت کرنے والوں کی تعداد پچاس سے متجاوز ہے۔صحاح ستہ، مشکوۃ، شمائل ترمذی اور دیگر کتب حدیث پر شرح وحاشیہ نویسی کا کام زوروشور سے انجام پارہا تھا۔شمائل ترمذی کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ان شروح وحواشی کے علاوہ حدیث اور علوم حدیث کے بہت سے مخطوطے تیار کئے گئے۔صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے کہ مجدد الف ثانی کے فرزند زادے مولانا فرح شاہ سرہندی (متوفی: 1122ھ) کو فقہ میں مقام اجتہاد حاصل تھا اور انہیں ستر ہزار حدیثیں مع اسناد اس طرح یاد تھیں کہ ہر راوی کے بارے میں جرح وتعدیل کے لحاظ سے پوری پوری تفصیلات ذہن نشین تھیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے حدیث اور علوم حدیث کو عام کرنے کے لئے جوان تھک کوششیں کیں ان کی تفصیل کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔شاہ صاحب نے علم حدیث کی عظمت اور اہمیت سے علماء کو ازسرنو روشناس کرایا۔ان کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز اور نواسے شاہ اسحٰق نے اس خزانے کو وراثت میں پایا اور اس کے سچے وارث اور امین بنے۔ان حضرات کے واسطے سے یہ علمی سرمایہ اور حدیث وسنت کی میراث دبستان دیوبند اور دیگر علمی اداروں کی طرف منتقل ہوئی اور ان اداروں نے ہندوستان کے چپے چپے پر دینی مدارس قائم کرکے دورہ حدیث کا موجودہ طریقہ رائج کیا۔اور اسی مینارۂ نور کی کرنیں پورے برصغیر؛ بلکہ آج افریقہ، یورپ اور دیگر خطوں کو بھی روشنی فراہم کررہی ہیں، اس طرح انہوں نے علم حدیث کو خواص کی مجلسوں سے نکال کر عوام کی محفلوں تک پہنچادیا۔

12.4 کتب حدیث کے اردو ترجموں کا آغاز اور ابتدائی چند نمونے

اردو زبان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ عربی اور غالبا فارسی کے بعد اسلامی تعلیمات کا ذخیرہ سب سے زیادہ اسی زبان میں پایا جاتا ہے۔اردو میں ترجمہ کردہ کتابوں کے ابتدائی نمونوں میں مذہبی کتابیں بھی شامل ہیں، ایک اندازہ کے مطابق اسلامی کتابوں کے ترجمہ کا آغاز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن سے ہوتا ہے، شاہ عبدالقادر کا ترجمہ موضح القرآن 1205ھ میں مکمل ہوا۔

12.4.1 تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار

اردو زبان میں حدیث کا پہلا ترجمہ ''تحفۃ الاخیار'' ہے، یہ دراصل ہندوستان کے مایہ ناز محدث امام صغانی کی کتاب ''مشارق الأنوار'' کا اردو ترجمہ ہے، یہ ترجمہ 1249ھ مطابق 1933ء میں مکمل ہوا اور سنہ تالیف کے تین سال بعد مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس کے مترجم مولانا خرم علی بہوری (متوفی: 1271ھ-1854ء) ہیں، آپ خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے تربیت یافتہ تھے، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف سے خوب شغف رکھتے تھے، آپ نے فقہ حنفی کی ممتاز کتاب ''درمختار'' کو بھی اردو کا جامہ پہنانا چاہا تھا، مگر عمر نے وفا نہ کی اور یہ ترجمہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔

12.4.2 انوار محمدی ترجمہ شمائل ترمذی

اردو زبان میں حدیث کا دوسرا ترجمہ ''انوار محمدی'' ہے، جو امام ترمذی کی یگانہ روزگار کتاب شمائل ترمذی کا ترجمہ ہے، مولانا کرامت علی جون پوری (متوفی 1290ھ/1873ء) اس کے مترجم ہیں، یہ کتاب بھی مطبع محمدی لکھنؤ ہی سے 1252ھ/1836ء میں شائع ہوئی، مولانا کرامت علی نے مشکوۃ کی پہلی جلد کا بھی ترجمہ کیا تھا، مگر اب وہ دستیاب نہیں ہے۔

مذکورہ دونوں ترجموں کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ زبان سادہ اور سلیس ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ تقریباً دو صدی گذرنے کے باوجود ان کا اسلوب تحریر آج بھی قابل فہم اور آسان محسوس ہوتا ہے۔

12.4.3 مظاہر حق ترجمہ مشکوۃ المصابیح، ظفر جلیل ترجمہ حصن حصین

زمانی ترتیب کے لحاظ سے اردو زبان میں حدیث کا تیسرا ترجمہ ''مظاہر حق'' ہے، جو دراصل مشکوۃ کا ترجمہ ہے، مولانا نواب قطب الدین خان دہلوی (متوفی: 1289ھ) نے اسے انجام دیا تھا، واضح ہو کہ مشکوۃ کا ابتداء'' شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی (متوفی: 1262ھ) نے ترجمہ کیا تھا، بعد کو نواب قطب الدین نے معمولی تبدیلی کے ساتھ اسے ہی بہتر بنانے کی کوشش کی، اس بابت مولوی ابویحی امام خان نوشہروی لکھتے ہیں:

''کتب حدیث کا سب سے پہلا اردو ترجمہ یہی تحفۃ الاخیار ہے اس کے بعد نواب قطب الدین خان دہلوی نے مشکوۃ المصابیح کا اردو ترجمہ وشرح بنام مظاہر حق کیا، مظاہر حق اصلاً شاہ محمد اسحاق دہلوی کا تھا، نواب صاحب نے بادنی تغیر مہذب فرمایا اور اس کا اعتراف بھی کیا''۔

مولانا نواب قطب الدین دہلوی نے حدیث واذکار کی ایک اور کتاب ''حصن حصین'' کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے، جو ظفر جلیل کے نام سے موسوم ہے، حصن حصین قاضی القضاۃ محمد دمشقی (متوفی: 832ھ) کی مقبول عام تالیف ہے۔

12.4.4 جائزۃ الشعوذی ترجمہ سنن ترمذی

اردو زبان میں کتب حدیث کے ترجمے کی ایک اور اہم کوشش جائزۃ الشعوذی ہے، یہ حدیث کی معروف اور رائج کتاب سنن ترمذی کا اردو ترجمہ ہے، مولانا بدیع الزماں (متوفی: 1304ھ/ 1886ء) اس کے مترجم ہیں، آپ کو مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کی شاگردی کا شرف حاصل ہے، آبائی وطن کانپور تھا، پھر حیدرآباد میں سکونت اختیار کی اور آگے چل کر حجاز ہجرت کر گئے، نواب صدیق حسن خان کی علمی رفاقت بھی آپ کو حاصل رہی ہے، جائزۃ الشعوذی: سنن ترمذی کا پہلا اور مکمل اردو ترجمہ ہے، حجاز ہجرت کرنے کے بعد 1294ھ/ 1877ء میں اس ترجمہ کا آغاز کیا گیا تھا؛ البتہ یہ کب پائے تکمیل کو پہنچی اس بات کی کوئی صراحت نہیں مل پائی ہے۔

12.4.5 صحاح ستہ کے ترجمے

ترجمہ صحاح ستہ باستثنائے ترمذی: کتب حدیث کے ترجمے کی تحریک چل پڑی تھی، مختلف اہم کتابوں کے ترجمے طبع ہو کر منظر

عام پر آنے لگے تھے، مگر ضرورت اس بات کی تھی کہ صحیح حدیثوں کے سب سے بڑے ذخیرے کتب ستہ کے ترجمے کئے جائیں؛ تاکہ ان کا نفع عام ہو سکے اور الحاد و بے دینی کی بادسموم کا مقابلہ حدیث وسنت کی نسیم سحری سے کیا جائے؛ چنانچہ معروف صاحب علم مولانا وحید الزمان (1267ھ/1850ء - 1338ھ/1919ء) نے اس جانب توجہ کی؛ آپ کانپور میں پیدا ہوئے، بعد کو حیدرآباد میں سکونت اختیار کی، میاں نذر حسین محدث دہلوی سے سند و اجازت حدیث رکھتے تھے، مولانا نے کتب حدیث کے ترجمہ کو اوج کمال تک پہنچا دیا؛ چنانچہ صحاح ستہ (باستثناء ترمذی) اور موطأ امام مالک کے اردو میں ترجمے کئے، واضح ہو کہ سنن ترمذی کے مترجم آپ ہی کے برادر کلاں تھے، مولانا وحید الزمان نے یہ کارنامہ نواب صدیق حسن خان کے مشورے پر انجام دیا تھا۔

زمانی ترتیب کے لحاظ سے آپ کی ترجمہ کردہ کتابیں اس طرح ہیں:

1. كشف المغطا عن كتاب الموطأ - آغاز 1295ھ، اختتام 1296ھ
2. هدى المحمود ترجمة سنن أبي داود - آغاز 1296ھ، اختتام 1297ھ
3. روض الربی من ترجمة المجتبى (سنن نسائی) - آغاز 1297ھ، اختتام 1299ھ
4. المعلم ترجمہ صحیح مسلم - آغاز 1301ھ۔ اختتام 1305ھ
5. تسهيل القاری شرح بخاری - آغاز 1305ھ۔
6. رفع العجاجة ترجمہ ابن ماجة - آغاز 1305ھ۔ اختتام 1310ھ
7. تيسير البارى ترجمہ صحيح بخارى - آغاز 1321ھ۔ اختتام 1323ھ

مولانا کا اسلوب ترجمہ آسان اور عام فہم ہے، آپ نے ان کتابوں میں سے سند حذف کر دی ہے، جا بجا توضیحی حاشیے لکھے ہیں، یہ تمام ترجمے چھپ چکے ہیں اور بازار میں دستیاب بھی ہیں۔

ترجمہ نگاری کے اس سفر میں ایک اہم سنگ میل اس وقت آیا جب کہ ممتاز صاحب علم مولانا عبد الدائم جلالی نے کتب ستہ کے ترجمے کا آغاز کیا، آپ 1929ء تا 1934ء تک مدرسہ عالیہ رام پور میں عربی زبان و ادب کے مدرس رہے، آپ نے حدیث کی پانچ کتابوں کا ترجمہ کیا ہے، ترجمہ میں روانی اور سلاست بھرپور انداز میں پائی جاتی ہے، محاوروں کے استعمال پر خوب قدرت رکھتے ہیں، جس کا اندازہ ان کے اسلوب سے لگایا جا سکتا ہے، آپ نے سند اور متن کو حذف کر دیا ہے؛ البتہ آخری راوی کا ذکر کیا ہے، نیز نمبر اندازی کر دی ہے؛ تاکہ متن سے مقابلہ کی صورت میں سہولت ہو، ذیل میں آپ کے ترجموں کی بعض تفصیلات ذکر کی جا رہی ہیں:

	کتاب	جلدیں		صفحات
1.	صحيح بخاری	3/ جلدیں	صفحات	1840
2.	صحيح مسلم	2/جلدیں	//	992
3.	تجريد البخاری	1/جلد	//	392
4.	سنن ابن ماجة	2/جلدیں	//	720
5.	سنن أبو داؤد	2/جلدیں	//	1124

12.5 کتب احادیث کے دیگر ترجمے

علماء اور محققین نے اردو داں طبقے کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو زبان میں احادیث کے ترجمے کا کام بڑے پیانے پر انجام دیا ہے۔ کام اتنا وسیع ہے کہ ایک کتب خانہ درکار ہے، ان تمام کا ذکر یہاں ممکن نہیں ہے، صرف اہم اور معروف ترجموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

بخاری شریف: صحیح بخاری کا مرتبہ حدیث کی تمام کتابوں میں اول ہے۔ اس کے مقام اور مرتبے کے بارے میں تمام علماء متفق ہیں، اس کتاب پر اردو زبان میں بہت سے کام ہوئے ہیں۔ مولانا محمد عاصم اعظمی نے صحیح بخاری کے 27 ترجمے ذکر کیے ہیں، اردو زبان میں اس کا ایک ترجمہ مولانا عبدالحکیم شاہ اختر نے ''بخاری شریف'' کے نام سے کیا ہے۔ مولانا نے یہ ترجمہ بامحاورہ کیا ہے اور ساتھ ہی ترجمے میں مکمل سند ذکر کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ ترجمہ کو راوی یا تابعی سے شروع کرتے ہیں اور قرآنی آیات کا بھی مکمل حوالہ درج کرتے ہیں۔ قرآنی آیات کا ترجمہ بھی معتبر و مستند تفاسیر کے عین مطابق ہے۔ کہیں کہیں مصنف نے عربی عبارتوں کا ترجمہ اردو اشعار سے بھی کیا ہے، یہ ترجمہ 1981ء میں مکمل ہوا۔

تفہیم البخاری صحیح البخاری کا ایک اور ترجمہ ہے، جو دس جلدوں پر مشتمل ہے، مترجم مولانا ظہور الباری اعظمی ہیں، ترجمے کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ جہاں کہیں وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں حاشیے کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔

مشکوۃ المصابیح بھی کتب حدیث میں ایک منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہے۔ مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہاں پوری نے اس کتاب کا شگفتہ انداز میں بامحاورہ ترجمہ کیا ہے۔ بین القوسین معتبر کتب کی روشنی میں وضاحتی الفاظ بڑھا دئے ہیں۔ ایک اور ترجمہ مرزا حیرت علی دہلوی کا ہے، جو بامحاورہ اور جدید اردو کے اسلوب پر کیا گیا ہے۔ مشکوۃ ہی کا ایک اور ترجمہ محمد اسحٰق صدیقی نے کیا ہے، یہ ترجمہ بھی آسان اور عام فہم ہے۔ محی الدین ابوزکریا نووی کی تصنیف کردہ کتاب ''ریاض الصالحین'' کتب احادیث میں اپنا مقام رکھتی ہے، مصنف نے اس کتاب میں حدیث کی مشہور کتابوں سے احادیث کو جمع کیا ہے، مولانا احمد یار خان نعیمی اشرفی نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کتاب کے کئی ترجمے شائع ہوئے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ نے بھی اس کتاب کا ترجمہ ''زادسفر'' کے نام سے کیا ہے جو کہ دل کش اور عام فہم زبان میں ہے۔

شیخ فواد عبدالباقی نے صحیح بخاری و مسلم کی متفق علیہ احادیث کو اپنی کتاب ''اللؤلؤ والمرجان'' میں جمع کیا ہے، اس کتاب کو کتب حدیث میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس میں انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ احادیث کا متن، الفاظ اور راویوں کے اعتبار سے صحیح بخاری کی حدیث کے متن سے زیادہ مطابقت رکھتا ہو اور ابواب کی ترتیب صحیح مسلم کے مطابق رکھی گئی ہے۔ مولانا سید شبیر احمد صاحب نے اس کتاب کا عام فہم اور بامحاورہ ترجمہ کیا ہے۔

12.6 حدیث کے اردو مجموعے

جس طرح اردو زبان میں قرآن، علوم قرآن اور علم تفسیر پر گراں مایہ اور بیش قیمت سرمایہ موجود ہے، اسی طرح علماء نے علم

حدیث کے فن پر بھی اردو میں گراں یا کتابیں تصنیف کی ہیں اور اس فن کو بھی اردو زبان میں منتقل کرنے اور اردو داں طبقے تک اس کے فیض کو پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

12.6.1 ترجمان السنہ

مولانا بدر عالم میرٹھی نے 1977ء میں ترجمان السنۃ کے نام سے احادیث نبوی کا مجموعہ شائع کیا۔ کتاب کافی ضخیم ہے، ابتداء میں مولانا نے اصول حدیث، ائمہ محدثین اور فقہاء کرام کی مختصر سوانح بھی تحریر کی ہے، اس مجموعہ میں زیادہ تر انہوں نے صحاح ستہ سے استفادہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں توحید و رسالت، ایمانیات، اسلام، اسلام میں رسول کا تصور اور ارکان اسلام جیسے موضوعات پر احادیث نبویہ کی روشنی میں تفصیلی بحث کی ہے۔ ایک اور جلد میں قضاوقدر کے تئیں مشرکین وملحدین اور منکرین کے اشکالات کا تشفی بخش جواب دیا ہے۔ اسی طرح حقوق انسانی کا تحفظ کے تحت حلال وحرام قرآن کا اعجاز اور قرآن کو ساری دنیا کے لئے رہ نما بتاتے ہوئے پر مغز اور مدلل گفتگو کی ہے۔ چوتھی جلد میں صاحب کتاب نے معجزات انبیاء کی حقانیت، فتنہ دجال، اور امام مہدی کی آمد کے متعلق تقریباً تمام ہی احادیث کا حسین گل دستہ پیش کیا ہے۔

12.6.2 معارف الحدیث

معارف الحدیث کے نام سے مولانا منظور نعمانی نے احادیث کا مجموعہ تیار کیا ہے، یہ کتاب بھی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی احادیث کا خوب صورت اور حسین مجموعہ ہے۔

پہلی جلد میں ایمانیات اور آخرت سے متعلق احادیث ہیں، اس کے علاوہ اس میں کتاب الرقائق اور کتاب الاخلاق پر بھی خصوصی گفتگو شامل ہے، اس مجموعے میں مولانا نے معاشرتی زندگی میں پائے جانے والے بگاڑ اور مسائل سے بحث کی ہے اور احادیث کی روشنی میں ان کا آسان حل پیش کیا ہے، اس مجموعہ میں ایمانیات، زہد واخلاق، طہارت ونماز، زکوۃ، روزہ، حج، تلاوت قرآن، اذکار ودعاء اور توبہ واستغفار، قضاوعدالت وغیرہ سے متعلق احادیث موجود ہیں، انداز بیان دل کش اور موثر ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے مقدمے نے اس کتاب کی اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ مولانا منظور نعمانی کا اسلوب تحریر بہت آسان اور دلکش ہوا کرتا تھا، یہ کتاب اس کی زندہ مثال ہے۔

12.6.3 فضائل اعمال

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی شہرۂ آفاق کتاب فضائل اعمال بھی دراصل احادیث نبویہ کا مجموعہ ہے، پہلے اس کتاب کا نام ''تبلیغی نصاب'' تھا، اس کتاب میں ایمان، نماز، علم، زکوۃ، اکرام مسلم، اخلاص نیت، دعوت وتبلیغ، ذکر اور صدقات سے احادیث نبوی جمع کر دی گئی ہیں، عربی متن مع اعراب کے لکھا گیا ہے، ترجمہ آسان، رواں اور سلیس ہے، اس کتاب میں صحیح وحسن روایتوں کے پہلو بہ پہلو ضعیف وکمزور روایتیں بھی شامل ہیں، مزید برآں فوائد ہیں بعض قصص وواقعات اور کرامات کا بھی ذکر ہے۔ مؤلف کتاب کی زبان عام فہم اور آسان ہے۔

یہ کتاب چند رسائل کا مجموعہ ہے، جو حکایات صحابہ، فضائل نماز، فضائل تبلیغ، فضائل ذکر، فضائل رمضان، فضائل قرآن، فضائل درود کے نام سے علحدہ علحدہ شائع ہوئے تھے بعد میں ان کو یکجا کر دیا، اس کے دوسرے حصہ میں فضائل صدقات، اور فضائل حج کے نام سے دو ضخیم رسائل ہیں۔

12.6.4 جواہر الحکم

یہ مولانا بدر عالم میرٹھی کا انتخاب کردہ احادیث کا مجموعہ ہے، مولانا نے اس کتاب میں ایک خاص نقطہ نظر سے احادیث منتخب کر کے ترتیب اور سلیقے سے جمع کر دی ہیں۔ احادیث کے ساتھ ان کا ترجمہ اور مختصر تشریح بھی شامل ہے، احادیث کے انتخاب اور تشریح میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دینی اور دنیاوی کامیابی سنتِ نبوی پر چلنے ہی سے مل سکتی ہے۔

12.6.5 انوارِ محمدی

اس کتاب کے مؤلف مولانا کرامت علی جونپوری ہیں؛ لیکن اس کی اشاعت 1994 میں مولانا مجیب اللہ ندوی نے کی، یہ کتاب شمائل ترمذی کی شرح ہے؛ لیکن اندازِ تالیف کے اعتبار سے یہ خود ایک مستقل کتاب معلوم ہوتی ہے۔

12.6.6 ترجمان الحدیث

یہ کتاب مولانا سید محمود حسن کی ہے، اس میں مرتب نے دنیا کی حقیقت بمقابلہ آخرت، توحید و رسالت، اقامت دین، جہاد فی سبیل اللہ اور اسلامی سیاست جیسے اہم عناوین پر گفتگو کی ہے، ترتیب اور تبویب میں حسن اور زبان و اسلوب شگفتہ اور شیریں ہے، احادیث پر اعراب لگانے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ اور ترجمہ اور تشریح کا خلاصہ ''رشحات'' کے نام سے بیان کر دیا گیا ہے، کتاب کی دوسری جلد میں مصنف نے خانگی و معاشرتی مسائل کو خاص موضوع بنایا ہے، نکاح کی اہمیت، شوہر و بیوی کے باہمی تعلقات، حقوق اولاد اور اعزہ و اقارب اور یتیموں کے علاوہ سماج کے دوسرے افراد کے حقوق کی حفاظت وغیرہ جیسے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔

12.6.7 انتخاب مسلم

یہ مجموعہ مولانا محمد عبد الستار تقی حیدر آبادی کا مرتب کردہ ہے، یہ کتاب ایک مخطوطہ ہے، جامعہ نظامیہ حیدر آباد کی لائبریری میں موجود ہے، کتاب کے ابتدائی صفحات میں اصولِ حدیث سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اور یہ دراصل صحیح مسلم کی حدیثوں کا انتخاب ہے، مختلف ابواب دین سے متعلق روایتیں اس میں شامل کی گئی ہیں۔

12.6.8 اساس تہذیب (ماخوذاز: قرآن وحدیث)

اس کتاب کے مرتب مولانا سید عبد اللطیف حیدر آبادی ہیں، یہ 1952ء میں دی انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل اسٹیٹ کلچرل اسٹڈیز آغا پورہ حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے، اس کتاب میں قرآن وحدیث سے اخذ کیا ہوا وہ مواد پیش کیا گیا ہے جو مسلمانوں کی ثقافت کی تعمیر کے لئے ضروری ہے، کتاب چار حصوں میں منقسم ہے، ایمان باللہ، عمل صالح، وحدتِ انسانی اور مذہبی رواداری۔ اس کتاب میں صحاحِ ستہ کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں کی احادیث بھی شامل ہیں۔

☆ شرح مقدمہ عبدالحق　　از　　مولانا سعد مشتاق قاسمی

☆ خیر الاصول فی أحادیث الرسول ﷺ　　از　　مولانا خیر محمد جالندھری

☆ علم حدیث۔ تاریخ وتعارف　　از　　سید عبدالماجد غوری/سید احمد زکریا غوری

12.8 موضوعات حدیث پر اردو کتابیں اور عربی کتابوں کا ترجمہ

اردو زبان میں حدیث کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں تحریر کی گئی ہیں، اوراس طرح ایک بڑا وقیع علمی کتاب خانہ تیار ہوگیا ہے۔ چنانچہ حجیت حدیث، تاریخ وتدوین حدیث، محدثین کے حالات وخدمات، حدیث کی کتابوں کے تعارف اور خصوصیات وغیرہ پر بہت اہم کتابیں سپرد قلم کی گئی ہیں، اسی طرح موضوع اور من گھڑت روایتوں کے بعض مجموعے بھی تیار کئے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو ان کے شر سے آگاہ کیا جاسکے۔ ذیل میں اس سلسلہ کی چند اہم کتابوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

12.8.1 حدیث کا تعارف

اس کتاب کے مولف محمد فاروق خان ایم اے ہیں، یہ مکتبہ اسلامی دہلی سے پہلی بار ستمبر 1974ء میں شائع ہوئی، اس کتاب میں چھ ابواب ہیں اور ہر باب طویل ہے۔ شروع کے تین ابواب میں حدیث کی حجیت، اصول حدیث اور تدوین حدیث پر لکھا گیا ہے، حدیث کے اکثر مباحث کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب کا دوسرا باب جس میں اٹھائیس ان ائمہ محدثین کا تذکرہ ہے، جو کثیر التصانیف ہیں اور جن کی حدیث پر عظیم خدمات ہیں، ترتیب میں ائمہ اربعہ اور مؤلفین صحاح ستہ کا تذکرہ پہلے ہے۔ کتاب کی زبان شستہ سادہ اور رواں ہے۔

12.8.2 حدیث اور فہم حدحث

اس کتاب کے مصنف مولانا عبداللہ معروفی استاذ شعبہ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند ہیں، مصنف کی یہ کتاب اصل میں محاضرات کا مجموعہ ہے، جوانہوں نے طلبہ کو دیئے ہیں اوران میں علمی وتحقیقی رنگ نمایاں ہے، مصنف نے ان محاضرات میں علم حدیث کی تعریف وتقسیم، حجیت حدیث، تاریخ تدوین حدیث، ہندوستان میں علم حدیث اور درسی کتب حدیث کے تعارف وخصوصیات پر روشنی ڈالی ہے، نقد حدیث کا روایتی ودرایتی معیار، فقہی اختلاف میں حدیث کا کردار، ضعف حدیث کی استدلالی حیثیت پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، اخیر کے باب میں امام اعظم ابوحنیفہ اور علم حدیث کے عنوان سے بحث کی ہے اوران کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب طلبہ واساتذہ کے لئے بڑی مفید ہے۔

12.8.3 محدثین عظام اوران کی کتابوں کا تعارف

اس کتاب کے مصنف مولانا سلیم اللہ خان مہتم جامعہ فارقیہ کراچی ہیں، کتاب پاکستان سے شائع ہوئی ہے جو کہ 272 صفحات پر مشتمل ہے، مصنف نے کتب ستہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ) کے علاوہ

مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد اور طحاوی شریف جیسی حدیث کی ان نو اہم کتابوں اور ان کے مصنفین کے حالات کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب طلبہ اور عام اردو داں طبقہ کے لئے اہم ہے۔

12.8.4 سنت رسول

اس کتاب کے مصنف محترم ڈاکٹر شیخ مصطفیٰ حسن سباعی ہیں، اصل کتاب کا نام 'السنۃ ومکانتہا فی التشریع' ہے اور مترجم ملک غلام علی ہیں، یہ کتاب دہلی سے پہلی بار اگست 1983 کو شائع ہوئی، کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، مصنف نے اس کتاب میں سنت کا مفہوم اور حدیث کی روایت و کتابت کے سلسلہ میں روشنی ڈالی ہے، نیز صحابہ سنت رسول کو کیسے اخذ کرتے تھے اور حدیث کے بارے میں صحابہ کا موقف کیا تھا، پھر آخر کے ابواب میں سنت کی حفاظت کے تئیں محدثین کی عظیم خدمات کو بیان کیا گیا اور اسی طرح تدوین سنت و دیگر علوم حدیث کے تعارف پر گفتگو کی گئی ہے، آخر میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مقالہ سنت کی ضرورت کے عنوان سے شامل کیا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب مختصر اور مفید ہے۔

12.8.5 تذکرۃ المحدثین

یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے جو دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کو مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین نے مرتب کیا ہے، پہلی جلد میں دوسری صدی ہجری کے اوائل سے چوتھی صدی ہجری کے نصف اول تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے، مثلا پہلے امام مالک، امام ابوداؤد طیالسی، امام ابوبکر بن شیبہ، اسحٰق بن راہویہؒ، امام عبداللہ دارمیؒ، امام بخاری، امام مسلم، امام ابن ماجہ، امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام ابوجعفر طحاویؒ وغیرہ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طریقے سے دوسری جلد میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری تک مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی علمی وحدیثی خدمات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مثلا: امام ابوالقاسم طبرانی، امام ابن حبان، امام ابوالحسن دارقطنی امام ابوعبداللہ حاکم، امام ابوبکر خطیب بغدادی وغیرہ، تیسری جلد میں محدثین ہند کا تذکرہ ہے، اس لحاظ سے یہ تینوں جلدیں بڑی اہم ہیں خاص طور سے تیسری جلد میں ہندوستانی محدثین کرام کو نمایاں کیا گیا ہے۔

12.8.6 فن اسماء الرجال

اس اہم کتاب کے مصنف مولانا تقی الدین ندوی اعظمی ہیں، یہ کتاب عربی زبان میں اس موضوع پر لکھی گئی بہت سی کتابوں کا نچوڑ ہے حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں اس موضوع پر بہت کم کتابیں دستیاب ہیں، یہ کتاب کتب اسماء الرجال سے استفادے کے طریقے، مشہور کتب رجال پر تبصرہ وتعارف، تاریخ رجال، تدوین حدیث وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔

12.8.7 علم حدیث اور چند اہم محدثین

مولانا سالم قدوائی کی کتاب ہے، جس میں تدوین حدیث، اصول حدیث، اصطلاحات حدیث اور مشہور محدثین کا تذکرہ شامل ہے، کتاب کی زبان نہایت آسان ہے، یہ کتاب یونیورسٹی کے مسلم طلباء کے نصاب کے لئے لکھی گئی تھی، اس لئے اس میں فنی بحثوں اور ائمہ کے اقوال کو بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔

12.8.8 علم حدیث میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ

برصغیر ہند و پاک کے علماء کو ابتداء ہی سے حدیث کی خدمت اور نشر و اشاعت سے بہت شغف رہا ہے، اور ان کے علمی کارناموں کے بغیر کتب خانہ حدیث ناقص شمار ہوگا، چنانچہ ڈاکٹر محمد اسحٰق نے اس موضوع پر قلم اٹھایا، اور نہایت عمدہ کتاب قلم بند کی۔ برصغیر میں علم حدیث کے آغاز، ارتقاء، حدیث کے مراکز اور شخصیات کا فاضلانہ جائزہ لیا ہے، شاید یہ کتاب اپنے موضوع پر نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے، تقریباً 300 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مرکزی مکتبہ اسلامی سے شائع ہوئی ہے۔

12.8.9 فتنہ وضع احادیث اور موضوع احادیث کی پہچان

مولانا مسعود عالم قاسمی کی تصنیف ہے، اس کتاب میں فتنۂ وضع احادیث کی تاریخ اور اس کے پس پردہ مقاصد کو حقائق کی روشنی میں لکھا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انکار حدیث کے فتنہ کا اس میں اہم کردار رہا ہے۔ اردو زبان میں اپنے موضوع پر یہ بہت نفیس اور عمدہ کتاب شمار کی جاتی ہے۔

12.8.10 احادیث صحیح بخاری و مسلم کو مذہبی داستانیں بنانے کی ناکام کوشش

حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی کی کتاب مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت نے فتنۂ انکار حدیث کو ہوا دینے میں بڑا کردار ادا کیا ہے، اس کتاب میں موضوع روایات کے ساتھ ساتھ بخاری اور مسلم کی احادیث پر بھی ہاتھ رکھا گیا ہے، چنانچہ مولانا ارشاد الحق اثری نے حبیب الرحمٰن صدیقی کی علمی خیانت کو واضح کرتے ہوئے بخاری و مسلم کے دفاع میں خوب علمی مواد جمع کر دیا ہے۔

12.8.11 عمدۃ الأقاویل فی تحقیق الأباطیل (غیر معتبر احادیث کی تحقیق)

موضوع روایات نے مسلم معاشرہ میں عقیدہ اور فکر و نظر کا بگاڑ پیدا کر دیا ہے، ایسی روایتوں کی شناخت اور ان پر وضع کا حکم لگانا محدثین اور علماء اسلام کی بنیادی ذمہ داری ہے، زیر نظر تالیف اسی موضوع پر ہے، مولانا محمد رضوان الدین معروفی قاسمی اس کے مولف ہیں، 101 روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، امام سخاوی، ملاعلی قاری، اور ابن الجوزی کی کتابوں سے زیادہ تر استفادہ کیا گیا ہے۔ ان روایتوں کے انتخاب میں کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ آغاز میں ایک جامع مقدمہ سپرد قلم کیا ہے، جس میں موضوع روایت کی شناخت، اس کی علامتیں اور واضعین حدیث سے متعلق تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔

12.8.12 ضعیف وموضوع روایات

اس کے مولف مولانا عبدالسلام رحمانی ہیں، آپ نے ضعیف وموضوع روایت کوایک ساتھ ذکر کر دیا ہے، جب کہ محدثین بہر حال ان دونوں میں فرق برتتے ہیں ، روایتوں کے انتخاب میں کوئی خاص ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے ۔ کتاب کی ترتیب میں معاصر عالم دین شیخ البانی کی تحقیق پر زیادہ تر انحصار کیا گیا ہے۔ اس کتابچہ میں بہت زیادہ رائج روایتوں پر کلام موجود ہے۔

12.8.13 دراسات فی الاحادیث النبویہ

یہ کتاب دراصل ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی کا تحقیقی مقالہ ہے، اس مقالے پر ان کو یورپ کی ایک مشہور یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی ، اس کتاب میں محقق نے تدوین حدیث کی تاریخ دلائل کے ساتھ پیش کی ہے ، مقالہ نگار نے مستشرقین مثلا شاخت اور گولڈز یہر وغیرہ کے تمام اعتراضات کا مدلل جواب تاریخی شواہد کے ساتھ دیا ہے، مصنف نے مستند تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ ہر زمانے میں حدیثوں کے مجموعے موجود رہے ہیں، ہر محدث اپنے شاگردوں کو درس دیتا تھا اور حدیثوں کا املا کراتا تھا، اس کے علاوہ دوسرے ضمنی مباحث بھی ذیل میں آگئے ہیں، اس کتاب میں مصنف نے تحقیق و بحث کا پورا حق ادا کر دیا ہے، نیز اس تحقیقی کتاب پر مصنف کو شاہ فیصل ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

12.8.14 تاریخ علوم احادیث

معروف فقیہ ومحدث مولانا محمد عمیم الاحسان مجددی برکتی (1329ھ-1394ھ) اس کتاب کے مؤلف ہیں۔ اپنے موضوع پر یہ نہایت جامع اور مفید کتاب ہے، تدوین حدیث، کتب حدیث، مشہور محدثین اور علوم حدیث کی دیگر شاخوں سے متعلق بنیادی اور اہم معلومات اختصار کے ساتھ اس میں جمع کر دی گئی ہیں، زبان شستہ ہے، یہ کتاب نایاب سی ہوتی جارہی تھی ، مگر دار العلوم ندوۃ العلماء کے مؤقر استاذِ حدیث مولانا ابوسحبان روح القدس نے تحقیق وتعلیق کے بعد اسے از سر نو شائع کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس تحقیق نے کتاب کی قیمت اور علمی وزن میں اضافہ کیا ہے۔ 202 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مؤسسۃ القدس لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

12.8.15 تاریخ تدوین حدیث

معروف محدث علامہ عبدالرشید نعمانی (1334ھ-1420ھ) کی یہ تالیف ہے، مؤلف نے مختلف انداز میں حجیت حدیث پر گفتگو کی ہے، نیز عہد نبوی اور عہد صحابہ وتابعین کے حدیثی نوشتوں کی روشنی میں تدوینِ حدیث کے مختلف مرحلوں پر گفتگو کی ہے ۔ صحاح ستہ اور دیگر حدیث کی کتابوں کا تعارف بڑے عالمانہ اندز میں کیا ہے، نیز امام ابوحنیفہ اور علم حدیث پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، بلاشبہ یہ کتاب طلبہٗ حدیث کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

12.8.16 تاریخ حدیث ومحدثین

ڈاکٹر محمد ابوزھو جامعہ ازہر کلیہ اصول الدین قاہرہ کی کتاب ہے، اس کتاب میں حدیث ومحدثین کی تاریخ کوادوار کے تحت ازابتداء تاعصر حاضر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، نیز خواتین کا خدمات حدیث میں جو حصہ ہے اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس لحاظ سے تاریخ حدیث کے سلسلے میں یہ ایک مفصل اور مفید کتاب ہے، اس کتاب کے مترجم پروفیسر غلام احمد حریری ہیں۔

12.8.17 علوم الحدیث

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر صبحی صالح ہیں، مصنف نے حدیث کی تاریخ، تدوین حدیث، حدیث وسنت کی اصطلاحات اور ان کے باہم فرق کو سمجھایا ہے، نیز علوم حدیث کی دیگر شاخوں کا تعارف بھی پیش کیا ہے، اسی طرح اخذ حدیث کے مختلف طریقوں پر بھی روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب علوم الحدیث کے موضوع پر عمدہ اور مفید ہے، اس کتاب کے مترجم پروفیسر غلام احمد حریری ہیں۔

12.8.18 حسنات الاخبار

کتاب کے مصنف قاضی عبدالصمد سیوہاروی ہیں، یہ کتاب تین سوصفحات اور چار ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب طویل اور کئی مباحث کا مجموعہ ہے، کتاب کے ابتداء کے تین ابواب اصول حدیث سے متعلق ہیں، ان ابواب میں حدیث کی تاریخ، تدوین، اقسام حدیث باعتبار سند ومتن، طبقات کتب حدیث باقسام صحت وضعف، فن اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے اصول، حدیث کی صحت کا معیار، وجوہ ترجیح جیسے اہم موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اس باب میں محدثین صحابہ وصحابیات، تابعین وتبع تابعین، ائمہ اربعہ بشمول صحاح ستہ کے مصنفین کی سوانح حیات اور حدیثی خدمات کا بہتر انداز میں ذکر ہے۔

مؤلف نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے تفقہ فی الحدیث پر خوب لکھا ہے اور آپ کے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ان کا بھی جواب دیا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ اس کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ہماری زبان میں ایک ایسی تصنیف کی ضرورت تھی جو تدوین حدیث وفنون پر مشتمل ہو، مصنف نے یہ کتاب لکھ کر اس ضرورت کو پورا کیا۔

12.8.19 حجیت حدیث

یہ کتاب مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی ہے، اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے، متحدہ ہندوستان میں ایک فرقہ حدیث کی حجیت سے انکار کر بیٹھا تھا، ان حضرات کا کہنا تھا کہ اصل صرف قرآن ہے اور وہی اسلام کا دستور ہے، یہ کتاب ان ہی لوگوں کے شبہات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، اس میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ اسلام کی چار حجتوں میں سے ایک حجت حدیث بھی ہے اور یہ حجت قطعی ہے، یہ ایک عالمانہ اور محققانہ کتاب ہے، منکرین حدیث کے شبہات کی تردید خالص علمی انداز میں کی گئی ہے، اور احادیث کے حجت ہونے پر خود قرآن کریم سے متعدد حجتیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔

12.8.20 حجیت حدیث

یہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے انگریزی مقالے The Authority of Sunnath کا اردو ترجمہ ہے، اس مقالے کو انگریزی سے اردو میں مولانا مسعود اشرف عثمانی نے منتقل کیا ہے، یہ کتاب سنت رسول ﷺ کے تعارف، حجیت اور حدیث کی استنادی حیثیت پر جامع اور اصولی انداز میں بحث کرتی ہے، دلائل کا التزام خصوصی طور پر کیا گیا ہے اور اسلوب بے حد آسان اور زبان سلیس ورواں ہے، یہ کتاب عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔

12.8.21 کتابتِ حدیث

مصنف مولانا منت اللہ رحمانیؒ ہیں، کتاب کا اصل موضوع تدوین حدیث ہے، اس سے پہلے اس موضوع پر اردو زبان میں کم کتابیں ہی دستیاب تھیں، مصنف نے اس میں دلائل وشواہد کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ تدوین حدیث کی ابتداء اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں ہی ہو چکی تھی، نیز حدیث کی حفاظت کے قدرتی اسباب اور محدثین کی جلیل القدر خدمات جیسے اہم موضوعات پر عمدہ اور عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

12.8.22 سنت کی آئینی حیثیت

اس کے مصنف مولانا سید ابوالاعلی مودودی ہیں، یہ کتاب دراصل ایک منکر حدیث کے اعتراضات کا جواب ہے، جو مراسلت کی شکل میں ہے، مولانا مودودی نے نہایت علمی وعقلی اسلوب میں ان شبہات کا جواب دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ حجیت حدیث پر لکھی گئی تحریروں میں اس کی حیثیت بہت ممتاز ہے اور خاص طور پر مستشرقین کی ریشہ دوانیوں پر خوب عمدہ بحث کی گئی ہے۔

12.8.23 حجیت حدیث

اس کتاب کے مؤلف ڈاکٹر شیخ عبدالغنی محمد عبدالخالق ہیں، آپ جامعۃ الازہر کے مایہ ناز فاضل ہیں، زیرنظر کتاب دراصل آپ کا پی ایچ ڈی کا علمی وتحقیقی مقالہ ہے، جو 1940ء میں پیش کیا گیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ حجیت حدیث پر اس پائے کی شاید ہی کوئی کتاب ہو، یہ عربی زبان کا مقالہ تھا، مگر ادارہ تحقیقات اسلامی نے مولانا محمد رضی الاسلام ندوی کے ذریعہ اسے اردو کا جامہ عطا کیا، واضح رہے کہ کتاب میں مختلف اسلوب میں صرف حدیث کی حجیت اور تشریعی حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے، حدیث کے مبنی بروحی ہونے یا نہ ہونے پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے، 869 صفحات پر مشتمل یہ کتاب عوام سے زیادہ اہل علم کے لئے مفید نظر آتی ہے۔

12.8.24 تدوین حدیث

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی یہ تالیف ہے، کم وبیش پانچ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب تدوین حدیث اور تاریخ وحجیت پر نہایت اہم شمار کی جاتی ہے، مؤلف نے کتاب کے آغاز میں بعض اہم مسائل پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے، جیسا کہ عام تاریخی ذخیرہ سے حدیث کے امتیازات اور تدوین حدیث کے قدرتی عوامل وغیرہ۔ مولانا گیلانی نے حضرت علیؓ کے دور تک کے تحریری سرمایہ اور تدوین وتاریخ سے متعلق بیشتر معلومات جمع کر دی ہیں، خلافت علی کے بعد کا ذکر اس کتاب میں شامل نہیں ہے۔ مؤلف کا اسلوب عالمانہ بھی ہے اور ادیبانہ بھی۔

12.9 خلاصہ

ہندوستان کی سرزمین علوم اور فنون کے اعتبار سے ہر دور اور ہر زمانے میں زرخیز رہی ہے، فجر اسلام ہی سے یہ علماء، صوفیاء، اولیاء کا مرکز رہی، تاریخ گواہی دیتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ہی مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں آچکے تھے، اس سرزمین نے شیخ محدث صغانی صاحب مشارق الأنوار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ علی متقی، شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے جلیل القدر اور علم حدیث کے روشن اور تابناک ستارے پیدا کیے، ان علماء اور محدثین نے عربی، اردو اور فارسی زبانوں میں تصنیفات لکھیں، اردو زبان کا دامن بھی اس سلسلہ میں کافی لبریز رہا ہے، اردو زبان میں حدیث کی بیشتر کتابوں کی منتقلی کا کام ہوا، حدیث کی کتابوں کی شرحیں لکھی گئیں، شاگردوں نے اپنے شیوخ کے درسی افادات کو جمع کیا اور طبع کروایا، حدیثوں کا انتخاب کر کے ان کے مجموعے عوام الناس کے فائدے کے لئے طبع کرائے گئے، یہاں تک کہ اصول حدیث جو صرف خواص تک محدود تھا اس کو بھی آسان اور سلیس زبان میں اُردو میں منتقل کیا گیا۔

12.10 نمونے کے امتحانی سوالات

1. ہندوستان میں علم حدیث کے آغاز پر روشنی ڈالئے۔
2. کتب حدیث کے اردو ترجموں کا آغاز کب ہوا، نیز ایک ابتدائی نمونے کا تعارف تحریر کیجئے۔
3. مولانا وحید الزمان کا تعارف کراتے ہوئے ان کی ترجمہ کردہ کتابوں کے نام ذکر کیجئے۔
4. حدیث کے اردو مجموعوں میں سے کسی دو کا تعارف قلم بند کیجئے۔
5. اصول حدیث پر اردو میں لکھی گئی کسی دو کتاب کا تعارف تحریر کیجئے۔
6. موضوع روایت پر اردو میں تصنیف کی گئی کسی دو کتاب پر روشنی ڈالئے۔

12.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تذکرۃ المحدثین جلد سوم — از — مولانا ضیاء الدین اصلاحی
2. علم حدیث میں برصغیر پاک و ہند کا حصہ — از — ڈاکٹر محمد اسحاق
3. تطور علم الحدیث فی الہند (1274ھ-1384ھ) — از — ڈاکٹر خالدہ ریحانہ
4. اردو زبان میں علوم اسلامی کا سرمایہ — از — ترتیب المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

بلاک:3 فقہ اسلامی

فہرست

اکائی 13 : تعارف اور مآخذ

اکائی کے اجزاء

13.1 مقصد

13.2 تمہید

13.3 لغوی تعریف

13.4 اصطلاحی تعریف

13.5 فقہ کی ضرورت واہمیت

13.6 فقہ کے مصادر

13.6.1 بنیادی مصادر

13.6.1.1 قرآن کریم

13.6.1.2 سنت رسول اللہ ﷺ

13.6.1.3 اجماع

13.6.1.4 قیاس

13.6.2 ثانوی مصادر

13.6.2.1 استحسان

13.6.2.2 مصالح مرسلہ

13.6.2.3 عرف وعادت

13.6.2.4 استصحاب

13.6.2.5 سابقہ شریعت

13.6.2.6 قول صحابی

13.6.2.7 سدذرائع

13.6.2.1 استحسان

لغت میں استحسان کے معنی کسی چیز کو اچھا سمجھنے، اس کی طرف مائل ہونے اور اس کے چاہنے کے ہیں، اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ قرآن، سنت یا اجماع کی کسی قوی دلیل کی بنیاد پر قیاس کو چھوڑ دینا۔

استحسانی مسائل سب سے زیادہ حنفی کتب فقہ میں ہیں، اور وہ سب عام طور پر اسی نوعیت کے ہیں کہ ان کے ذریعہ کسی مشکل و دشواری کو دفع کیا گیا ہے، مثلاً کنویں میں اگر نجاست گر جائے تو شریعت نے پاکی کا جو عام اصول بتلایا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ محض پانی نکال دینا کنویں کی پاکی کے لئے کافی نہ ہو؛ بلکہ کنویں کی دیواریں اور نیچے کی سطح بھی پانی سے دھودی جائے؛ لیکن کنویں کی تطہیر کے مسئلہ میں اس عام اصول سے بڑی دشواری کا سامنا ہوتا؛ اسی لئے اس دشواری سے بچانے کے لئے استحساناً پانی نکال دینے کو کافی قرار دیا گیا۔

حجیت استحسان کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، حنفیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک حجت ہے، امام شافعی اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک حجت نہیں ہے، یہی ظاہر یہ، معتزلہ اور علماء شیعہ کا مذہب ہے؛ لیکن محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ اختلاف لفظی ہے حقیقی نہیں؛ کیوں کہ امام شافعیؒ وغیرہ نے جس استحسان کی حجیت کا انکار کیا ہے اس سے مراد وہ استحسان ہے جس کی بنیاد محض عقل ورائے، ہوس پرستی اور خواہش نفس ہو، جس کے پیچھے کوئی شرعی دلیل نہ ہو، اور حنفیہ وغیرہ اس طرح کے استحسان کے قائل نہیں ہیں، استحسان کی حجیت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُم﴾[زمر:55]

(تمہارے رب کی طرف سے جو احکام تمہاری طرف نازل کئے گئے ہیں ان میں سے سب سے بہترین احکام کی پیروی کرو)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''جس چیز کو مسلمان اچھا خیال کریں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے''۔ [مسند احمد حدیث نمبر:3600، تحقیق احمد محمد شاکر]۔

13.6.2.2 مصالح مرسلہ

لغوی اعتبار سے مصلحت ''نفع حاصل کرنے اور نقصان دور کرنے'' کو کہتے ہیں، یہ مصلحتیں تین قسم کی ہیں:

1. مصالح معتبرہ: یعنی وہ مصلحتیں جنہیں شریعت نے معتبر سمجھا ہے، مثلاً جان، مال، دین، عقل اور نسل کی حفاظت سے متعلق سارے احکام، جیسے دین کی حفاظت کے لئے جہاد، جان کی حفاظت کے لئے قصاص، عقل کی حفاظت کے لئے شراب نوشی کی حد، نسل کی حفاظت کے لئے حد زنا وقذف اور مال کی حفاظت کے لئے چوری کی حد۔
2. مصالح ملغاۃ: یعنی وہ مصلحتیں جنہیں شریعت نے لغو قرار دیا ہے، جیسے: حق وراثت میں مرد وعورت کے درمیان مساوات۔
3. مصالح مرسلہ: یعنی ایسی مصلحتیں جن کے متعلق شریعت نے نہ معتبر ہونے کی وضاحت کی ہو اور نہ ہی انہیں لغو کہا ہو، اس میں وہ تمام مصلحتیں آئیں گی جن کی شریعت نے نہ ترغیب دی ہو اور نہ ہی انہیں برا سمجھا ہو، اور یہ کسی بھی زمانہ میں پیش

آسکتی ہیں، جیسے: جمع وتدوین قرآن کی مصلحت، جمعہ کے دن مزید ایک اذان کا اضافہ، جیلوں کی تعمیر اور خلافت فاروقی میں تقسیم وظائف وغیرہ کی مصلحت۔

عبادت میں مصالح مرسلہ کا اعتبار نہیں ہے، اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے، کیوں کہ عبادت امور تعبدی وتوقیفی میں سے ایک ہے، جن میں رائے واجتہاد کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی ہے، البتہ معاملات کے باب میں مصالح مرسلہ کی حجیت کے بارے میں اختلاف ہے؛ تاہم جمہور مالکیہ اور حنابلہ اسے حجیت تسلیم کرتے ہیں، حنفیہ مصالح مرسلہ کو استحسان کے راستے سے قبول کرتے ہیں، یہی جمہور فقہاء کا مذہب ہے۔

13.6.2.3 عرف وعادت

لغت میں عرف کا اطلاق مختلف معنوں پر ہوتا ہے، مانوس، مستحسن، معیاری چیز، اعتراف، صبر اور تسلسل، اصطلاحی تعریف اس کی یہ ہے: لوگوں کا قول یا فعل جو کہ ان کے درمیان مانوس، متعارف ہو اور ان میں اس کا رواج ہو، عرف کو عادت کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

عرف اپنی وضع کے اعتبار سے کبھی قولی ہوتا ہے اور کبھی عملی، اور اپنی وسعت ودائرہ کے اعتبار سے کبھی عام ہوتا ہے اور کبھی خاص اور شرعی نقطۂ نظر کے اعتبار سے کبھی عرف صحیح ہوتا ہے اور کبھی فاسد۔

عرف قولی کی مثال لفظ ''ولد'' ہے جسے عرف میں مذکر اولاد پر بولا جاتا ہے مؤنث پر نہیں، گو لغت میں نر و مادہ دونوں طرح کی اولاد پر اطلاق ہوتا ہے، عرف عملی کی مثال عام لوگوں کے لئے بنائے گئے غسل خانوں میں داخل ہونا ہے، جس میں ٹھہرنے کی مدت متعین نہیں ہوتی اور نہ ہی پانی کے استعمال کی مقدار کی تعیین ہوتی ہے۔

عرف عام وہ قول یا فعل ہوتا ہے جو کہ دنیا کہ تمام شہروں میں یا اکثر شہروں میں لوگوں کے درمیان رواج پذیر ہو، جیسے استصناع (سامان بنانے کا آرڈر دینا)، عرف خاص لوگوں کا وہ قول یا فعل ہے جو کسی خاص ملک یا شہر یا طبقہ میں رائج ہو، جیسے تاجروں کے درمیان کسی عیب کا قابل فسخ یا مبیع کے واپس کرنے کا حق رائج ہو جائے۔

عرف خواہ قولی یا عملی، عام ہو یا خاص، معتبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ نص کے خلاف نہ ہو، اکثر مقامات پر مروج ہو اور لوگوں کی اکثریت اس سے واقف ہو، جس مسئلہ میں عرف کو حجت بنایا جارہا ہو، ضروری ہے کہ عرف اس مسئلہ سے پہلے موجود ہو اور معاملہ کے فریقین نے عرف کے خلاف صراحت نہ کر دی ہو۔

عرف کی حجیت پر متعدد آیات واحادیث سے استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

﴿وَمَن كَانَ فَقِيراً فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ {نساء:6}

(یتیم کے ولی کے لئے رخصت دی گئی ہے کہ اگر وہ فقیر ہو تو معروف طریقہ سے کھا سکتا ہے)۔

یہاں معروف کا معنی عرف ورواج ہی ہے، اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ہند رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بخل کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

شرکت	شمولیت، شراکت، دو یا اس سے زیادہ لوگوں کا پارٹنرشپ کے ساتھ کاروبار کرنا
اجارہ	اس معاملہ کو کہا جاتا ہے جس میں ایک فریق کی طرف سے منفعت کی پیش کش ہو اور دوسرے کی طرف سے معاوضہ کے طور پر اجرت کی۔
استنباط	استخراج کرنا، نتیجہ نکالنا
مستنبط کرنا	نتیجہ نکالنا
تواتر	لگاتار
دوام	پائیدار رہنا، ہمیشہ رہنا
ضمناً	کسی کے ضمن و تابع
مصالح، مصلحت کی جمع	مفادات، فائدے
متفق	سب کا اتفاق
سکوتی	خاموشی کے ساتھ
علت	وجہ
قیاس	برابر کرنا، اندازہ کرنا
تطہیر	پاک کرنا
بیوع، بیع کی جمع	خرید وفروخت
تعبدی	عبادت سمجھنا
توقیفی	اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا
استمرار	ہمیشہ رہنا
مغیر	بدلنے والا
متعارض	باہم ایک دوسرے سے ٹکرانے والا

13.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. فقہ اسلامی۔ تدوین و تعارف — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
2. قاموس الفقہ — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
3. فقہ اسلامی۔ تعارف اور تاریخ — پروفیسر اختر الواسع۔ ڈاکٹر فہیم اختر ندوی
4. برصغیر میں علم فقہ — محمد اسحاق بھٹی
5. فقہ اسلامی، اصول، خدمات اور تقاضے — ترتیب: مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اکائی 14 : تاریخ وتدوین فقہ

اکائی کے اجزاء

14.1 مقصد

14.2 تمہید

14.3 آغاز وارتقا

14.4 عہد نبوی میں فقہ

14.5 پہلی صدی ہجری میں فقہ

14.6 فقہاء صحابہ وتابعین

14.7 فقہ کے مراکز

14.7.1 مدینہ منورہ

14.7.2 مکہ مکرمہ

14.7.3 کوفہ

14.7.4 بصرہ

14.7.5 شام

14.7.6 مصر

14.7.7 یمن

14.8 دور وسطی کے مجتہدین وفقہاء

14.9 دور جدید میں فقہ اسلامی کے ماہرین

14.10 خلاصہ

14.11 نمونے کے امتحانی سوالات

14.12 فرہنگ

14.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

14.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ سے طلبہ یہ جان سکیں گے کہ فقہ اسلامی کا آغاز اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا کس طرح ہوا؟ عہد رسالت اور صحابہ کرامؓ کے دور میں فقہ اسلامی کی صورت حال کیا تھی؟ صحابہ کرامؓ کے بعد دور تابعین اور مجتہدین کے زمانے میں جب کہ زندگی کے بے شمار نئے نئے مسائل سیلاب کی طرح رونما ہونے لگے تھے، عجمی تہذیب کا عربی تہذیب سے اختلاط اسلام کے لئے ایک نیا چیلنج تھا، ایسے وقت میں یہ حضرات کس طرح شرعی حل کا استنباط کر کے لوگوں کی رہنمائی فرماتے تھے؟ نیز طلبہ اس اکائی کو پڑھ کر اس بات سے بھی آگاہ ہو جائیں گے کہ اس وقت فقہی مراکز کہاں اور کس حال میں تھے، دور وسطی کے مجتہدین وفقہاء اور دور جدید میں فقہ اسلامی کے ماہرین کون لوگ ہیں؟ اور ان کے کیا کارہائے نمایاں ہیں؟

14.2 تمہید

اس اکائی میں بتایا جائے گا کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں فقہ کا مفہوم کیا تھا، پھر اس میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں، بالآخر یہ لفظ شریعت کے ایک خاص باب کے لئے مختص ہو گیا، آپ ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کے دور میں نئے مسائل حل کرنے کے کیا طریقے تھے، ان حضرات کا اجتہاد اور استنباط مسائل کے سلسلہ میں کیا منہج تھا؟ ان کے بعد دور تابعین اور عہد مجتہدین میں کیا نئے فقہی رجحانات پیدا ہوئے، اور یہ کہ بڑے بڑے شہروں میں فقہی مراکز قائم ہوئے، مجتہدین کے دور میں فقہی مسالک کی تشکیل عمل میں آئی، فقہ کے موضوع پر عمومی انداز کی اور خصوصی مسلکی رنگ میں نئی نئی کتابیں تصنیف ہوئیں، تقلید کا دور شروع ہوا اور ہر فقہی منہج کے حامل فقہاء نے اپنے اپنے مسلک کی تائید میں کتابیں تالیف کیں، ان سب پر اس اکائی میں روشنی ڈالی جائے گی، نیز یہ بھی بتایا جائے گا کہ دور وسطی اور دور جدید میں فقہی خدمات کس طرح انجام دی گئیں، اور فقہ مقارن کا رجحان اس دور میں کیسے ہوا؟ اور اس موضوع پر کون سی کتابیں لکھی گئیں، اس کے اسباب ومحرکات کیا تھے؟ نیز ان دونوں ادوار میں جن فقہاء کا نمایاں کردار رہے، ان کا بھی ذکر آئے گا۔

14.3 آغاز وارتقا

فقہ اسلامی کا آغاز عہد رسالت سے ہوتا ہے، آپ ﷺ کی رسالت کا دور 23 سال پر مشتمل ہے، یہی دور آنے والے تمام ادوار کی اساس وبنیاد ہے، حقیقت میں آگے پیش آنے والے فقہ کے تمام تر ادوار اسی دور کی توسیع اور عمارت سازی ہیں۔

فقہ اسلامی کا آغاز نزول وحی سے ہوتا ہے، اور وفات نبوی تک پوری شریعت مکمل ہو جاتی ہے، قرآن کریم وفات نبوی سے چند مہینے پہلے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ دین مکمل ہو چکا ہے: ﴿ اَلْیَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِینَكُمْ ﴾ [المائدہ: 3] اور رسول اللہ ﷺ نے بھی وفات سے تھوڑی دیر پہلے پوری انسانیت کے لئے مکمل دستور حیات اور ہدایت نامہ قرآن وحدیث کو بتایا، چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ: میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں، تم جب تک ان دونوں کو تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت۔ [موطا مالک، حدیث نمبر : 1594]

یہ بات معلوم ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم فتوی نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ ان میں ایک مخصوص جماعت تھی جو کارفتوی انجام دیتی تھی، جو قرآن کو اچھی طرح پڑھنا جانتی تھی اور علوم قرآن سے خوب آگاہ تھی، ایسے لوگوں کو قراء کہا جاتا تھا، جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا، عرب سے نکل کر عجم تک پہنچا، اسی طرح مملکت اسلامیہ کی وسعت بھی بڑھتی گئی، قرآن کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بھی اسی تناسب سے ہوتا گیا، اس کے ماہرین پیدا ہونے لگے، اور نئے مسائل کے استنباط کا ملکہ فروغ پانے لگا، یہاں تک کہ فقہ نے ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی، اور ''قراء'' کا لفظ ''فقہاء'' سے بدل گیا۔

ابتدا میں فقہ کے دوطریقے رائج ہوئے، ایک طریقہ اختیار کرنے والوں کو اہل ارائے کہا جاتا تھا، یہ اہل عراق تھے، دوسرے طریقہ کے ماننے والوں کو اہل حدیث سے یاد کیا جاتا تھا، یہ اہل حجاز تھے۔

اہل عراق کے طریقۂ فقہ کے امام وپیشوا امام ابوحنیفہؒ تھے، اور اہل حجاز کے طریقہ فقہ کے سرخیل امام مالک بن انسؒ تھے، اس کے بعد امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کی شخصیتیں آتی ہیں، دونوں طریقوں پر فقہ کو سب سے پہلے امام محمدؒ نے جمع کیا، اس کے بعد ان کے تلمیذ رشید امام شافعیؒ نے اس جامع طریقہ کو مزید آگے بڑھایا اور فروغ دیا، اس کے بعد امام شافعیؒ کے جلیل القدر شاگرد امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے شاگردوں نے اس امتزاج کو حاصل کیا اور اس کو مزید وسعت و ترقی دی۔

تیسری صدی ہجری میں ہی علماء کا ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے سرے [illegible] کا انکار کیا، اور قرآن وحدیث کے ظاہر پر عمل کرنے کو ترجیح دی، یہ لوگ ''ظاہریہ'' کہلائے، اس مذہب کے بانی امام داؤد بن علی (متوفی: 270ھ) تھے، ان کے بعد اس مذہب کو امام ابن حزم اندلسی (متوفی 456ھ) نے اختیار کیا اور اس کو بڑی تقویت پہونچائی، گو کثرت سے تفرد اختیار کرنے کی وجہ سے وہ لوگوں کے درمیان معتوب بھی ہوئے۔

عہد صحابہ میں ہی بڑے بڑے شہروں میں فقہ کے بڑے بڑے مراکز قائم ہو چکے تھے، مؤرخین نے لکھا ہے کہ دور خلافت راشدہ میں مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر اور یمن سات فقہی مراکز تھے، تمام مراکز پر صحابہ کارفتوی اور استنباط مسائل کے ذریعہ لوگوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے، ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اس منصب کو سنبھالا، یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں تابعین، تبع تابعین اور ان کے بعد ایک عرصہ تک بہت سے فقہی مسالک رائج ہوئے، پھر ان سالک پر عمل کرنے والوں کی تعداد گھٹتی گئی اور بالآخر ختم ہو گئے، جن فقہی مسالک کو اللہ تعالیٰ نے دوام بخشا اور آج تک لوگ ان پر عمل پیرا ہیں، وہ اہل سنت والجماعت میں فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی ہیں، اہل تشیع میں فقہ جعفری اور فقہ زیدی ہیں ان کے علاوہ فقہ اباضی کو بھی ایک خاص دائرہ میں فروغ حاصل ہوا۔

الغرض فقہ اسلامی کا آغاز عہد رسالت سے ہوا، آہستہ آہستہ پروان چڑھتا رہا، مملکت اسلامیہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس کا دائرہ بھی پھیلتا رہا اور اس کا ارتقا ہوتا رہا، ائمہ مجتہدین کے دور میں آ کر مستقل فن کی حیثیت سے اس کی تدوین عمل میں آئی اور اس کو بڑا استحکام حاصل ہوا، اس طرح فقہ اسلامی اس دور اجتہاد میں اپنے ارتقا کے بام عروج کو پہنچی، اور اس کے بعد ہر دور میں اس دبستان کی آبیاری ہوتی رہی ہے۔

14.4 عہد نبوی میں فقہ

فقہی احکام کے مدار دو ہیں، قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ، یقیناً قرآن وحدیث کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے، فرق اتنا ہے کہ قرآن کے الفاظ ومعانی دونوں باری تعالیٰ کے ہیں، اور حدیث کے الفاظ نبی کریم ﷺ کے اور معانی اللہ کی طرف سے ہیں، قرآن مجید متن اور آپ ﷺ کی ذات اس کی شارح ہے، جیسا کہ قرآن مجید نے ایک سے زائد مقامات پر اس طرف اشارہ کیا ہے [آل عمران: 63-61، الحشر: 7، النحل: 44] اس اعتبار سے فقہی احکام کے مدار دو ہیں: قرآن اور حدیث، قرآن مجید میں کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں، جن میں سے زیادہ تر سورتیں مکہ ہی میں نازل ہوئی ہیں، کیوں کہ صرف بیس سورتیں بالاتفاق مدنی ہیں، اور بیاسی سورتوں کے مکی ہونے پر اتفاق ہے، اور باقی بارہ سورتوں کے بارے میں مکی یا مدنی ہونے کی بابت اختلاف ہے۔

مکی زندگی میں قرآن کا خاص موضوع، دعوت دین، عقیدہ کی اصلاح، بعض اصولی احکام جیسے مردار، خون اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کی حرمت، معاشرہ میں بعض پھیلی ہوئی مسلمہ برائیوں کی مذمت، جیسے ناحق قتل کی ممانعت، زنا، بچیوں کو زندہ درگور کرنے کی مذمت وغیرہ اور بہت سارے اسلامی آداب واخلاق، جیسے: عدل وانصاف، ایفاء عہد، اچھی باتوں پر تعاون، ظلم وزیادتی اور بری باتوں پر عدم تعاون اور گذشتہ اقوام کے قصص وواقعات ہیں، مدنی زندگی کی آیات میں زیادہ تر فقہی احکام کا ذکر ہے، خاص طور پر عبادات، معاملات، احوال شخصیہ، ملکی وغیر ملکی قوانین اور بین الاقوامی تعلقات کا بیان ہے۔

قرآن مجید کے فقہی احکام دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو اپنے منشاء ومراد کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں، جیسے: نماز روزہ وغیرہ کا فرض ہونا، قتل کی حرمت، میراث کے احکام، نکاح میں محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کی تعیین، یہ وہ احکام ہیں جن کا انکار موجب کفر ہے، دوسری قسم کے وہ احکام ہیں جو اپنے منشاء ومراد کے اعتبار سے دوٹوک انداز میں واضح نہیں ہیں، ان میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہے، جس کی وجہ سے استنباط میں اختلاف رائے ہونا ناگزیر ہے، لہٰذا ان میں ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔

احکام کے باب میں قرآن کا طرز بیان دوسری قانون کی کتابوں سے بالکل مختلف ہے، قرآن میں ترتیب سے یکجا سارے احکام کا ذکر نہیں ہے؛ بلکہ پورے قرآن میں منتشر ہے، مزید برآں اس کے ساتھ ترغیب وترہیب اور حکمت ومصلحت کا بھی ذکر ہوتا ہے؛ تاکہ لوگوں میں احکام الٰہی پر عمل کرنے کی رغبت پیدا ہو؛ کیوں کہ قرآن کے نزول کا اصل مقصد لوگوں کی ہدایت ہے۔

- جہاں تک قرآن کے طریقہ تشریع کی بات ہے تو اس کی چند اہم صورتیں حسب ذیل ہیں:

سماج میں کوئی واقعہ پیش آتا جس کا حکم لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا اور لوگ، تو نبی کریم ﷺ سے پوچھتے تو آپ ﷺ پر اس کے متعلق وحی نازل ہوتی، دوسرے الفاظ میں آپ واقعات کی مناسبتوں سے آیات کا نزول کہہ سکتے ہیں، جیسے: مکہ مکرمہ کی ایک حسین وجمیل خاتون نے حضرت مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کو شادی کی پیشکش کی اور وہ کافر تھی، حضرت مرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شادی کی اجازت چاہی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ﴾ [البقرہ: 221] (اور (مومنو!) مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرنا)۔

اسی طرح بعض مرتبہ بغیر واقعاتی مناسبت کے لوگ آپ ﷺ سے سوال کرتے تھے، اس پر آیت نازل ہوتی تھی، جیسے: ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ [البقرہ:219] (لوگ آپ سے شراب اور جوا کے بارے میں پوچھتے ہیں) وغیرہ، اس طرح 13 رمسائل کا ذکر سوال وجواب کے انداز میں قرآن نے ذکر کیا ہے۔

کبھی بغیر سبب کے آیتیں نازل ہوتی تھیں، جیسے: اقامت صلاۃ، وضواور بعض دوسری عبادات کی آیات۔

تشریع احکام کے کچھ بنیادی اصول ہیں جن کو عہد رسالت میں فقہی احکام کو وضع کرنے کے لئے مدنظر رکھا گیا، اور وہ یہ ہیں، عدم حرج، قلت تکلیف اور آسانی، اور تدریج۔

عدم حرج: اس کا مطلب تنگی کو دور کرنا، عملی احکام میں تنگی کا نہ ہونا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فقہی احکام میں اس اصول کو بھرپور ملحوظ رکھا ہے، واضح رہے کہ عدم حرج سے مراد یہ نہیں ہے کہ سرے سے تکلیف ومشقت ہی نہ ہو، اس اعتبار سے مشقت کی دو قسمیں ہوجاتی ہیں، ایک وہ معمولی مشقت جسے عرف میں مشقت تصور نہیں کیا جاتا ہے، شارع نے بھی اس کا لحاظ نہیں رکھا ہے؛ کیوں کہ شرعی احکام کے مکلّف ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہوگی۔ مشقت کی دوسری قسم وہ ہے جسے عرف میں مشقت سمجھا جاتا ہے، انسان اس کی وجہ سے دقت محسوس کرتا ہے، شریعت نے اس مشقت کا اعتبار کیا ہے اور اس کی وجہ سے احکام میں تخفیف برتا ہے، اسی کو عدم حرج گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی نوع کی مشقت وحرج اور تنگی کو دور کرنے کی طرف قرآن مجید میں کئی مقامات پر تصریح کی ہے۔ [البقرہ: 185. 286 المائدہ: 6، الحج: 78] مثلاً نماز ہے، اس میں قیام (کھڑا ہونا) فرض ہے، کھڑے ہونے میں اگر کسی کو ادنی مشقت ہے، تو اس سے قیام ساقط نہیں ہوگا؛ لیکن اگر کھڑے ہونے میں اس کو غیر معمولی مشقت ہوتی ہو تو پھر اس سے قیام ساقط ہوجائے گا اور وہ بیٹھ کر نماز ادا کرے گا۔

یسر وآسانی: یہ عدم حرج کا لازمی نتیجہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ احکام میں توازن واعتدال ہو، واجبات وفرائض کا زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے'' [البقرہ: 286، مزید دیکھئے: النساء: 28] اسی وجہ سے اسلام نے کثرت سوال سے منع کیا اور دین میں غلو سے روکا [المائدہ: 101] اور ایک بنیادی اصول یہ بتادیا کہ دین آسان ہے:

" إن الدين يسر ولن يشاد الدين إلا غلبه " [بخاری، حدیث نمبر: 39]

اسی وجہ سے قرآن میں واجبات وفرائض کی مقدار بہت تھوڑی ہے جن کو کم مدت میں آسانی سے سیکھا جاسکتا ہے اور ان پر عمل بھی آسان ہے، ان میں بھی اس بات کا مکمل خیال رکھا گیا ہے کہ پہلے سے جو رسوم اور عادات واطوار چلے آرہے ہیں، ان میں سے جو اسلام کی نظر میں درست تھے ان کو باقی رکھا گیا، بعض میں معمولی اصلاح اور ترمیم کی گئی، اور جو بالکل ظلم وزیادتی پر مبنی تھے یا انسانی فطرت کے مغائر اور اس کے لئے ضرر رساں تھے، ان سے روکا گیا، اور شرعاً ان کو ممنوع قرار دیا گیا، جس کی واضح مثال نکاح شغار ہے۔

تدریج: اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹھہر ٹھہر کے، آہستہ آہستہ کسی کام کا حکم دینا، یکبارگی بوجھ نہ ڈالنا، چوں کہ عرب کی بگڑی ہوئی صورتحال کو دیکھتے ہوئے حکمت کا تقاضا تھا کہ ان کو عمل پر آمادہ کرنے کے لئے حکمت کے ساتھ بتدریج احکام دیئے جائیں؛ چنانچہ

قرآنی آیات اور احادیث رسول میں بہت سے احکام کی مشروعیت بتدریج ہوئی ہے، اس کی واضح مثال شراب کی حرمت ہے، تیسرے مرحلہ میں اس کی قطعی حرمت نازل ہوئی، پہلے مرحلہ میں ذہن سازی کی گئی کہ تمہارے لئے اس میں فوائد تھوڑے اور نقصان زیادہ [البقرہ: 291]، دوسرے مرحلہ میں نشہ کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے روکا گیا [النساء: 43]، تیسرے مرحلے میں اس کی حرمت کا قطعی حکم نازل ہوا [المائدہ: 9]۔

- آپ پڑھ چکے ہیں کہ فقہی احکام کے مصادر قرآن وحدیث ہیں؛ اسی کے ساتھ علماء نے اجتہاد رسول اور اجتہاد صحابہ کو بھی شامل کیا ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ دونوں حدیث کے ذیل میں آجاتے ہیں؛ کیوں کہ اجتہاد رسول قول رسول یا فعل رسول ہوا، اور اجتہاد صحابہ کی تائید صراحۃ یا حکماً رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ہونے کے بعد معتبر ہے، اس لئے یہ حدیث کی ایک قسم تقریر (آپ ﷺ کے سامنے کوئی کام کیا گیا یا آپ ﷺ کے علم میں آیا؛ لیکن آپ ﷺ نے اس پر خاموشی اختیار فرمائی) کے ذیل میں آجاتا ہے۔

آپ ﷺ کے بعض افعال طبعی نوعیت کے ہیں، جیسے اٹھنے، بیٹھنے، اور گفتگو کرنے کا انداز وغیرہ، اس طرح کے امور میں سے جو بہ اختیار عمل میں لایا جاسکتا ہے ان کا کرنا مستحب ہوگا، اور جو آدمی کے اختیار وارادہ سے باہر ہو ان سے شرعی حکم متعلق نہیں ہوں گے۔

14.5 پہلی صدی ہجری میں فقہ

علماء نے تدوین فقہ کے جو تاریخی ادوار متعین کئے ہیں، اس حیثیت سے یہ اکائی دو حصوں میں منقسم ہوگی، پہلا: خلافت راشدہ کا عہد (11 تا 40ھ)، دوسرا: اصاغر صحابہ اور تابعین کا عہد (41 ہجری سے پہلی صدی کے اختتام اور دوسری صدی کے اوائل تک)۔

14.5.1 خلافت راشدہ کا عہد

اس دور میں صحابہ کرام کے سامنے احکام شریعت کے اخذ واستنباط کے مصادر: قرآن، حدیث، اجماع امت اور قیاس واجتہاد تھے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو انہوں نے قاضی شریح کے نام کوفہ روانہ کیا تھا، ایسا ہی خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی عمل تھا کہ وہ جن مسائل میں قرآن وسنت میں کوئی نص نہیں پاتے تو صحابہ کرام میں سے اہم شخصیتوں کو جمع فرماتے، ان سے مشورہ کرتے اور ان کے اتفاق سے فیصلہ فرماتے، یہی بقیہ خلفاء راشدین کا طریقہ رہا۔

اس طرح عہد صحابہ میں بعض مسائل پر اتفاق میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی کوشش کو بڑا دخل رہا، جیسے مانعین زکاۃ سے جہاد، نبی کریم ﷺ کے متروکات میں میراث کا جاری نہ ہونا، قرآن کی جمع وترتیب وغیرہ اور حضرت عمر ؓ کے زمانہ میں تراویح باجماعت پر صحابہ ؓ کا اتفاق ہوا۔

اس وقت تک شراب نوشی کی حد متعین نہیں تھی، حضرت عمر ؓ نے اس سلسلہ میں اکابر صحابہ ؓ سے مشورہ کیا، تو بالآخر حضرت علی ؓ کی رائے ''اسّی کوڑے'' پر فیصلہ ہوا، اور یہی شراب کی حد مقرر ہوگئی۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ اتفاق رائے کی کوشش کے باوجود اتفاق نہیں ہوسکا، اور صحابہ کے درمیان اختلاف باقی رہا، اور بعد کے ادوار میں بھی وہ اختلاف منتقل ہوتا رہا ہے؛ البتہ صحابہ کرام ﷺ فقہی اختلاف کو مذموم نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ ایک دوسرے کی رائے کا پورا احترام کرتے تھے، اور بڑی ہی فراخ دلی کے ساتھ دوسروں کو اختلاف کرنے کا حق بھی دیتے تھے، اس طرح دلیل کی روشنی میں جو جس کی رائے پر عمل کرنا چاہتا کرتا، کوئی صحابی دوسرے کو اپنی رائے پر عمل کرنے کی ترغیب نہیں دیتا تھا، چنانچہ حضرت عمر ﷺ نے ایک موقع سے فرمایا کہ اگر میرے پاس اللہ یا اس کے رسول کا حکم ہوتا تو میں اس کو نافذ کر دیتا؛ لیکن میری بھی رائے ہے اور رائے میں سب شریک ہیں؛ چنانچہ انہوں نے حضرت علی ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کے فیصلہ کو برقرار رکھا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی مملکت کی وسعت اور عرب وعجم کے تہذیبی میل جول سے بہت سے نئے مسائل پیدا ہوئے جن کا حل قرآن وحدیث میں صراحۃً نہیں تھا؛ چنانچہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد فوری خلافت کا مسئلہ پیش آیا، اس کی صراحت قرآن وحدیث میں موجود نہیں تھی، اجتہاد کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا، مختلف رائیں سامنے آئیں اور آخر میں ایک رائے پر سب کا اتفاق ہوا، اس طرح حضرت ابوبکر صدیق ﷺ صحابہ کے اجتہاد سے خلیفہ منتخب ہوئے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ نئے مسائل کے فقہی احکام مستنبط کرنے کا طریقہ یہی تھا کہ پہلے قرآن میں حکم تلاش کیا جائے، اگر اس میں نہ ملے، تو سنت رسول میں دیکھا جائے، اگر اس میں بھی نہ ملے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے پچھلے اجماعی فیصلے دیکھے جائیں، یعنی اجماع صحابہ میں تلاش کیا جائے، اگر اتفاق سے اس میں بھی نہ مل سکے تو قیاس کیا جائے، یعنی شریعت کے مشابہ مسائل پر علت مشترکہ کی بنیاد پر قیاس کیا جائے؛ چنانچہ حضرت عمر فاروق ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷺ کو ایک خط میں تحریر فرمایا:

> ''مسائل میں اشباہ وامثال کو پہچانو اور پھر ان کی روشنی میں ان کے بارے میں ایسی رائے قائم کرو جو تمہیں اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور حق سے قریب تر نظر آئے''۔ (سنن دار قطنی :2/512، اعلام الموقعین :1/72)

قیاس کا مطلب گذر چکا ہے، جہاں تک اجتہاد کی بات ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ کتاب وسنت سے حکم شرعی مستنبط کرنے میں چند قیود وشرائط کے ساتھ پوری پوری کوشش کی جائے، اس کی دوصورتیں ہوتی ہیں:

اول یہ کہ کتاب وسنت کی منصوص عبارت سے استخراج مسائل کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ کتاب وسنت کے منصوص مسائل سے بذریعہ قیاس استخراج مسائل کیا جائے، جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شراب کی حد کو حد قذف پر قیاس فرمایا، اس طور پر کہ جب کوئی شراب پیتا ہے تو نشہ میں مبتلا ہوتا ہے، پھر نشہ کی حالت میں بکواس شروع کرتا ہے اور اس میں لوگوں پر بہتان تراشی بھی کر گذرتا ہے، اس لئے جو سزا تہمت اندازی (قذف) کی ہے، یعنی اسّی (80) کوڑے، وہی شراب نوشی پر بھی دی جانی چاہیے؛ چنانچہ اسی کوڑے پر فیصلہ ہوا۔

صحابۂ کرام ﷺ کا ایک طریقہ یہ تھا کہ جب قرآن وحدیث میں کسی نئے مسئلہ کا حل نہیں ملتا، اور نہ ہی اجماع اور قیاس کے ذریعہ اس کے حکم کا استخراج ممکن ہوتا تو مصلحت مرسلہ کی بنیاد پر فیصلہ فرماتے، جیسا کہ عراق وشام کی فتوحات کے وقت مجاہدین کے درمیان زمینات کی تقسیم کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمر ﷺ، حضرت عثمان ﷺ اور حضرت علی ﷺ اور بعض دوسرے صحابہ ﷺ نے انھیں بیت المال کی ملکیت قرار دیا؛ تاکہ عام مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچے اور اس سے مزید رفاہی کام انجام دیے جاسکیں۔

اسی طرح صحابہ کرام ﷺ اور خاص کر کے حضرت عمر ﷺ نے بعض فیصلے شریعت کے عمومی مقاصد کی بنیاد پر کئے ہیں، جیسا کہ حضرت عمر ﷺ نے قحط کے زمانہ میں چوری کی حد کو موقوف کر دیا؛ کیوں کہ اس وقت لوگ اضطرار کی حالت میں تھے، اور شریعت کا مسلمہ اصول ہے کہ اضطرار کی حالت میں چوری کرنے سے حد جاری نہیں ہوتی، اس لئے کہ انسان اپنے اختیاری افعال کے بارے میں اللہ کے یہاں جواب دہ ہے، نہ کہ اضطراری افعال کے بارے میں۔

بعض اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم نے دفع مفسدہ اور فتنہ کے دروازے کو بند کرنے کے لئے فقہی فیصلے کئے ہیں، جیسے: اگر کوئی مرض الموت میں اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو شریعت کے اصول کے مطابق مطلقہ کو اس مرد کے متروکہ میں سے کچھ بھی نہ ملے؛ لیکن چوں کہ بعض غیر منصف مرد اسے بیوی کو میراث سے محروم کرنے کا ذریعہ بنا سکتے تھے، اسی لئے صحابہ نے ظلم کے دروازے کو بند کرنے کے لئے ایسی مطلقہ عورت کو بھی میراث کی مستحق قرار دیا، اسی طرح حضرت عمر ﷺ نے ایک مجلس کی تین طلاق کو تین طلاق ہی واقع قرار دیا؛ تا کہ بددین لوگوں کی بری نیت کا سد باب ہو سکے اور اللہ کی محرمات کی حفاظت ہو سکے۔

- فقہی مسائل کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن میں فقہاء صحابہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اختلاف بے بنیاد نہیں ہے؛ بلکہ اس کے کچھ اسباب و وجوہ ہیں جو اس اختلاف کے پیچھے کارفرما رہے ہیں اور اس اختلاف میں بھی حق کی جستجو مطلوب تھی نہ کہ تنگ نظری، تعصب اور دوسروں کی مخالفت، واضح رہے کہ اختلاف صحابہ کے تجزیے سے اس کے مختلف اسباب سامنے آتے ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

(1) **لفظ میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال:** یعنی قرآن وحدیث کے کسی لفظ میں ایک سے زیادہ معنی کے احتمال ہونے کی وجہ سے اختلاف ہوا، جیسے قرآن نے مطلقہ عورت کی عدت تین ''قروء'' قرار دی ہے، قروء قرء کی جمع ہے، اس کے دو متضاد معنی آتے ہیں، ایک حیض دوسرے طہر؛ چنانچہ حضرت عمر ﷺ حضرت علی ﷺ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ نے اس سے حیض کا معنی مراد لیا، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زید بن ثابت ﷺ اس سے طہر مراد لیتے ہیں۔

(2) **حدیث کا عدم سماع:** یعنی ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے حدیث سنی اور دوسرے صحابی نے حدیث نہیں سنی اور نہ ہی دوسرے واسطہ سے ان تک پہنچ سکی، ظاہر ہے کہ جن تک کسی مسئلہ کے بارے میں حدیث نہیں پہنچی تو انہوں نے اجتہاد کے ذریعہ فیصلہ کیا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عام اصول کے مطابق غسل کرتے وقت خواتین کو سر کے بالوں کو کھولنے کا حکم دیا کرتے تھے؛ کیوں کہ غسل میں پانی کا پورے جسم تک پہنچنا ضروری ہے، اس کے برخلاف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سر پر تین چلو پانی ڈالنے کو کافی سمجھتی تھیں، بالوں کے کھولنے کو ضروری قرار نہیں دیتی تھیں؛ اس لئے وہ کہتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک ہی برتن سے غسل کرتی تھی اور میں صرف اپنے سر پر تین چلو ڈال لیا کرتی تھیں۔ (دیکھئے: مسلم، حدیث نمبر: 331)

(3) **فعل کا حکم سمجھنے میں اختلاف:** بعض مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے کسی عمل کے منشا و مقصد کو متعین کرنے میں اختلاف رائے ہوا ہے، جیسے حج میں منی سے مکہ واپس ہوتے ہوئے وادی ابطح میں قیام کا حکم، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور بعض دوسرے صحابہ حضور ﷺ کے اس عمل کو سنت قرار دیتے ہیں، جب کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسے طبعی فعل قرار دیتے ہیں۔

(4) **سہو ونسیان:** مطلب یہ ہے کہ کوئی صحابی نبی کا کوئی عمل نقل کرے اور اس میں بھول کر غلط حکم لگا دے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے ماہ رجب میں عمرہ کیا؛ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ابن عمر نے یہ بات بھول کر کہہ دی ہے، حقیقت میں آپ ﷺ نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا۔ (بخاری، حدیث نمبر: 1776)

(5) **وہم:** حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے روایت کی کہ مطلقہ بائنہ عورت عدت میں نفقہ اور رہائش کی حقدار نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہا نے سنا تو اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں ایک عورت کی بات پر نہ معلوم کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی کتاب اللہ اور سنت رسول کو نہیں چھوڑ سکتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہا کا خیال یہ تھا کہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کا وہم ہو سکتا ہے؛ کیوں کہ قرآن کی سورہ طلاق (آیت: 1) میں مطلقہ کے رہائش فراہم کرنے کی ہدایت موجود ہے۔

(6) **مزاج و مذاق اور طریقہ استنباط کا فرق:** بعض صحابہ کرام جیسے حضرت ابو ہریرہ ﷺ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ کا مزاج و مذاق حدیث کے ظاہری الفاظ پر قناعت کا تھا، جب کہ بعض دوسرے صحابہ کرام جیسے حضرت عمر ﷺ، حضرت علی ﷺ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ وغیرہ حدیث کے مقصد و منشاء پر نظر رکھتے تھے اور قرآن و دین کے عمومی مزاج و طبیعت کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کا مزاج تھا، جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آگ میں پکی ہوئی چیزوں کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ پھر تو گرم پانی سے غسل کیا جائے تو اس سے بھی وضو واجب ہو جائے گا؟

(7) **ضبط کا اختلاف:** حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''مردہ کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسے وہم شمار کیا کرتی تھیں؛ کیوں کہ یہ قرآن کے حکم ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی﴾ [فاطر: 18] (ایک شخص پر دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں ہوگا) کے خلاف ہے۔ (دیکھئے: ابوداؤد، حدیث نمبر: 3129)

(8) **حکم کی علت کے استخراج میں اختلاف:** جیسے بعض صحابہ کا موقف تھا کہ جنازہ کے لئے کھڑے ہونے کی علت فرشتوں کی تعظیم ہے، اس لئے مومن اور کافر دونوں کے لئے کھڑا ہونا چاہیے، جب کہ بعض دوسرے صحابہ کا موقف تھا کہ یہ حکم موت کی ہولناکی کے باعث ہے۔

14.5.2 صغار صحابہ و تابعین کا عہد

اس دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ سے نکل کر عالم اسلام کے مختلف شہروں میں رہائش پذیر ہو گئے، اور علم دین کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے' لوگ بھی ان کے گرد کثرت سے جمع ہو گئے، اور ان سے خوب استفادہ کیا، یہاں تک کہ تابعین کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جو مرجع خلائق بن گئی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور دراز علاقوں میں پھیل جانے کی وجہ سے اجتماعی اجتہاد کی جگہ پر انفرادی اجتہاد کا غلبہ ہو گیا، اور دوسرے یہ کہ مختلف علاقوں کے رواج و عادات اور ہر شہر کے حالات اور کاروباری طریقے اور لوگوں کے فکری و عملی رجحانات مختلف تھے، جس کی وجہ سے اس اختلاف کا اثر فقہاء کے نقطۂ نظر پر پڑا، اور پہلے دور کے بمقابلہ اس دور میں اختلاف رائے کی کثرت ہو گئی۔

ویسے تو دورِ صحابہ میں ہی صحابہ کے دو طبقے پیدا ہو چکے تھے، ایک طبقہ اہل حدیث اور دوسرا طبقہ اہل رائے سے مشہور ہوا، اہل حدیث کا طبقہ قیاس برائے نام کرتا تھا، ان کی نگاہ قرآن وحدیث کے ظاہری الفاظ پر مرکوز ہوتی تھی، دوسرا طبقہ بھی قرآن وحدیث سے استدلال کرتا تھا، ظاہری الفاظ کے ساتھ معانی کا غواص تھا، استنباط مسائل میں شرعی احکام کے علل، اسباب، مقاصد اور مصالح کی بھی رعایت کرتا تھا، اور اصول وقوانین کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کرتا تھا، ایسے لوگ زیادہ تر اہل عراق تھے، اور اہل حدیث زیادہ تر اہل حجاز تھے۔

صحابہ میں اہل حجاز کے اساتذہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام تھے، اور اہل عراق کے اساتذہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے فقہاء صحابہ تھے، اس دور میں اجتہاد کے دونوں طریقے زیادہ نمایاں ہوئے اور دونوں طریقوں کو خوب فروغ ملا، نیز اس دور میں فقہ اور حدیث کا فن ایک دوسرے سے ممتاز ہوا، فقہ وفتاویٰ میں مشغول رہنے والے فقہاء کہلائے، اور متن حدیث کی روایت اور اس کی سند کی تحقیق میں مصروف رہنے والے محدثین کہلائے۔

اس عہد میں بھی بنیادی طور پر اجتہاد واستنباط کا وہی طریقہ رہا جو اکابر صحابہ نے اختیار کیا تھا، البتہ ثانوی مراجع کا استعمال بھی وسیع پیمانہ پر شروع ہوگیا، ثانوی مراجع کی تفصیل پیچھے آچکی ہے۔

اس دور میں فقہ اسلامی کا تعلق واقعاتی مسائل سے رہا، یعنی جو مسائل پیش آئے ان ہی کا حکم بتایا گیا، امکانی تفریعات اور مفروضہ احکام کا استخراج نصوص سے نہیں کیا گیا۔

14.6 فقہائے صحابہ وتابعین

جن مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتاوی محفوظ ہیں اور ہم تک پہنچے ہیں، ان کی تعداد (149) ہے، ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں، علماء نے صحابہ ﷺ سے منقول فتاوی کی تعداد کے لحاظ سے صحابہ کی تین قسمیں کی ہیں، مکثرین، متوسطین، اور مقلین:

☆ مکثرین سے مراد وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جن میں سے ہر ایک سے فتاوی کا ایک عظیم مجموعہ منقول ہے، ان کی تعداد سات ہے، حضرت عمر ﷺ، حضرت علی ﷺ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت زید بن ثابت ﷺ۔

☆ متوسطین سے صحابہ کی وہ جماعت مراد ہے جن میں سے ہر ایک صحابی سے فتاوی کا منقول مجموعہ چھوٹا سا ہو، یہ کل بیس صحابہ ﷺ ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں: حضرت ابوبکر صدیق ﷺ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت انس ﷺ۔

☆ مقلین وہ صحابہ ہیں جن سے منقول فتاوی کی تعداد بہت تھوڑی ہو، بعض سے تو صرف ایک یا دو فتوے منقول ہیں، ان کی تعداد ایک سو بائیس ہے، جن میں سے چند یہ ہیں: حضرت ابو درداء ﷺ، حضرت ابوذر غفاری ﷺ اور حضرت ابی بن کعب ﷺ۔

جہاں تک فقہاء تابعین کی بات ہے تو ان کی تعداد بہت ہے، جن میں اہم اور مشہور یہ ہیں:

سعید بن المسیب مخزومیؒ، عروہ بن زبیرؒ، امام زین العابدین علی بن حسینؒ، عبید اللہ بن عبد اللہؒ، سالم بن عبد اللہ، سلیمان بن یسارؒ، قاسم بن محمد ابو بکرؒ، نافع مولی ابن عمرؒ، ابن شہاب زہریؒ، امام ابو جعفر محمد باقر بن علیؒ، ابو زناد عبد اللہ بن ذکوانؒ، یحی بن سعیدؒ، ربیعہ الرائی بن عبد الرحمٰنؒ، مجاہد بن جبرؒ، عکرمہ مولی ابن عباسؒ، عطاء بن رباحؒ، ابو الزبیر محمد بن مسلمؒ، علقمہ بن قیس نخعیؒ، مسروق بن اجدعؒ، عبیدہ بن عمرو سلمانیؒ، اسود بن یزید نخعیؒ، شریح بن حارث کندیؒ، ابراہیم بن یزید نخعیؒ، سعید بن جبیرؒ، عامر بن شراحیل شعبیؒ، ابو العالیہ ریاحیؒ، حسن بن ابی الحسن بصریؒ، جابر بن زیدؒ، محمد بن سیرینؒ، قتادہ بن دعامہ، عبد الرحمٰن بن غنم اشعریؒ، ابو ادریس خولانی، قبیصہ ابن ذویبؒ، مکحول بن ابی مسلمؒ، رجاء بن حیوہؒ، عمر بن عبد العزیزؒ، ابو الخیر مرثد بن عبد اللہؒ، یزید بن ابی حبیبؒ، طاؤس ابن کیسانؒ، وہب بن منبہؒ اور یحی بن کثیرؒ، نعمان بن ثابت ابو حنیفہ۔

یہ وہ تابعین ہیں جو اس دور میں لوگوں کو فتوی دیا کرتے تھے اور احادیث رسول بھی بیان کرتے تھے، یہ مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، اور فقہ و فتاوی اور روایت حدیث میں مشہور تھے۔

گذشتہ سطروں میں جن فقہاء صحابہ و تابعین کا ذکر آیا ہے ان میں سے چند اہم اور مشہور فقہاء کی سیرت اختصار کے ساتھ پیش کی جاتی ہے:

1. حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ: صاحب فراست اور صاحب رائے تھے، آپ ﷺ جن مخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرتے تھے ان میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے نزدیک زیادہ سمجھ بوجھ والے تھے، آپ ﷺ کی موافقت میں وحی الہی کئی مرتبہ نازل ہوئی، رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط لکھا، وہ خط جہاں آپ کے حسن انتظام کو نمایاں کرتا ہے، وہیں آپ کی وسعت علم کو بھی اجاگر کرتا ہے، اس خط کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کو اسلامی فیصلے کے لئے بنیادی اور رہنما اصول قرار دیا گیا۔
استنباط احکام میں آپ کو بڑا ملکہ حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ قوت استنباط اور کار فتوی میں صحابہ کرام کے درمیان آپ کا اونچا مقام تھا اور سب میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، شریعت اسلامی کی روح، مصلحت اور اس کے مقصد سے آپ کا اجتہاد خوب ہم آہنگ رہا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے غلام ابو لؤلؤہ کے ہاتھ 3 2 ھ میں شہید ہوئے۔
2. حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: رسول اللہ کے قریب ترین خادم خاص تھے، قرآن کے ماہر تھے، قضا اور فتوی دینے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ان کو کوفہ معلم اور وزیر بنا کر بھیجا تو اہل کوفہ سے ایک تاریخی جملہ فرمایا: ''میں نے عبد اللہ کی بابت اپنے اوپر تم لوگوں کو ترجیح دی''، مشہور تابعی ابراہیم نخعیؒ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اتفاق رائے سے عدول نہیں کرتے تھے، جب دونوں کے درمیان اختلاف ہوتا تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے کو اختیار کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود ''فقیہ فی الدین عالم بالسنۃ'' ہیں، یعنی ان کو دین میں بڑا تفقہ حاصل ہے اور وہ حدیث کے بڑے عالم ہیں۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اصحاب رائے فقہاء صحابہ میں سے تھے، جس مسئلہ میں نص نہیں ہوتی اس میں توقف نہیں کرتے تھے بلکہ بذریعہ قیاس حکم کا استنباط کرتے تھے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریقہ تھا، اسی طریقہ کو علقمہ بن قیس نخعیؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے لیا، ان سے ابراہیم نخعیؒ نے، ابراہیم نخعیؒ سے حماد بن ابوسلیمانؒ نے اور حماد بن ابوسلیمانؒ سے امام ابوحنیفہؒ نے اخذ کیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آخری عمر میں کوفہ سے مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے تھے اور یہیں 32ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی، طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

3. حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ: علم کا سمندر تھے، اصحاب رائے فقہاء میں سے تھے، قرآن وسنت کے بڑے عالم تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں، پس جو علم کا طالب ہو وہ علم کے دروازہ پر آئے"۔ (مجمع الزوائد: 14/9) مزید آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی ابن ابی طالب ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کسی فیصلے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ٹوکا کہ ایسے میں ایسا ہونا چاہیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو قبول فرمایا، اور فرمایا: "اگر علی نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا"۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: علی سنت کے بہت بڑے عالم ہیں، جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو انہوں نے فرمایا: "ابن ابی طالب کی موت کے ساتھ علم وفقہ رخصت ہو گئے"، حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: "علی لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن وسنت کے جانکار تھے"۔

آپ ﷺ عبدالرحمٰن بن ملجم خارجی کے ہاتھ 40ھ میں شہید ہوئے۔ (اسد الغابۃ لابن الاثیر)

4. حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ: بڑے ذہین صحابی تھے، صرف سترہ دن میں سریانی زبان اور پندرہ دن میں عبرانی زبان سیکھی تھی، رسول اللہ ﷺ کے خطوط لکھا کرتے تھے، کاتبین وحی میں سے ایک تھے، عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں بعض دوسرے صحابہ ﷺ کے ساتھ جمع قرآن کا کام انجام دیا ہے، مدینہ منورہ میں فتویٰ، قضا، قراءت اور علم فرائض کے امام اور مرجع خلائق تھے، اصحاب رائے فقہائے صحابہ میں سے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ صحابہ میں سب سے بڑے عالم اور راسخ فی العلم (علم میں پختگی و گہرائی والے) تھے، 45ھ میں وفات پائی۔

5. حضرت ابوہریرہ عبدالرحمٰن بن صخر دوسی رضی اللہ عنہ: سب سے زیادہ احادیث رسول ﷺ آپ ہی سے مروی ہیں، اہل حدیث فقہاء میں سے تھے، آپ کثرت سے فتویٰ دینے والوں میں سے تھے، اہل مدینہ کا علم حدیث اور فقہ وفتاویٰ کا دارومدار جن صحابہ رضی اللہ عنہما پر ہے ان میں سے ایک آپ بھی ہیں، آپ کی وفات 58ھ میں ہوئی۔

6. حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما: ہجرت سے دو سال پہلے پیدا ہوئے، رسول اللہ نے آپ کو دین کی فقاہت اور تاویل قرآن میں مہارت کی دعاء دی، تفسیر اور فقہ وفتاویٰ میں اہل مکہ کے علم کا مدار آپؓ ہی ہیں، ابوبکر محمد نے آپؓ کے فتاویٰ کو جمع کیا تو ان کی بیس جلدیں ہوئیں، آپ کی وفات 68ھ میں ہوئی۔

7. حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما: اہل حدیث فقہاء میں سے تھے، بہ کثرت فتوی دینے والوں میں سے تھے، بڑے متقی و پرہیز گار اور فتوی دینے میں شدت سے احتیاط پر عمل پیرا تھے۔ 73ھ میں وفات ہوئی۔

8. ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ان مکثرین فقہ وفتاوی میں شمار ہے، اور جن کی طرف ہر طرح کے شرعی مسائل میں لوگ رجوع ہوا کرتے تھے۔ (اعلام الموقعین: 1/ 12-14)

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں وفود آیا کرتے تھے، وہ آپ ﷺ سے سوالات کرتے تھے، اور آپ ﷺ ان کے سوالات کے جوابات مرحمت فرمایا کرتے تھے، نیز لوگوں کے مقدمات کے فیصلے فرماتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے جوابات اور فیصلے سنتیں اور محفوظ کر لیتی تھیں۔ (موسوعة فقه عائشة ام المومنين، ص: 83,82) نیز رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اور خواتین کے درمیان عورتوں سے متعلق مخصوص مسائل کی بابت استفسار کے لئے واسطہ بنایا تھا، اس طریقہ سے عورتوں سے متعلق فقہی مسائل میاں اور بیوی کے درمیان مشترک ومخصوص شرعی احکام پر انہیں عبور حاصل ہوگیا تھا، ویسے عمومی طور پر بھی فقہ اسلامی میں ان کو اس حد تک دسترس ہوگئی تھی کہ خلافت راشدہ کے دور میں تاحیات منصب فقہ وفتاوی پر فائز رہی ہیں۔ (تاريخ التشريع الاسلامي: خضری بک، ص: 125، موسوعة فقه عائشه ام المومنين، ص: 78)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے محض حفظ فتاوی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ وہ غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کرتی تھیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ علم فرائض اور فقہ اسلامی سے آگاہ کسی اور کو نہیں پایا۔ حضرت عطاء بن ابی رباحؒ تابعی کہتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لوگوں میں سب سے بڑی فقیہہ تھیں، لوگوں میں سب سے بڑی عالمہ تھیں، لوگوں میں سب سے زیادہ اچھی رائے والی تھیں۔ (موسوعة فقه عائشه ام المومنين)

9. سعید بن میسّب: خلافت فاروقی کے دوسرے سال پیدا ہوئے، ابتداء ہی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے اور ان کے فقہی آراء کو حفظ کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ان کو راوئ عمر کہا جانے لگا، اپنے فضل وکمال، تقوی و پرہیز گاری اور فقہ وفتوی میں گہرائی کی وجہ سے کبار تابعین میں شمار ہوتے ہیں، آپ کو فقیہ الفقہاء کہا جاتا تھا، مدینہ میں حال یہ تھا کہ جب کوئی نیا مسئلہ پیدا ہوتا تو ہر کوئی دوسرے کے پاس بھیج دیتا، بالآخر سعید بن میسّبؒ کے پاس آتا اور وہ اس کا جواب دیتے، اس وقت صحابہ کی معتد بہ تعداد مدینہ منورہ میں موجود تھی اس کے باوجود وہ فتوی دیتے تھے، ظاہر ہے کہ ایسی جرأت کثرت علم اور دین میں بڑی فقاہت کی بنیاد پر ہی ہوسکتی ہے، آپ کی وفات ولید بن عبدالملک کے دور حکومت میں 94ھ میں ہوئی۔

10. نافع مولی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ: مدینہ منورہ کے کبار فقہاء اور محدثین میں سے تھے، آپ کی وفات 117ھ میں ہوئی۔

11. علقمہ بن قیس نخعی کوفیؒ: رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیدا ہوئے، البتہ آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی، آپ کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کثرت روایت کی وجہ سے راوئ ابن مسعود کہا جاتا تھا، فضل وکمال اور تفقہ فی الدین کی وجہ سے فقہ کے امام تھے، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ سے آکر فتوی پوچھتے تھے، 61ھ یا 62ھ میں وفات پائی۔

12. ابراہیم بن یزید بن قیس نخعی کوفیؒ: آپ کی جلالت علم، اور فقہ میں مہارت پر سب کا اتفاق ہے، شعبی کہتے ہیں: میں نے ابراہیم نخعیؒ سے بڑا عالم نہیں دیکھا، آپ کی وفات 96ھ میں ہوئی۔

13. حسن بن ابی الحسن یسار بصریؒ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے اواخر میں پیدا ہوئے، بڑے پایہ کے فقیہ تھے، دین میں بصیرت اور اصابت رائے کی وجہ سے کہا گیا کہ اگر حسن بصریؒ جوانی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور پاتے تو صحابہ بھی ان کے علم کے محتاج ہوتے، علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ بعض علماء نے ان کے فتاوے کو سات ضخیم جلدوں میں جمع کیا ہے۔ بصرہ میں 110ھ میں وفات پائی۔

14. عطاء بن ابی رباح مولی قریشؒ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پیدا ہوئے، امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں: میں نے عطاء سے افضل نہیں دیکھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: اے اہل مکہ! تم لوگ میرے پاس جمع ہوتے ہو حالانکہ تمہارے درمیان عطاء موجود ہیں، آپ کی وفات 114ھ میں ہوئی۔

15. محمد بن سیرین مولی انس بن مالک رضی اللہ عنہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دو خلافت کے اواخر میں پیدا ہوئے، بڑے فقیہ اور امام تھے، 110ھ میں وفات پائی۔

امام ابوحنیفہ بھی تابعین میں شمار ہوتے ہیں چونکہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ وغیرہ کو دیکھا ہے، اور وہ مشہور بھی ہیں۔

14.7 فقہ کے مراکز

خلافت راشدہ کے دور میں اور اس کے بعد اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، اور نئی آبادیوں کا سلسلہ پھیلتا گیا اور عرب وعجم کی تہذیبوں نے مل کر ایک نئی تہذیب اور جدید طرز زندگی سے لوگوں کو روشناس کرایا، اور فکری وعملی رجحانات میں ایک انقلاب برپا کیا، جس کی وجہ سے ضروریات زندگی بڑھیں، اور حاجات انسانی میں تغیر واقع ہوا، نئے نئے مسائل جنم لینے لگے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس چیز کو محسوس کیا اور وہ مدینہ منورہ سے نکل کر مختلف دور دراز علاقوں اور شہروں میں پھیل گئے اور ہر ایک نے اپنی جگہ فقہ کا مرکز قائم کیا، اس طرح فقہ وافتاء کے بہت سے مراکز قائم ہوگئے؛ لیکن ان مراکز فقہ وافتاء میں اہم اور زیادہ مشہور سات تھے اور وہ یہ ہیں: مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر اور یمن۔ درج ذیل سطور میں ان سات مراکز کا تعارف اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

14.7.1 مدینہ منورہ

عہد رسالت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک مدینہ منورہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی، علم وفن، لوگوں کی آمدورفت اور اسلامی حکومت کے مختلف امور اور پالیسیاں طے ہونے کے اعتبار سے مدینہ ایک عظیم الشان مرکز تھا، یہاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر اکابر صحابہ موجود تھے، جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ ان ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کرنے والے تابعین درج ذیل ہیں: سعید بن مسیّب مخزومیؒ، (متوفی 94ھ)، ابوبکر بن عبدالرحمٰن مخزومیؒ (متوفی 94ھ)، عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہؒ (متوفی 98ھ)، سلیمان بن یسارؒ مولی ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا (متوفی 107ھ)، نافع مولی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (متوفی 117ھ)، امام ابوجعفر محمد باقر بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ (متوفی 114ھ)، یحی بن سعید انصاریؒ (متوفی 146ھ)، عروہ بن زبیرؒ (متوفی 94ھ)، زین العابدین علی بن حسین رضی اللہ عنہ (متوفی 94ھ)، سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (متوفی 106ھ)، قاسم بن محمد ابوبکر (متوفی 146ھ)، محمد بن مسلمؒ بن شہاب زہری (متوفی 124ھ)، ربیعہ الرائی بن ابوعبدالرحمٰن (متوفی 136ھ)، ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان (متوفی 131ھ)۔ رحمہم اللہ۔ یہ حضرات حدیث وفقہ میں مدینہ منورہ اوراس کے مضافات میں اپنی نظیر آپ تھے۔

14.7.2 مکہ مکرمہ

رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو کچھ دنوں کے لئے مکہ کا معلم ومفتی بنا کر بھیجا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مدینہ سے مکہ تشریف لے آئے اور یہاں زندگی کا آخری دور گذارا، اہل مکہ ان کے علم وفضل سے خوب مستفیض ہوئے، یہاں اصحاب افتاء تابعین میں سے مجاہد بن جبیرؒ (متوفی 103ھ)، عطاء بن ابی رباح (متوفی 114ھ)، عکرمہ مولی ابن عباسؓ (متوفی 107ھ)، ابوالزبیر محمد بن مسلم (متوفی 128ھ) اورعبدالعزیز بن محمد بن مسلم زنجی (رحمہم اللہ) زیادہ مشہور اور قابل ذکر ہیں۔

14.7.3 کوفہ

کوفہ اور بصرہ دونوں شہر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آباد کئے گئے تھے، دراصل ان دونوں شہروں کی حیثیت فوجی چھاؤنیوں کی تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد نے ان کی طرف رخ کیا اوران میں سے اچھی خاصی تعداد نے ان دونوں شہروں کو اپنا وطن بنالیا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا معلم، مفتی اور وزیر مقرر کرکے بھیجا، آپ کوفہ میں دس سال مقیم رہے، یہاں کے باشندوں نے آپ سے خوب استفادہ کیا۔

یہ بات معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کرلیا، اس طرح کوفہ دارالخلافہ بن گیا، کوفہ 35ھ سے 40ھ تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دارالخلافہ رہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اہل کوفہ نے خوب استفادہ کیا، پھران دونوں کے شاگردوں اوران کے شاگردوں کے شاگردوں سے کوفہ کا علمی ماحول سرگرم رہا، اور یہاں فقہی مسائل کی خوب اشاعت ہوئی، کوفہ کے مجتہدین فقہاء اور مفتیان کی ایک لمبی فہرست ہے، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے تربیت یافتہ شاگرد تھے، ان میں سے چند اہم ناموں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

فقیہ عراق علقمہ بن قیس نخعی (متوفی 62ھ)، مفتی مسروق بن اجدع (متوفی 63ھ)، معلم عراق عبیدہ بن عمرو سلمانیؒ (متوفی 92ھ)، فقیہ کوفہ عامر شعبیؒ (متوفی 95ھ)، حماد بن ابوسلیمان (متوفی 120ھ)، عبدالرحمن بن ابولیلیٰ (متوفی 83ھ)، سعید بن جبیر (متوفی 95ھ)، عمرو بن شرحبیل (متوفی 104ھ)، ابراہیم بن یزید نخعیؒ (متوفی 95ھ)، قاضی کوفہ شریح بن حارث کندیؒ (متوفی 78ھ) اور اسود بن یزید نخعیؒ (متوفی 95ھ)۔

14.7.4 بصرہ

بہت سے صحابہ کرام ؓ اس میں سکونت پذیر ہوگئے، اس شہر کے مجتہدین صحابہ میں سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خاص طور پر قابل ذکر اور شہرت کے حامل ہیں، ان کے بعد خود ان کے اور دیگر اجلہ صحابہ کے شاگرد بصرہ کے مسند فقہ وفتاوی پر فائز ہوئے، اور بڑی گرانقدر خدمت انجام دی، اور وہ یہ ہیں:

ابوالعالیہ رفیع بن مہران ریاحیؒ (متوفی 90ھ) فقیہ بصرہ ابوشعشاء جابر بن یزیدؒ (متوفی 93ھ) حسن بن ابی الحسن یسار مولی زید بن ثابت بصریؒ (متوفی 110ھ) محمد بن سیرینؒ (متوفی 110ھ) اور قتادہ بن دعامہ سدوسیؒ (متوفی 118ھ)۔

14.7.5 شام

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شام فتح ہوا تھا، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو شام کے معلم اور مفتی کی حیثیت سے روانہ فرمایا تھا، ان کے بعد خود ان حضرات صحابہ کے شاگرد، نیز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بے شمار شاگرد شام کے منصب فقہ وافتاء پر فائز ہوئے، جن میں سے چند اہم نام یہ ہیں:

عبدالرحمن بن غنم اشعریؒ (متوفی 78ھ)، ابوادریس خولانیؒ (متوفی 80ھ)، عمر بن عبدالعزیزؒ (متوفی 101ھ)، قبیصہ بن ذویبؒ (متوفی 86ھ)، رجاء بن حیوہؒ (متوفی 112ھ) اور مکحول بن سلمہؒ (متوفی 113ھ)۔

14.7.6 مصر

مصر بڑا قدیم ملک ہے، اس کی تہذیب پرانی ہے، اپنے علم وفن میں پہلے سے مشہور ہے، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مصر فتح ہوا تھا، اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور خلافت تھا، مصر فتح ہونے کے بعد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ وہیں سکونت پذیر ہوگئے، آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ (متوفی 65ھ) جو خود بھی صحابی رسول ہیں وہاں کے مفتی بنے، ان کے بعد وہاں کے تابعین میں سے مفتی مصر ابوالخیر مرثد بن عبداللہ یزنیؒ (متوفی 90ھ) اور دوسرے مفتی مصر یزید بن حبیب مولی ازدؒ زیادہ مشہور ہوئے۔

14.7.7 یمن

یمن عہد رسالت میں ہی اسلامی ملک بن چکا تھا، رسول اللہ ﷺ نے خود وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ عرصہ کے لئے بھیجا تھا، پھر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو وہاں کا امیر و معلم اور قاضی و گورنر بنا کر روانہ کیا، اس طرح یمن کو فقہ و افتاء کے اہم اور مشہور مراکز میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے، تابعین میں طاؤس بن کیسانؒ (متوفی 106ھ) جو کہ فقیہ یمن سے معروف ہوئے وہب بن منبہؒ صنعانی (متوفی 114ھ) جو کہ یمن کے عالم و قاضی سے مشہور ہوئے، اور یحیٰ بن ابی کثیرؒ مولی طئی (متوفی 129ھ) قابل ذکر ہیں۔

14.8 دور وسطی کے مجتہدین وفقہاء

دور وسطی کا آغاز چوتھی صدی ہجری کے اختتام کے بعد پانچویں صدی مطابق تیرہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے، اور ختم (1009ھ) مطابق (1869ء) پر ہوتا ہے، یہاں سے دور جدید شروع ہوتا ہے۔ دور وسطی میں بہت سے مجتہدین وفقہاء پیدا ہوئے، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس لئے ان میں سے چند نمایاں فقہاء کا نام ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

1. قاضی عبدالوہاب بن نصر بغدادیؒ مالکی (متوفی 422ھ): دبستان فقہ مالکی کے بڑے عالم وفقیہ تھے، ان کی تصنیفات بہت ہیں، ان میں سے ایک مدونہ کی شرح ہے۔
2. ابوالحسن احمد بن محمد قدوری بغدادی حنفیؒ (متوفی 427ھ): اپنے زمانہ کے بڑے فقیہ تھے، آپ کی مشہور کتاب ''المختصر للقدوری'' ہے، اس کے علاوہ ''التجرید'' کے نام سے ضخیم کتاب تصنیف کی ہے، جس میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے درمیان اختلافی مسائل کو جمع کر دیا ہے۔
3. شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد حلوانی بخاری حنفیؒ (متوفی 448ھ): اپنے زمانہ میں اہل بخاری کے امام تھے، ان کی مشہور کتاب ''مبسوط'' ہے۔
4. ابوالحسن علی بن محمد ماوردی شافعیؒ (متوفی 450ھ) فقہ میں ان کو بڑی بصیرت تھی، ان کی فقہ میں حاوی، الاقناع اور الاحکام السلطانیۃ وغیرہ کتابیں ہیں۔
5. ابوعبداللہ محمد بن علی دامغانیؒ (متوفی 478ھ): عراق میں احناف کی مسند فقہ وفتاوی ان پر ختم ہوگئی۔
6. شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسیؒ (متوفی 483ھ): فروعی مسائل میں مجتہد تھے، بڑے متکلم، مناظر اور اصولی مجتہد تھے، قید خانہ میں پندرہ ضخیم جلدوں میں مبسوط نامی کتاب کا زبانی املا کروایا، اس کے علاوہ فقہ میں شرح السیر الکبیر اور شرح مختصر الطحاوی بھی آپ کی شاہکار تصنیفات ہیں۔
7. علی بن محمد بزدویؒ (متوفی 482ھ): انہوں نے مبسوط کے نام سے گیارہ ضخیم جلدوں میں کتاب لکھی، امام محمدؒ کی کتاب الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔
8. امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ جوینی شافعیؒ (متوفی 487ھ): فقہ، اصول فقہ اور علم کلام میں پورے مشرق والوں کے امام تھے، فقہ میں ان کی بے نظیر تصنیف ''نهاية المطلب في دراية المذهب'' ہے۔

9. حجۃ الاسلام ابوحامد محمد بن محمد غزالیؒ شافعی (متوفی 505ھ): فقہ شافعی میں ''البسیط''، ''الوسیط''، ''الوجیز'' اور ''الخلاصۃ'' کتابیں تصنیف کی ہیں، مذہب شافعی میں یہ کتابیں بڑی اہم اور فقہ وفتاوی میں بڑے استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔

10. ابوالولید محمد بن محمد بن رشد قرطبی مالکیؒ (متوفی 525ھ): اندلس اور مغرب میں اپنے وقت کے فقہ میں امام تھے، ان کی مشہور تصنیف ''کتاب المقدمات'' ہے۔

11. طاہر بن احمد بن عبدالرشید بخاریؒ حنفی (متوفی 542ھ): فتاوی کی مشہور کتاب ''خلاصۃ الفتاوی'' کے مصنف ہیں، فروعی مسائل میں مجتہد تھے۔

12. ابوبکر بن مسعود بن احمد کاسانی (متوفی 587ھ): فقہ میں گہرائی وگیرائی اور مجتہدانہ شان کی وجہ سے ملک العلماء کا لقب پایا، ان کی مشہور کتاب ''بدائع الصنائع'' ہے، جو ہندوستان اور مصر سے کئی بار شائع ہو چکی ہے۔

13. فخر الدین حسن بن منصور اور جندی فرغانی حنفیؒ (متوفی 592ھ): قاضی خاں سے مشہور ہیں، فروعی مسائل میں مجتہد ہیں، فقیہ النفس اور بڑے امام ہیں، فتاوی میں ان کی کتاب ''فتاوی قاضی خاں'' سے مشہور ہے، اور کئی فقہ کی کتابوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں، جن میں ''شرح الجامع الصغیر'' اور ''شرح الزیادات'' زیادہ مشہور ہیں۔

14. علی بن ابوبکر بن عبدالجلیل فرغانیؒ مرغینانی صاحب ہدایہ (متوفی 593ھ): فقہ وفتاوی میں اپنے وقت کے امام وفقیہ تھے، ہدایہ کے علاوہ ''مختارات النوازل'' اور ''کتاب التجنیس والمزید'' وغیرہ بھی آپ کی تصنیفات ہیں۔

15. محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن احمد بن رشد مالکیؒ (متوفی 595ھ): ابن رشد الحفید سے مشہور ہیں، ان کی شاہکار تصنیف ''بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد'' ہے۔

16. افتخار الدین عبدالمطلب بن فضل عباسی بلخی حلبیؒ (متوفی 616ھ): ان کی شرح ''الجامع الکبیر'' مشہور ہے، اور یہ حلب میں فقہ حنفی کے امام سمجھے جاتے تھے۔

17. ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد قزوینی رافعی شافعیؒ (متوفی 623ھ): مسند امام شافعی کے شارح ہیں، امام غزالی کی مشہور کتاب ''الوجیز'' کی شرح لکھی ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام ''الشرح الکبیر'' اور بعض نے ''فتح العزیز'' ذکر کیا ہے۔

18. محی الدین ابوزکریا یحی بن شرف نوویؒ شافعی (متوفی 676ھ): اپنے زمانہ کے بڑے محدث وفقیہ تھے، حدیث وفقہ میں مختلف کتابیں تصنیف کی ہیں، ان ہی میں سے ایک کتاب ''المجموع شرح المھذب'' ہے، جو کافی مشہور ومقبول ہے۔

19. ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی حنفیؒ (متوفی 710ھ): ان کو خاتم مجتہد المذہب (مذہب حنفی میں آخری مجتہد) کہا جاتا ہے، محدث، مفسر، فقیہ اور اصولی تھے، ان کی مشہور کتاب ''کنز الدقائق'' ہے۔

20. تقی الدین احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ حنبلیؒ (متوفی 728ھ): مختلف علوم وفنون میں یکتائے روزگار تھے، آپ کی تصنیفات بہت ہیں، فقہ میں الفتاوی الکبری، یا مجموع فتاوی ابن تیمیہؒ 36 ضخیم جلدوں میں ہے۔

21. محمد بن ابی بکر شمس الدین بن قیم جوزیہؒ (751ھ 691ھ): آپ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے مایہ ناز شاگرد، ان کے علمی سرمایہ کے وارث اور اپنی ذات میں ایک امت کے درجہ کے حامل تھے، آپ کی تالیفات مختلف علوم میں ہیں، جن میں مشہور تصنیفات یہ ہیں: ''زاد المعاد فی ھدی خیر العباد'' اور ''اعلام الموقعین''۔

22. ابو محمد عثمان بن علی فخر الدین زیلعی حنفیؒ (متوفی 743ھ): بڑے فقیہ تھے، ''کنز الدقائق'' کی شرح ''تبیین الحقائق'' لکھی، جو کہ مقبول ومشہور ہے اور معتمد شرح سمجھی جاتی ہے۔

23. محمد بن عبد الواحد کمال الدین ابن ہمام حنفیؒ (متوفی 761ھ): فقہ اور اصول فقہ کے امام تھے، ان کی بہت سی تصانیف ہیں، ان میں سے ایک فتح القدیر ہے جو کہ ہدایہ کی شرح ہے، شرح مکمل نہیں کر سکے، کتاب الوکالہ تک پہنچے تھے کہ زندگی وفا نہیں کر سکی، قاضی زادہ افندی نے ''نتائج الأفکار'' کے نام اس کا تکملہ لکھا، یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ مطبوعہ ہیں۔

24. ابو الضیاء خلیل بن اسحاق کردی مصری مالکیؒ (متوفی 776ھ): فقہ میں مختصر ابن حاجب کی مبسوط شرح لکھی، جس کا نام ''التوضیح'' رکھا۔

25. محمد بن احمد بن موسی بدر الدین عینی حنفیؒ (متوفی 855ھ): بڑے محدث وفقیہ تھے، فقہ میں ان کی کئی کتابیں ہیں، ان میں سے ہدایہ کی شرح ''البنایۃ'' اور کنز کی شرح ''رمز الحقائق'' ہے۔

26. شیخ الاسلام زکریا انصاری شافعیؒ (متوفی 926ھ): فقہ اور حدیث میں ان کی تالیفات بہت ہیں، ان میں سے فقہ میں ''منہاج الطلاب'' اور ''أسنی المطالب فی شرح روض الطالب'' ہیں۔

27. ابراہیم بن محمد حلبیؒ (متوفی 956ھ): ان کی تصنیفات بہت ہیں، ان میں سے مشہور کتاب ''ملتقی الابحر'' ہے جس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں، اور بعض شرحوں کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

28. زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم حنفیؒ (متوفی 969ھ): انہوں نے کنز کی مبسوط شرح لکھی، جس کا نام ''البحر الرائق'' رکھا، یہ کتاب ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر طبع ہو چکی ہے۔

29. شہاب الدین احمد بن محمد بن حجر ہیتمی شافعیؒ (متوفی 995ھ): علوم عقلیہ اور نقلیہ دونوں کے ماہر تھے، علم فقہ کے سمندر تھے، ان کی مشہور کتاب ''تحفة المحتاج شرح المنهاج للنووی'' ہے۔

30. ابو الحسن نور الدین علی اجهوری مالکیؒ (متوفی 1066ھ): ان کی فقہ میں مشہور کتاب ''**مواهب الجليل في تحرير ما حواه مختصر الخليل**'' ہے۔

31. ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن علی خرشی مالکیؒ (متوفی 1101ھ): مختلف علوم میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں، اپنے زمانہ میں مذہب مالکی کے شیخ اور فقہ وفتاوی میں مرجع خلائق تھے، انہوں نے مختصر خلیل کی ایک نفیس شرح لکھی۔

32. ابو الحسن نور الدین علی بن احمد عدوی مالکیؒ (متوفی 1189ھ): مختلف کتابوں پر بڑے مفید حواشی لکھے۔

33. محمد بن علی شوکانی صنعانیؒ (1250ھ، 1173ھ): آپ پہلے زیدی مذہب پر تھے، جب کتاب وسنت پر عبور حاصل ہوا اور علم اصول فقہ اور اجتہاد واستنباط احکام کے طریقے سے آگاہ ہو گئے تو خود مجتہد بن کر ابھرے، علم کا چرچا ہوا، یہاں تک کہ یمن کے قاضی بنے اور تادم حیات اس منصب پر فائز رہے۔ آپ کی تصنیفات دو سو سے اوپر ہیں، جن میں مشہور ''نیل الأوطار''، ''**ارشاد الفحول**'' اور ''فتح القدیر'' ہیں، ان کی فقہ کا خلاصہ ان کی کتاب ''**السيل الجرار المتدفق على حدائق الرأزهار**'' میں جمع ہے، فقہ میں مختلف موضوعات پر بھی دیگر کئی رسائل ہیں، ان میں سے ''**رسالة في الطلاق**''، ''**طيب النشر في المسائل العشر**'' اور ''**رسالة في أسباب سجود السهود**'' ہیں۔

34. محمد امین بن عابدین دمشقی حنفیؒ (متوفی 1252ھ): اپنے زمانہ میں مذہب حنفی کے امام تھے، فقہ میں آپ کی مشہور اور شاہکار کتاب ''ردالمحتار علی الدرالمختار'' ہے، اور ''رسائل ابن عابدین'' کے نام سے آپ کے فقہی مقالات کا مجموعہ بھی موجود ہے۔

14.9 دور جدید میں فقہ اسلامی کے ماہرین

فقہ اسلامی کے ارتقا کے سلسلہ میں دور جدید کا نقطۂ آغاز تیرہویں صدی ہجری کے اواخر 1285ھ مطابق 1869ء کو قرار دیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ خلافت عثمانیہ کے دور میں ''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' کی ترتیب جب عمل میں آئی تو فقہ اسلامی کی خدمت کا ایک نیا رجحان پیدا ہوا، اور ایک نئی بیداری آئی، سلطنت عثمانیہ ترکی نے وزیر انصاف کی صدارت میں اکابر فقہاء کی ایک کمیٹی تشکیل دی اور انہیں حکم ہوا کہ فقہ حنفی کے مطابق دفعہ وار مجموعہ قوانین اسلام مرتب کریں، چنانچہ یہ کام 1285ھ مطابق 1869ء شروع ہوا اور 1293ھ مطابق 1876ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور یہ ''مجلۃ الاحکام العدلیہ'' کے نام سے موسوم ہوا، جس میں کل دفعات (1851) ہیں، بعض مسائل کو چھوڑ کر تمام تر مسائل فقہ حنفی کے راجح اقوال پر مبنی ہیں، بعض مسائل میں احوال زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے ضعیف اقوال کو بھی قبول کیا گیا ہے۔

شیخ احمد بن عبداللہ قاری نے حنبلی مذہب کے مطابق مجموعہ قوانین اسلام مرتب کیا، اس کا نام ''مجلۃ الاحکام الشرعیۃ علی مذہب الامام احمد بن حنبلؒ'' رکھا، یہ مجموعہ (2384) دفعات پر مشتمل ہے، جسٹس عبدالقادر عودہ شہید نے اسلام کے فوجداری قانون کا انسانی خودساختہ قانون سے موازنہ کرتے ہوئے ''التشریع الجنائی فی الاسلام مقارنا بالقانون الوضعی'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، اِدھر برصغیر میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن پاکستان نے ''مجموعہ قوانین اسلام'' کے نام سے چھ جلدوں میں ایک کتاب مرتب کی، ہندوستان میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے زیر نگرانی ہندوستانی علماء کی کمیٹی کے ذریعہ پرسنل لاء سے متعلق ''مجموعہ قوانین اسلام'' مرتب ہوا، جس میں (529) دفعات ہیں، جو نہایت اہم ہیں۔

1962ء میں حکومت مصر نے فقہی انسائیکلوپیڈیا کا منصوبہ بنایا، اب تک ''موسوعۃ جمال عبدالناصر فی الاسلام'' کے نام سے سولہ جلدیں طبع ہوچکی ہیں، وزارت اوقاف کویت کی طرف سے 1966ء میں ''الموسوعۃ الفقھیۃ'' کے منصوبہ کو منظوری ملی، پینتالیس جلدوں میں یہ کام مکمل ہوا، اس کا اردو ترجمہ بھی مکمل ہوچکا ہے، جس کی بارہ جلدیں طبع ہوچکی ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر رواس قلعہ جی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، انہوں نے الف بائی ترتیب پر صحابہ وتابعین کے کئی فقہی انسائیکلوپیڈیا تیار کئے۔

اب ہم اس تمہید کے بعد دور جدید میں فقہ اسلامی کے ماہرین کے تذکرے کی طرف آتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس دور کے تمام فقہاء کا احاطہ مشکل ہے، ان میں سے بعض نمایاں شخصیات کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(1) علامہ عبدالحی لکھنوی (1264ھ-1304ھ): آپ بڑے ذہین وفطین اور قوی الحافظہ تھے، ایک بڑے محدث ہونے کے ساتھ بڑے پایہ کے فقیہ بھی تھے، آپ کی تصنیفات (115) ہیں، جن میں اہم ترین شرح وقایہ کی شرح ''السعایۃ'' ہے، شروح وحواشی کے علاوہ مسائل فقہ سے متعلق تقریباً چوالیس رسالے ہیں، اس کے علاوہ ''نفع المفتی والسائل'' بزبان عربی، ''مجموعۃ الفتاوی'' بزبان فارسی اور

فتاوی عبدالحی (ایک جلد) بزبان اردو ہیں، عالم اسلام کے مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے آپ کی کتابوں کو اپنی خصوصی تحقیق کا موضوع بنایا اوران کی متعدد کتابوں کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔

(2) مولانا سید محمد نذیر حسین (1805ء-1902ء): آپ کی اہم ترین خدمت فتاوی نذیریہ (2 جلدیں) ہے، یہ آپ کی عمر بھر کے فتاوے اور علمی مقالات کا عمدہ ترین شاہکار ہے۔

(3) نواب صدیق حسن خان (1248ھ م1832ء- 1323ھ م1908ء): اپنے زمانہ کے بڑے پایہ کے محدث اور فقیہ تھے، آپ کی تالیفات بہت ہیں، ان میں فقہ کے موضوع پر ''البنیان المرصوص من بیان ایجاز الفقہ المنصوص'' ہے۔

(4) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (1244ھ م1829ء -1323ھ م1908ء): علامہ انور شاہ کشمیری آپ کو ''فقیہ النفس'' کہتے تھے اور علامہ ابن عابدین شامی (صاحب ردالمحتار) پر فائق قرار دیتے تھے۔ آپ کے فتاوی کا مجموعہ ایک جلد میں چھ سو آٹھ (608) صفحات پر مشتمل شائع ہوا تھا، ان کے بقیہ متفرق فتاوی بھی اب مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی تحقیق کے ساتھ ''باقیات فتاوی رشیدیہ'' کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔

(5) عبدالرحمن شربینی شافعی (متوفی 1326ھ م1908ء): اصولی، فقیہ شافعی مصری اور یگانہ روزگار تھے، اور بڑے محقق عالم تھے، فقہ میں آپ کی کتاب ''حاشية البهجة في فقه الشافعية'' ہے۔

(6) احمد بک حسینی (1332ھ م1913ء- 1271ھ م1854ء): مختلف علوم میں ماہر تھے، فقہ اور اصول فقہ آپ کا خاص موضوع رہا ہے، چنانچہ کتاب الام للامام الشافعی کی صرف عبادات کے باب کی شرح چوبیس جلدوں میں بنام ''رشد الأنام'' لکھی، اس کے علاوہ ''بهجة المشتاق في بيان حكم زكاة الأوراق'' وغیرہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

(7) مولانا محمد انواراللہ فاروقی (1264ھ-1336ھ): محدث، فقیہ، اصولی، متکلم اور محقق تھے، حیدرآباد دکن کے سرکاری قاضی بھی ایک زمانہ تک رہ چکے ہیں، آپ کی تالیفات مختلف موضوعات پر ملتی ہیں، فقہ میں ''حقیقۃ الفقہ'' اور ''مسئلہ ربا'' ہیں۔

(8) مفتی عزیزالرحمن عثمانیؒ (1275ھ- 1347ھ، 1928ء) اپنے زمانہ کے بلند پایہ فقیہ تھے، دارالعلوم دیوبند کے شعبہ افتاء کی خشت اول ہیں، مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ کی تحریر کے مطابق کم وبیش سوا لاکھ فتاوی آپ کے قلم سے جاری ہوئے، البتہ جن فتاوی کا ریکارڈ موجود ہے وہ (37561) ہیں۔

(9) مولانا مفتی رکن الدین بن محمد قاسم (متوفی 1347ھ): حدیث وفقہ اور خاص طور پر فتوی نویسی میں بڑا ملکہ تھا، ایک ممتاز مفتی اور عظیم فقیہ سے جانے جاتے تھے، آپ کے فتاوے کا مجموعہ تین جلدوں میں فتاوی نظامیہ کے نام سے شعبہ نشر واشاعت جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔

(10) محمد بخیت بن حسین مطیعی حنفی (1271ھ 1854ء- 1354ھ 1935ء): مصر کے ایک بڑے فقیہ اور وہاں کے سرکاری مفتی تھے، اسکندریہ کے محکمہ شرعیہ کے صدر اور مصر کے شہر اسیوط کے قاضی رہ چکے ہیں، آپ کی تالیفات بہت ہیں، جن میں چند فقہ کے موضوع پر ہیں، ان ہی میں سے ''ارشاد العباد في الوقف على الأولاد'' اور ''القول الجامع في الطلاق''، ''القول الكافي في التصوير الفوتو غرافي'' اور دیگر فتاوی ہیں۔

(11) مولانا اشرف علی تھانویؒ (1271ھ 1854ء-1354ھ 1935ء): ہمہ جہت صلاحیتوں کے حامل تھے، مفسر، محدث اور فقیہ ہونے کے ساتھ ایک کامیاب واعظ اور پیر طریقت تھے، برصغیر میں حکیم الامت کے لقب سے جانے جاتے ہیں، مختلف اسلامی علوم میں تقریباً ایک ہزار تصنیفات چھوڑی ہیں، ان ہی میں سے ''امداد الفتاویٰ'' (6 جلدیں) ''الحیلۃ الناجزۃ'' اور آپ کے علمی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ ''بوادر النوادر'' (2 رجلدیں) ہیں۔

(12) احمد ابراہیم (1291ھ م 1874ء-1364ھ 1945ء): فقہی مذاہب کے درمیان تقابلی مطالعہ میں ممتاز تھے، آپ کی چند تالیفات ملتی ہیں، ان میں سے '' أحكام الاحوال الشخصية في الشريعة الاسلامية''، '' النفقات'' اور ''الوصايا'' مشہور ہیں۔

(13) مولانا عبدالصمد رحمانی (1300ھ-1393ھ): آپ شرعی علوم میں دسترس رکھتے تھے، فقہی مسائل اور اصولوں پر گہری نظر تھی، آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کی ہیں، فقہ میں ''کتاب الفسخ والتفریق''، ''کتاب العشر والزکاۃ'' اور ''آداب القضاء'' زیادہ مشہور و مقبول ہیں۔

(14) شیخ ابوزہرہ (1316ھ م-1897ء-1395ھ-1974ء): ان کا اصل کارنامہ موجودہ حالات اور ترقی پذیر دنیا میں احکام شریعت کی تطبیق اور افراد سازی ہے، آپ نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے، فقہ کے موضوع پر ''کتاب الاحوال الشخصیۃ'' اور ''احکام الترکات والمیراث'' قابل ذکر ہیں۔

(15) احمد عبدالمجید ہریریؒ (1324ھ م 1906ء-1404ھ-1984ء): مصر کے مفتی رہ چکے ہیں، اسی طرح موسوعہ فقہیہ کویت کی کمیٹی کے صدر بھی تھے، آپ کی زیادہ تر تصنیفات فقہ ہی کے موضوع پر ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں: ''نظام الحکم فی الاسلام'' ''نظام القضاء فی الاسلام'' اور ''نظام الزکاۃ فی الاسلام''۔

(16) حسنین محمد حسنین مخلوف (1308ھ م 1890ء-1410ھ م 1990ء) شرعی قاضی اور مصر کے مفتی عام تھے ''هيئة كبار العلماء'' اور '' مجمع البحوث الاسلامیه ازهر '' کے ممبر بھی رہے ہیں، آپ کی مختلف تصنیفات ہیں، ان میں سے ''الرفق بالحيوان فی الشريعة الاسلامية''، '' المواريث فی الشريعة الاسلامية'' اور ''فتاوی شرعيه وبحوث اسلاميه'' ہیں۔

(17) عبداللہ بن عبدالخالق المشد (1321ھ م 1903ء 1411ھ م 1990ء): بڑے فقیہ اور اصولی تھے اور مختلف فقہی کمیٹیوں کے ممبر تھے، کسی ایک فقہی مذہب پر فتویٰ نہیں دیتے تھے، بعض فقہی مسائل میں جمہور علماء سے ہٹ کر ان کا اپنا اجتہاد بھی ہے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں سے ''فی فقہ الحنفیۃ المقارن'' اور ''تهذيب كتاب الهداية فی الفقه الحنفی'' ہیں۔

(18) جادالحق علی جادالحق (1335ھ م 1917ء-1416ھ م 1996ء): مصر کے مفتی عام اور وزیر اوقاف ہونے کے ساتھ ساتھ جامعہ ازہر مصر کے شیخ بھی تھے، حق گو اور شریعت کے معاملہ میں گرمجوش اور بے باک تھے، آپ کی تالیفات کئی ہیں، ان میں سے اہم ترین ''أحكام الشريعة فی مسائل طبية للأمراض النسائية'' ہے۔

(19) مفتی کفایت اللہ دہلوی (1875ء-1953ء) آپ علوم وفنون کے جامع تھے، فقہ و فتاویٰ میں آپ کو خاص امتیاز حاصل تھا، مفتی اعظم تھے، آپ کی اہم اور مقبول کتاب تعلیم الاسلام (4 رحصے) کم عمر بچوں کے لئے ہے، اس کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں، ان میں زیادہ مشہور آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ ''کفایت المفتی'' (8 رجلدیں) ہے اپنے خاص، سہل مختصر اور جامع اسلوب افتاء میں ممتاز تھے۔

(20) مولانا مفتی محمد شفیع (1314ھ-1396ھ) مفتی اعظم پاکستان سے معروف ہیں، آپ کے قلم سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ فتاوے جاری ہوئے ہیں، ان میں مختصر فتوی کا مجموعہ "امداد المفتیین" کے نام سے ایک جلد میں (896) صفحات پر مشتمل شائع ہو چکا ہے، اور آپ کے چوالیس فقہی رسائل کا مجموعہ جواہر الفقہ (7/جلدیں) کے نام سے مکتبہ دار العلوم، کراچی اور دیگر مطابع سے شائع ہوا ہے۔

(21) شیخ احمد بن محمد زرقا شامی حنفیؒ (متوفی 1357ھ) اپنے زمانہ کے ایک بڑے حنفی فقیہ تھے، فتوی میں علماء اور عوام کے لئے مرجع تھے، آپ کی مشہور تصنیف ''شرح القواعد الفقهية'' ہے جس میں فقہی جزئیات بہت ہیں۔

(22) شیخ احمد ابراہیم حسینی مصری (متوفی 1364ھ-1945ء): آپ اہل سنت والجماعت کے فقہی مذاہب کے علاوہ زیدیہ، امامیہ، اباضیہ اور ان مجتہدین صحابہ و تابعین کے فقہی مذاہب سے بھی آگاہ تھے جن کی پیروی کرنے والے اب دنیا میں نہیں رہے، فقیہ النفس اور اصولی تھے، انھوں نے مسلکی تعصب سے اٹھ کر فقہی تحقیقات پیش کی ہیں، ڈاکٹر عبد الفتاح ابو غدہ کا بیان ہے کہ شیخ احمد ابراہیم کی چھوٹی بڑی کتابیں ملا کر (30) سے اوپر ہوتی ہیں، ان میں مشہور و مقبول یہ ہیں: ''أحكام الأحوال الشخصية في الشريعة الاسلامية'' اور ''أحكام الوقف والمواريث''۔

(23) محمد بن حسن حجوی (متوفی: 1367ھ-1291ھ): مغرب اقصی کے امام و فقیہ اور اصولی تھے، آپ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد (99) تک پہنچتی ہے، جن میں سب سے زیادہ اہم اور مقبول کتاب ''الفكر السامي في تاريخ الفقه الاسلامي'' چار جلدوں میں ہے اور فقہ کے موضوع پر دوسری اور کتابیں بھی ہیں۔

(24) عیسی بن یوسف بن احمد منّون مقدسی شافعی (1376ھ-1306ھ م 1889ء): فقیہ اصولی تھے، آپ کی کل آٹھ تصنیفات ہیں ان میں ''رسالة في مناسك الحج''، ''رسالة في حكم قتل المرتد'' اور ''تكملة المجموع شرح المهذب'' ہے جو مکمل نہیں ہو سکی۔

(25) ابو الوفاء سید محمود شاہ بن مبارک حنفی افغانیؒ (1395ھ-1310ھ): بڑے محدث، فقیہ اور محقق تھے، کہا جاتا ہے کہ دکن میں مذہب حنفی کی مسند ان پر ختم ہوگئی، انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ ''مجلس احياء المعارف النعمانية'' حیدرآباد دکن میں قائم کی، جہاں سے فقہ حنفی کی بہت ساری کتابیں تحقیق کے بعد شائع ہوئیں، خود ان کی تحقیق و حواشی کے ساتھ کئی کتابیں یہاں سے طبع ہوئیں، ان ہی میں سے چند یہ ہیں: ''كتاب الأصل للامام محمدؒ''، ''كتاب الجامع الكبير للاما م محمد''، ''كتاب اختلاف أبي حنيفة وابن أبي ليلى''، ''مختصر الطحاوي في فقه الحنفية''، ''كتاب النفقات للخصاف'' اور ''شرح الزيادات للسرخسي''۔

(26) مولانا محمود حسن گنگوہیؒ (1417ھ-1325ھ): آپ نے اپنے قلم سے کوئی کتاب نہیں لکھی، آپ کے اہل مجلس علماء نے آپ کے نتائج افکار، خلاصۂ تحقیقات، رسائل، خطوط، ملفوظات اور فتاوی کی ترتیب کا کام انجام دیا؛ چنانچہ آپ کے فتاوی کا مجموعہ 18/جلدوں میں شائع ہوا، تمام جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد سات ہزار سات سو تیرہ ہے۔

(27) شیخ مصطفی احمد زرقا حنفی (1907ء-1999ء): وہ بے مثال فقیہ اور یگانۂ روزگار تھے، حقیقت میں وہ بیسویں صدی عیسوی میں فقہ اسلامی اور اصول فقہ کے ایک اہم ستون تھے، آپ نے ''الموسوعة الفقهية'' یعنی فقہی انسائیکلوپیڈیا کویت کا منصوبہ پیش کیا اور آپ کی تحریک و نگرانی میں کام شروع ہوا، آپ کی اہم ترین تصنیفات یہ ہیں: ''الفقه الاسلامي في ثوبه الجديد''، ''أحكام الأوقاف''، ''عقد التامين وموقف الشريعة منه''، ''المدخل الفقهي العام'' اور ''المدخل في القوانين المدنية''۔

(28) مفتی نظام الدین اعظمی (1328ھ-1910ء- 1420ھ م2000ء): آپ اختراعی ذہن کے حامل تھے، فقہ میں نئے مسائل حل کرنے کا اچھا ملکہ تھا، اس پر آپ کے فتاوے شاہد ہیں، آپ کے بعض اہم فتاوی اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی طرف سے ''منتخب نظام الفتاوی'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئیہیں، آپ کے فتاوی مختلف فقہی ابواب میں تقسیم کرکے دیوبند سے بھی 6-7 جلدوں میں شائع ہوئے ہیں، اس کا نام بھی نظام الفتاوی ہے، اس کے علاوہ مزید حدیث وفقہ اور نحو وصرف پر بھی آپ کی کتابیں ہیں۔

(29) قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (1937ء-2002ء): اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پایاں فقہی بصیرت عطا فرمائی تھی، جو فقہ وفتاوی میں آپ کی کئی جہتوں سے خدمات ہیں، ان میں ایک اسلام کے عدالتی قوانین سے متعلق آپ کی تصنیف ''اسلامی عدالت'' ہے جو (740) دفعات پر مشتمل ہے، آپ کے فتاوی کا مجموعہ ''فتاوی قاضی'' کے نام سے ایک جلد میں طبع ہو چکا ہے، قضاء کے موضوع پر قاضی محمد بن اسماعیل اشفورقانی کی کتاب ''صنوان القضاء وعنوان الافتاء'' پر آپ نے تحقیقی کام کیا، جو تحقیق کے بعد 4 جلدوں میں کویت سے شائع ہوئی۔

مذکورہ بالا اکابر فقہاء کے علاوہ اور بھی فقہاء ہیں جن میں سے بعض دنیا سے جا چکے ہیں اور بعض بقید حیات ہیں، ان میں قابل ذکر لوگ یہ ہیں:

اسلامی فقہ (3رجلدیں) کے مصنف مولانا مجیب اللہ ندویؒ، فتاوی رحیمیہ (10رجلدیں) کے مصنف مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ، احسن الفتاوی (8رجلدیں) کے مصنف مفتی رشید احمد (پاکستان)، فتاوی رضویہ اور دیگر کتابوں کے مصنف مولانا احمد رضا خان بریلوی، فتاوی امارت شرعیہ (2رجلدیں) کے مصنفین مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، مفتی محمد عباس پھلواروی اور دیگر مفتیان، فتاوی مظاہر علوم کے مصنف مولانا خلیل احمد سہارنپوری، آپ کے مسائل اور ان کا حل (9رجلدیں) کے مصنف مولانا یوسف لدھیانوی، احکام ومسائل (2رجلدیں) کے مصنف سید احمد قادری، علم الفقہ کے مصنف مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی، فتاوی ندوۃ العلماء کے مصنفین مولانا مفتی محمد ظہور ندوی، مولانا ناصر علی اور مولانا نیاز احمد ندوی، نامور اور فقیہ اور ماہر معاشیات مولانا محمد تقی عثمانی، شام کے نامور فقیہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی، شام ہی کے مشہور فقیہ اور درجنوں فقہی انسائیکلوپیڈیا کے مصنف ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی، عالم عرب کے مشہور فقیہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی، ڈاکٹر محمد سعید رمضان بوطی، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر عبدالمحسن ترکی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور القواعد الفقہیہ کے مصنف ڈاکٹر علی احمد ندوی۔

14.10 خلاصہ

فقہ اسلامی کا آغاز عہد رسالت میں ہوتا ہے، یہی دور آنے والے تمام ادوار کی اساس وبنیاد ہے، نقطۂ آغاز وحی الٰہی سے ہوتا ہے اور آپ کی وفات تک پوری شریعت مکمل ہو جاتی ہے۔

آپ ﷺ کی وفات کے بعد پیش آنے والے نئے مسائل کے بارے میں بعض صحابہ کرام فتوی دیا کرتے تھے، فتوی دینے والے صحابہ دو طرح کے تھے، ایک ظاہر لفظ پر اکتفا کرتے تھے، دوسرے ظاہر لفظ کے ساتھ ساتھ درایت سے بھی کام لیتے تھے، مقاصد شریعت اور مصالح کی بنیاد پر بھی فتوی دیتے تھے، پہلی قسم کے صحابہ اصحاب حدیث سے معروف ہوئے، جیسے حضرت عبداللہ بن

عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ، دوسری قسم کے صحابہ اصحاب رائے سے مشہور ہوئے، ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں، پہلے طریقہ کو اہل حجاز نے اپنایا دوسرے طریقے کو اہل عراق نے اختیار کیا، جس کے سرخیل بعد کے دور میں امام ابوحنیفہؒ بنے۔

صحابہ کے دور میں ہی فقہ کے مراکز قائم ہو چکے تھے ان کے بعد ان کے شاگردوں نے ان مراکز کو اور مستحکم کیا، اور ان مراکز سے فقہ وفتاوی کا چشمہ بعد کے ادوار میں بھی جاری رہا، ان فقہی مراکز میں مشہور سات ہیں: مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر، اور یمن۔

ابتداء میں متعدد فقہی مسالک رائج ہوئے؛ لیکن رفتہ رفتہ اکثر فقہی مسالک گردش زمانہ کی نذر ہوگئے، جو فقہی مسالک محفوظ رہے اور آج تک محفوظ ہیں اور ان پر لوگ عمل پیرا ہیں، وہ اہل سنت والجماعت میں فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی، فقہ حنبلی، اور اہل تشیع میں فقہ جعفری، فقہ زیدی اور ان کے علاوہ فقہ اباضی ہیں۔

عہد رسالت میں قرآن وحدیث دو مصادر تھے، آپ ﷺ کے بعد قرآن وحدیث کے علاوہ اجماع صحابہ بھی مصدر شرع قرار پایا، اس کے بعد اجتہاد وقیاس، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم استنباط احکام میں دوسرے درجہ کے مصادر جیسے مصالح مرسلہ وغیرہ کا بھی استعمال کرتے تھے، مجتہدین کے عہد میں قرآن وحدیث، اجماع وقیاس کے علاوہ اقوال صحابہ کا اضافہ ہوا، اور دوسرے درجہ کے مصادر جیسے مصالح مرسلہ، استحسان، اور سد ذرائع وغیرہ کا بھی اضافہ ہوا گو کہ ان کی حجیت پر میں تمام علماء کا اتفاق نہیں۔

تمام صحابہ کرام فتوی نہیں دیتے تھے بلکہ بعض ہی دیتے تھے، البتہ ان میں بعض مکثرین ہیں، بعض متوسطین اور بعض مقلین ہیں، مکثرین میں سرفہرست حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں، متوسطین میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ، اور مقلین میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں۔

فقہاء صحابہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں، فقہاء تابعین میں سعید بن مسیبؒ، نافعؒ، علقمہؒ، ابراہیم نخعیؒ، حسن بصریؒ، عطا بن ابی رباحؒ، اور محمد بن سیرینؒ زیادہ مشہور ہیں۔

تیسری صدی ہجری میں ظاہری مسلک کا ظہور ہوا، جس کے بانی امام داؤد بن علی متوفی 270ھ تھے، انہوں نے قیاس کا انکار کیا اور ظاہری قرآن پر عمل کرنے کو ترجیح دی۔

جہاں تک دور وسطی کے مجتہدین وفقہاء کی بات ہے تو اس دور میں ان کی بڑی تعداد ہے، تاہم ان میں نامور شخصیات یہ ہیں: قاضی عبدالوہاب مالکی، ابوالحسن احمد بن محمد قدوری، شمس الائمہ حلوانی، ابوالحسن علی بن محمد ماوردی، ابوعبداللہ علی دامغانی، شمس الائمہ سرخسی، علی بن محمد بزدوی، امام الحرمین جوینی، امام غزالی، ابوالولید محمد بن احمد قرطبی، طاہر بن احمد بخاری، ملک العلماء کاسانی، قاضی خاں، صاحب ہدایہ مرغینانی، صاحب بدایۃ المجتہد ابن رشد مالکی، ابوالقاسم عبدالکریم رافعی، امام نووی، ابوالبرکات نسفی حنفی، شیخ

الاسلام ابن تیمیہ، زیلعی حنفی، ابن ہمام حنفی، زکریا انصاری شافعی، ابراہیم حلبی، ابن نجیم مصری، شہاب الدین ابن حجر ہیتمی، ابوعبداللہ خرشی مالکی اور علامہ ابن عابدین شامی۔

14.11 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. عہد نبوی میں فقہ کے موضوع پر روشنی ڈالیے۔
2. عہد صحابہ میں احکام شریعت کے طریقہ استنباط کا تعارف کرائیے۔
3. صغار صحابہ و تابعین کے عہد میں فقہ کا تذکرہ کیجیے۔
4. فقہ کے مراکز کون کون سے ہیں؟ ان میں سے دو کا تعارف کرائیے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. اصحاب رائے فقہاء صحابہ کا تعارف کرائیے۔
2. فقہی مرکز مدینہ منورہ پر روشنی ڈالیے۔
3. دور وسطی کے تین نمایاں فقہاء کا ذکر کیجیے۔
4. دور جدید میں فقہ کے تین ماہرین کا تعارف پیش کیجیے۔

14.12 فرہنگ

ایفاء عہد	وعدہ پورا کرنا
احوال شخصیہ	جن احکام میں دو آدمیوں کے درمیان دوطرفہ مالی بنیاد پر تعلقات قائم نہ ہو، ایک طرف ہو یا بالکل نہ ہو
تشریع	قانون سازی کرنا، فقہی مسائل مستنبط کرنا
شارع	قانون ساز، مراد اللہ کی ذات
عدول	کسی دلیل کی بناء پر ایک مسلک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے مسلک کی رائے کو اختیار کرنا
مذموم	برا، معیوب
مسلمہ اصول	تسلیم شدہ اصول
دفع مفسدہ	بگاڑ کو دور کرنا

مرض الموت	وہ بیماری جس میں انسان کی موت واقع ہو
سد باب	دروازہ بند کرنا
غواص	غوطہ خور، غوطہ لگانے والا
مفروضہ احکام	وہ مسائل جو ابھی پیش نہ آئے ہوں ان کا شرعی حکم
خشت اول	پہلی اینٹ
حربی	دارالحرب کا رہنے والا

14.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. فقہ اسلامی ۔ تدوین و تعارف : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
2. قاموس الفقہ : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
3. فقہ اسلامی ۔ تعارف اور تاریخ : پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
4. برصغیر میں علم فقہ : محمد اسحاق بھٹی
5. فتاوی دارالعلوم دیوبند (مقدمہ) : مرتب: مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی

اکائی 15 : فقہی مسالک

اکائی کے اجزاء

15.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو اس بات سے واقف کرانا ہے کہ فقہی مسالک سے کیا مراد ہے؟ اہل سنت والجماعت اور دوسرے مکاتب فکر کے فقہی مذاہب کیا ہیں؟ ان کی تشکیل کس طرح عمل میں آئی؟ ان کے خصائص وامتیازات کیا ہیں، اور ان کے نمائندہ فقہاء کون کون ہیں؟۔

15.2 تمہید

اس اکائی میں سب سے پہلے فقہی مسالک کا مفہوم اور ان کے بانیان کا تذکرہ ہوگا، ان کی عملی تشکیل پر روشنی ڈالی جائے گی، اس میں اہل سنت والجماعت کے فقہی مذاہب کے ساتھ اہل تشیع کے فقہی مذاہب اور اباضیہ کا بھی ذکر آئے گا، ان سب کی خصوصیات وامتیازات اور ان کے مشہور فقہاء کے حالات سے بھی واقف کرایا جائے گا۔

15.3 فقہی مسالک

فقہی مسالک سے مراد وہ مختلف رجحانات ہیں جو مختلف مجتہدین اور فقہاء نے نصوص شریعت یعنی قرآن وحدیث سے احکام کے استنباط میں اختیار کیے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج جس انداز میں فقہی مسالک مشہور ہیں، اس انداز میں عہد صحابہ میں موجود نہیں تھے؛ لیکن ان رجحانات کی بنیاد اُسی دور میں پڑ چکی تھی، پچھلی اکائی میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ صحابہ کے درمیان دو جماعتیں پائی جاتی تھیں، ایک اہل حدیث جو نصوص کے ظاہری الفاظ پر اپنی نگاہ مرکوز رکھتے تھے، نصوص کے اندرون غواصی کے قائل نہیں تھے، اسی وجہ سے بعض اوقات کوئی مسئلہ ان کے سامنے پیش ہوتا، اگر اس کا حکم قرآن وحدیث کے ظاہری الفاظ میں نہیں ملتا تو وہ توقف کرتے اور جواب دینے سے انکار کردیتے، دوسری جماعت اصحاب رائے فقہاء کی تھی، یہ فقہاء صحابہ قرآن وحدیث کے معانی کے غواص تھے، اور شرعی احکام کے استنباط میں شریعت کی مصالح اور لوگوں کے احوال کو بھی پیش نظر رکھتے تھے، یہ دونوں رجحانات ان دونوں طرح کے فقہاء صحابہ کے شاگردوں میں منتقل ہوئے اور اس دور کے تابعین میں ان کے طرز استنباط کا یہ فرق اور زیادہ نمایاں ہوگیا۔

ایک وقت آیا کہ صحابہ کرام عالم اسلام کے مختلف شہروں میں پھیل گئے اور انھوں نے وہاں رہائش اختیار کر لی، جس کے نتیجہ میں طرز استنباط کے اس فرق کو اور فروغ ملا، اور مسائل میں اختلافات بڑھ گئے، تابعین نے ان رجحانات کو لیا، اور زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ یہی رجحانات فقہی مسالک کی شکل اختیار کر گئے۔

ابتدا میں مسالک متعدد تھے؛ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا سیاسی حالات اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر بعض مسالک کے علماء اور ماننے والے کم ہوتے چلے گئے، اور ان کی فقہی آراء مدون نہ ہوسکیں، جن مسالک کو علما زیادہ میسر ہوئے انہوں نے اپنے اپنے مسالک کی فقہی آراء کو مدون کیا اور مزید ان میں نکھار پیدا کیا، اور نقلی وعقلی دلائل سے ان آراء کو مضبوط کیا، حسن اتفاق یہ کہ ہر دور میں ان مسالک کو باصلاحیت علماء ملتے رہے ہیں جو اپنے بعد والوں تک انہیں محفوظ طریقہ پر منتقل کرتے رہے، یہاں تک کہ آج بھی وہ باقی ہیں اور لوگ ان پر عمل کر رہے ہیں، یہی وہ مسالک ہیں جن کو ہم حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، اہل حدیث، جعفریہ، زیدیہ اور اباضیہ کے ناموں سے جانتے ہیں۔

15.4 حنفی

اہل سنت والجماعت کے چاروں مذاہب میں سب سے قدیم مذہب حنفی ہے، اس کی نشو ونما کوفہ میں ہوئی جہاں ایک ہزار سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خیمہ زن ہوئے، جن میں 24 / بدری صحابہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا دار الخلافہ اسی شہر کو بنایا، فقہی احکام کی باضابطہ تدوین کا عمل سب سے پہلے اسی شہر میں امام ابوحنیفہؒ کی قیادت میں ہوا، اسی وجہ سے یہ فقہ امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب ہوکر فقہ حنفی کہلائی، یہ مذہب آہستہ آہستہ پورے عراق پھر مصر، فارس، بخارا، بلخ، روم، فرغانہ، ہندوستان کے اکثر حصے اور یمن کے کچھ حصوں میں پھیل گیا، اس مذہب کے پھیلنے کی بنیادی وجہ عہدۂ قضا پر حنفی قاضیوں کا فائز رہنا ہے، خلافت ہارون رشید کے دور میں امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام ابویوسفؒ قاضی القضاۃ مقرر ہوئے، حکومت کے ہر علاقے میں ان ہی کے حکم سے قاضی مقرر ہوتا تھا، زیادہ تر قاضی کا رقضا میں ان پر اعتماد کرتے تھے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ فقہ حنفی کی نشر واشاعت اور حفاظت وتدوین میں امام ابویوسفؒ کا بڑا حصہ ہے، اسی طرح ان کے بعد بھی سلطنت کے منصب قضا پر زیادہ تر حنفی قاضی ہی مقرر ہوتے رہے ہیں، اور حکومت کا مذہب حنفی رہا، جس کی وجہ سے اس مذہب حنفی کی بہت زیادہ ترویج واشاعت ہوئی۔

اسد بن فرات بن سنان حنفی فقیہ جب شمالی افریقہ کے علاقے جو لیبیا، تیونس اور الجزائر پر مشتمل ہے، کے قاضی مقرر ہوئے تو ایک عرصہ تک یہاں بھی حنفی مذہب غالب رہا یہاں تک کہ معز بن بادیس کے ہاتھ اقتدار آیا تو اس نے مالکی مذہب کی اشاعت کی، جس کی وجہ سے آج اس علاقے کی اکثریت مالکی مذہب پر ہے۔

ادھر قاضی اسماعیل بن یسع حنفی کے ذریعہ مصر میں حنفی مذہب پہنچا جب وہ یہاں کے قاضی مقرر ہوئے، اس کے بعد نشیب وفراز آتا رہا، یہاں تک کہ جب مصر میں عثمانی حکومت آئی، تو یہاں کا منصب قضا احناف کے لئے خاص ہوگیا جس کی وجہ سے اس ملک میں مذہب حنفی کو دوبارہ قوت حاصل ہوگئی، اس طرح آج بھی یہاں مذہب حنفی پر عمل کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔

آج کی دنیا میں عراق، خراسان، بجستان، جرجان، طبرستان، افغانستان، ترکمانستان، تاجکستان، قزاقستان، بوسنیا، البانیہ، شام، ترکی، برما، بنگلہ دیش، ہندوپاک اور ایران کے سنی علاقوں میں مذہب حنفی کے ماننے والے کثرت سے موجود ہیں، انڈونیشیا، سری لنکا، تھائی لینڈ، ملیشیا، سعودی عرب، کویت، بحرین اور برازیل وغیرہ میں بہت کم ہیں، ایک اندازہ کے مطابق احناف دنیا کے کل مسلمانوں کا دو تہائی حصہ ہیں۔

فقہ حنفی کا سلسلہ اسناد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جا کر ختم ہوتا ہے، فقہ حنفی کا رشتہ ان کے علاوہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ملتا ہے، جن کے شاگردوں سے امام ابوحنیفہؒ نے استفادہ کیا، ان کی تعداد مورخین نے کم وبیش چار ہزار لکھی ہے۔ اس کے بعد حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے چالیس باکمال شاگردوں کے ذریعہ فقہ حنفی کی تدوین عمل میں آئی، ان مدون مسائل کو ان کے مشہور شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی نے کتابی شکل میں محفوظ کیا، اور ان کے دوسرے شاگرد امام ابو یوسف کا بھی فقہ حنفی کی حفاظت وتدوین اور نشر واشاعت میں بڑا حصہ رہا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا طرز استنباط اور استخراج مسائل یہ تھا جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ اور دوسرے علماء نے بیان کیا ہے کہ آپ پہلے قرآن کو اختیار کرتے، اگر اس میں نہیں ملتا تو سنت رسول ﷺ پر عمل کرتے، اگر سنت رسول میں بھی نہیں ملتا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال پر نظر ڈالتے، اگر ان میں باہم اختلاف ہوتا تو جس صحابی کا قول قرآن وحدیث سے زیادہ قریب ہوتا اسے قبول کر لیتے اور اس حد سے باہر تجاوز نہیں کرتے، اور اگر اتفاق سے صحابہ کا بھی کوئی قول نہیں ملتا تو تابعین میں سے کسی کا قول اختیار نہیں کرتے بلکہ خود اجتہاد کرتے، جیسا کہ دوسرے لوگ کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب امام ابوحنیفہؒ نے تدوین فقہ کی مجلس آراستہ کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنت اجتماعی اجتہاد کی تجدید کی تو اپنے شاگردوں میں سے چالیس باکمال افراد کا انتخاب کیا، جو تفسیر، حدیث، اسماء الرجال اور دیگر اسلامی علوم کے ماہر تھے، کاروبار اور تجارت کے حالات سے خود آپ واقف تھے، اس کے باوجود امام محمدؒ کی ڈیوٹی تھی کہ روزانہ بازار جا کر مروجہ معاملات معلوم کر کے آئیں اور یہاں مجلس میں پیش کریں، طریقہ کار یہ تھا کہ مجلس میں مسئلہ پیش ہوتا، اولاً قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں غور کیا جاتا، اگر ان میں کوئی دلیل نہ مل پاتی، تو اقوال صحابہ کی طرف رجوع کیا جاتا، اگر ان سے بھی کوئی رہنمائی نہ ملتی تو قرآن وحدیث میں صراحت کردہ مسائل سے علت کا استخراج کیا جاتا اور علت میں اشتراک کی بنیاد پر قیاس کیا جاتا، کبھی استحسان سے بھی کام لیا جاتا، کافی بحث ومباحثہ کے بعد طے ہونے والے مسائل درج رجسٹر کر لئے جاتے، اس بڑے اہتمام کے ساتھ ایک نئی ترتیب کے ساتھ فقہ مدون ہوئی، یہ نئی ترتیب فقہی ابواب وموضوعات کی ترتیب کہلائی اور معروف ہوگئی، جس میں پہلے طہارت اس کے بعد ترتیب سے عبادات کے دوسرے ابواب، پھر مناکحات، معاملات وغیرہ، جیسا کہ آج کل فقہ کی کتابوں میں ترتیب ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک اندازہ کے مطابق اس مجلس سے طئے پانے والے تقریباً پانچ لاکھ مسائل مرتب ہوئے۔ معلوم ہوا کہ فقہ حنفی صرف امام ابوحنیفہؒ کی آراء واجتہادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ چالیس مایہ ناز اور ماہرین علماء وفقہاء اور محدثین کی کاوشوں اور اجتہادات کے نتیجہ کا نام فقہ حنفی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی اجتہاد فقہ حنفی کا طرۂ امتیاز ہے، اور اس اجتماعی طریقہ اجتہاد میں آزادانہ بحث ونقد نے فقہ حنفی میں نصوص ورائے اور مقاصد شریعت اور انسانی مصالح کے درمیان ایک خاص قسم کا توازن پیدا کر دیا ہے، اسی میں فقہ حنفی کی مقبولیت اور مدتوں عالم اسلام پر اس کی فرماں روائی کا راز پوشیدہ ہے۔

15.4.1 فقہ حنفی کی خصوصیات

بعض خصوصیات و امتیازات ہر فقہی مسلک کی ہیں جو اس کو دوسرے مما لک سے ممتاز کرتے ہیں، آگے کی سطروں میں ہر فقہی مذہب کی خصوصیات کا ذکر آئے گا، فقہ حنفی کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

1. فقہ حنفی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تدوین اجتماعی اجتہاد کے طریقہ پر ہوئی ہے، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے منہج پر ہوئی ہے۔
2. فقہ حنفی کی ایک بڑی خصوصیت شخصی آزادی کی رعایت ہے؛ چنانچہ فقہ حنفی میں بالغ لڑکی کو اپنے نفس پر مکمل اختیار دیا گیا ہے، وہ ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح آپ کرسکتی ہے جب کہ اکثر فقہاء کے یہاں اس کے اختیارات محدود ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے نکاح کا ایجاب وقبول بھی نہیں کرسکتی۔
3. غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور مذہبی وانسانی حقوق کی رعایت ولحاظ جس درجہ فقہ حنفی میں ہے کسی اور مذہب میں نہیں ہے؛ چنانچہ غیر مسلموں کو اپنے اعتقادات ومعاملات کے بارے میں آزادی ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسلمان سے بھی غیر مسلم شہری کے قتل پر قصاص لیا جائے گا، جب کہ دوسرے فقہاء کے یہاں مسلمان غیر مسلم کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔
4. چوتھی اہم خصوصیت یہ ہے کہ فقہاء احناف نے دین کے مسلمہ اصول اور عقل سے ہم آہنگی کا خاص خیال رکھا ہے، مثلاً: شریعت کی ایک تسلیم شدہ اصل یہ ہے کہ انسان کا جسم پاک ہے، اس کا چھونا موجب نجاست نہیں، یہ عقل ودانش کے مطابق بھی ہے، اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ نے شرمگاہ یا عورتوں کے چھونے کو ناقض وضو قرار نہیں دیا۔
5. پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ فقہ حنفی میں انسانی ضروریات اور مجبوریوں کا خیال، اور شریعت کے اصل مزاج، آسانی اور دفع حرج کا لحاظ قدم قدم پر نظر آتا ہے، مثلاً: امام ابوحنیفہؒ نے پانی کے زیادہ اور کم کی مقدار کی کوئی تحدید نہیں کی، اس کو ان لوگوں کی رائے پر رکھا جو خود پانی کی پاکی یا ناپاکی کے مسائل سے دوچار ہوں، روزہ میں اصل تو یہی ہے کہ روزہ شروع ہونے سے پہلے روزہ کی نیت کرلی جائے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ روزہ ایسے وقت شروع ہوتا ہے کہ عین اسی وقت نیت کو ضروری قرار دینا مشقت سے خالی نہیں، اس مجبوری کو دور کرنے کے لئے امام ابوحنیفہؒ نے روزہ کا وقت شروع ہونے کے بعد بھی نیت کو کافی قرار دیا، اور فقہ حنفی میں صراحت کی گئی کہ صبح صادق سے افطار تک جتنا وقت ہوتا ہے اس کے نصف تک نیت کرنے کی گنجائش ہے۔
6. امام ابوحنیفہؒ کوفہ کے بڑے تاجر تھے، اس لئے قانون تجارت میں تفصیل اور گہرائی جتنی فقہ حنفی میں ملتی ہے کسی اور کے یہاں نہیں ملتی، چنانچہ بیع سلم میں چوں کہ مبیع موجود نہیں ہوتی ہے، اس لئے امام ابوحنیفہ نے ضروری قرار دیا کہ اس شئی کی جنس، نوعیت، مقدار، صفت، ادائیگی کی مدت اور مبیع کی حوالگی کے مقام کے علاوہ کس شہر کی صنعت ہے؟ اس کی صراحت بھی کردی جائے کہ مختلف علاقوں اور شہروں کی صنعتوں اور ان کی قیمتوں میں قابل لحاظ فرق ہوتا ہے۔
7. فقہ حنفی کی ساتویں خصوصیت ''فقہ تقدیری'' ہے، یعنی مسائل کے پیش آنے سے پہلے آئندہ ممکن الوقوع مسائل کے حل کی طرف توجہ دی جائے۔

8. فقہ حنفی کی بڑی اہم خصوصیت ''حیلۂ شرعی'' ہے، حیلہ کے اصل معنی معاملات کی تدبیر میں مہارت کے ہیں۔شریعت کی اصطلاح میں حرمت ومعصیت سے بچنے کے لئے ایسی خلاصی کی راہ اختیار کرنے کا نام ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہو۔

15.4.2 فقہ حنفی کے مشہور فقہاء

یہاں دوسری صدی کے اوائل سے چوتھی صدی ہجری کے ختم تک کے مشہور فقہاء احناف کا ذکر کیا جاتا ہے؛ کیوں کہ چوتھی صدی کے بعد کے فقہاء کا ذکر پچھلی اکائی میں دور وسطی اور دور جدید کے ذیل میں آچکا ہے۔

1. امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطیؒ (80ھ-150ھ): راجح قول کے مطابق آپ کو متعدد صحابہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے، مجتہد تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے طریقۂ اجتہاد اور منہج استنباط کے وارث اور ترجمان تھے، امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے محتاج ہیں، آپ ایک بڑے محدث بھی تھے، چنانچہ ابوالمؤید محمد بن محمود خوارزمی (665ھ) نے آپ کے تلامذہ سے مروی احادیث کو ''جامع المسانید'' کے نام سے جمع کردیا ہے، یہ کتاب مصر سے طبع ہوئی ہے، اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے، امام ابوحنیفہ کی فقہی آراء کو جاننے کا اہم ذریعہ امام ابویوسف اور امام محمد کی کتابیں ہیں۔
2. امام ابویوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب انصاریؒ (113ھ-183ھ): آپ امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد ہیں، ابن ابی لیلی سے بھی آپ کو تلمذ حاصل ہے، مجتہد اور فقیہ ہونے کے ساتھ حافظ حدیث بھی تھے، مہدی، ہادی اور ہارون رشید تینوں خلفاء کے دور میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے ہیں، آپ اسلامی تاریخ کے پہلے قاضی القضاۃ تھے، ابن ندیم نے اپنی کتاب ''الفہرست'' میں آپ کی املاءات میں کتاب الصلوۃ اور کتاب الزکاۃ کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ آپ کی اور بھی کتابیں ہے؛ البتہ ان میں زیادہ مشہور ''کتاب الخراج'' ہے اور یہ مطبوعہ ہے، اسی طرح ایک کتاب '' اختلاف ابي حنيفة و ابن أبي ليلى '' بھی ہے جو دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔
3. امام محمد بن حسن بن فرقد شیبانیؒ (122ھ-198ھ) آپ نے مسعر بن کدام، امام اوزاعی، سفیان ثوری اور امام مالک سے حدیث کا درس لیا، البتہ فقہ وحدیث میں امام ابوحنیفہ کے درس سے زیادہ متاثر ہوئے، امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد امام ابویوسفؒ سے استفادہ کیا، بغداد میں قیام کے دوران امام شافعیؒ نے آپ سے خوب استفادہ کیا یہاں تک کہ امام شافعیؒ کی کتاب الام پر امام محمدؒ کے طریقۂ تالیف کی گہری چھاپ ہے، امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ میں نے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم امام محمدؒ سے حاصل کیا، امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کو یہ دقیق مسائل کہاں سے حاصل ہوئے؟ فرمایا: امام محمدؒ کی کتابوں سے۔

فقہ حنفی کا مدار امام محمد کی کتابوں پر ہے، اور امام محمد خود بھی مجتہد مطلق تھے، آپکی کتابوں کی تعداد (990) ہے جن میں یہ مشہور ہیں: المبسوط، الجامع الکبیر، الجامع الصغیر، السیر الکبیر، السیر الصغیر، الزیادات، یہ چھ کتابیں ظاہر روایت کہلاتی ہیں۔

4. امام ابوحنیفہ کے تیسرے مشہور شاگرد زفر بن ہذیل (متوفی 158ھ) مجتہد مطلق تھے، بڑے ذہین وفطین تھے، بڑے قیاس کرنے والے تھے، یہاں تک کہ آپ کی زبردست قوت قیاس کی خود امام شافعیؒ کے شاگرد امام مزنی نے بڑی ستائش کی ہے۔اس کے باوجود امام زفر کا بیان ہے: ''ہم (احناف) رائے پر اسی وقت تک عمل کرتے ہیں جب تک کہ کوئی حدیث سامنے نہ آئے، اور جب کوئی حدیث سامنے آگئی (جو رائے کے خلاف ہے) تو اس رائے کو ہم ترک کردیتے ہیں''۔

5. امام ابوحنیفہ کے چوتھے مشہور شاگرد حسن بن زیاد لؤلؤی (متوفی 204ھ) ہیں، آپ نے امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ سے بھی استفادہ کیا ہے، آپ کی تالیفات میں سے ایک کتاب ''المجرد'' ہے، نیز ان کی کچھ امالی بھی ہیں۔

6. احمد بن عمر خصاف (متوفی 261ھ): یہ تیسری صدی ہجری کے مشہور فقیہ ہیں، آپ کی تالیفات بہت ہیں، ان میں سے ایک ''الاسعاف في أحكام الأوقاف'' ہے۔

7. احمد بن محمد طحاوی مصری (متوفی 321ھ): آپ چوتھی صدی کے اوائل کے مشہور محدث وفقیہ ہیں، آپ کی تالیفات بہت ہیں، ان میں سے اہم اور مطبوعہ حدیث میں ''معانی الآثار'' اور دوسری ''مشکل الآثار ہیں''، اور فقہ میں ''مختصر طحاوی'' ہیں۔

8. ابوالحسن عبداللہ بن حسن کرخیؒ (260ھ-340ھ): آپ عراق میں حنفی مذہب کے امام تھے، علماء نے آپ کو فروعی مسائل میں مجتہد قرار دیا ہے، آپ کی تالیفات متعدد ہیں، ان میں سے مختصر طحاوی، الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر کی شرحیں ہیں۔

9. ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص (متوفی 370ھ): امام کرخی کے شاگرد اور ان کی وفات کے بعد حنفی مذہب کے امام کہلائے، آپ نے مختصر کرخی، مختصر طحاوی، اور الجامع للامام محمد کی شرحیں لکھیں، آپ کی ایک مشہور کتاب ''ادب القضاۃ'' بھی ہے، اور آیات احکام کی پہلی شاہکار تفسیر احکام القرآن (3/جلدیں) ہے جو کہ مطبوعہ اور متداول ہے۔

10. ابوجعفر محمد بن عبداللہ بلخی ہندوانی (متوفی 362ھ): بلخ کے ائمہ میں سے تھے، ان کو ابوحنیفہ صغیر کہا جاتا تھا۔

11. ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی (متوفی 373ھ): امام الھدی سے مشہور ہیں، آپ کی تالیفات نوازل، عیون، فتاوی، خزانۃ الفقہ اور الجامع الصغیر کی شرح ہیں۔

12. ابوعبداللہ یوسف بن محمد جرجانی (متوفی 398ھ): آپ امام کرخی کے شاگرد ہیں، بہت سی کتابیں تالیف کی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مفصل اور مشہور ''خزانۃ الأکمل'' (6/جلدیں) ہے۔

15.5 مالکی

فقہ حنفی کے بعد جس فقہ کی تدوین عمل میں آئی اور جس کے ماننے والے ایک بڑی تعداد میں دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ ہے فقہ مالکی، یہ مذہب حضرت امام مالک بن انسؒ کی طرف منسوب ہو کر مالکی کہلایا، اس کی نشوونما مدینہ منورہ میں ہوئی جہاں قرآن مجید کی نوے فیصد آیات احکام نازل ہوئیں، اسی طرح زیادہ تر حدیثوں کا تعلق بھی مدنی زندگی سے ہے، حضورﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کا دارالخلافہ مدینہ تھا، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ابتدائی دور بھی مدینہ ہی میں گذرا، اسی لئے صحابہ کی بڑی تعداد یہیں مقیم رہی، نیز حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی روایات واحادیث اور فتاوی سے مدینہ کی فضائیں گونج رہی تھیں، ان کے بعد ان حضرات صحابہ کے تربیت یافتہ باکمال شاگردوں کی ایک بڑی جماعت، ان میں بالخصوص سعید بن مسیبؒ، عروہ بن زبیرؒ، قاسم بن محمد بن ابوبکرؒ، خارجہ بن زید بن ثابتؒ، عبیداللہ بن عبداللہ بن مسعودؒ اور سالم بن عبداللہؒ جو فقہاء سبعہ سے مشہور ہیں، پوری زندگی اسی شہر میں مقیم رہے، یہ فقہاء سبعہ اجتماعی طور پر مسائل پر غور کرتے تھے، اور ان کے فتاوی کو خاص اہمیت واعتبار حاصل تھا، مزید برآں حج کے موقع پر علماء ومحدثین روضہ اطہر کی زیارت کے لئے مدینہ میں جمع ہوتے تھے، اس طرح قدرتی طور پر امام مالک کو مختلف اہل علم سے تبادلۂ

خیال، بحث و مناقشہ اور استفادہ کے قیمتی مواقع حاصل ہوئے تھے، غرضیکہ اس طرح فقہ مالکی دراصل صحابہ و تابعین کے عہد کے فقہاء مدینہ کی فقہ کی ایک مرتب صورت ہے، جس میں روایت حدیث اور رائے دونوں کا بہترین امتزاج ہے۔

مذہب مالکی آہستہ آہستہ مدینہ سے باہر پورے حجاز، یمن، شام، بصرہ، مصر، اندلس، مراکش، سسلی، اور سوڈان وغیرہ میں بھی پھیل گیا، لیبیا، تیونس، اور الجزائر وغیرہ میں اس مذہب کو اس وقت غلبہ حاصل ہوا جب کہ معزبن بادلیس نے 407ھ میں اس علاقے کا اقتدار سنبھالا اور یہاں کے لوگوں کو مذہب مالکی پر عمل کے لئے مجبور کر دیا۔

آج یہ مذہب مراکش، موریطانیہ، تیونس، الجزائر اور لیبیا میں موجود ہے، اور ان علاقوں میں اس مذہب کے پیروکار بکثرت ہیں، تاہم مصر، سوڈان، لبنان اور حجاز میں بھی ان کی اقلیت موجود ہے، (1930ء) میں لگائے گئے اندازے کے مطابق اس مذہب کے پیروکاروں کی تعداد چار کروڑ تھی۔

فقہ مالکی کا سلسلہ نسب حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کی زبانی یہ ہے کہ فقہ مالکی میں اول درجہ متصل یا مرسل حدیث کو حاصل ہے، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے فیصلہ جات، پھر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے فتاوی، اس کے بعد دوسرے مدنی صحابہ کے فتاوی کا درجہ ہے، اس کے بعد مدینہ منورہ کے مشہور اصحاب افتاء — سعید بن مسیبؒ، عروہ بن زبیرؒ، قاسمؒ، سالمؒ، سلیمان بن یسارؒ، ابو سلمہؒ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارثؒ، ابوبکر عمرو بن حزم اور خلیفہ راشد حضرت عمر بن [illegible]ؒ — کے فتاوی کو اہمیت حاصل ہے۔

بعد کے ادوار میں جن شخصیات نے فقہ مالکی کی تدوین و ترویج میں حصہ لیا وہ کل آٹھ ہیں، ان میں سب سے پہلی شخصیت امام مالکؒ کے محبوب شاگرد عبداللہ بن وہب کی ہے، جو اپنے استاذ امام مالکؒ کی صحبت میں بیس سال رہے، اور ان سے روایت و فتاوی نقل کئے، دوسری شخصیت عبدالرحمٰن بن قاسم کی ہے، یہ بھی امام مالکؒ کے ساتھ بیس سال رہے، ان کی حیثیت فقہ مالکی کی ترتیب و تدوین میں وہی ہے جو امام محمد کو فقہ حنفی میں ہے، المدونہ میں آپ ہی کے ذریعہ امام مالکؒ کے افادات اور مرویات جمع ہوئے، تیسری شخصیت اشہب بن عبدالعزیز کی ہے، جن کے تفقہ کی ستائش امام شافعیؒ نے کی، چوتھی شخصیت اسد بن فرات کی ہے، جنہوں نے امام مالکؒ کے بعد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے بھی استفادہ کیا، اور آپ ہی ''المدونہ'' کی تدوین و ترتیب کے اصل محرک بنے۔

امام مالکؒ کے اہم تلامذہ میں سے ایک عبدالملک بن ماجشون کا نام بھی آتا ہے، امام مالکؒ کے بعض فتاوی ان کے ذریعہ بھی منقول ہیں، فقہ مالکی کی تدوین و ترتیب میں سب سے نمایاں کام عبدالسلام بن سعید سحنون کا ہے، گو ان کو امام مالک سے راست شرف تلمذ حاصل نہیں ہوا، لیکن امام مالکؒ کے تین باکمال شاگرد ابن وہب، ابن قاسم، اور اشہب سے شرف تلمذ حاصل ہے، ''المدونہ'' کی موجودہ صورت کے مرتب یہی ہیں۔

سحنون کے شاگرد محمد بن احمد العتبی نے ''العتبیة'' یا ''المستخرجة''، مرتب کی اور ابن ماجشون کے شاگرد عبدالملک بن حبیب نے ''الواضحة'' مرتب کی ہے۔

اس طرح ان آٹھ شخصیتوں کو فقہ مالکی کی تدوین و ترتیب اور ترویج میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

جہاں تک طریقہ استنباط کی بات ہے تو عام مجتہدین کی طرح امام مالکؒ نے بھی سب سے پہلے احکام کے لئے قرآن پر اعتماد

کیا، اس کے بعد حدیث رسول پر، قبول حدیث کے سلسلہ میں محدثین حجاز اور اہل مدینہ کے عمل کو زیادہ اہمیت دیتے، خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فتاوی اور فیصلہ جات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، اس کے بعد دوسرے مدنی صحابہ کے فتاوی، پھر مدینہ کے فقہائے سبعہ کے فتاوی کو اہمیت دیتے تھے، اگر قرآن وحدیث میں کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو اجتہاد وقیاس کرتے تھے، آپ مصالح مرسلہ کو بھی معتبر سمجھتے تھے، سد ذرائع کی بھی آپ کے نزدیک کافی اہمیت تھی، چنانچہ صورت واقعہ پر نظر رکھنے کے بجائے اس سے پیدا ہونے والے نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے فیصلہ فرماتے، اور جو امور حرام اور بگاڑ کا ذریعہ بنتے ہوں ان سے بھی روک دیتے۔

15.5.1 فقہ مالکی کی خصوصیات

فقہ مالکی کی چند خصوصیات ہیں، اور وہ یہ ہیں۔

1. فقہ مالکی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں روایت اور رائے دونوں کی رعایت کی گئی ہے؛ کیوں کہ امام مالکؒ جہاں ایک طرف بڑے محدث تھے تو دوسری طرف روایات میں درایت سے بھی کام لیتے تھے۔
2. طہارت ونجاست کے احکام میں جتنی آسانی مذہب مالکی میں ہے کسی اور مذہب میں نہیں ہے، دیکھئے مالکیہ کے یہاں پانی ناپاک ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پانی کے اوصاف میں تغیر واقع ہو جائے، خواہ پانی کی مقدار کم ہو یا زیادہ، ٹھہرا ہو یا جاری، جب کہ حنفیہ، شوافع اور حنابلہ کے ہاں پانی کی قلیل مقدار میں نجاست گر جائے تو ناپاک ہو جائے گا، چاہے پانی کے اوصاف میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی ہو۔
3. اسی طرح معاملات میں بھی فقہ مالکی میں ایک گونہ آسانی کی راہ اختیار کی گئی ہے، مثلاً قبضہ سے پہلے خرید وفروخت کی ممانعت کا حکم غذائی اشیاء سے ہے، دوسری چیزوں سے نہیں، مالکیہ کی اس رائے کو اختیار کرنے میں بہت سے معاملات جواز کے دائرہ میں آجائیں گے۔
4. شخصی اور عائلی قوانین میں فقہ مالکی انسانی فطرت اور معاشرتی مصلحت سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہے، جیسے: تنگ دست اور قدرت کے باوجود نفقہ سے بے پرواشوہر کی بیوی کے لئے حق تفریق، خلع میں قاضی کو خصوصی اور وسیع اختیار اور شدید اختلاف کی صورت میں جبری خلع کی گنجائش وغیرہ۔
5. آزادیٔ رائے کا احترام، اس کی واضح مثال اس وقت سامنے آتی ہے جب کہ خلیفہ وقت ہارون رشید نے اجازت چاہی کہ ان کی کتاب "المؤطا" کعبہ میں لٹکا دی جائے اور لوگوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ اسی کے مطابق عمل کریں، آپ نے اسے پسند نہیں فرمایا، اور کہا کہ خود رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے درمیان فروعی مسائل میں اختلاف رہا ہے۔
6. امام مالکؒ کے یہاں مصالح کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے کہ فقہ مالکی کی یہ خصوصیت شمار کی جانے لگی کہ آسانی وسہولت اور مصالح کی رعایت فقہ مالکی میں زیادہ ہے۔

15.5.2 فقہ مالکی کے مشہور فقہاء

1. امام دار الہجرۃ مالک بن انس بن مالک بن ابو عامر (93ھ-179ھ): آپ ایک عظیم محدث اور بلند پایہ فقیہ تھے، مجتہد مطلق تھے، امام سفیان بن عیینہ نے بشارت نبوی "لوگ علم کی تلاش میں سفر کریں گے اور مدینہ کے عالم سے بڑا کوئی عالم نہیں پائیں گے" کا مصداق

آپ ہی کو قرار دیا۔ آپ نے درس وتدریس کی مجلس اس وقت تک آراستہ نہیں کی جب تک کہ ستر شیوخ حدیث وفقہ نے اس بات کی گواہی نہ دیدی کہ اب آپ مسند درس کے قابل ہو چکے ہیں، آپ کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے کہ آپ کے حلقہ درس میں آپ کے بلند پایہ شاگردوں کے علاوہ آپ کے متعدد شیوخ نے بھی شرکت فرمائی۔

فقہ میں آپ کے خصوصی استاذ ربیعۃ بن عبدالرحمٰن ہیں، جو اپنے کثرت اجتہاد وقیاس کی وجہ سے ربیعہ الرائے سے مشہور ہوئے، ویسے آپ نے مدینہ کے فقہاء سبعہ سے بھی خوب استفادہ کیا، اور حج کے موقع سے ان علماء سے بھی استفادہ کیا جو روضہ اقدس کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ آیا کرتے تھے۔

آپ کی شاہکار تصنیف ''الموطأ'' ہے، جہاں یہ احادیث کا مجموعہ ہے، وہیں صحابہ وتابعین کے آثار، فتاوی اور آراء کا بھی مجموعہ ہے، آپ نے اس میں اپنی آراء بھی درج فرمائی ہیں، اس کے علاوہ آپ کے افادات اور فتاوی ''المدونہ'' میں بھی جمع کئے گئے، جیسا کہ آپ نے اس سے پہلے پڑھا۔

2. ابوالحسن علی بن زیاد تونسی (متوفی 182ھ): امام مالک اور لیث بن سعد سے کسب فیض کیا، اور فقیہ افریقہ سے معروف تھے۔
3. عبدالرحمٰن بن قاسم (متوفی 191ھ): امام مالکؒ کی صحبت میں بیس سال رہے، مجتہد مطلق کے درجہ پر فائز تھے، آپ ہی کے ذریعہ ''المدونہ'' میں امام مالک کے افادات وفتاوی جمع ہوئے۔
4. ابومحمد عبداللہ بن وہب بن مسلم مصری (125ھ-197ھ): امام مالک کی صحبت میں بیس سال رہے، مصر میں فقہ مالکی کے پھیلنے کا ذریعہ یہی بنے، کہا جاتا ہے کہ فقاہت میں ابن قاسم سے بڑھے ہوئے تھے، ان کو دیوان علم کا لقب دیا جاتا تھا، انہوں نے فقہ، روایت، اور عبادت تینوں کو جمع کر رکھا تھا۔
5. اشہب بن عبدالعزیز قیسی (150ھ-204ھ): امام شافعی کا بیان ہے کہ میں نے اشہب سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا، ان کی ایک کتاب '' مدونہ'' ہے جو مدونۃ اشہب سے معروف ہے، یہ سحنون کی مدونہ کے علاوہ ہے۔
6. اسد بن فرات (متوفی 213ھ): فقہ حنفی اور مالکی کے جامع تھے، آپ کی ایک کتاب ''الأسدیہ'' نامی ہے، جو ''المدونہ'' کی بنیاد واساس ہے۔
7. یحیی بن یحیی بن کثیر لیثی (متوفی 234ھ): اندلس کے رہنے والے تھے، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اندلس میں فقہ مالکی کو پھیلایا۔
8. سحنون، عبدالسلام بن سعید تنوخی (متوفی 240ھ): مصر اور مدینہ کے علماء سے تفقہ حاصل کیا، یہاں تک کہ اپنے زمانہ میں بڑے فقیہ بن گئے، یہی صاحب ''المدونہ'' ہیں، جس پر مذہب مالکی کا مدار ہے۔
9. محمد بن سحنون (متوفی 256ھ): تقریباً دوسو کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے مشہور ترین کتاب ''الجامع'' ہے۔
10. محمد بن عبداللہ حکم (متوفی 268ھ): ان کی بھی تصنیفات بہت ہیں، ان میں چند یہ ہیں: ''کتاب الدقائق والشروط''، ''کتاب آداب القضاۃ''، اور ''کتاب الدعوی والبینات''۔
11. محمد بن ابراہیم اسکندری بن زیاد (متوفی 269ھ): ابن مَوّاز سے معروف ہیں، اپنے زمانہ کے بڑے فقیہ تھے، ان کی مشہور کتاب ''الموازیۃ'' ہے مالکیہ کے نزدیک بڑی معتمد اور عظیم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

12. محمد بن لبابہ اندلسی (متوفی 336ھ) فقہ وفتاوی میں بڑے فائق تھے، فقہ میں آپ کی کئی تالیفات ہیں، ان میں سے مشہور اور بقول ابن حازم فارسی بے نظیر کتاب ''المنتخبة'' ہے۔

13. بکر بن علاء قشیری (متوفی 344ھ): ان کی بھی کئی تصنیفات ہیں، ان میں سے ایک ''كتاب الاحكام المختصر من كتاب اسماعيل بن اسحاق والزيادة عليه'' ہے۔

14. ابواسحاق محمد بن قاسم بن شعبان عنسی (متوفی 355ھ): مصر میں اپنے وقت کے فقہاء مالکیہ کے امام تھے، فقہ میں ان کی کتاب ''الزاهي الشعباني في الفقه'' ہے۔

15. محمد بن حارث بن اسد خشنی (متوفی 361ھ): قرطبہ میں فقہ وفتاوی کے حافظ سمجھے جاتے تھے، انہوں نے مذہب مالکی میں اختلاف واتفاق اور امام مالک کے اصحاب نے جن مسائل میں امام مالک سے اختلاف کیا ہے، کے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔

16. ابوبکر محمد بن عبداللہ معیطی اندلسی (متوفی 367ھ): انہوں نے ابوعمر اشبیلی کے ساتھ مل کر ''کتاب الاستیعاب'' کا تکملہ لکھا، جو ایک سو حصوں پر مشتمل ہے۔

17. یوسف بن عمر بن عبدالبر (متوفی 380ھ): انہوں نے کتاب ''الاستذكار بمذاهب علماء الأمصار فيما تضمنه الموطأ من معاني الآثار'' ''التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد'' اور ''كتاب الكافي'' لکھی۔

18. ابومحمد عبداللہ بن ابوزید عبدالرحمٰن قیروانی (متوفی 386ھ): اپنے وقت میں مالکی مذہب کے امام تھے، مالک صغیر سے معروف تھے، ان کی تالیفات بہت ہیں، ان میں سے ''النوادر والزيارات على المدونة''، ''مختصر المدونة''، ''تهذيب العتبية'' اور ''كتاب الرساله'' زیادہ مشہور ہیں۔

19. ابوبکر محمد بن عبداللہ ابہری (متوفی 395ھ): ان ہی کے ذریعہ عراق میں مذہب مالکیہ پھیلا، ان کی کئی تالیفات ہیں، ان میں سے ''الرد على المزني''، ''كتاب الأصول'' اور ''كتاب إجماع أهل المدينة'' ہیں۔

20. ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ (متوفی: 399ھ): بڑے فقہاء ومحدثین میں سے تھے، ان کی کتابیں کئی ہیں، ان میں سے کتاب ''المنتخب في الأحكام'' اور ''كتاب المذهب'' مشہور ہے۔

15.6 شافعی

فقہ شافعی اہل سنت والجماعت کا تیسرا فقہی مسلک ہے، جو فقہ امام شافعیؒ کی طرف منسوب ہو کر فقہ شافعی کہلائی امام شافعیؒ نے اُس وقت کے مروج تمام فقہی مسالک سے استفادہ کیا، ایک طرف امام مالکؒ سے استفادہ کیا تو دوسری طرف امام ابو یوسف اور امام محمد سے استفادہ کیا، شام میں امام اوزاعی کے شاگرد عمر بن ابی سلمہ سے کسب فیض کیا اور مصر میں امام لیث بن سعد کے شاگرد یحی بن حسان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، اس طرح امام شافعی کی شخصیت مرکزی اور اہل حدیث اور اہل رائے دونوں کے لئے مرجع بن گئی، اور فقہ شافعی میں اُس وقت رائج تمام فقہی رجحانات کی خوبیاں سمٹ کر آ گئیں۔

فقہ شافعی کا آغاز مکہ مکرمہ سے ہوا، اسی وجہ سے فقہ شافعی پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی فقہی آراء اور فکر کا گہرا اثر ہے، اس کے بعد یہ مسلک مدینہ اور عراق و بغداد سے ہوتا ہوا مصر پہنچا جہاں اس کو عروج حاصل ہوا، یہاں سے شام، خراسان، توران اور بلاد فارس تک پہنچا۔

موجودہ دور میں اس مذہب کے ماننے والے اکثر فلپائن، ملیشیا، انڈونیشا، تھائی لینڈ، سری لنکا، مصر، سوڈان، اردن، لیبیا، لبنان، اور فلسطین میں آباد ہیں، ان کی کچھ تعداد شمالی افریقہ، سعودی عرب، عراق، شام، یمن اور برصغیر کے ساحلی علاقوں میں آباد ہے، 1930ء کے اندازے کے مطابق دنیا میں شوافع کی تعداد کم وبیش دو سو کروڑ ہے۔

امام شافعیؒ کا مذہب دو واسطوں سے لوگوں تک پہنچا اور پھیلا، ایک آپ کے تلامذہ کے ذریعہ اور دوسرا آپ کی کتابوں کے ذریعہ، آپ کو مختلف علاقوں کے باکمال شاگرد ملے جن میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے علاقہ میں مرجعیت حاصل تھی، مکہ کے تلامذہ میں ابوبکر حمیدی (م: 219ھ) ابواسحاق ابراہیم (م: 237ھ) ابوالولید بن جارود، بغداد کے تلامذہ میں ابوعلی زعفرانی، ابوعلی حسین کرابیسی، امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ، مصر میں حرملہ بن یحی، ابویعقوب بویطی، ابوابراہیم مزنی ربیع بن سلیمان مرادی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

دوسرا واسطہ کتابوں کا، آپ کی پہلی کتاب ''الحجة'' ہے، جو قدیم اقوال کے لئے مرجع ہے، دوسری کتاب ''المبسوط'' ہے، امام ابوزہرہ کا خیال ہے کہ امام شافعی نے اپنی کتاب ''الحجۃ'' میں مصر آنے کے بعد کافی تغیر وتبدیلی کی اور اسی کو ''المبسوط'' کے نام سے موسوم فرمایا، نیز اسی کا نام ''الام'' بھی ہے، اسی طرح امالی کبری، اور املاء صغیر کا بھی ذکر آتا ہے، اسی طرح ابوعبدالرحمن کی روایت سے کتاب السیر، اور ابوالولید موسی بن جارود کی روایت سے ''مختصر'' کی تالیف کا ذکر کیا جاتا ہے، ایک کتاب ''السنن'' بھی آپ کی طرف منسوب ہے۔

امام شافعیؒ نے بغداد میں قیام کے دوران جو مسائل لکھے یا شاگردوں کو املا کرایا وہ سب آپ کے قدیم اقوال کہلاتے ہیں، اس کے بعد (199ھ) میں آپ بغداد سے مصر تشریف لے گئے، یہاں تقریبا چار سال مقیم رہے، یہاں آپ نے جہاں جدید کتابیں تصنیف فرمائیں، وہیں اپنی قدیم آراء واجتہادات پر نظر ثانی فرمائی، اور بے شمار مسائل میں اپنی سابقہ رائے سے رجوع فرمایا، ان ہی تبدیل شدہ آراء کو امام شافعیؒ کا قول جدید قرار دیا جاتا ہے۔

جہاں تک فقہ شافعی کے طریقہ اجتہاد واستنباط کی بات ہے تو امام شافعیؒ بھی دوسرے ائمہ کی طرح پہلے قرآن کریم اس کے بعد سنت رسول میں مسئلہ کا حکم تلاش کرتے ہیں، قرآن کے ظاہر الفاظ کا اعتبار کرتے ہیں، جب تک کہ دلیل سے ثابت نہ ہو جائے کہ اس کا ظاہر مراد نہیں ہے، سنت رسول کے بعد اجماع پر عمل کرتے ہیں، واضح رہے کہ اجماع سے ان کے نزدیک اختلاف کا عدم علم مراد ہے، اگر ان تینوں مصادر میں مسئلہ کا حکم نہ مل سکے تو قیاس کے ذریعہ مسئلہ کا حکم مستنبط کرتے ہیں۔

چوں کہ امام شافعیؒ نے اپنے طریق استنباط اور اصول اجتہاد کو باضابطگی سے کتاب الرسالہ میں مرتب فرمادیا ہے اس وجہ سے ان کے شاگردوں اور ان کے بعد کے فقہاء کے لئے اپنے امام کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور تخریج وتفریع نیز مختلف اقوال میں انتخاب وترجیح کو آسانی ہوگئی۔

15.6.1 فقہ شافعی کی خصوصیات

فقہ شافعی اپنی گوناگوں خصوصیات وامتیازات اور خوبیوں کی وجہ سے دوسری فقہ سے ممتاز ہے، ان میں سے چند خصوصیات یہ ہیں:

1. پہلی خصوصیت تو یہی ہے کہ صاحب مذہب نے خود اپنے طریقہ اجتہاد اور اصول استنباط واستخراج کو ایک منظم ومنضبط انداز میں مرتب فرمادیا۔
2. اسی طرح بانی مسلک نے خود ہی اس مسلک کے احکام وآراء کا بڑا حصہ مدون فرمادیا۔
3. فقہ شافعی کی خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت اختلافی احکام میں تورع واحتیاط اور ممکن حد تک اختلاف سے بچنے کی کوشش ہے، چنانچہ جسم کی پاکی کے لئے شوافع کے یہاں ملنا ضروری نہیں، مالکیہ کے یہاں ضروری ہے۔
4. دوسرے فقہاء کی طرح فقہاء شوافع کے نزدیک بھی اختلافی مسائل میں توسع پایا جاتا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ان ہی برائیوں سے روکا جائے گا جن کے ناجائز ہونے پر اتفاق ہے۔
5. گناہ کے بارے میں سخت رویہ اختیار کرنا اور اس کے سارے دروازوں کو بند کرنے کی کوشش کرنا فقہ شافعی کی اہم خاصیت ہے، چنانچہ ان کے نزدیک معیصت کی نیت سے سفر کرنے والوں کو سفر میں نماز قصر اور رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت وغیرہ کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔
6. فقہ شافعی کا ایک نمایاں پہلو حج کے احکام میں آسانی کا ہے، جیسے: حرم شریف جانے والے نے اگر حج وغیرہ کی نیت نہ کی ہو تو وہ بغیر احرام کے میقات سے آگے بڑھ سکتا ہے۔
7. فقہ مالکی کی طرح فقہ شافعی میں بھی معاشرتی مصالح کی رعایت ہے، مثلاً: تنگ دست اور نفقہ نہ دینے والے شوہر سے بیوی تفریق کا مطالبہ کرسکتی ہے، بلکہ بعض صورتوں میں عورت اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔
8. فقہ شافعی میں اقوال کی کثرت ہے، کسی بھی مسئلہ میں کم سے کم دو قول ضرور ملیں گے، ایک قول قدیم دوسرا قول جدید۔

15.6.2 فقہ شافعی کے مشہور فقہاء

1. امام محمد بن ادریس شافعی (150-204ھ)، آپ کی چوتھی پشت میں ایک بزرگ شافع بن سائب ہیں، ان ہی کی طرف منسوب ہوکر ''شافعی'' کہلائے، نویں پشت میں آپ کا نسب عبد مناف پر جاکر رسول اللہ ﷺ سے مل جاتا ہے، غزہ فلسطین میں پیدا ہوئے اور مصر میں وفات پائی، آپ نے مدینہ، عراق، شام اور مصر کا سفر کیا اور فقہ مالکی، فقہ حنفی، فقہ اوزاعی اور فقہ لیثی کی تحصیل کی، اور ان تمام کی فقہ کو اپنے اندر سمولیا اور مجتہد مطلق بن گئے، اس کے بعد ایک نئی فقہ کی بنیاد ڈالی جو فقہ شافعی سے معروف ہوئی، نیز آپ نے حج کے موقع پر آنے والے محدثین وفقہاء سے خوب استفادہ کیا، اور فقہ کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث کے بھی امام ہوگئے، امام احمد کا بیان ہے کتاب اللہ اور سنت رسول کا لوگوں میں سب سے بڑا ماہر امام شافعی تھے، آپ کی کئی تصنیفات ہیں، جن میں چند یہ ہیں:
    1. مسند شافعی، جو آپ کے شاگرد محمد بن یعقوب نے مرتب کی۔
    2. الرسالۃ فی أدلۃ الأحکام: اس میں اصول فقہ کی بحثیں ہیں۔
    3. کتاب الام: اس میں فقہی احکام ومسائل کا بیان ہے۔
2. ابو یعقوب یوسف بن یحیٰ بویطی (متوفی 231ھ): آپ نے امام شافعیؒ سے فقہ حاصل کی، امام شافعی آپ کے فتوی پر اعتماد کرتے تھے، امام شافعی کی حیات میں ہی ''مختصر'' نامی کتاب لکھی، امام شافعی سے دریافت کیا گیا کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین بننے کے لائق کون ہے؟ امام شافعی نے فرمایا: وہ ابو یعقوب بویطی ہیں، مسند شافعی کے مرتب آپ ہی ہیں۔

3. ابوعلی حسن بن محمد صباح زعفرانی (متوفی 260ھ): امام شافعی کے اہم عراقی شاگردوں میں سے ہیں، اور قول قدیم کے راویوں میں سے ہیں، آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔

4. ابوابراہیم اسماعیل بن یحیٰ مزنی مصری (175ھ-264ھ): فقہاء شوافع آپ کو مجتہد مطلق قرار دیتے ہیں، آپ کی مشہور ترین کتاب ''المختصر'' ہے، اس کے علاوہ الجامع الصغیر، اور الجامع الکبیر، بھی ہیں۔

5. حرملہ بن یحیٰ بن حرملہ (متوفی 266ھ) امام شافعی سے وہ کتابیں روایت کی ہیں جو ربیع نے روایت نہیں کی ہیں، مثلاً ''کتاب الشروط'' (3/جلدیں) ''کتاب السنن'' (10/جلدیں)، ''كتاب النكاح''، "كتاب ألوان الابل والغنم وصفاتها وأسنانها"۔

6. ربیع بن سلیمان بن عبدالجبار مرادی (متوفی 270ھ): امام شافعی کی صحبت میں ایک طویل زمانہ رہے ہیں، آپ کے توسط سے ہی امام شافعی کی ''كتاب الرسالہ'' اور ''كتاب الام'' ہم تک پہنچی ہیں۔

7. ابن زیاد نیشاپوری، ابوبکر عبداللہ بن محمد (متوفی 324ھ): ان کی متعدد تصانیف میں سے ''كتاب الربا'' بہت مشہور ہے۔

8. ابواسحاق ابراہیم بن احمد مروزی (متوفی 340ھ): کہا جاتا ہے کہ ابن سریج کے بعد عراق میں فقہ شافعی کی امامت آپ پر ختم ہوگئی، آپ کی تصنیفات بہت ہیں، آپ نے مختصر مزنی کی شرح بھی لکھی ہے۔

9. ابوبکر احمد بن اسحاق ضبعی نیساپوری (متوفی 342ھ): فقہ میں اونچا مقام ہے، آپ کی اہم تصنیف ''كتاب الاحكام'' ہے۔

10. ابوبکر محمد بن احمد حداد (متوفی 344ھ): آپ کی بہت سی تصانیف ہیں، جن میں سے یہ مشہور ہیں، ''الفروع المبتكرة الغريبة'' ''كتاب أدب القاضي والفرائض''۔

11. ابوعلی حسین بن حسین (متوفی 345ھ): ابن ابی ہریرہ سے مشہور ہیں، ائمہ شوافع میں سے ہیں، ''المختصر'' کی شرح لکھی ہے۔

12. ابوالولید حسان بن محمد قرشی (متوفی 349ھ): ان کی بھی متعدد تصنیفات ہیں۔

13. ابوالسائب عقبہ بن عبیداللہ بن موسیٰ قاضی (متوفی 350ھ): ائمہ شوافع میں سے ایک ہیں، بغداد میں یہ پہلے شافعی قاضی ہیں۔

14. ابوالقاسم عبدالواحد بن حسین صیمری (متوفی 386ھ): آپ مذہب شافعی کے حافظ تھے، آپ کی تصنیفات یہ ہیں: ''الافصاح فی المذهب''، ''كتاب صغير فی أدب المفتي والمستفتي'' اور ''كتاب فی الشروط''۔

15.7 حنبلی

یہ اہل سنت والجماعت کا چوتھا معروف فقہی مسلک ہے، امام احمد بن حنبلؒ کی طرف منسوب ہو کر حنبلی کہلاتا ہے، اس مذہب کی ابتدائی نشو ونما بغداد میں ہوئی، پھر شام کے شہروں سے ہوتا ہوا دیگر علاقوں تک پھیلا؛ لیکن اس مذہب کو وہ عروج و کمال حاصل نہیں ہوا جو پچھلے تینوں فقہی مسالک کو حاصل ہوا، دراصل ان تینوں فقہی مذاہب کو حکومت کی سرپرستی ملی جو حنبلی مسلک کو نہیں مل سکی۔

ایوبی دور کے آخر میں مصر میں اس مذہب کو کچھ فروغ ملا، موصل، آذربائیجان، اور آرمینا وغیرہ میں بھی یہ مذہب پہنچا۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک کو جدید سعودی حکومت کے بانی عبدالعزیز آل سعود کی حمایت و تائید حاصل تھی؛ اس لئے سعودی عرب کی حکومت نے فقہ حنبلی کو اپنا قانونی مسلک قرار دیا، اس طرح فقہ حنبلی کو سعودی حکومت کے سرکاری مذہب کی حیثیت

6. ابوبکر خلال احمد بن محمد بن ہارون (متوفی 311ھ): انہوں نے امام احمد کے اصحاب کی فقہ کو جمع کیا، یہاں تک کہ انہیں کہا جانے لگا "جامع الفقه الحنبلی" امام احمد کے خاص شاگرد ابوبکر خلال مروزی کی صحبت میں زیادہ رہے۔

7. ابوالقاسم عمر بن حسین خرقی (متوفی 334ھ): ان کی تصنیفات بے شمار ہیں، ان میں مشہور "المختصر فی الفقه" ہے، دراصل یہ ابوبکر خلال کی کتاب کی تلخیص ہے۔

8. ابوبکر عبدالعزیز بن جعفر (متوفی 363ھ): ان کی متعدد تصانیف ہیں، ان میں سے ایک "الخلاف مع الشافعی" ہے۔

15.8 اہل حدیث

آپ پڑھ چکے ہیں کہ دور صحابہ میں ہی اصحاب الحدیث اور اصحاب الرائے پیدا ہو چکے تھے، اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین ومجتہدین کے زمانہ میں دونوں ہی طبقے اور بھی ممتاز اور اپنی اپنی جگہ مستحکم ہو چکے تھے، یہ بھی آپ پڑھ آئے ہیں کہ اہل حدیث صحابہ، تابعین یا ان کے بعد کے علماء کا استنباط احکام میں کوئی منہج نہیں رہا ہے، وہ ظاہر نصوص پر عمل کرتے تھے، اور نصوص کے ظاہر عبارت سے جو مسئلہ معلوم ہوتا تھا پوچھنے والوں کو بتا دیتے تھے، بقیہ مسائل ظاہر عبارت سے معلوم نہیں ہو سکتے تو ان میں توقف کرتے، معانی میں غواصی کے عادی نہیں تھے۔

جہاں تک موجودہ دور کا تعلق ہے اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ لاہور کی تصریح کے مطابق: اہل حدیث کی اصطلاح ایک مخصوص اور معین مسلک کے طور پر بالخصوص برصغیر میں بارہویں صدی ہجری میں نمایاں ہوئی، نظری اور عملی اعتبار سے حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (متوفی 1320ھ) نے ہندوستان میں اس مسلک کی تنظیم کی اور اس کے استحکام کے لئے کوشش فرمائی، بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اہل حدیث مسلک نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور دہلی میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے ملک گیر تنظیم قائم ہوئی، جس نے مدارس و مکاتب کے قیام، مبلغوں کے وعظ اور جلسوں کے ذریعہ مسلک اہل حدیث کو پورے ملک میں عام کیا، نیز یہ مسلک اپنے چند فقہی رجحانات کی وجہ سے ممتاز ہے، جیسے: تراویح کی آٹھ رکعات، ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک شمار کرنا، نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قراءت وغیرہ۔ بقیہ مسائل میں زیادہ تر فقہ حنبلی اور فقہ شافعی سے مماثلت پائی جاتی ہے۔

اس زمانہ میں اس مسلک سے وابستہ لوگ خود کو سلفی اور اثری بھی کہتے ہیں، اس وقت اس کے بڑے بڑے تعلیمی ورفاہی ادارے اور تنظیمیں قائم ہیں، اس مسلک کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ کسی مجتہد کی تقلید کرنے کے بجائے براہ راست قرآن وحدیث سے مسئلہ اخذ کیا جائے، اہل حدیث بدعات ورسومات کے سخت مخالف ہیں، اور توحید وسنت کے داعی ہیں۔

فقہ اہل حدیث کے مشہور فقہاء میں سے چند نامور شخصیات یہ ہیں: علامہ نواب صدیق حسن خان قنوجی بھوپالی (متوفی: 1890ء)، مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (متوفی: 1902ء)، مولانا ثناء اللہ امرتسری (متوفی: 1867ء-1948ء) جن کے فتاوی ثنائیہ اور تفسیر قرآن مشہور ہیں، شیخ ناصر الدین البانی (متوفی: 1914ء-1999ء) کی تحقیقات پر بھی اس مسلک میں اعتماد پایا جاتا ہے جن کی تصنیفات، تحقیقات اور حواشی بے شمار ہیں، فقہ میں "أحکام الجنائز" تلخیص کتاب "تحفة المودود فی

أحكام المولود''، ''تمام المنة في التعليق على كتاب فقه السنة للسيد سابق'' قابل ذکر ہیں اس طرح فتاوی کے بھی کئی مجموعے اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جن میں ایک مشہور ''فتاوی اہل حدیث'' ہے جس کے مصنف حافظ عبد اللہ روپڑی ہیں۔

بعض دیگر علماء اہل حدیث جو دراصل حدیث کے شارح ہیں، انہوں نے شرح کے ذیل میں فقہی مسائل ذکر کئے ہیں، وہ یہ ہیں: مولانا شمس الحق عظیم آبادی جو سنن ابی داؤد کی شرح عون المعبود کے مصنف ہیں مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری جو سنن ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی کے مصنف ہے، مولانا عبید اللہ مبارک پوری جو کہ ''مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح'' کے مصنف، ہیں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری جو کہ ''منة المنعم في شرح صحيح مسلم'' کے مصنف ہیں۔

15.9 جعفریہ

شیعہ حضرات کے فقہی مذاہب میں سے ایک مشہور مذہب ''فقہ جعفریہ'' ہے، یہ حضرت امام ابوعبد اللہ جعفر صادق کی طرف منسوب ہو کر فقہ جعفریہ کہلاتی ہے، اہل تشیع کے درمیان امامت کے مسئلہ میں اختلاف کے باعث تین مشہور فرقے وجود میں آئے، فرقہ زیدیہ، فرقہ اسماعیلیہ اور فرقہ امامیہ جسے اثنا عشریہ (بارہ امام والے) بھی کہا جاتا ہے، اس فرقہ کے لوگ زیادہ ہیں، ان کا فقہی مسلک ''جعفریہ'' ہے۔

فقہ جعفریہ کی بنیاد مدینہ میں پڑی، اس اعتبار سے اس فقہ کا پہلا مرکز مدینہ منورہ تھا، اس کے بعد کوفہ، بغداد، نجف، حلہ، رے، قم اور مشہد اس فقہ کے مراکز رہے ہیں، اس وقت ایران، عراق، شام، لبنان، اور ہندوستان و پاکستان میں اس فقہ پر عمل کرنے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

فرقہ امامیہ بارہ ائمہ کو مانتے ہیں اور ان کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، پہلے امام حضرت سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ، اور آخری امام محمد مہدی ہیں، جن کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ''سامراء'' بغداد میں روپوش ہیں، اور دوبارہ ظہور پذیر ہوں گے، امام جعفر صادق ان بارہ اماموں میں چھٹے امام ہیں۔

فقہ جعفریہ میں تیسری صدی ہجری کے وسط تک ان کے ائمہ کو مرجعیت حاصل تھی، وہی حاکم اعلی ہوتے تھے اور تمام شیعہ مذہبی طور پر اس کے احکام کے تابع ہوتے تھے، بارہ اماموں کے بعد چار اشخاص کو مرجعیت کا درجہ عطا ہوا جو نوابین اربعہ کہلائے، اور وہ چار اشخاص یہ ہیں: عثمان بن سعید، محمد بن عثمان بن سعید، حسین روح اور ابوالحسن علی بن محمد سمری، ان نوابین کے بعد اکابر فقہاء کا درجہ آتا ہے، جن کو ان کے درمیان مرجع کی حیثیت حاصل رہی، ان میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا مجتہد کہلاتا ہے، جو بارہ اماموں کے بعد حاکم شرع کی حیثیت رکھتا ہے، اس پر تقلید حرام ہوتی ہے، اس کو بادشاہ وقت کے محاسبہ کا حق حاصل ہوتا ہے۔

فقہ جعفریہ میں قرآن، سنت اور ائمہ کے اقوال بنیادی مآخذ ہیں، حدیث میں وہی روایات ان کے نزدیک مقبول ہیں جن کی روایت اہل بیت ائمہ نے کی ہو، اجماع، قیاس، استحسان اور مصالح وغیرہ کو دلیل تسلیم نہیں کیا گیا ہے، البتہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے؛ لیکن عام لوگوں کو اجتہاد کا حق نہیں ہے؛ بلکہ ان کے ائمہ ہی اجتہاد کریں گے اور لوگوں کو حکم شرعی بتائیں گے۔

اور قرآن وحدیث کے بعد ائمہ کے اقوال وارشادات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور یہ اقوال نصوص شارع کا درجہ رکھتے ہیں، جب ائمہ کی طرف سے کوئی قول صادر ہوگا تو اس کی پیروی سب پر لازم ہوگی۔

فقہ جعفریہ کی اہم کتابیں اور ان کے مؤلفین جن پر مذہب جعفریہ کی بنیاد ہے، یہ ہیں:

1. ''بشائر الدرجات فی علوم آل محمد وما خصهم الله به'' جس کے مصنف ابو جعفر محمد بن حسن بن فروخ صفار اعرج (متوفی 290ھ) ہیں، یہ کتاب 1285ھ میں طبع ہو چکی ہے۔
2. ''فقہ الرضا'' اس کے مؤلف علی رضا ہیں، 1274ھ میں طبع ہو چکی ہے۔
3. سب سے مشہور اور اہم کتاب ''الکافی فی علم الدین'' ہے، جس میں چھوٹی اور درمیانی کتابوں کو جمع کر دیا گیا ہے، اور اہل بیت کے واسطوں سے سولہ ہزار ننانوے (16099) حدیثیں مروی ہیں، اس کے مؤلف شیخ محمد بن یعقوب بن اسحاق کلینی رازی (متوفی 328ھ) ہیں۔
4. "من لا یحضره الفقیه" مؤلف: محمد بن علی بن ابو یہ قمی (متوفی 381ھ)، جو شیخ صدوق سے مشہور ہیں۔
5. "کتاب الاستبصار"، "تهذیب الاحکام"، مؤلف: ابو جعفر طوسی (متوفی 460ھ)۔
6. "شرائع الاسلام" مؤلف: محقق حلی جعفر بن حسن (676ھ)۔
7. ''تذکرة الفقهاء'' اور ''قواعد الاحکام'' مؤلف: علامہ حلی جمال الدین حسن بن یوسف (متوفی 726ھ)۔

جہاں تک فقہ جعفریہ کی خصوصیات کی بات ہے تو سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اہل بیت کی روایات لی جاتی ہیں اور قرآن وحدیث کے بعد ائمہ کے اقوال وارشادات اہمیت کے حامل ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کی فقہ سے زیادہ دور نہیں ہے، فقہ شافعی سے زیادہ قریب ہے، اور فی الجملہ اہل سنت سے تقریباً سترہ مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں: نکاح متعہ، اہل سنت کے نزدیک حلال نہیں ہے اور فقہ جعفریہ میں حلال ہے، طلاق پر گواہ بنانا فقہ جعفریہ میں ضروری ہے اور اہل سنت کے یہاں ضروری نہیں ہے، خفین پر مسح کرنا اہل سنت کے نزدیک مشروع عمل ہے اور فقہ جعفریہ میں مشروع نہیں ہے، وضو میں ان کے یہاں دونوں پاؤں پر مسح درست ہے جب کہ اہل سنت کے یہاں درست نہیں؛ بلکہ دھونا ضروری ہے، اسی طرح وہ اذان اور تشہد میں ''أشهد أن علیا ولی الله'' کا اضافہ کرتے ہیں، اہل سنت کے نزدیک اضافہ درست نہیں ہے۔

جہاں تک فقہ جعفریہ کے مشہور فقہاء کا تعلق ہے تو پیچھے بات آچکی ہے کہ یہ فقہ حضرت امام جعفر صادق کی طرف منسوب ہے، آپ کا پورا نام اس طرح ہے: امام ابوعبداللہ جعفر صادق بن محمد باقر بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہا (80ھ-148ھ) آپ بارہ اماموں میں چھٹے امام ہیں، صادق آپ کا لقب ہے، آپ نے علماء مدینہ اور کوفہ دونوں سے کسب فیض کیا، آہستہ آہستہ علم وفضل کے عروج وکمال کو پہنچے تو عالم اسلام سے علماء وفضلاء آپ سے استفادہ کے لئے جوق در جوق حاضر ہونے لگے، آپ حدیث وفقہ کے ساتھ دیگر علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے، آپ کی طرف کئی کتابیں منسوب ہیں، شیعہ امامیہ کی فقہ کا دارومدار آپ اور آپ کے والد ماجد امام محمد باقر پر ہے۔

آپ کے بعد فقہ جعفریہ کے مشہور فقہاء میں ابوالنضر محمد بن مسعود عباسی اور ابوعلی محمد بن احمد بن جنید ہیں، یہ دونوں ہی ابوجعفر محمد باقر کے اصحاب میں سے ہیں، ان کے علاوہ موسی کاظم (183 ھ)، ان کے بیٹے علی رضا بن فروخ صفار اعرج قمّی (متوفی 290 ھ) اور محمد بن یعقوب بن اسحاق کلینی رازی (328 ھ) ہیں۔

15.10 زیدیہ

زیدیہ سے مراد وہ شیعہ حضرات ہیں جو امام زین العابدین علی بن حسین رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے فرزند حضرت زید بن علی کو امامت کے منصب کا مستحق قرار دیتے ہیں اور ان کو اپنا امام مانتے ہیں، اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دور میں کوفہ شہر میں آپ کی بیعت ہوئی، اس اعتبار سے اس فقہ کی بنیاد کوفہ میں پڑی؛ لیکن یمن میں پھیلی اور وہیں اس کو فروغ ملا۔

زیدیوں میں بھی آٹھ مختلف جماعتیں، مختلف نامور شخصیات کی طرف منسوب ہوکر مشہور ہوئی ہیں، فقہ زیدیہ کے پیروکار زیادہ تر یمن میں پائے جاتے ہیں، 288 ھ سے آج تک وہاں کی حکومت کا سرکاری مذہب زیدیہ چلا آرہا ہے۔

طریقہ استنباط میں فقہاء زیدیہ قرآن وحدیث اور اجتہاد پر اعتماد کرتے ہیں، البتہ جعفریہ کی طرح یہ لوگ بھی اہل بیت کی روایات ہی کو اہمیت دیتے ہیں، مزید یہ حضرات قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ اور استصحاب کو بھی حجت مانتے ہیں۔

فقہ زیدیہ کی بھی بعض خصوصیات وامتیازات ہیں جن کی وجہ سے دوسرے فقہی مسلک سے ممتاز ہوجاتی ہے اور وہ یہ ہیں:

1. اصول استنباط، اجتہاد اور فتاوی میں عموماً مسلک حنفی کی طرف میلان ہے۔
2. شیعہ فرقوں اور مذاہب میں سے اہل سنت والجماعت سے سب سے زیادہ قریب یہی فرقہ زیدیہ ہے، اس فرقہ کے بانی حضرت امام زید شیخین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف طعن کرنے والوں پر نکیر فرماتے تھے اور زیدی حضرات بھی اپنے امام کی پیروی میں شیخین کے خلاف گستاخی نہیں کرتے ہیں، گو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفضیل کے قائل ہیں۔
3. یہ فقہ فروعی مسائل میں عموماً فقہ حنفی اور بعض مسائل میں فقہ شافعی سے قریب ہے۔
4. دوسرے فقہی مسالک کی طرح زیدیہ اپنے امام زید کی اتباع فروعی مسائل میں نہیں کرتے ہیں۔
5. فقہ زیدیہ میں نکاح متعہ اور کتابیہ سے نکاح حرام ہے، اسی طرح خفین پر مسح ان کے یہاں درست نہیں ہے، جب کہ اہل سنت کے نزدیک کتابیہ سے نکاح حلال ہے اور خفین پر مسح کرنا درست ہے۔

زیدیہ فقہ کی سب سے قدیم کتاب ''المجموع'' ہے جو امام زید بن علی کی طرف منسوب ہے، یہ کتاب مطبوعہ ہے، دوسری مشہور کتاب جو دراصل ''المجموع'' ہی کی شرح ہے'' الروض النضیر شرح مجموع الفقه الکبیر'' کے نام سے چار جلدوں میں ہے، جس کے مؤلف شرف الدین حسین بن علی احمد سیاغی حیمی (متوفی: 1221 ھ) ہیں، یہی دو کتابیں زیدیہ فقہ کی اساس وبنیاد ہیں۔

زیدیہ فقہ کے چند مشہور اور نمایاں فقہاء ہیں، اور وہ یہ ہیں:

8. ابوعمار، عبدالکافی بن یوسف تناوتی (متوفی بعد 570ھ-1174ء): چھٹی صدی ہجری کے مشاہیر اباضی علماء میں سے تھے، علم کلام، سیرت اور فقہ کے موضوعات پر آپ کی کئی تصنیفات ہیں، اور اکثر ابھی تک مخطوطہ ہیں، ان ہی میں سے ایک ''کتاب الفرائض'' ہے۔

9. ابوساکن، عامر بن علی شّماخی (متوفی 792ھ-1389ء): اکابر علماء اباضیہ میں سے ہیں، آپ کی کئی وقیع تصانیف ہیں، ان میں سے زیادہ مشہور'' الایضاح'' ہے یہ کتاب خالص فقہ اباضی پر ہے، ویسے فقہ مقارن پر بھی آپ کی ایک تصنیف ہے۔

10. ابوربیع سلیمان حیلاتی (متوفی 1099ھ-1688ء): اپنے زمانہ کے بڑے جلیل القدر عالم، مورخ اور فقیہ تھے، آپ کی کئی تالیفات، رسائل اور فقہی جوابات ہیں، ان میں سے ایک ''اَجوبۃ فی الفقہ والأحکام'' ہے۔

11. محمّد بن یوسف بن عیسی اُطفیّش (1237ھ-1821ء- 1332ھ-1914ء): دور جدید کے مغربی علاقہ کے اباضی علماء میں سب سے زیادہ مشہور ہیں، اسی طرح ''قطب الأئمۃ'' سے شہرت رکھتے ہیں، آپ کی تالیفات حدیث، فقہ، علم کلام، تاریخ، منطق، طب، فلکیات اور علوم عربیہ میں ہیں، آپ کے فتاوی منتشر ہیں، یکجا نہیں ہیں۔

12. صالح بن عمر: اکابر علماء میں سے تھے، آپ کی تالیفات کئی ہیں، ان میں چند یہ ہیں، ''مراقی العوام الی معرفۃ مبادیٔ الاسلام''، ''رسالۃ الصوم والافطار'' اور ''کشف القناع عن مسائل وقع فیھا النزاع''۔

15.12 ظاہری

ظاہری مسلک تیسری صدی ہجری میں امام داؤد اصبہانی نے شروع کیا، اہل سنت والجماعت کے چاروں فقہی مذاہب حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی میں قرآن وحدیث اور اجماع کے علاوہ قیاس اور بعض دوسرے درجہ کے دلائل کو قدرے اختلاف کے ساتھ حجت مانا گیا ہے، قرآن وحدیث کے ظاہری مفہوم کی رعایت کے ساتھ ساتھ اس سے آگے اس کے اندر غواصی اور غور وخوض کو روا رکھا گیا، جب کہ ظاہری مسلک میں قرآن وحدیث اور اجماع کے علاوہ قیاس اور دوسرے درجہ کے دلائل استحسان اور ذرائع وغیرہ کی حجیت سے انکار کیا گیا ہے، اجماع میں بھی صرف اجماع صحابہ یا پوری امت کا اجماع ہو تو اس کو قبول کیا گیا ہے، نص اور اجماع کی عدم موجودگی میں استصحاب یعنی اباحت اصلیہ کو اختیار کیا گیا، نص میں بھی اس کے ظاہری مفہوم سے استدلال پر اکتفا کیا گیا ہے۔

فقہ ظاہری پانچویں صدی ہجری کے نصف تک قابل عمل رہی ہے، اس کے بعد آہستہ آہستہ اس پر عمل کرنے والے کم ہوتے گئے ہوتا گیا، اس صدی میں ابن حزم نے اس رجحان کو اختیار کیا اور اس پر کتابیں لکھیں، اس طرح اس مذہب کے مردہ تن میں دوبارہ زندگی کی روح پھونک دی؛ گو بعض تفصیلی آراء میں داؤد ظاہری اور ابن حزم کے درمیان فرق پایا جاتا ہے، تاہم بنیادی رجحان یعنی ظاہر نصوص سے استدلال پر اکتفا کرنے میں دونوں میں اتحاد پایا جاتا ہے۔

ابن حزم اندلسی کے اس ظاہری مذہب کو اختیار کر لینے کی وجہ سے اندلس میں اس کو فروغ ملا، لیکن پانچویں صدی ہجری میں یہ فقہ اضمحلال کا شکار ہو گئی اور آہستہ آہستہ آٹھویں صدی ہجری میں آکر پورے طور پر ختم ہو گئی اور اس کے ماننے والے ناپید ہو گئے۔

اس مذہب کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اس کے ماننے والے حدیث وقرآن کے ظاہری نصوص پر عمل کرتے ہیں اور رائے وقیاس کے استعمال میں جمہور علماء کی مخالفت کرتے ہیں، اسی وجہ سے ظاہری علماء سود کی حرمت کو صرف چھ قسم کی اجناس میں منحصر کرتے ہیں جن کی حدیث میں صراحت آئی ہے، یعنی سونا، چاندی، کھجور، گیہوں، جو اور نمک۔

اسی طرح فقہ ظاہری میں لکھا ہے کہ مالدار بیوی پر اس کے تنگ دست شوہر اور اس کی اپنی ذات کا نفقہ لازم ہوگا جب کہ جمہور فقہاء کے یہاں اس حالت میں بھی شوہر ہی پر نفقہ لازم ہوتا ہے۔

ظاہری مذہب میں کسی کو طلاق کا وکیل بنانا درست نہیں ہے اور نہ ہی تفویض طلاق صحیح ہے یعنی بیوی کو اپنے اوپر طلاق دینے کا اختیار دینا صحیح نہیں ہے، جب کہ جمہور فقہاء کے یہاں کسی کو طلاق دینے کا وکیل بنانا اور تفویض طلاق صحیح ہے۔

اس مذہب کے مشہور فقہاء زیادہ نہیں ہیں، بلکہ بانی مذہب کے علاوہ دو اور ہیں:

1. ظاہری فقہ کے مؤسس امام ابوسلیمان داؤد بن علی بن خلف اصبہانی (202ھ 270ھ) ظاہری سے مشہور ہوئے، کوفہ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں وفات پائی، اسحاق بن راہویہ اور ابوثور وغیرہ سے علم حاصل کیا، حافظ حدیث، فقیہ مجتہد تھے، ابتداء میں شافعی تھے، پھر اپنا ایک نیا فقہی مذہب اختیار کیا، جو آگے چل کر ظاہری مذہب سے معروف ہوا۔

امام داؤد ظاہری نے کئی کتابیں تصنیف کیں، ان میں سے فقہ کے موضوع پر "أبواب الفقه"، اصول فقہ میں: "كتاب إبطال التقليد"، "كتاب إبطال القياس" اور "كتاب الحجة" وغیرہ ہیں۔

2. ابوالحسن عبداللہ بن احمد بن محمد مغلس متوفی (324ھ) بڑے فاضل محدث اور فقیہ تھے، کہا جاتا ہے کہ ان کے زمانے میں ان پر ظاہری مذہب کی ریاست ختم ہوگئی۔

3. ابومحمد علی بن سعید بن حزم اندلسی (384ھ-456ھ) آپ مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے، ابتداء میں فقہ مالکی کی تعلیم حاصل کی اور اس پر عمل بھی کیا، پھر مذہب شافعی اختیار کیا اور کچھ دنوں اس پر بھی عمل کیا، اس کے بعد ظاہر مذہب کو اختیار کیا، آخری دم تک اسی مذہب پر قائم رہے، اس کی تائید میں کتابیں تصنیف کیں اور اس کے فروغ کے لئے زبردست کوششیں کیں، آپ کی اہم ترین کتاب فقہ میں "المحلى" ہے، اور اصول فقہ میں "الاحكام في أصول الإ حكام" ہے۔

15.13 خلاصہ

فقہی مسالک ان مختلف رجحانات کا نام ہے جو مختلف مجتہدین اور فقہاء نے قرآن وحدیث سے نئے پیش آنے والے جزوی مسائل کے احکام کو مستنبط کرنے میں اختیار کئے ہیں، مختلف عہد میں متعدد فقہی مسالک وجود میں آئے؛ لیکن مختلف اسباب کے تحت بعض باقی رہے، بقیہ ڈیڑھ دو سو سال، زیادہ سے زیادہ پانچ سو صدی ہجری تک باقی رہے پھر مٹ گئے، صرف تاریخ کے اوراق میں ان کا ذکر ملتا ہے، جو فقہی مسالک باقی رہ گئے ہیں، ان میں اہل سنت والجماعت کے چار فقہی مسالک (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) ہیں، اور دوسرے مکاتب فکر کے جعفریہ، زیدیہ اور اباضیہ ہیں، فقہ ظاہری بھی ایک عرصہ تک باقی رہی دور حاضر میں فقہ اہل حدیث بھی مشہور ہے، یہ دونوں مسالک تقلید شخصی کے قائل نہیں ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے فقہی مسالک میں سب سے قدیم فقہ حنفی ہے، جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب ہے، البتہ چالیس باکمال علماء محدثین وفقہاء کی اجتماعی تحقیق سے یہ فقہ وجود میں آئی، کوفہ شہر میں اس کی نشوونما ہوئی، جہاں ایک ہزار سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قیام پذیر ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر یہاں روانہ فرمایا، اور حضرت

علی رضی اللہ عنہ نے اس شہر کو دارالخلافہ بنایا، اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی فقہ وفتاوی اوران کے اجتہادات کا اس فقہ پر گہرا اثر ہے، ویسے اس مذہب کی بنیادی کتابیں امام محمدؒ کی تصنیفات ہیں، جو ظاہر روایت سے معروف ہیں، فقہ حنفی کی تدوین اور ترویج واشاعت میں جہاں امام محمد کی کتابوں کا رول رہا ہے، وہیں امام ابو یوسفؒ نے عملی کردار ادا کیا ہے، ان دونوں کے علاوہ امام ابوحنیفہؒ کے دوسرے اصحاب جیسے امام زفر، امام حسن بن زیاد ہیں، بعد کے ادوار میں احمد بن عمر خصاف، احمد بن محمد طحاوی، ابوبکر جصاص رازی، ابوجعفر ہندوانی، ابواللیث سمرقندی، ابوعبداللہ یوسف جرجانی اور ابوالحسن کرخی کا بھی اہم حصہ رہا ہے۔

دوسرا فقہی مسلک مالکی ہے، جو امام مالکؒ کی طرف منسوب ہے، اس کی نشو ونما مدینہ منورہ میں ہوئی، جو ہزاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسکن رہا ہے، اسی وجہ سے امام مالکؒ کے نزدیک عمل اہل مدینہ کی بڑی اہمیت ہے؛ البتہ اس فقہ مالکی پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فقہی آراء اور فقہاء سبعہ (سات بڑے مجتہد فقہاء تابعین) کے اجتہادات کا گہرا اثر پایا جاتا ہے، اس فقہی مسلک کی بنیادی کتابوں میں خود امام مالک کی کتاب ''الموطأ'' اور ''المدونہ'' ہیں۔ بعد کے ادوار میں فقہ مالکی کی ترویج واشاعت اور تدوین میں مشہور مالکی فقہاء نے حصہ لیا، ان میں عبداللہ بن وہب، عبدالرحمٰن بن قاسم، اشہب بن عبدالعزیز، عبدالملک بن ماجشون، عبدالسلام سعید سحنون، محمد بن احمد عتبی، عبدالملک بن حبیب، اسد بن فرات، یحیٰ بن کثیر لیثی، محمد بن سحنون، اور محمد بن عبداللہ وغیرہ ہیں۔

تیسرا فقہی مسلک فقہ شافعی ہے، جو امام محمد ابن ادریس شافعیؒ کی طرف منسوب ہے، اس مسلک کی تشکیل مکہ، پھر عراق و بغداد اور مصر میں ہوئی، اس فقہ پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی فقہی آراء اور منہاج فکر کا گہرا اثر ہے، اس مسلک کی بنیادی کتابیں خود امام شافعی کی اپنی تالیفات ہیں، جن میں زیادہ مشہور کتاب ''الأم'' اور ''کتاب الرسالۃ'' ہیں، اس فقہی مسلک کی تدوین وترویج اور تشکیل میں جن فقہاء نے حصہ لیا ہے، وہ یہ ہیں: ابویعقوب بویطی، ابوابراہیم مزنی مصری، حرملہ بن یحیٰ، ربیع بن سلیمان مرادی، ابواسحاق مروزی، ابوبکر احمد بن اسحاق، ابوبکر محمد بن احمد حداد، ابوعلی حسین بن حسین، ابوالولید حسان بن محمد قرشی، ابوالسائب عقبہ قاضی اور ابوالقاسم عبدالواحد صیمری ہیں۔

چوتھا فقہی مسلک فقہ حنبلی ہے، امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب ہے، اس مسلک کی تشکیل کا عمل بغداد میں انجام پایا، امام احمد گو محدث ومجتہد تھے؛ لیکن وہ اپنی فقہی آراء مدون کئے جانے کو پسند نہیں فرماتے تھے، آپ کی فقہی آراء واجتہادات اور فتاوی کو آپ کے شاگردوں جن میں آپ کے دونوں صاحبزادے عبداللہ اور صالح بھی شامل ہیں، نے مدون کیا، اس فقہ کی بنیادی کتابیں الجامع الکبیر از ابوبکر خلال، اس کی تلخیص مختصر الخرقی، پھر اس کی مبسوط شرح ابن قدامہ کی المغنی ہے، اس فقہ کے مشہور فقہاء میں صالح، ابوبکر خلال، عبدالملک بن عبدالحمید میمونی، ابوالقاسم عمر بن حسین خرقی، بعد کے ادوار میں ابن قدامہ، ابن تیمیہ اور ابن قیم قابل ذکر ہیں۔

اہل حدیث کی اصطلاح ایک مخصوص اور معین مسلک کے طور پر بالخصوص برصغیر میں بارہویں صدی ہجری میں نمایاں ہوئی، نظری اور عملی اعتبار سے حضرت مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی نے ہندوستان میں اس مسلک کی تنظیم کی اور اس کے استحکام کے لئے کوشش فرمائی، بیسویں صدی کے آغاز میں اہل حدیث مسلک نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور دہلی میں آل انڈیا اہل حدیث

کانفرنس کے نام سے ملک گیر تنظیم قائم ہوئی۔ یہ تنظیم اپنے چند فقہی رجحانات کی وجہ سے مشہور ہے جیسے: تراویح کی آٹھ رکعات، ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک شمار کرنا وغیرہ، بقیہ مسائل میں زیادہ تر فقہ حنبلی یا فقہ شافعی سے مماثلت پائی جاتی ہے، نواب صدیق حسن خان، مولانا ثناء اللہ امرتسری، وغیرہ ان کی مشہور شخصیات ہیں۔

اہل تشیع کے فقہی مسالک میں فقہ جعفری بہت مشہور ہے، یہ امام جعفر صادق کی طرف منسوب ہے، اس کی بنیاد مدینہ منورہ میں پڑی، اور عراق، بغداد، لبنان، شام اور ایران مراکز رہے ہیں اور اس وقت بھی ان مقامات پر اس فقہ پر عمل کرنے والے کثرت سے موجود ہیں، اس فقہ میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے، البتہ اجتہاد کرنے کا حق صرف ائمہ کو حاصل ہوتا ہے، اور قرآن وحدیث کے بعد ائمہ کے اقوال کو بڑی حیثیت ہوتی ہے، اس مذہب کی بنیادی کتابوں میں ''بشائر الدرجات''، ''الکافی فی علم الدین''، ''من لا یحضرہ الفقیہ'' اور ''شرائع الإسلام'' زیادہ مشہور ومعروف ہیں، اس فقہ کے مشہور فقہاء امام جعفر صادق اور آپ کے والد امام محمد باقر کے علاوہ ابوالنضر محمد عیاشی اور ابوعلی محمد بن احمد، موسیٰ کاظم، علی رضی، ابن فروخ صفار قمی اور محمد بن یعقوب کلینی ہیں۔

شیعہ حضرات کا دوسرا فقہی مسلک زیدیہ ہے، جو امام زین العابدین علی بن حسین کے فرزند زید کی طرف منسوب ہے، اس فقہ کی بنیاد کوفہ میں پڑی اور یمن میں پھیلا، اس فقہ کی بنیادی کتابیں ''المجموع'' اس کی شرح ''الروض النضیر'' ہیں، اس کے مشہور فقہاء میں امام زید کے علاوہ حسن بن علی، حسن بن زید، قاسم بن ابراہیم، اور ہادی یحیٰ بن حسن ہیں۔

ایک اور فقہی مذہب اباضیہ ہے جو اہل سنت والجماعت اور اہل تشیع سے الگ ہے، اس کی نسبت عبداللہ بن اباض تمیمی کی طرف ہے، اس مذہب پر عمل کرنے والے عمان میں بکثرت ہیں، بقیہ اور دوسرے مقامات پر بھی پائے جاتے ہیں، اس فقہ کی بنیادی کتابیں ''شرح النیل وشفاء العلیل''، ''قاموس الشریعہ''، ''منہج الطالبین''، اور ''الایضاح'' ہیں۔ اس فقہ کے مشہور فقہاء ابوالشعثاء جابر جلندی، جلنوی بن مسعود، ربیع بن حبیب اور بشر بن غانم خراسانی وغیرہ ہیں۔

ظاہری مسلک تیسری صدی ہجری میں شروع ہوا، اس کے بانی امام داؤد اصفہانی ہیں، پانچویں صدی ہجری کے بعد آہستہ آہستہ اس پر عمل کرنے والے کم ہوتے گئے، اس صدی میں ابن حزم نے اس رجحان کو اختیار کیا اور اس پر کتابیں لکھیں جن میں سب سے مشہور کتاب ''المحلی'' ہے، ظاہری مسلک میں قرآن وحدیث کے صرف ظاہری مفہوم کو لیا گیا ہے، قرآن وحدیث اور اجماع کے علاوہ قیاس اور دوسرے درجہ کے دلائل استحسان اور سد ذرائع وغیرہ کی حجیت سے انکار کیا گیا ہے، پانچویں صدی ہجری میں یہ فقہ پورے طور پر ختم ہوگئی اور اس کے ماننے والے نہ رہے۔

15.14 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. فقہ حنفی کی تدوین وتشکیل پر روشنی ڈالیے۔

2. فقہ مالکی کا تعارف اور اس کی خصوصیات بیان کیجئے۔

3. فقہ جعفری کا تعارف کرائیے۔

4. فقہ حنبلی کی تدوین وخصوصیات پر روشنی ڈالئے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجئے۔

1. فقہ اباضیہ اور اس کی خصوصیات بیان کیجئے۔

2. فقہ زیدیہ کا تعارف کراتے ہوئے اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالئے۔

3. ظاہری مذہب کا تعارف کرائیے۔

4. فقہ شافعی کی خصوصیات بیان کیجئے۔

15.15 فرہنگ

عاملین، عامل کی جمع	عمل کرنے والا
فیصل	فیصلہ کرنے والا
وقیع	عزت دار
اجزاء: جزء کی جمع	حصہ
فروع: فرع کی جمع	شاخ، فقہی جزئیہ
مبسوط	مفصل

15.16 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. فقہ اسلامی۔ تعارف اور تاریخ — پروفیسر اختر الواسع۔ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی

2. فقہ اسلامی۔ تدوین وتعارف — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

3. قاموس الفقہ — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اکائی 16 : فقہی علوم اور مضامین

اکائی کے اجزاء

16.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ اصول فقہ، قواعد فقہیہ، مقاصد شریعت، تکلیفی احکام، اجتہاد وتقلید کے معنی ومطلب، نظام قضاء فتوی اور پرسنل لا جیسے اہم مباحث سے آگاہ ہو جائیں گے۔

16.2 تمہید

اس اکائی میں اصول فقہ، اور اصول فقہ کی تعریف وتشریح، موضوع، غرض وغایت، اصولی فقہاء کا منہج تصنیف اور اس پر لکھی گئیں کتابوں کا تذکرہ ہوگا، اسی طرح قواعد فقہیہ کا تعارف کرایا جائے گا، اس کے اور اصول فقہ کے درمیان فرق اور اس موضوع پر لکھی گئی اہم کتابوں کا ذکر بھی آئے گا، مقاصد شریعت کیا ہیں؟ اجتہاد وتقلید، نظام قضا، فتوی، آداب واصول، اور پرسنل لا جیسے اہم موضوعات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

16.3 اصول فقہ۔ایک تعارف

اصول فقہ کا موضوع نہایت اہم ہے، کیوں کہ اس کا تعلق جہاں فقہ اسلامی سے ہے وہیں قرآن وحدیث سے بھی ہے، اس لئے کہ یہ ذریعہ استنباط ہے، قرآن وحدیث مصدر استنباط ہیں اور احکام شرعیہ اس کا خلاصہ ہیں۔

اصول، اصل کی جمع ہے، اور اصل لغت میں ''مايبنى عليه غيره'' کو کہتے ہیں، یعنی جس پر کسی دوسری شئی کی بنیاد ہو، خواہ یہ بنیاد حسی ہو، جیسے عمارت کی بنیاد، یا معنوی ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ [ابراهیم:24] کہا جاتا ہے: "الأصل في وجوب الصلاة قوله تعالى: وأَقِيمُوا الصَّلَاةَ "[البقرہ:42] یعنی نماز کی فرضیت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''تم لوگ نماز قائم کرو'' نیز فقہاء کہتے ہیں:" أصل هذه المسألة: الكتاب والسنة " یعنی اس مسئلہ کی دلیل قرآن وسنت ہے، اسی سے اصولِ فقہ کا جملہ ماخوذ ہے، یعنی فقہ کی دلیلیں جیسے: کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور قیاس وغیرہ۔

فقہ کے لغوی معنی: کسی شئی کا جاننا اور سمجھنا، اور اصطلاحی تعریف: فقہ ایسا علم ہے جن میں ان شرعی احکام سے بحث ہوتی ہے جن کا تعلق عمل سے ہے اور جن کو تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اصول فقہ کی اصطلاحی تعریف: اصول فقہ ان قواعد کا جاننا ہے جن کے ذریعہ تفصیلی ادلہ شرعیہ سے شریعت کے عملی احکام کے استنباط کا طریقہ معلوم ہو اور وہاں تک رسائی ہوسکے۔

یہاں قواعد سے مراد کلی قواعد ہیں، جن کے ذریعہ سے شرعی احکام مستنبط ہوتے ہیں، جزوی دلائل نہیں، جیسے بیع کی حلت اور سود کی حرمت پر استدلال، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا" [البقرہ:275] کیوں کہ اصول فقہ کلی دلائل اور ان کی دلالت سے بحث کرتا ہے، جیسے: کلام پاک، حدیث رسول، نص ظاہر پر مقدم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم (امر) وجوب کے لئے ہوتا ہے وغیرہ۔

نیز قواعد کے مفہوم میں وہ اصول بھی شامل ہیں، جن کے بغیر استنباط احکام نامکمل رہتا ہے اور مقصود تک رسائی ممکن نہیں ہوتی، جیسے: دلیل کا منسوخ نہ ہونا، دوسری راجح دلیل کے معارض نہ ہونا وغیرہ۔

ادلہ تفصیلیہ سے مراد جزئی دلائل ہیں جو کہ متعین مسائل سے متعلق ہوتی ہیں، ان میں سے ہر دلیل کسی مخصوص متعین حکم پر دلالت کرتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ''[نساء:23] (تمہارے اوپر تمہاری مائیں حرام کی گئی ہیں)۔

کلی یا اجمالی دلائل کا تعلق مخصوص ومتعین مسائل سے نہیں ہوتا ہے، کوئی بھی کلی دلیل کسی خاص متعین مسئلہ پر دلالت نہیں کرتی ہے، کلی دلائل شرعی احکام کے مصادر قرآن، حدیث، اجماع، قیاس اور ان کے متعلقات ہیں، جیسے: امر وجوب کے لئے، نہی تحریم کے لئے وغیرہ۔

کلی دلائل سے علماء اصولیین بحث کرتے ہیں اور تفصیلی دلائل سے فقہاء بحث کرتے ہیں، فقہ کا موضوع مکلّف کا عمل ہے اس حیثیت سے کہ اس کے شرعی احکام دریافت کئے جائیں، اور دلائل سے ان کا ربط واضح کیا جائے؛ چنانچہ فقیہ مکلّف کی خرید وفروخت، اس کی نماز، اس کے روزہ اور دیگر کاموں کے بارے میں بحث کرتا ہے، تاکہ اس کے ان افعال میں سے ہر ایک کے بارے میں شرعی حکم معلوم ہو جائے۔

اصول فقہ کا موضوع کلی ادلۂ شرعیہ اور کلی احکام شرعیہ دونوں ہیں، کلی ادلۂ شرعیہ اس اعتبار سے کہ اس سے کلی احکام ثابت ہوتے ہیں اور کلی احکام شرعیہ اس اعتبار سے کہ وہ کلی دلائل شرعیہ سے مستنبط ہوتے ہیں۔

ادلۂ شرعیہ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس متفق علیہ ہیں، اس کے علاوہ استحسان، عرف وعادت، مصالح مرسلہ، سد ذرائع، آثار صحابہ، شرائع ماقبل اور استصحاب بھی ہیں؛ لیکن یہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہیں، ان میں سے بعض کو بعض فقہاء ادلۂ شرع تسلیم کرتے ہیں اور دوسرے فقہاء دوسرے ادلہ کو مانتے ہیں، اسی طرح عام، خاص، مطلق، مقید، امر اور نہی وغیرہ بھی ادلۂ شرع ہیں، اس کی مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھا جائے، مثلاً: قرآن مجید اول دلیل شرعی عام ہے، ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی آیات احکام ایک ہی طرح کی نہیں ہیں، بلکہ مختلف اسلوب اور مختلف انداز والفاظ کے ساتھ نازل ہوئی ہیں، کہیں صیغہ امر، صیغہ نہی اور کہیں صیغہ اطلاق اور صیغہ عموم کے ساتھ ہیں، یہ سب دلیل شرعی عام قرآن مجید ہی کی شاخیں اور اس کی قسمیں ہیں، ان پر بھی دلیل کلی شرعی کا اطلاق ہوتا ہے۔

جہاں تک حکم کلی کی بات ہے تو یہ بھی ایسا نوع عام ہے، جس کے تحت بہت سی جزئیات آتی ہیں، مثلاً: فرض، واجب، حرام، صحیح، باطل، یہ سب حکم کلی ہیں، ہر ایک کے تحت جزئی احکام ہیں، حرام ایک حکم کلی ہے، اس کے تحت زنا، چوری، ناحق قتل، سود اور رشوت وغیرہ سب آتے ہیں اور مجموعی اعتبار سے ان سب پر حکم کلی ''حرام'' ہونے کا اطلاق ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی حرمت تنہا حکم جزئی ہے، یعنی زنا کی حرمت ایک حکم جزئی، چوری کی حرمت ایک حکم جزئی، ناحق قتل کی حرمت ایک حکم جزئی، اس طرح ہر ایک تنہا تنہا حکم جزئی ہے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے دوسرے کلی وجزئی احکام کو سمجھا جاسکتا ہے۔

فقہ کی غرض وغایت: شرعی احکام کو لوگوں کے افعال واقوال پر منطبق کرنا، اصول فقہ کے اغراض وفوائد علماء نے مختلف بیان کئے ہیں، ان سب کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے سبھی ہو سکتے ہیں، اس سے اُصول فقہ کی افادیت واہمیت اور ہر دور میں اس کی ضرورت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، یہاں ان سب کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

1. تاریخی فائدہ: (الف) فقہاء مجتہدین پر اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔

(ب) اُصولی قواعد کے توسط سے مجتہدین فقہاء کے مدارک اجتہاد، ان کے طرق استنباط کی معرفت ہوتی ہے کہ انہوں نے کس طرح شرعی احکام کا استنباط کیا ہے، اس سے ایک مقلد کو بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی روشنی میں نت نئے مسائل کو آسانی سے حل کرتا ہے۔

2. اجتہاد: اس سے اجتہاد اور اخذ واستنباط کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، احکام پر منصوص اور قیاسی دلائل قائم کیے جاسکتے ہیں۔
3. ترجیح: ایک مقلد کے اندر اپنے مذہب کے فقہاء کے اقوال کے درمیان ترجیح وتوفیق اور ان کو نظیر بنا کر ان پر نئے مسائل کی تخریج کی قوت وصلاحیت پیدا ہوتی ہے اور وہ استدلالی اعتبار سے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں دلائل فراہم کرسکتا ہے۔
3. موازنہ: مختلف دبستانِ فقہ کے فقہاء کے اقوال اور ان کے عقلی ونقلی دلائل کے درمیان موازنہ ومقارنہ کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، موازنہ کے نتیجہ میں ایسی رائے تک پہنچنا آسان ہوتا ہے جو قوتِ دلیل کے اعتبار سے راجح ہو۔
4. خطاء سے حفاظت: یہ فن انسان کو اجتہاد واستنباط اور احکام میں ہونے والی فکری غلطی سے بچاتا ہے، مختلف فقہاء کے اقوال وآراء، اور ان کے دلائل وشواہد کے درمیان موازنہ کرتے وقت نفس پرستی کی خطاء سے محفوظ رکھتا ہے۔
5. احکام کے درجات کی تعیین: اس علم کے حامل کے لئے زبان وبیان کے مختلف اسالیب کو سامنے رکھتے ہوئے احکام کے درجات کو متعین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔
6. فکری الحاد پر رد: یہ فن کتاب وسنت کی غلط تعبیر کرنے والوں اور دین کی غلط تشریح کرنے والوں پر رد اور ان کے شبہات کے ازالہ کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے؛ کیوں کہ اُصولِ فقہ کے ذریعہ ہی استدلال واستنباط کی غلطی کو سمجھا جاسکتا ہے، اور دوسروں کو اس سے واقف کرایا جاسکتا ہے۔
7. جدید مسائل کا حل: ہر دور میں پیدا ہونے والے نئے مسائل پر احکام شرعیہ کی تطبیق اُصول فقہ میں مہارت سے ہی ممکن ہوسکتی ہے، خود اس دور میں پیدا ہونے والے بہت سے مسائل عرف، مصالح مرسلہ، ضرورت وحاجت، سدذریعہ اور قیاس وغیرہ سے متعلق ہیں، جب تک اُصول فقہ پر گہری نظر نہ ہوگی، ان پیش آمدہ مسائل کے بارے میں درست رائے قائم کرنا بھی ممکن نہیں۔
8. دینی فائدہ: اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی معرفت حاصل ہوتی ہے، جس پر عمل کر کے انسان دین ودنیا کی سعادت سے سرفراز ہوتا ہے اور آخرت میں سرخرو ہوگا۔

16.3.1 اصول فقہ کی تاسیس

ہر فن بہ تدریج وجود پذیر ہوتا ہے، یہی حال اُصول فقہ کا ہے کہ بحیثیت فن مرتب ہونے میں اس کو بھی وقت لگا ہے اور ایک طویل مدت کے بعد دوسری صدی ہجری میں جا کر اس نے باضابطہ فن کی شکل اختیار کی ہے، اس سے پہلے بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح منتشر تھا اور اسے مرتب فن کی شکل دینے کی ضرورت نہیں تھی؛ اس لئے کہ عہد رسالت میں وحی الٰہی کا سلسلہ جاری تھا، آپ ﷺ کے رحلت فرما جانے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور آیا، وحی کا سلسلہ بند ہوگیا؛ لیکن نئے مسائل کا سلسلہ نہیں رُکا؛ بلکہ مزید اس میں تیزی آگئی اور پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہی پیش آنے لگے، جس کی وجہ سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجتہاد کیا جیسا کہ حضور ﷺ نے ان کی تربیت فرمائی تھی، آپ ﷺ جب صحابہ کے درمیان موجود تھے اس وقت متعدد بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجتہاد کیا ہے اور آپ ﷺ نے ان کے اجتہاد کی تصویب بھی فرمائی، ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا؛ بلکہ ایک موقع سے آپ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے جواب "اجتهد برأيي ولا آلو" (میں اجتہاد کروں گا اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوگی) پر خوشی کا اظہار فرمایا اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا:

"الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله لما یُرضي رسول الله"(ابوداود، کتاب القضاء، باب اجتهاد الرأی ،حدیث نمبر:3592)

(تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے رسول کے قاصد کووہ بات سکھائی، جواس کے رسول کے منشاء کے مطابق ہے)۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجتہاد آزادانہ نہیں تھا، جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجتہاد کیا اور جن موقعوں پر کیا، ان کے سامنے اُصول رہے ہیں، وہ عربی زبان وادب سے بخوبی واقف تھے، قرآن کے انداز واُسلوب سے اچھی طرح مانوس اور آگاہ تھے، اسبابِ نزول، ناسخ ومنسوخ، مجمل ومفصل، مطلق ومقید، اسباب ورود احادیث سے قرآن کی تفسیر اور اُصولی مباحث پر دسترس رکھتے تھے، یہی مباحث اُصولِ فقہ کی کتابوں میں زیر بحث آئے ہیں۔

چنانچہ وہ عورت جس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ حمل سے ہے، اس کی عدت کے بارے میں اختلاف ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کی عدت وضع حمل (بچہ جننا) ہوگی، اس حکم پر انہوں نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے:

"وَأُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ"[الطلاق: 4]

(اور حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ اُن کا وضع حمل ہوجائے)۔

اس سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک اُصولی قاعدہ کی طرف اشارہ فرمایا: اور وہ یہ کہ بعد میں آنے والی دلیل پہلے آنے والی دلیل کے لئے ناسخ ہوتی ہے؛ اس لئے یہاں بھی یہی حکم ہوگا کیونکہ وضع حمل والی آیت عدت وفات والی آیت کے بعد نازل ہوئی ہے، اس لئے حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہوگی۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ شراب پینے والے کو اسّی کوڑے لگائے جائیں، اس کی علت یہ بیان کرتے ہیں کہ جو شخص شراب پیتا ہے، اس پر نشہ طاری ہوتا ہے، جب وہ نشہ میں آتا ہے تو بکواس بکتا ہے اور جو بکواس کرتا ہے وہ دوسروں پر تہمت لگاتا ہے، اس لئے اس پر حدقذف جاری ہوگی، اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا کہ شراب پینے والے کی سزا کی حکم انجام کے اعتبار سے ہوگا"الحکم بالمآل فی عقوبة شارب الخمر"۔

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے دور میں ائمہ مجتہدین پیدا ہوئے ہیں اور ان کی اجتہادی کاوشوں سے اُمت نے خوب فائدہ اُٹھایا، دوسری اور تیسری صدی ہجری بالخصوص علوم وفنون کی تدوین کا دور رہا ہے اور ائمہ مجتہدین کا عہد زریں کہا جاتا ہے، یہی وہ زمانہ ہے کہ جس میں سیاسی اعتبار سے پوری دنیا کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں آچکی تھی، اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا، تقریباً ایک چوتھائی دنیا پر اسلام کی حکمرانی تھی، جس کی وجہ سے تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوا، حالات نے کروٹ لی، نت نئے مسائل پیدا ہوئے، جدید نظریات نے جنم لیا، نئی تحریکیں سامنے آئیں، دوسروں کے علوم وفنون نے بھی اسلامی سلطنت کی طرف رُخ کیا، عقلیت پسند گروہ نے اپنا سر اُٹھایا، فتنوں نے اپنا منہ کھولا، غرض یہ کہ گوناگوں مسائل ومشکلات نے ائمہ مجتہدین کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا، بلند عزم وحوصلہ کے مالک فقہاء نے بھی خوب اجتہاد کیا اور اس زمانہ کے لوگوں کی دینی قیادت ورہنمائی کا فریضہ بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام دیا۔

مصادرِ شرع (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس) جو دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں تھے وہی ائمہ مجتہدین کے عہد میں بھی تھے، صرف صحابہ کے فتاویٰ واجتہادات کا اضافہ ہوا، ائمہ مجتہدین نے جہاں خود اجتہاد کیا اور ان کے درمیان آراء کا اختلاف ہوا، وہیں آثارِ صحابہ اور ان کے فتاویٰ کے درمیان ترجیح وتوفیق اور حجت وعدم حجت کے بارے میں بھی اختلاف ہوا، ظاہر ہے اس اختلاف کی اساس اخذ واستنباط کا اُصولی اختلاف اور ان کے اجتہاد کے قواعد وضوابط کا مختلف ہونا ہے۔

حضرات مجتہدین صحابہ وتابعین اور ان کے بعد ائمہ مجتہدین کے فتاویٰ اور آراء کے اساسی قواعد وضوابط اب تک منتشر تھے، کچھ تو کتابوں میں تھے اور کچھ سینہ بسینہ محفوظ تھے، نیز دوسری صدی کے اواخر اور تیسری صدی کے اوائل میں اجتہادات کی بہتات ہوگئی، جس کی وجہ سے اشتباہات واحتمالات کی کثرت ہوگئی؛ چوں کہ ناپختہ علماء نے بھی اجتہاد شروع کر دیا، جس کی وجہ سے علماء راسخین نے ضرورت محسوس کی کہ اجتہاد کے شرائط وقواعد متعین کئے جائیں، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے جو اخذ استنباط کے معتبر اُصول چلے آرہے تھے، ان کی تدوین عمل میں آئی اور انہیں مزید تنقیح وتوضیح کے ساتھ مرتب کر دیا گیا۔ اصول فقہ کا بانی کون ہے؟ اس بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے، بنیادی طور پر تین اقوال ملتے ہیں، پہلا قول: امام ابوحنیفہؒ او رصاحبینؒ، دوسرا قول: امام شافعیؒ، تیسرا قول: امام باقرؒ اور ان کے صاحبزادے امام جعفر صادقؒ:

(الف) علامہ ابن قطلو بغا نے تاج التراجم میں، علامہ موفق مکی نے مناقب ابی حنیفہؒ میں محدث کبیر خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد، ابن ندیم نے "کتاب الفهرست" اور علامہ ابن ہمام نے "التحریر" میں امام ابو یوسفؒ کو مدون اول قرار دیا ہے اور ان کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اُصول فقہ کے موضوع پر پہلی تصنیف ان کی ہے، بعض حضرات نے ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسفؒ سے پہلے امام حنیفہؒ نے اس موضوع پر "کتاب الرأي" کے نام سے تصنیف کی ہے، ان ہی میں سے امام طحاوی کے شاگرد حافظ ابوالعوام عبدالرشید بن محمد سعدیؒ (متوفی:335ھ)، جو ابن ابی العوام سے مشہور ہیں نے "فضائل أبي حنيفة وأصحابه" میں اور محقق ابوالوفاء افغانیؒ نے مقدمہ "أصول السرخسي" میں نقل کیا ہے کہ اس موضوع پر ان کی پہلی تالیف "کتاب الرأي" ہے، اسی طرح بعض نے امام محمدؒ کی کتاب "کتاب الرأي" کا بھی ذکر کیا ہے بلکہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں امام محمدؒ کی کئی تالیفات کا ذکر کیا ہے، کتاب اجتہاد الرأی، کتاب الاستحسان اور کتاب اصول فقہ، اسی طرح امام محمد کی ایک کتاب "كتاب الحجة على أهل المدينة" ہے۔

(ب) عام طور پر علماء شوافع نے امام شافعیؒ کو مدون اول کی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور ان کی مشہور کتاب "كتاب الرسالة" کو پہلی تصنیف قرار دیا ہے؛ چنانچہ علامہ ابن خلدون (متوفی:808ھ) اپنے مقدمہ تاریخ ابن خلدون میں لکھتے ہیں:

"كان أول من كتب فيه الشافعي، أملى فيه رسالته المشهورة ...... ثم كتب فقهاء الحنفية فيه" (مقدمة ابن خلدون، ص: 455)

(اس موضوع پر سب سے پہلے شافعی نے لکھا، انھوں نے اس فن پر اپنا مشہور رسالہ املا کرایا...... پھر فقہاء احناف نے کتابیں لکھیں)

امام فخر الدین رازی (متوفی:606ھ) نے پورے یقین کے ساتھ امام شافعی کو ہی اس فن کا پہلا مصنف قرار دیا ہے: (مناقب الشافعی، ص:156)

علامہ بدرالدین زرکشی (متوفی: 794ھ) نے "البحر المحیط" میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ عبدالرحیم بن حسین اسنوی (متوفی: 772ھ) اور بعض دوسرے فقہاء شوافع نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

(ج) اہل تشیع میں امامیہ فرقہ نے اُصول فقہ کا مدون اول امام محمد باقر بن علی بن زین العابدین کو قرار دیا ہے اور ان کے بعد ان ہی کے فرزند امام ابوعبداللہ جعفر صادقؒ کو اس فن کے دوسرے مرتب کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

اِس سلسلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ امام شافعیؒ کی کتاب "الرسالۃ" اُصولِ فقہ کے موضوع پر پہلی تالیف نہیں ہے؛ بلکہ بعض تذکرہ نگاروں کے بقول ان سے پہلے امام ابوحنیفہؒ، امام یوسفؒ اور امام محمد نے بھی کتابیں تصنیف کی ہیں، اور تاریخی شواہد اور علمی اقتباسات کی رو سے امام ابویوسفؒ مدون اول اور ان کی لکھی ہوئی کتاب پہلی تصنیف قرار پائی ہے، ہاں یقیناً دنیا میں اس وقت موجود مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں میں پہلی کتاب امام شافعیؒ کی "الرسالۃ" ہے، اسی طرح مذہب شافعی میں اُصول فقہ کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں "الرسالۃ" کو اولیت حاصل ہے۔

16.3.2 اصول فقہ پر لکھی جانے والی کتابوں کا منہج

امام شافعیؒ کے بعد اُصول فقہ کے موضوع پر ہر دور میں بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں؛ البتہ چوتھی صدی ہجری سے یہ فن محقق علماء کی توجہ کا خاص مرکز رہا ہے، ہر ایک کا اپنا ایک خاص منہج رہا ہے؛ ان میں تین مناہج مقبول ہوئے ہیں، اہل علم نے ان ہی تین مناہج پر کتابوں کو تقسیم کیا ہے: متکلمین کا منہج، فقہاء کا منہج، دونوں مناہج کو جامع منہج۔

1. متکلمین کا منہج اور اس کی نمائندہ کتابیں

متکلمین فقہاء نے اس علم کے اُصول وقواعد کو واضح کیا اور نظری ومنطقی انداز میں اس پر دلائل ذکر کیے اور ان اُصولوں پر جو احکام ومسائل متفرع ہوتے ہیں، انہیں ذکر کرنے سے گریز کیا، گویا پوری توجہ اُصول وقواعد کو زیادہ سے زیادہ دلائل سے طاقتور بنانے پر رہی، مثال یا توضیح کے طور پر ضمناً اکا دکا مسئلہ زیر بحث آ گیا، اس منہج کو متکلمین فقہاء کا منہج کہا جاتا ہے اس منہج کو شوافع کا منہج بھی کہا جاتا ہے، یہی منہج اکثر اُصولیین فقہاء شوافع ومالکیہ کا رہا ہے۔

اس منہج پر اُصول فقہ کی بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے چند اہم اور مشہور کتابیں یہ ہیں:

1. الرسالة: امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعیؒ: متوفی: (204ھ)
2. الرد علی ابن داود فی إبطال القیاس: احمد بن عمر بن سریج ابوالعباس (م: 306ھ)
3. إثبات القیاس: محمد بن ابراہیم بن منذر، ابوبکر (م: 306ھ)
4. إثبات القیاس: ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری (م: 324ھ)
5. اختلاف الناس فی الأسماء والاحکام والخاص والعام: ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعری (م: 324ھ)
6. کتاب دلائل الأعلام علی أصول الأحکام: ابوبکر محمد بن عبد صیر فی (م: 330ھ)
7. الهداية: ابواحمد محمد بن سعید خوارزمی شافعی (م: 343ھ)

8. التقريب والإرشاد في ترتيب طرق الاجتهاد : قاضی ابوبکر محمد بن طیب باقلانی (م:413ھ)

9. كتاب العمدة: قاضی عبدالجبار ہمدانی معتزلی (م:415ھ)

10. كتاب المعتمد: علامہ ابوالحسین محمد بن علی بصری معتزلی (م:436ھ)

11. الاحكام في أصول الأحكام: علامہ ابومحمد علی بن حزم اندلسی ظاہری (م:456ھ)

12. العمدة في أصول الفقه: قاضی ابویعلی حنبلی (م:458ھ)

13. إحكام الفصول في أحكام الأصول: ابوالولید سلیمان بن خلف باجی (م:474ھ)

14. المنهاج في ترتيب الحجاج: ابوالولید سلیمان بن خلف باجی (م:474ھ)

15. أللمح في أصول الفقه: ابواسحاق ابراہیم شیرازی (م:476ھ)

16. التبصرة في أصول الفقه: ابواسحاق ابراہیم شیرازی (م:476ھ)

17. البرهان في أصول الفقه: امام الحرمین عبدالملک بن یوسف جوینی (م:478ھ)

18. قواطع الأدلة: علامہ ابوالمظفر منصور سمعانی (م:489ھ)

19. المستصفى: امام ابوحامد محمد غزالی (م:505ھ)

20. المنخول من تعليقات علم الأصول: امام ابوحامد غزالی (م:505ھ)

21. التمهيد: ابوالخطاب کردوانی حنبلی (م:510ھ)

22. الوصول الى الأصول: ابوالوفاء علی بن عقیل بغدادی حنبلی (م:531ھ)

23. المحصول في أصول الفقه: امام فخرالدین رازی (م:606ھ)

24. الإحكام في أصول الأحكام: سیف الدین ابوالحسین علی آمدی (م:631ھ)

25. الامام في بيان ادلة الاحكام: علامہ عزالدین ابن عبدالسلام (م:620ھ)

26. منتهى الوصول والأمل في علمي الأصول والجدل: علامہ عثمان بن حاجب مالکی (646ھ)

27. منهاج الوصول الى علم الأصول: قاضی ناصرالدین بیضاوی (م:685ھ)

28. البحر المحيط: علامہ بدرالدین زرکشی شافعی (م: 794ھ)۔

2. فقہاء کا منہج اور اس کی نمائندہ کتابیں

اُصول فقہ کے موضوع پر تالیف وتصنیف کا دوسرا منہج یہ رہا ہے کہ ائمہ مجتہدین سے منقول فقہی جزئیات کو بنیاد بنا کر اُصول وقواعد مرتب کئے جائیں، یہ طریقۂ تالیف فقہ سے زیادہ قریب اور فروعی مسائل کے فہم کے لئے زیادہ مناسب ہے؛ اسی لئے اس طریقۂ تالیف کو فقہاء کا طریقہ کہا جاتا ہے اس منہج کو احناف کا منہج بھی کہا جاتا ہے۔

اس منہج پر اُصول فقہ کی جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں، ان میں سے چند اہم اور مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں:

1. مأخذ الشرائع: امام ابومنصور ماتریدی (م:330ھ)

2. الفصول فى الأصول: ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی (م:370ھ)
3. تقويم الأدلة: ابوزید عبیداللہ بن عمر بن عیسیٰ دبوسی (م:430ھ)
4. كنز الوصول إلى معرفة الأصول (أصول البزدوی): فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی (م:482ھ)
5. تمهيد الفصول فى الأصول (أصول السرخسی): محمد بن احمد بن ابی سہل شمس الأئمہ سرخسی (م:483ھ)
6. منار الأصول فى نتائج العقول: شمس الدین ابوبکر سمرقندی (م:541ھ)
7. منار الأنوار: حافظ الدین ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی (م:710ھ)

3. دونوں مناہج کا جامع منہج اوراس کی نمائندہ کتابیں

تیسرا منہج متقدمین کے دونوں مناہج کا جامع اوراس کی خوبیوں کا حامل ہے، جس نے ساتویں صدی ہجری میں علم اُصول فقہ کی دنیا میں ایک علمی انقلاب برپا کیا، وہ نیا منہج یہ تھا کہ جہاں اُصول وقواعد کو خوب واضح کر کے لکھا جائے اور انہیں دلائل سے آراستہ کیا جائے، وہیں ان اُصولوں کے تحت آنے والے فقہی جزئیات بھی ذکر کیے جائیں؛ تاکہ اس میں دونوں مناہج کی خوبیاں جمع ہوجائیں اور دونوں مناہج کے درمیان موازنہ اور ترجیح میں آسانی ہو، اوراسی اعتبار سے جزئیات کی تخریج بھی کی جاسکے، اس طرز پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند اہم اور مشہور کتابیں یہ ہیں:

1. تخريج الفروع على الأصول: علامہ شہاب الدین زنجانی شافعی (م:656ھ)
2. بديع النظام: الجامع بين أصول البزدوی والاحكام الأمدی: ابن ساعاتی مظفر الدین احمد بن علی بعلبکی حنفی (م:694ھ)
3. فصول البدائع فى أصول الشرائع: شمس الدین محمد بن حمزہ (م:734ھ)
4. تنقيح الأصول: صدر الشریعہ عبیداللہ بن مسعود بخاری محبوبی (م:747ھ)
5. جمع الجوامع: تاج الدین عبدالوہاب بن علی سبکی (م:771ھ)
6. التمهيد فى تخريج الفروع على الأصول: جمال الدین اسنوی شافعی (م:772ھ)
7. التحرير: علامہ ابن ہمام کمال الدین محمد بن عبدالواحد حنفی (م:861ھ)
8. مسلم الثبوت: علامہ محب اللہ بن عبدالشکور بہاری (م:1119ھ)

16.4 قواعد فقہیہ

قواعد، قاعدہ کی جمع ہے، قاعدہ کے معنی اساس وبنیاد کے ہیں، خواہ یہ بنیاد حسی ہو جیسے: گھر کی بنیاد، یا معنوی ہو، جیسے دین کی بنیاد، قرآن میں لفظ "القواعد" دوجگہ استعمال ہوا ہے [البقرۃ:127، النحل:26]۔

اصطلاحی اعتبار سے قواعد فقہیہ سے مراد وہ اکثری فقہی قانونی اصول ہیں جن کے تحت بہت سے شرعی احکام داخل ہوتے ہیں، جیسے "اليقين لا يزول بالشک" (جو چیز یقین سے ثابت ہو، اس کو محض شک کی وجہ سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا)۔

یہ ایک اکثری فقہی قاعدہ ہے، جو عبادات، معاملات، اور تقریباً تمام فقہی ابواب میں جاری ہوتا ہے، اوراس پر مختلف ابواب فقہ کے مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

اسی سے قریب ایک اور اصطلاح ''ضابطہ'' کی ہے، ضبط کے معنی کسی شئ کو محفوظ کرنا، اصطلاحی اعتبار سے وہ ایک فرعی فقہی اصل ہے جس کے تحت فقہ کے کسی ایک باب سے متعلق مسائل داخل ہوتے ہیں، جیسے: ''أیما اهاب دبغ فقد طهر'' (جس چمڑے کو دباغت دے دی جائے وہ پاک ہو جائے گا) ایک فقہی ضابطہ ہے، اس کا تعلق صرف طہارت کے باب سے ہے، قاعدہ اور ضابطہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ قاعدہ عام ہے اور ضابطہ خاص ہے، یعنی قاعدہ کا تعلق فقہ کے مختلف ابواب سے ہوتا ہے اور ضابطہ کا تعلق فقہ کے کسی ایک باب سے ہوتا ہے، جیسا کہ ابھی آپ نے اس کی تفصیل پڑھی۔ علمی اعتبار سے گو یہ فرق کیا جاتا ہے؛ لیکن استعمال اور عملی میدان میں قاعدہ کا ضابطہ پر اور ضابطہ کا قاعدہ پر اطلاق خوب ہوا ہے۔

جہاں تک قواعد فقہ اور اصولی قواعد کے درمیان فرق کی بات ہے تو دونوں کے درمیان چند امور میں فرق پایا جاتا ہے، تاہم اصول فقہ کے قواعد اور قواعد فقہیہ کے درمیان اس بات میں مماثلت پائی جاتی ہے کہ دونوں ہی کے تحت فقہی جزئیات متفرع ہوتی ہیں، اور کئی اعتبارات سے دونوں میں فرق پایا جاتا ہے:

1. **استعمال کے اعتبار سے:** علم اُصول فقہ ایک فقیہ کے لئے آلہ اجتہاد اور صحیح اخذ واستنباط کے لئے ایک قانون وضابطہ ہے؛ جب کہ قواعد فقہیہ کتب فقہ کے مختلف ابواب میں منتشر فقہی جزئیات اور باہم ایک دوسرے سے ملتے جلتے احکام کو ایک ضابطہ کے تحت جمع کرتے ہیں، ان تمام جزئیات واحکام میں مشترک ایک علت ہوتی ہے جو سب کو جامع وشامل ہوتی ہے، ایک فقیہ ایک مسئلہ کے تمام نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے اخذ واستنباط میں ان سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔
2. **انطباق کے اعتبار سے:** اُصول فقہ کے اُصول وقواعد ایسے کلی ہوتے ہیں کہ فقہ کے تمام جزئیات ان پر منطبق ہوتے ہیں، اس کے مقابلہ میں قواعد فقہیہ اکثری واغلبی ہوتے ہیں، یعنی فقہ کے پورے جزئیات ان پر منطبق نہیں ہوتے ہیں؛ بلکہ اکثر وبیشتر منطبق ہوتے ہیں اور کچھ مستثنیٰ ہوتے ہیں۔
3. **وجود کے اعتبار سے:** اخذ واستنباط کے اُصول وقواعد پہلے بنائے گئے اس کے بعد اس کی روشنی میں احکام مستنبط کئے گئے، اس کے برخلاف قواعد فقہیہ فقہی جزئیات سے مستفاد ہیں، یعنی فقہی جزئیات پہلے وجود میں آئے، اس کے بعد قواعد فقہیہ ان ہی جزئیات کو احاطہ کرنے کے لئے وضع کئے گئے۔
4. **بنیاد کے اعتبار سے:** اُصول فقہ کی بنیادیں تین علوم ہیں: علم کلام، عربی زبان کے قواعد، ادلۂ شرعیہ، بنیادی طور پر ان ہی علوم سے اُصول فقہ مربوط ہوتا ہے، اور قواعد فقہیہ کی بنیادیں احکام شرعیہ اور عام مقاصد شریعت ہیں۔
5. **تعلق کے اعتبار سے:** اُصول فقہ کے اُصول وقواعد کا تعلق ادلۂ شرعیہ سے ہے اور قواعد فقہیہ کا تعلق مکلفین کے افعال سے ہے۔

قواعد فقہ کا سانچہ مختلف انداز سے تیار ہوتا ہے، کبھی عین نص سے، جیسے: ''الخراج بالضمان'' (ابو داود: 3508) (جو نفقہ ان کا ذمہ دار ہو وہی فائدہ کا حقدار ہے)، یہ حدیث نبوی کا ایک ٹکڑا ہے، کبھی کسی خاص نص سے قاعدہ مستنبط ہوتا ہے، جیسے: ''المیسور لایسقط بالمعسور'' (حکم شرع تنگی کی وجہ سے مکمل طور پر ساقط نہیں ہوتا ہے) یہ قاعدہ اللہ کے رسول ﷺ کے ارشاد ''جب میں تم لوگوں کو کسی چیز سے روکوں تو اس سے بچو، اور جب کسی کام کا حکم دوں تو اس کو مقدور کے مطابق کرو'' (بخاری: 7288) سے ماخوذ ہے۔

کبھی صرف ایک نص سے نہیں، بلکہ نصوص کے مجموعہ سے ماخوذ ہوتا ہے، جیسے:" المشقة تجلب التيسير " (مشقت سہولت کا باعث بنتی ہے) یہ قاعدہ اللہ تعالیٰ کے مختلف ارشادات سے بنایا گیا ہے [بقرہ: 185، 286، حج: 78]۔ کبھی قاعدہ کی بنیاد کو اجماع بنایا جاتا ہے، جیسے:" الاجتهاد لا ينقض بالاجتهاد" (ایک اجتہاد دوسرے اجتہاد کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاتا)۔ بعض اوقات قواعد فقہ مجتہدین کے اقوال سے ماخوذ ہوتے ہیں، جیسے: امام ابو یوسفؒ کا قول: " لا ينبغي لأحد أن يحدث شيئاً في طرق المسلمين مما يضرهم" (کسی کے لئے درست نہیں کہ مسلمانوں کے راستہ میں ان کو نقصان پہنچانے والا کوئی تصرف کرے) اس اصولی قول کو بعد کے فقہاء نے فقہی قاعدہ کا قالب عطا کر دیا، اسی طرح امام محمدؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ کے یہاں بھی ایسے فقرے ملتے ہیں جن کو قواعد فقہیہ قرار دیا گیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے قواعد فقہ کی تدوین تین مرحلوں میں ہوئی ہے، پہلا مرحلہ: نشو ونما، دوسرا مرحلہ: ارتقاء وتدوین، تیسرا مرحلہ: تکمیل و پختگی۔

پہلا دور (نشو ونما): عہد رسالت سے ائمہ مجتہدین تک پھیلا ہوا ہے، آپ پڑھ چکے ہیں کہ بہت سے قواعد فقہیہ قرآن وحدیث سے نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ بحیثیت فن تو نہیں؛ لیکن عہد رسالت میں قرآن وحدیث کے نصوص میں ایسے اصول منتشر تھے جن کی حیثیت قاعدہ کی ضرور ہوتی تھی، اور بعد میں وہ قواعد فقہ سے معروف ہوئے، عہد رسالت کے بعد عہد صحابہ میں حضرت عمر ؓ اور حضرت علی ؓ وغیرہ صحابہ کرام ؓ نے کچھ اصولی قواعد ارشاد فرمائے ہیں: چنانچہ حضرت عمر ؓ کا قول ہے:" البينة على المدعي واليمين على من أنكر " (ثبوت مدعی کے ذمہ ہوگا اور قسم انکار کرنے والے کے ذمہ) (موسوعة فقه عمر بن الخطاب، ص: 431) گو کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہو کر اس کو شہرت ملی چونکہ انہوں نے ایک قانونی ضابطہ کے طور پر اس کو استعمال کیا، حضرت علی ؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کا ارشاد ہے:" ليس على مؤتمن ضمان " (امانتدار شخص پر ضمان نہیں ہے) (سنن بيهقي: 289/4 مصنف عبدالرزاق: 182/8)۔

صحابہ کے بعد بھی تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کے عہد میں اور فقہ اسلامی کی اولین تالیفات میں ایسے اصولی نظریات ملتے ہیں، جن کو "قواعد فقہیہ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؛ چنانچہ قاضی شریح تابعی کا قول ہے:" من شرط على نفسه طائعا غير مكره فهو عليه" (بخاری) (جس نے بخوشی کسی کے دباؤ کے بغیر اپنے کو کسی شرط کا پابند کیا تو وہ اسی شرط پر ہے)، امام ابو یوسفؒ کا بیان ہے:" لا يؤخذ شي من أموالهم إلا بحق يجب عليهم " (لوگوں کا کوئی مال نہیں لیا جائے گا، سوائے اس کے کہ ان سے کوئی حق متعلق ہو) (كتاب الخراج، ص: 125)، امام محمدؒ کا قول ہے:" لايجتمع الأجر والضمان" (کتاب الام: 168/4) (اجرت اور ضمان دونوں جمع نہیں ہوں گے)، امام شافعیؒ کہتے ہیں:" يجوز في الضرورة مالايجوز في غيرها" (كتاب الام: 168/4) (بوقت ضرورت جو چیز جائز ہوتی ہے وہ غیر وقت میں جائز نہیں ہوتی ہے)، امام احمد کا قول ہے:" كل ماجاز فيه البيع تجوز فيه الهبة والصدقة والرهن" (جس شئی میں بیع درست ہو، تو اس میں ہبہ، صدقہ اور رہن بھی درست ہوں گے)۔

دوسرا دور (ارتقاء وتدوین): یہ دور چوتھی صدی ہجری سے شروع ہو کر دسویں صدی ہجری پر ختم ہوتا ہے، یہ وہ دور ہے جس میں قواعد فقہیہ مستقل فن کے طور پر سامنے آیا، اور اس موضوع پر مستقل کتابوں کی تصنیف شروع ہوئی، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مذہب حنفی کو اس میں اولیت حاصل ہے، چنانچہ ابوطاہر محمد بن محمد دباس حنفی (متوفی: 340ھ) نے سترہ قواعد فقہ ایسے مرتب کئے تھے، جن پر فقہ حنفی کی تمام تر جزئیات منطبق ہوتی ہیں، ان سترہ قواعد میں یہ پانچ بنیادی قواعد ہیں: "الأمور بمقاصدها" (امور میں مقاصد کا اعتبار ہوگا)، "اليقين لايزول بالشک" (جو چیز یقین سے ثابت ہو، اسے محض شک کی وجہ سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا) "المشقة تجلب التيسير" (مشقت سہولت کا باعث بنتی ہے)، "الضرر يزال" (ضرر دور کیا جائے گا)، "العادة مُحكَّمة" (عرف وعادت کی حیثیت حکم کی ہوگی)۔ اس کے بعد امام ابوالحسن عبیداللہ بن حسین کرخی (260-340ھ) نے مزید قواعد کا اضافہ کیا، اس طرح کل 37/قواعد ہوگئے، یہی مجموعہ قواعد "اصول کرخی" سے معروف اور مطبوعہ ہے، اس سلسلہ کی یہ پہلی مطبوعہ کتاب پائی جاتی ہے۔

پانچویں صدی ہجری کے مشہور اصولی فقیہ ابوزید عبیداللہ بن عمر دبوسی (متوفی: 430ھ) ہیں، انہوں نے "تأسیس النظر" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جس میں مختلف فقہاء کی آراء کے اختلاف کی بنیادوں کو قواعد فقہ میں تلاش کرنے کی اچھی کوشش کی، یہ کتاب 85/قواعد وضوابط پر مشتمل ہے، اس صدی کے علماء قواعد میں معروف مورخ اور ظاہری فقیہ ابن حزم اندلسی (متوفی: 456ھ) کا نام بھی آتا ہے، جنہوں نے دو کتابیں تالیف کیں، ایک کا نام "الاملاء فی قواعد الفقه" ہے، دوسرے کا نام "الإحكام في أصول الأحكام" ہے، چھٹی صدی ہجری میں علاء الدین سمرقندی حنفیؒ (متوفی: 540ھ) کی کتاب "إيضاح القواعد" کا ذکر آتا ہے، ساتویں صدی ہجری میں محمد بن ابراہیم جاجرمی شافعی (متوفی: 613ھ) کی "القواعد فی فروع الشافعية"، عزالدین بن عبدالسلام شافعی (متوفی: 620ھ) کی "قواعد الأحكام فی مصالح الأنام"، شهاب الدين قرافی مالکی (متوفی: 684ھ) کی "الفروق"، محمد بن عبداللہ بکری مالکی (متوفی: 685ھ) کی "المُذَهَّب فی ضبط المَذْهب" وغیرہ تالیفات منظر عام پر آئیں، آٹھویں صدی ہجری کو قواعد فقہیہ کا زرّیں دور سمجھا جاتا ہے، اس صدی میں قواعد فقہ پر بڑی تعداد میں کتابیں تصنیف ہوئیں، ان میں مشہور یہ ہیں: "القواعد الكبرى في فقه الحنابلة" از نجم الدین طوفی (متوفی: 716ھ) "الأشباه والنظائر" از ابن وکیل مصری شافعی (متوفی: 716ھ)، "القواعد النورانية" از ابن تیمیہ (متوفی: 728ھ)، "الأشباه والنظائر" از تاج الدین سبکی (متوفی: 771ھ) اور از جمال الدین اسنوی شافعی (متوفی: 772ھ)، "المنثور فی القواعد" از بدرالدین زرکشی (متوفی: 794ھ)، "القواعد فی الفقه الإسلامی" از ابن رجب حنبلی (متوفی: 795ھ)، "القواعد فی الفروع" از شرف الدین غزی حنفی (متوفی: 799ھ)۔

نویں صدی ہجری کی مشہور کتابیں اور مصنفین یہ ہیں: "أسنى المقاصد فی تحرير القواعد" محمد بن محمد زبیری (متوفی: 808ھ)، "القواعد المنظومة" از ابن ہائم (متوفی: 815ھ)، "القواعد الكلية والضوابط الفقهية" از ابن عبدالہادی (متوفی: 880ھ)، دسویں صدی ہجری کے مشہور مصنفین میں جلال الدین سیوطیؒ شافعی (متوفی: 910ھ) ابن نجیم مصری حنفی (متوفی: 970ھ) ان دونوں میں سے ہر ایک نے "الأشباه والنظائر" کے نام سے قواعد فقہ پر کتابیں لکھیں، اسی طرح ابوالحسن زقاق مالکی (متوفی: 912ھ) ہیں، جنہوں نے نظم میں فقہی قواعد کو بیان کیا۔

تیسرا دور (تکمیل وپختگی): دسویں صدی کے اختتام، گیارہویں صدی کے آغاز سے دور حاضر تک کے زمانہ پر مشتمل ہے، اس دور میں قواعد فقہیہ پر جو نمایاں علمی کام ہوئے ہیں وہ اس طرح ہیں کہ ترکی کے ایک حنفی فقیہ محمد ابو سعید خادمی (متوفی: 1176ھ) نے اصول فقہ میں "مجامع الحقائق" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جس کے آخر میں ابن نجیم مصری کے قواعد پر اضافہ کے ساتھ 154 / قواعد بھی شامل کردیئے، تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ سلطان عبدالعزیز خان عثمانی کے زیر نگرانی اُس زمانہ کے باکمال علماء کی کمیٹی کے ذریعہ "مجلة الاحكام العدلية" کی ترتیب عمل میں آئی، جس کے شروع میں ایک سو اہم قواعد بھی جمع کئے گئے، پھر کئی اہل قلم علماء نے اس کی شرحیں لکھیں جن میں ان قواعد کی تنقیح وتحقیق کی خدمت انجام دی۔

اس کے بعد سلطان عبدالحمید ترکی کے عہد میں دمشق کے مفتی شیخ محمود حمزہ نے مجلّہ کے علاوہ قواعد وضوابط کو فقہی ابواب کی ترتیب پر ایک کتاب میں جمع کردیا، جس کا نام "الفرائد البهية فى القواعد والفوائد الفقهية" رکھا، ماضی قریب کے ایک بڑے حنفی فقیہ شیخ احمد زرقاء نے "شرح القواعد الفقهية" کے نام سے قواعد کی وقیع تشریح وتوضیح کی، اس کے بعد ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقاء نے اس کام کو آگے بڑھایا، اور اپنی مایہ ناز تالیف "المدخل الفقهي العام" میں اس موضوع پر بڑی اچھی گفتگو کی ہے، دور حاضر کے ایک ہندوستانی عالم اور شیخ مصطفیٰ زرقاء کے فیض یافتہ ڈاکٹر علی احمد ندوی کی دو کتابیں "القواعد الفقهية" اور "جمهرة القواعد الفقهية" اس موضوع پر [illegible] ہیں اور نہایت قابل قدر ہیں، اسی طرح ایک اہم کتاب "موسوعة القواعد الفقهية" از ڈاکٹر محمد صدقی بن احمد بورنو [illegible]ث غزی ہے، جس میں مذاہب اربعہ (حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ) کے درمیان متفق علیہ ومختلف فیہ فقہی قواعد وضوابط کو حروف تہجی کے مطابق جمع کیا اور پہلی مرتبہ 1423ھ میں مؤسسۃ الرسالہ، بیروت کی طرف سے 13 جلدوں میں قواعد فقہ پر یہ انسائیکلوپیڈیا شائع ہوا، بورنو نے "الوجيز فی ايضاح قواعد الفقه الكلية" کے عنوان سے ایک دوسری کتاب بھی لکھی۔

16.5 مقاصد شریعت

اسلامی شریعت کے ہر حکم کے پیچھے کوئی ایک مقصد یا متعدد مقاصد ہوتے ہیں، اور حکم پر عمل کے ذریعہ ان اہداف ومقاصد تک پہنچنا مطلوب ہوتا ہے، اسلامی مقاصد کے مجموعہ کو مقاصد شریعت کہتے ہیں۔ اسلامی شریعت کے تمام احکام کے پیچھے کچھ نہ کچھ اللہ تعالیٰ کے مقاصد واسرار ضرور کارفرما ہیں، جن کو بروئے کار لانے کے لئے بندے کو احکام دیئے گئے، یہ اور بات ہے کہ بعض مقاصد کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنے پیغمبر کی زبانی بیان فرمادیا، اور اکثر مقاصد کو مخفی رکھا۔

ظاہر ہے کہ شریعت کا نزول انسانی مفاد کے لئے ہوا ہے، اسی وجہ سے اس کے تمام احکام انسان کے پانچ مقاصد کی حفاظت وتکمیل کے اردگرد گھومتے ہیں، اور وہ یہ ہیں: دین، جان، نسل، عقل اور مال، ان پانچ مقاصد کی حفاظت کے لئے انسان کو دو طرح کے احکام دیئے گئے ہیں، ایک وہ ہیں جن کے ذریعہ پانچوں امور کی حفاظت ہوتی ہے، دوسرے وہ احکام جو ان پانچوں امور کو نقصان پہونچانے والی اشیاء سے بچاتے ہیں، چنانچہ دین کی حفاظت جہاں اسلام اور اس کی طرف ترغیبات سے ہوتی ہے، وہیں ارتداد کی سزا اور جہاد کے احکام کی مشروعیت کے ذریعہ اس کو ضرر پہنچنے سے بچایا گیا، جان کی حفاظت کے لئے ایک طرف کھانے پینے

16.6 احکام خمسہ تکلیفیہ (پانچ تکلیفی احکام)

احکام سریعت میں چار ارکان ہیں: حاکم ،محکوم فیہ،محکوم علیہ اور حکم۔

حاکم: اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جس کی طرف سے حکم صادر ہوتا ہے،محکوم فیہ: مکلف شخص کا وہ فعل جس سے حکم متعلق ہوتا ہے، محکوم علیہ سے مکلفین اشخاص مراد ہیں، جو احکام الٰہی کے مخاطب ہیں اور جن کے افعال پر شریعت حکم لگاتی ہے۔

جہاں تک حکم کی بات ہے تو اس کے لغوی معنی ''علم وفہم اور عدل کے ساتھ فیصلہ'' کے ہیں، اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خطاب جو مکلفین سے مطالبہ، یا اختیار یا وضع کے طور پر متعلق ہو، یعنی اللہ کے خطاب سے مراد اللہ کا حکم ہے جو مکلّف کے افعال واعمال سے متعلق ہوتا ہے، مطالبہ سے مراد کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا طلب ہو، پھر کسی کام کے کرنے کا مطالبہ دو طریقے سے ہوتا ہے، اگر مطالبہ لازمی طور پر ہو تو وہ فرض وواجب ہے، اگر مطالبہ لازمی طور پر نہ ہو تو وہ استحباب وندب ہے، اگر کسی کام کے ترک کا مطالبہ ہو، اور اس ترک فعل کو لازم قرار دیا گیا ہو تو وہ حرام ہے، اور اگر اس سے کم درجہ کا مطالبہ ہو تو وہ مکروہ ہے، اختیار کے ساتھ حکم دینے سے مراد اباحت ہے جس میں مکلّف پر نہ اس کا کرنا لازم ہوتا ہے اور نہ ہی ترک یعنی نہ کرنا، دونوں ہی پہلو برابر ہوتے ہیں، ''وضع'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی حکم کو کس شئی کے ساتھ اس طور پر مربوط کر دیا گیا ہو کہ ایک شئی کو دوسری شئی کے لئے سبب یا شرط قرار دیا گیا ہو یا اس کے بجائے اس کے لئے مانع قرار دیا گیا ہو، جیسے نماز کے وجوب کے لئے وقت کا پایا جانا سبب ہے، پاکی نماز کی صحت کے لئے شرط ہے، اور مورث کا قاتل کے لئے وارث بننے سے مانع ہے۔

علماء اصولیین نے حکم کی کئی طرح کی تقسیم کی ہے؛ لیکن بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں، تکلیفی اور وضعی، حکم تکلیفی سے مراد یہ ہے کہ مکلّف سے کسی کام کے کرنے یا اس سے رکنے کا مطالبہ ہو یا کرنے اور نہ کرنے کے درمیان اختیار ہو، دوسرے الفاظ میں مکلّف کے افعال کی صفت کو حکم تکلیفی کہہ سکتے ہیں، جیسے وجوب، استحباب، حرمت، مکروہ وغیرہ۔

احکام تکلیفی سے دنیوی مقصود ان احکام کی ادائیگی سے ذمہ کا فارغ ہو جانا ہے، چاہے وہ عبادات ہوں یا معاملات، اس لحاظ سے احکام تکلیفی کی تین قسمیں ہوتی ہیں: صحیح، فاسد اور باطل۔

اگر یہ دنیوی مقصود پورے طور پر ادا ہو جائے تو ''صحیح'' ہے، اگر پورے طور پر ادا نہ ہو تو ''باطل'' ہے، ارکان وشرائط اس مقصد کے حصول اور ذمہ سے فارغ ہونے کو متقاضی ہوں، لیکن مطلوبہ خارجی اوصاف پورے نہ ہو پائیں تو ''فاسد'' ہے۔

حکم تکلیفی کا اخروی مقصود ثواب کا حصول، یا عذاب کے حکم کا مرتب ہونا ہے، اس اعتبار سے احکام کی پانچ قسمیں ہوتی ہیں: واجب، مندوب، حرام، مکروہ اور مباح، یہ تقسیم جمہور فقہاء کے نزدیک ہے، احناف کے یہاں اس سے زیادہ قسمیں ہیں، احناف کے مذہب کے مطابق سات قسمیں ہوتی ہیں: فرض، واجب، مندوب، حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی اور مباح۔

جمہور علماء کے قول کے مطابق تکلیفی احکام کی قسموں کی تعریف اس طرح ہوگی:

واجب: شارع (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) مکلّف کو کسی کام کے کرنے کا حکم دیا گیا ہو، اور یہ مطالبہ حتمی اور لازم ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا واجب ہے، عمل کرنے والا ثواب پائے گا، عمل نہ کرنے والا عقاب کا مستحق ہوگا، اس کا منکر کافر ہوگا جب کہ قطعی دلیل سے ثابت ہو۔

احناف کے مذہب کے مطابق درجہ ومقام کے لحاظ سے واجب سے اوپر کے درجہ میں فرض کی ایک اصطلاح ہے، اب دیکھئے فرض اور واجب کی تعریف ان کے مطابق اس طرح ہوگی، فرض: اس حکم کو کہتے ہیں، جو ایسی دلیل قطعی سے ثابت ہو، جس میں شک وشبہ نہ ہو، جیسے: ارکان اسلام جو قرآن سے ثابت ہیں، اسی حکم میں وہ احکام بھی ہیں جو خبر متواتر یا مشہور سے ثابت ہوں جیسے نماز میں قرأت قرآن کا مسئلہ، اس کا حکم یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا فرض ہوگا، عمل کرنے والا ثواب کا مستحق ہوگا، نہ کرنے والا عقاب کا مستحق اور اس کا منکر کافر ہوگا۔

واجب: اس حکم کو کہتے ہیں جو دلیل ظنی سے ثابت ہو جس میں شک کی گنجائش ہو، جیسے: صدقہ فطر، نماز عیدین اور وتر، یہ سب ظنی دلائل سے ثابت ہیں، دلیل ظنی سے مراد خبر واحد ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا واجب ہوگا، عمل کرنے والا ثواب کا مستحق ہوگا، عمل نہ کرنے والا عقاب کا سزاوار ہوگا اور اس کا منکر فاسق ہوگا، کافر نہیں۔

واجب کی دو قسمیں ہوتی ہیں: واجب عینی اور واجب کفائی، واجب عینی سے مراد یہ ہے کہ شارع مکلفین میں سے ہر فرد سے مستقل کسی کام کے کرنے کا مطالبہ کرے، اور دوسرے کے کرنے سے ساقط نہ ہو، جیسے: پانچوں وقت کی فرض نمازیں اور روزہ وغیرہ، اس کا حکم یہ ہے کہ ہر مکلف پر اس کا کرنا لازم ہے، ایک دوسرے کی طرف سے ادائیگی معتبر نہیں ہوگی اور ذمہ سے مطالبہ ساقط نہیں ہوگا، واجب کفائی سے مراد یہ ہے کہ شارع تمام مکلفین سے کسی کام کے کرنے کا مطالبہ کرے، ہر ہر فرد سے علیحدہ علیحدہ مطالبہ نہ ہو، جیسے: اللہ کے راستہ میں جہاد، فیصلہ کرنا، فتوی دینا، شہادت کی ادائیگی، ایجادات، اسی طرح دوسرے علوم وفنون اور پیشے جن کی امت اور انسانیت کو ضرورت ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا کرنا تمام لوگوں پر واجب ہوتا ہے اس طور پر کہ اگر بعض لوگ اس کام کو انجام دیدیں تو بقیہ لوگوں کے ذمہ سے واجب ساقط ہوجائے گا اور گنہگار نہیں ہوں گے، یہ جمہور علماء کے مذہب کے مطابق ہوا، احناف کے مطابق واجب کی جگہ فرض کہہ دینا کافی ہوگا۔

مندوب: سے مراد ہر وہ عمل ہے جس کا مطالبہ شارع کی طرف سے ہو؛ لیکن مطالبہ لازمی طور پر نہ ہو، جیسے آپس میں دین کا معاملہ کرتے وقت اس کو لکھ لینے کا حکم ہے؛ لیکن یہ حکم وجوبی نہیں ہے بلکہ استحبابی ہے [بقرہ:283] اس کا حکم یہ ہے کہ عمل کرنے والا ثواب کا مستحق ہوگا؛ لیکن عمل نہ کرنے والا عقاب کا مستحق نہیں ہوگا۔

احناف کے مذہب کے مطابق مندوب کی تین قسمیں ہوتی ہیں: سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، مستحب: سنت مؤکدہ: جس کی انجام دہی مکلّف سے تاکیدی طور پر مطلوب ہو، لازمی طور پر نہیں، جیسے: اذان اور پانچوں فرض نمازوں کی ادائیگی جماعت کے ساتھ، وضو میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا وغیرہ، اس کا حکم یہ ہے کہ عمل کرنے والا ثواب کا مستحق ہوگا، چھوڑنے والا عقاب کا مستحق نہیں ہوگا؛ بلکہ عتاب وملامت کا مستحق ہوگا، اس کو ''سنت الھدیٰ'' بھی کہتے ہیں، سنت غیر مؤکدہ: جس کی انجام دہی مکلّف سے تاکیدی طور پر مطلوب نہ ہو اور نہ ہی لازمی طور پر، جیسے: عصر وعشاء سے پہلے کی چار رکعات سنتیں، پیر اور جمعرات کے دنوں کے

اوپر جس تقلید کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد تقلید مطلق ہے، جس میں مقلد کسی ایک فقیہ یا کسی ایک متعین فقہی مسلک کا پابند نہ ہو؛ بلکہ مختلف احکام میں مختلف مجتہدین کی تقلید کرتا ہو۔

تقلید کی دوسری قسم تقلید شخصی ہے جس میں مقلد کسی امام فقہ یا دبستان فقہ کا التزام اور تمام احکام میں اس کے اجتہادات کو قبول کرنے اور اس کی تشریحات پر عمل کرنے کا اہتمام کرتا ہو، اس کے وجوب وجواز کے بارے میں اختلاف ہے، بعض نے تقلید شخصی کو عامی شخص کے لئے واجب قرار دیا ہے، جب کہ دوسرے بعض علماء نے محض جائز کہا ہے؛ لیکن موجودہ حالات میں تقلید شخصی ضروری ہے، کیوں اگر ضروری قرار نہ دیا جائے تو علوم اسلامی سے دوری، ورع وتقوی کی کمی اور سیاسی تاثر وہ امور ہیں کہ دین میں زبردست فتنہ اور ہوس پرستی کو کوئی طاقت روک نہ سکے گی۔

جہاں تک ائمہ اربعہ کی فقہ میں تقلید کے منحصر ہونے کی بات ہے تو یہ قدرتی نظام کا نتیجہ ہے کہ سلف صالحین میں جن ائمہ مجتہدین کا ہم نام سنتے ہیں ان کی فقہ آج مرتب ومکمل شکل میں موجود نہیں ہے، اور نہ ہی زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ان سے رہنمائی ملتی ہے، اس کے برخلاف ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہؒ (150-80) امام مالکؒ (179-93) امام شافعیؒ (204-150) اور امام احمد بن حنبلؒ (241-164) کی فقہی کوششیں بڑی حد تک مرتب ومکمل محفوظ شکل میں ہم تک پہنچی ہیں، اور زندگی کے بیشتر مسائل وواقعات کا راست حل ان کی فقہ میں موجود ہے، یا ایسی نظیریں موجود ہیں جن کی روشنی میں نئے پیش آنے والے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے، اس لئے فطری طور پر خود بخود چاروں ائمہ کی فقہ میں تقلید منحصر ہوکر رہ جاتی ہے، اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ان ہی میں سے کسی ایک کی تقلید کو ضروری قرار دیا جائے، ایک تو اس وجہ سے کہ عوام میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ ان میں دلائل میں تنوع کی وجہ سے ایک ہی مسئلہ کے سلسلہ میں مختلف فقہی اسکولز میں کئی طرح کے احکام کے درمیان ترجیح کی صلاحیت نہیں۔

16.8 نظام قضاء

لغوی معنی: فیصلہ کرنا، کسی چیز کو ادا کرنا، فقہاء کی اصطلاح میں: ''کسی چیز کو لازم کرنے یا کسی چیز کے لزوم کو ختم کرنے سے عبارت ہے ''الحکم إنشاء إلزام أو إطلاق'' جیسے: نفقہ یا کسی کے اوپر حق شفعہ کو لازم قرار دیا جائے، نظام قضاء کے وجوب کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے؛ اس لئے کہ قرآن مجید نے متعدد انبیاء کو فریضۂ قضاء کی ادائیگی کا حکم فرمایا [ص:26 الأنبیاء: 28]، اور خود آپ ﷺ کو بھی متعدد مواقع پر فریضۂ قضاء انجام دینے کا حکم فرمایا [المائدہ:48-45، نساء:65] اور عام لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اپنے اختلافات کو لوٹانے کا حکم دیا اور ان کے فیصلے پر راضی رہنے کو فریضہ قرار دیا [النساء:58] چنانچہ آپ نے بہت سے مقدمات فیصل فرمائے ہیں، اس موضوع سے متعلق حدیث کی کتابوں میں ''أبواب الاحکام'' کے تحت روایتیں جمع کردی گئی ہیں، ظاہر ہے حکم الٰہی اور اسوۂ نبی پر عمل نظام قضاء کے قیام کے بغیر ممکن نہیں، گو غیر مسلم ملک ہو، فقہاء نے کافروں کے غلبہ والے ملکوں میں بھی مسلمانوں پر اپنے امیر ووالی کے انتخاب کو واجب قرار دیا، جو کہ مسلمانوں کے لئے قاضی مقرر کرسکے یا وہ خود فیصلے کرے۔

نظام قضاء کے قیام کی اہمیت وفضیلت جہاں قرآن وحدیث سے معلوم ہوتی ہے وہیں مصلحت کا تقاضا بھی ہے، چنانچہ تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے تو اس کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ غیر مسلم جج کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں معتبر نہیں ہے، چنانچہ اگر کوئی مسلم خاتون سرکاری عدالت سے فسخ نکاح کرالے تو گو یہ فیصلہ اسلامی قانون کے مطابق ہو یہ فیصلہ شرعاً معتبر نہیں۔

ایسی خواتین کے لئے اسلامی زندگی پر باقی رہنے، معصیت سے بچنے اور پاکیزہ زندگی گذارنے کے لئے واحد راستہ نظام قضاء کا قیام ہے؛ تاکہ شرعی قاضی فسخ نکاح کے مقدمات کا فیصلہ کرسکے۔

قضاء کے بنیادی ارکان چھ ہیں: قاضی، مقضی بہ یعنی جس دلیل کو قاضی اپنے فیصلے کی بنیاد بنائے، مقضی لہ یعنی جس کا حق دوسرے پر ثابت ہو، مقضی فیہ یعنی وہ مسئلہ جس کے سلسلہ میں قاضی کا فیصلہ مطلوب ہو یا جس پر اس نے فیصلہ کیا ہو، مقضی علیہ یعنی جس پر کسی دوسرے کا حق ثابت ہو، قضاء کی کیفیت اور اس کا طریقہ۔

قاضی مقرر کرنے کا حق امام المسلمین یعنی مسلمانوں کے فرمانروا کا ہے، اسی طرح اس کی اجازت ومشورہ سے اسلامک اسٹیٹ کے صدر قاضی کو بھی قضاۃ مقرر کرنے کا اختیار ہوتا ہے، غیر مسلم ممالک میں قاضی مقرر کرنے کی تین صورتیں ہوتی ہیں: اول یہ کہ حکومت کسی مسلمان کو ذمہ دار بنادے اور وہ مسلمانوں کا قاضی مقرر کرے، دوسری صورت یہ ہے کہ اگر حکومت کسی کو ذمہ دار مقرر نہ کرے تو مسلمان خود باہمی اتفاق رائے سے ایک امیر منتخب کریں اور وہ امیر قاضی کا تقرر کرے، تیسری صورت یہ ہے کہ اگر عام مسلمان اپنا امیر منتخب کرنے میں ناکام رہے تو ان میں سے ارباب حل وعقد باہمی اتفاق سے کسی شخص کو قاضی مقرر کرلیں۔

قاضی کے اوصاف: عہدۂ قضاء پر مقرر ہونے والا شخص مسلمان، عاقل، بالغ اور عادل ہو، احکام شرعیہ سے واقف ہو، بینا ہو، سنتا ہو، اجتہاد وقیاس سے واقف ہو، فقہ کے ساتھ احادیث وآثار پر بھی نگاہ ہو، عربی زبان کے اصول وقواعد سے آگاہ ہو، لوگوں کے عرف اور محاورات سے واقف ہو، ذہین اور معاملہ فہم ہو۔

مقضی بہ: سے مراد وہ دلیلیں ہیں، جن کی بنیاد پر قاضی مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے، اس سلسلہ میں قاضی وہ طریقہ کار اختیار کرے گا جو ایک مجتہد اجتہاد میں کرتا ہے، یعنی سب سے پہلے قرآن مجید کی ان آیات میں حکم کو تلاش کرے گا کو جو منسوخ نہ ہوں، اس میں حکم موجود نہ ہو، تو سنت رسول میں تلاش کرے گا، اگر سنت رسول میں بھی حکم نہ مل سکے تو اجماع صحابہ، پھر اجماع تابعین اور ان کے بعد کے مجتہدین کا اجماع میں تلاش کرے گا، اور اگر اس مسئلہ کے بارے میں اجماع بھی نہ ہو، اور فقہاء کی آراء مختلف ہوں تو اجتہاد کے ذریعہ کسی ایک قول کو ترجیح دے گا اور اس کے مطابق فیصلہ کرے گا، واضح رہے کہ ترجیح میں قوت دلیل کو اساس بنائے گا، اگر قاضی اجتہاد کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو ارباب افتاء کی رائے پر عمل کرے گا، ایک عرصہ سے علمی انحطاط کی وجہ سے اجتہاد کے مطلوبہ شرائط کے حامل قاضی نایاب ہیں، اس لئے کسی مقلد کو ہی قاضی مقرر کرنے کا معمول چلا آرہا ہے، اس وجہ سے مقلد قاضی کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ان ہی قواعد واصول کا پابند رہے جو افتاء کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔

مقضی لہ: سے مراد مقدمہ کا وہ فریق ہے، جس کے حق میں قاضی کا فیصلہ ہو، اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ قاضی اپنے حق میں اور ایسے شخص کے حق میں فیصلہ نہیں کرسکتا جس کے حق میں اس کی شہادت معتبر نہیں، اگر فیصلہ کرے بھی تو نادرست اور ناقابل نفاذ

قضاۃ	قاضی کی جمع ، جج
عادل	معتبر اور قابل اعتماد شخص جو عقیدہ یا عمل کے اعتبار سے فاسق نہ ہو
افتاء	فتوی دینا
ظاہر روایت	امام محمد کی چھ کتابوں کا مجموعہ
نوادر	امام محمد کی ظاہر روایت کی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابیں اور امام ابوحنیفہ کے دوسرے شاگردوں کی تالیفات
منقح	خوب واضح کیا ہوا
انس و جن	انسان و جنات
سد ذرائع	ایک دوسرے درجہ کا مصدر شریعت
حیض	وہ خون جو بالغ غیر حاملہ عورت کے رحم سے آئے اور اس کا سبب بیماری نہ ہو
متروکہ مال	چھوڑا ہوا مال

16.14 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. فقہ اسلامی ۔ تعارف اور تاریخ — پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
2. فقہ اسلامی ۔ تدوین و تعارف — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
3. قاموس الفقہ — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
4. منصب افتاء — مفتی محمد زاہد گڑھی سلیم پور
5. مقاصد شریعت ۔ تعارف اور تطبیق — ایفا پبلیکشنز، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی
6. مقاصد شریعت کی تفہیم — ڈاکٹر فہیم اختر ندوی

اکائی 17 : فقہی کتابیں

اکائی کے اجزاء

17.1 مقصد

اس اکائی کا بنیادی مقصد طلبہ کو ان تفصیلات سے واقف کرانا ہے کہ ابتدائی کتب فقہ کیا ہیں؟ نیز وہ فقہی متون اور شروحات کا مطلب جاننے کے ساتھ ساتھ، اس سے متعلق فقہی کتابوں سے واقف ہوسکیں، عمومی کتب فقہ سے واقفیت کے بعد خصوصی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں سے بھی آگاہ ہوسکیں۔

17.2 تمہید

اس اکائی میں فقہی مسالک کی ابتدائی کتب فقہ کا تعارف کرایا جائے گا، ہر مسلک کی ابتدائی کتابیں ہی بنیادی کتابیں ہوتی ہیں اور اس مسلک کا سرمایہ بھی، فقہی مسالک کے متون تیار ہوئے پھر ان متون کی شرحیں لکھی گئیں، متون کی حیثیت صحیح مذہب اور راجح اقوال کے مجموعہ کی ہوتی ہے، اس لئے ان کا بھی تعارف پیش ہوگا؛ چوں کہ فقہی مسائل میں مختلف پہلوؤں سے کام ہوا ہے، اس لئے موضوعات کے اعتبار سے جو کتب فقہ منظر عام پر آئی ہیں، ان کا بھی ذکر ہوگا۔

17.5 فقہی موضوعات پر کتابیں

فقہ کے تمام موضوعات پر عام طور پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا اوپر ذکر آچکا ہے، بعض فقہی موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر فقہاء نے مستقل طور پر اس پر قلم اٹھایا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، ان ہی موضوعات میں سے ایک قضاء ہے، اس سلسلہ کی اہم کتابیں یہ ہیں:

قضاء پر اہم کتابیں:

- ادب القاضی: امام ابوبکر خصافؒ (متوفی: 261ھ) یہ ادب قضاء پر اہم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، 120/ابواب پر مشتمل صدر شہید کی شرح کے ساتھ چھپ چکی ہے۔
- ادب القاضی: ابوالعباس احمد طبری معروف بہ ابن قاص (متوفی: 335ھ)۔
- أدب القاضی: قاضی ابوالحسن ماوردی شافعیؒ (متوفی: 450ھ)۔
- روضة القضاة وطریق النجاة: ابوالقاسم علی سمنانیؒ (متوفی: 499ھ)۔
- أدب القضاء: علامہ شہاب الدین ابن ابی الام حموی شافعیؒ (متوفی: 246ھ)۔
- الطریق الحکمیة فی السیاسیة الشرعیة: ابن قیم جوزیہؒ (متوفی: 751ھ)۔
- تبصرة الحکام فی أصول الأقضیة ومناهج الأحکام: ابن فرحون مالکی (متوفی: 799ھ)۔
- جواهر العقود ومعین القضاة والموقعین والشهود: شمس الدین سیوطی (متوفی: 810ھ)۔
- لسان الحکام فی معرفة الأحکام: ابن شحنہ حنفیؒ (متوفی: 882ھ)۔
- معین الحکام فی ما یتردد بین الخصمین من الأحکام: علاء الدین طرابلسی حنفیؒ (متوفی: 844ھ)۔
- صنوان القضاء وعنوان الافتاء: قاضی عماد الدین اشفورقانیؒ (متوفی: 486ھ)۔
- آداب قضاء (اُردو) مولانا عبدالصمد رحمانی۔
- اسلامی عدالت (اُردو) قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (متوفی: 1422ھ)۔

محکمہ احتساب پر کتابیں:

اسلامی نظام حکومت میں لوگوں کو اشرار کے ظلم وزیادتی سے بچانے کے لئے ایک ''احتساب'' یا ''حسبہ'' کا شعبہ بھی رکھا گیا ہے، اس شعبہ کی اہمیت کے پیش نظر فقہاء نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے چند اہم کتابیں جو دستیاب ہیں وہ یہ ہیں:

- نهایة الرتبة فی طلب الحسبة: عبدالرحمٰن نصر شیزری (متوفی: 589ھ)۔
- الحسبة فی الاسلام: شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہؒ (متوفی: 728ھ)۔
- معالم القربة فی أحکام الحسبة: محمد بن محمد قرشی معروف بہ ابن الاخوۃ (متوفی: 729ھ)۔
- معید النعم ومبید النقم: تاج الدین عبدالوہاب سبکیؒ (متوفی: 707ھ)۔
- آداب الحسبة: ابوعبداللہ محمد بن احمد سقطی۔

نظام حکومت پر اہم کتابیں:

نظام حکومت بڑا اہم موضوع ہے، سماج کی صلاح وفساد نظام حکومت اور حکمرانوں کے رویہ سے بڑی حد تک متعلق ہے، اس لئے فقہاء نے خاص طور پر اس طرف توجہ دی اور کتابیں تالیف فرمائیں، اس سلسلہ کی چند اہم مطبوعہ کتابوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

- سلوک المالک فی تدبیر الممالک: شہاب الدین احمد ابن ابی ربیعؒ (متوفی: 272ھ)۔
- الأحکام السلطانية والولايات الدينية: قاضی ابوالحسن علی ماوردی (متوفی: 450ھ)، ماوردی کا یہ خاص موضوع رہا ہے، انہوں نے اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، اور بعض طبع بھی ہوچکی ہیں، ان ہی میں سے یہ ہیں: کتاب قوانين الوزارة، نصيحة الملوک، تسهيل النظر وتعجيل الظفر في أخلاق الملک وسياسة المُلک.
  الأحکام السلطانية، قاضی ابویعلی محمد بن حسین فراء (متوفی: 458ھ)۔
- غياث الأمم في التياث الظلم: امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک جوینی (متوفی: 478ھ) یہ اس موضوع پر اہم کتاب سمجھی جاتی ہے، جو "غیاثی" اور "نظامی" سے بھی معروف ہے۔
- سراج الملوک: ابن ابی زندقہ طرطوشی مالکیؒ (متوفی: 520ھ)۔
- المنهج السلوک فی سياسة الملوک: عبدالرحمٰن شیزری (متوفی: 589ھ)۔
- تحرير الأحکام في تدبير أهل الاسلام: علامہ بدرالدین بن جماعہ (متوفی: 733ھ)۔

مالیاتی نظام سے متعلق اہم کتابیں:

بعض فقہاء نے اسلام کے مالیاتی نظام کے متعلق کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے چند کے نام اس طرح ہیں:

- کتاب الخراج: امام ابویوسفؒ (متوفی: 182ھ) اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ کتاب خلیفہ ہارون رشید کی خواہش پر امام ابویوسفؒ نے تالیف فرمائی جو اس موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔
- کتاب الکسب: امام محمد بن حسن شیبانی (متوفی: 189ھ): امام محمدؒ کے شاگرد محمد بن سماعہ نے "الاکتساب فی الرزق المستطاب" کے نام سے اس کی تلخیص کی، جو 1206ھ میں محمود ارنوس کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔
- کتاب الخراج: یحیٰ بن آدم قرشی (متوفی: 203ھ)۔
- **کتاب الأموال**: ابوعبید قاسم بن سلامؒ (متوفی: 224ھ)۔
- **کتاب الأموال**: حمید بن زنجویہ (متوفی: 251ھ)۔
- الخراج وصناعة الکتابة: قدامہ بن جعفر (متوفی: 328ھ)۔
- کتاب الأموال: ابوجعفر احمد بن نصر داوٗدیؒ (متوفی: 402ھ)۔

نظام وقف سے متعلق اہم کتابیں:

اسلام میں وقف کا نظام ابتداء اسلام سے رہا ہے، اس لئے فقہاء نے بھی اس سے اعتناء کیا ہے؛ چنانچہ اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے چند اہم کتابوں کا نام اس طرح ہے:

- كتاب أحكام الوقف: ہلال بن یحی بصریؒ (متوفی:245ھ)۔
- أحكام الأوقاف: امام ابوبکر خصافؒ (متوفی 261ھ)۔
- كتاب الاسعاف فی أحكام الأوقاف: برہان الدین طرابلسی، یہ خصاف کی کتاب کی تلخیص ہے۔

اسی طرح بچوں سے متعلق حافظ ابن قیم جوزیہؒ کی ''تحفة المودود فی أحكام المولود''، اور محمد بن استروشی (متوفی 633ھ) کی ''جامع أحكام الصغار'' اہم ہیں اور طبع بھی ہو چکی ہیں، اسی طرح خواتین سے متعلق بھی ماضی قریب اور دور حاضر میں کئی کتابیں طبع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں سب سے مفصل اور اہم کتاب ''المفصل فی أحكام المرأة والبيت المسلم'': ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی ہے، جو بارہ جلدوں میں چھپی ہے۔

17.6 خلاصہ

بحیثیت فن فقہ کی تدوین دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی رفتہ رفتہ فقہی مسالک وجود میں آئے، اہل سنت والجماعت کے چار فقہی مسالک ظاہر ہوئے جن کو بقا حاصل ہوا اور آج ان کے متبعین پائے جاتے ہیں، وہ چار مسالک یہ ہیں حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ، ظاہر ہے کہ مسالک کی زندگی و اساس ابتدائی کتب فقہ ہیں، فقہ حنفی کا دارومدار امام محمد کی چھ کتابوں: المبسوط، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، الزیادات، کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر پر ہے، جن کو ظاہر روایت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے بعد نوادر اور فتاوی و واقعات کا نمبر آتا ہے، نوادر میں ہارونیات، کیسانیات، کتاب الامالی اور کتاب المجرد شامل ہے، فتاوی واقعات میں خاص طور پر ابواللیث سمرقندی کی کتاب النوازل قابل ذکر ہے۔

فقہ مالکی کی ابتدائی کتابیں خود امام مالک کی مؤطا، اس کے بعد ابن سحنون کی المدونۃ الکبری ہے، اس کے علاوہ الواضحۃ عبدالملک بن حبیب کی، المستخرجۃ محمد عتبی قرطبی کی، اور الموازیۃ ابن مواز کی اہمیت کی حامل ہیں، ان ہی چاروں کتابوں پر فقہ مالکی کا دارومدار ہے، فقہ شافعی کی ابتدائی کتب کتاب الأم خود امام شافعیؒ کی، بویطی اور مزنی کی مختصر ہیں، فقہ حنبلی کی ابتدائی کتب کتاب السنن، ابوبکر خلال کی ''الجامع الکبیر'' اور اس کی تلخیص مختصر خرقی ہیں، جس کی مشہور شرح ابن قدامہ کی المغنی ہے، فقہ جعفریہ کی مشہور ابتدائی کتاب ''الکافی'' ہے اور فقہ زیدیہ کی ''المجموع'' ہے۔

متون وشروحات میں احناف کے یہاں متون اربعہ مختصر قدوری، وقایۃ الروایۃ، المختار للفتوی اور مجمع البحرین مشہور ہیں، جن کے مسائل معتبر اور مفتی بہ ہیں، ان کے علاوہ متون کی کتابیں جیسے مختصر طحاوی، مختصر کرخی، بدایۃ المبتدی، کنزالدقائق اور تنویر الأبصار ہیں، شروحات میں الکافی کی شرح المبسوط شمس الائمہ سرخسی کی، ہدایہ کی شرح فتح القدیر علامہ ابن ہمام کی، کنزالدقائق کی شرح البحرالرائق ابن نجیم مصری کی، تنویر الابصار کی شرح درمختار علاء الدین حصکفی کی اور اس کی شرح ردالمحتار ابن عابدین شامی کی مشہور ہیں۔

مالکیہ کے یہاں متون میں مختصر خلیل مشہور و مقبول ہے، اس کی بہت سی شروحات لکھی گئی ہیں، ان میں زیادہ مشہور خرشی علی مختصر خلیل اور شرح منح الجلیل علی مختصر خلیل ہیں۔

فقہ شافعی میں ''المھذب'' اہم ترین متن ہے، جس کی مشہور شرح المجموع امام نوویؒ کی ہے، دوسرا متن منہاج الطالبین امام نوویؒ کے قلم سے ہے، جس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، ان میں دو شرحیں مغنی المحتاج علامہ شربینی کی اور نہایۃ المحتاج علامہ رملی کی زیادہ مقبول مشہور اور مستند ہیں۔

فقہ حنبلی میں مختصر خرقی اہم ترین متن اور مقبول و معتبر کتاب ہے، اس کی قبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی تقریباً تین سو شروحات لکھی گئی ہیں، ان میں زیادہ مشہور علامہ ابن قدامہ کی شرح المغنی ہے، دوسرا متن المقنع ہے، اس کی مقبول شرح الشرح الکبیر ہے، تیسرا متن ''الاقناع'' ہے، جس کی شرح علامہ بہوتی نے لکھی۔

جہاں تک فقہی موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کی بات ہے تو بعض موضوعات کو فقہاء نے مرکز توجہ بنایا اور مستقل کتابیں تصنیف کیں، جیسے: قضاء، محکمہ احتساب، نظام حکومت، نظام مالیات، وقف، بچوں سے متعلق فقہی مسائل، اسی طرح خواتین سے متعلق فقہی مسائل۔

17.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. حنفیہ کی ابتدائی کتب فقہ کا تعارف کرائیے۔
2. حنفیہ کے متون پر روشنی ڈالیے۔
3. فقہی موضوعات پر ایک نوٹ لکھیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. فقہ شافعی کی ابتدائی کتابوں کا تعارف کرائیے۔
2. فقہ مالکی کے متون اور شروحات پر روشنی ڈالیے۔
3. فقہ حنبلی کی ابتدائی کتب اور متون کا تعارف تحریر کیجیے۔

17.8 فرہنگ

امہات اربعہ	چار بنیادی کتابیں
مخطوطہ	ہاتھ سے لکھا ہوا، غیر مطبوعہ مسودہ
مطبوعہ	چھپا ہوا، چھپی ہوئی کتاب
مفتی بہ	وہ فقہی رائے جس کے مطابق فتوی دیا جائے۔

17.9 مطالعے کے لئے معاون کتابیں

1. فقہ اسلامی ۔ تعارف اور تاریخ — پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی
2. قاموس الفقہ — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
3. فقہ اسلامی ۔ تدوین و تعارف — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اکائی 18 : فقہ اسلامی کی خدمت میں علماء ہند کا حصہ

اکائی کے اجزاء

18.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو اس بات سے واقف کرانا ہے کہ فقہ اسلامی کی خدمت میں علماء ہند کا کیا حصہ رہا ہے اور کس نوعیت کی خدمت انجام پائی، اردو زبان میں عربی زبان سے کن فقہی کتابوں کا ترجمہ ہوا؟ مزید وہ اس سے بھی واقف ہوسکیں کہ ہمارے علماء ہند نے اردو میں مستقل طور پر کن موضوعات پر فقہی کتابیں لکھی ہیں؟

18.2 تمہید

اس اکائی میں بتایا جائے گا کہ علماء ہند نے فقہ کے میدان میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے؟ ان کی خدمات کن پہلوؤں سے انجام پائیں، نیز یہ بھی ذکر ہوگا کہ علماء ہند نے فقہ وفتاوی کی کن کن کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں کئے اور کس طرح اردو زبان کو فقہ اسلامی کے ذخیرہ سے مالا مال کیا؟

18.3 اردو میں کتب فقہ کا ترجمہ

ترجمہ مستقل ایک فن ہے، مسلمانوں نے دوسری زبانوں سے علوم وفنون کی بہت ساری کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، بعد کے دور میں جب اردو زبان وجود پذیر ہوئی، تو مسلمانوں نے اس کو اپنی زبان سمجھا، اور اس زبان میں اسلامی علوم کو منتقل کرنا شروع کیا

یہاں تک کہ عربی زبان کے بعد اردو ہی وہ زبان ہے جس میں دینی علوم کی کتابیں زیادہ ملتی ہیں، علماء نے قرآن وحدیث کے ساتھ فقہ کو بھی اردو کا جامہ پہنایا، اور بہت سی اہم کتابوں کو عربی سے اردو میں منتقل کیا، یہاں ان ہی کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

- **نورالایضاح:** علامہ حسن بن علی شرنبلالی کی تالیف ہے: نصابی کتاب ہے، مسائل کی ترتیب فطری اور عمدہ ہے، مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ نے اس کتاب کا سلیس ترجمہ اور ضروری تشریح کی ہے۔
- **مختصر القدوری:** یہ ابوالحسین احمد ابن محمد قدوری بغدادیؒ (متوفی: 428ھ) کی تالیف ہے، بڑی اہم نصابی کتاب ہے، سب سے زیادہ مستند و معتبر متن ہے، اس کے اردو میں کئی ترجمے ہوئے ہیں، ایک ترجمہ مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی کا ہے، دوسرا ترجمہ مولانا عبدالحفیظ نے "اشرف النوری" کے نام سے کیا ہے، جو 1983ء میں مکتبہ تھانوی دیوبند سے طبع ہوا، تیسرا ترجمہ مولانا محمد حنیف گنگوہیؒ نے "الصبح النوری" کے نام سے کیا ہے، یہ حنیف بکڈپو دیوبند سے طبع ہوا ہے۔
- **الهدایه:** یہ امام ابوالحسن علی مرغینانی (متوفی: 593ھ) کی مشہور تالیف ہے، یہ بھی نصابی کتاب ہے، حسن ترتیب اور منہج تالیف میں اپنی مثال آپ ہے، اس کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں، ایک ترجمہ مولانا سید امیر علی کا ہے، جو "عین الہدایہ" کے نام سے مشہور ہے، مزید وضاحت اور شرح بھی کی ہے، دوسرا ترجمہ مولانا خلیل احمد سکروڈوی نے "اشرف الہدایہ" کے نام سے کیا ہے، یہ مکتبہ تھانوی دیوبند طبع ہوا ہے، اسی نام سے مولانا محمد یوسف تاولوی نے بھی صرف لفظی ترجمہ کیا ہے، جو 1991ء میں مکتبہ تھانوی سے چھپا ہے، مولانا محمد حنیف گنگوہیؒ کا بھی ایک ترجمہ وشرح ہے، جس کا نام "غاية السعاية فی حل مافی الهداية" ہے۔
- **کنز الدقائق:** درس نظامی کے مدارس میں داخل نصاب کتاب ہے، اس کے مصنف حافظ الدین ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی (متوفی: 710ھ) ہیں، اس کا اردو ترجمہ "تحفة العجم فی فقه الأعظم" ہے، 1309ھ میں مطبع منشی نول کشور لکھنو سے طبع ہوا ہے، مترجم کا نام اس پر نہیں۔
- **شرح الوقایه:** یہ صدر الشریعہ اصغر عبیداللہ بن مسعود کی مشہور تصنیف ہے، یہ بھی اہم نصابی کتاب ہے، اس کے دو ترجمے ہوئے ہیں، ایک "نور الہدایہ" کے نام سے مولانا حاجی وحید الزماں کا ہے، جو 1289ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا، دوسرا ترجمہ مولانا عبدالحفیظ کا ہے، جو "اشرف الوقایہ" کے نام سے دیوبند سے طبع ہوا ہے۔
- **الدرالمختار:** علاء الدین حصکفی کی مشہور کتاب ہے، اس کے دو ترجمے ہوئے، مولانا خرم علی اور مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی نے "غایۃ الاوطار" کے نام سے مختصر وضاحت کے ساتھ ترجمہ کیا ہے، یہ دیوبند سے چار جلدوں میں طبع ہوا ہے، دوسرا ترجمہ "کشف الأسرار" کے نام سے مولانا ظفیر الدین مفتاحی نے کیا ہے، البتہ یہ ترجمہ مکمل نہیں ہے۔
- **فتاوی عالمگیری:** یہ کتاب ہندوستان میں ہی اورنگ زیب عالمگیر کے زیر اہتمام ممتاز علماء ہند کے ذریعہ تیار ہوئی، اس کے تین ترجمے دستیاب ہیں: ایک ترجمہ مولانا احتشام الدین مرادآبادی اور مولانا امیر علی کا ہے، دوسرا ترجمہ مولانا کفیل الرحمٰن اور مولانا انظر شاہ کشمیری کا ہے، تیسرا ترجمہ جزوی ناتمام مولوی محمد ہاشم کا ہے۔
- **شریعت محبوبیه:** دراصل قسطنطنیہ کے احکام عدالت نے قوانین دیوانی شرعی کو عربی میں مرتب کر کے شائع کیا تھا، اس کا ترجمہ مولوی ہاشم نے "شریعت محبوبیہ" کے نام سے کیا۔

❁ موسوعہ فقہیۃ: یعنی فقہی انسائیکلوپیڈیا جو حکومت کویت نے باکمال علماء کے ذریعہ (45) جلدوں میں چاروں فقہی مسالک کے مذہب کے مطابق تیار کروایا اور شائع کیا، جس کا ترجمہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا دہلی کے زیرنگرانی باصلاحیت علماء کے ذریعہ انجام پایا۔ اور متعدد جلدیں چھپ چکی ہیں۔

معاصر ممتاز عالم دین ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی فقہ الزکاۃ کا ترجمہ شمس پیرزادہ نے کیا، اور فتاوی معاصرۃ کا ترجمہ سید زاہد اصغر فلاحی نے کیا ہے، دونوں ترجمے شائع ہوچکے ہیں، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' کا ترجمہ مولانا صدر الدین اصلاحی نے کیا، اور ان کی دوسری کتاب ''عقد الجید'' کا ترجمہ مولانا احسن نانوتوی نے کیا، اسی کتاب کا ایک جدید ترجمہ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی نے کیا ہے۔ جدہ فقہ اکیڈمی اور مکہ کی اسلامی فقہ اکیڈمی کے فقہی فیصلوں کا ترجمہ ڈاکٹر مولانا محمد فہیم اختر ندوی نے کیا، ''اوضح المسالک إلی أحکام المناسک'' از شیخ عبدالعزیز محمد سلیمان کا ترجمہ مولانا مختار ندوی نے کیا ہے، 1402ھ میں الدار السلفیہ ممبئی سے شائع ہوئی ہے، ''مجلۃ الاحکام العدلیۃ'' جس کو سلطان عبدالعزیز ترکی حکمران نے ممتاز علماء کے ذریعہ تیار کروایا، جس میں معاملات سے متعلق دفعہ اور قوانین ہیں، اس کا اردو میں ترجمہ عبدالقدوس ہاشمی ندوی نے کیا ہے، پاکستان سے 1966ء میں طبع ہوا ہے۔

18.4 اردو میں فقہی کتابیں

عربی زبان کے بعد اردو زبان فقہ اسلامی کی کتابوں سے مالا مال ہے، مختلف نوعیتوں سے کتابیں لکھی گئی ہیں، بعض عام ہیں، تو بعض خاص موضوعات سے متعلق ہیں اور بعض نئے مسائل پر ہیں، آگے کی سطروں میں اختصار کے ساتھ ان کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

عام کتب فقہ:

❁ عام فقہی کتابیں: عام فقہی احکام ومسائل پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، سب کا احاطہ مشکل ہے، ان میں سے جو مشہور ومقبول ہیں وہ درج ذیل ہیں:

❁ علم الفقہ: مصنف مولانا عبدالشکور فاروقی ہیں، یہ کتاب چھ جلدوں میں ہے، اس میں مفتی بہ مسائل ذکر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، مصنف نے اپنے عہد کے نئے مسائل سے بھی گفتگو کی ہے، ابتدائی چار جلدوں میں ہر باب سے متعلق اس کے آخر میں چالیس احادیث اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چالیس آثار نقل کئے ہیں۔

❁ حقیقۃ الفقہ: یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، مصنف مولانا انوار اللہ خان صاحب ہیں۔

❁ عمدۃ الفقہ: یہ مولانا سید زوار حسین کی تالیف ہے، تین حصوں میں ہے، شروع کے دو حصوں میں دلائل کا ذکر نہیں ہے، تیسرے حصے میں مسائل کے ساتھ دلائل ذکر کرنے کا بھی مصنف نے اہتمام کیا ہے، اس میں ایمان وعقائد اور طہارت سے روزے تک کے احکام ہیں۔

❁ اسلامی فقہ: یہ مولانا مجیب اللہ ندوی کی تصنیف ہے، تین جلدوں میں ہے، بڑی جامع کتاب ہے، تمام ابواب فقہ کا احاطہ ہے، کثیر الوقوع قدیم وجدید مسائل ذکر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، بعض مسائل میں ان کی انفرادیت بھی ہے۔

- فقہ اسلامی: دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں ارکان اسلام کا بیان ہے، اور دوسرے حصہ میں معاشرتی مسائل اور معاملات کی بحث ہے، کتاب کے مصنف مولانا محمد یوسف اصلاحی ہیں، یہ کتاب حنفی مذہب کے مطابق ہے، البتہ حاشیہ میں بعض مقامات پر اہل حدیث مسلک کی بھی وضاحت ہے۔
- بہار شریعت: یہ مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی کی اہم کتاب ہے، تین ضخیم جلدوں میں ہے، اس میں عقائد وطہارت سے لے کر بیوع تک کے اکثر ابواب فقہ آگئے ہیں۔
- بہشتی زیور: اس کتاب کی تالیف کے اصل محرک حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہیں، اور اصل مصنف مولانا سید احمد علی فتحپوری ہیں، اس میں عورتوں سے متعلق مسائل اور وہ مسائل جو عورت اور مرد دونوں سے متعلق ہوں درج کئے گئے ہیں، یہ کل گیارہ حصوں میں ہے جو ان دنوں ایک جلد میں طبع ہوگئی ہے۔
- بہشتی ثمر: اس کتاب کے مرتب مولانا محمد عیسیٰ ہیں، بچوں کے لئے مرتب کی گئی ہے، اسی لئے ہر باب کے آخر میں سوالات بھی قائم کر دیئے گئے ہیں۔
- دین کی باتیں: اس کتاب کو مولانا سعید نے بہشتی زیور اور بہشتی گوہر سے مسائل کا انتخاب کر کے مرتب کیا ہے، یہ بڑی کتابوں کا نچوڑ اور پیش آمدہ مسائل کا مختصر حل ہے۔
- تعلیم الاسلام: مفتی کفایت اللہؒ کی تصنیف ہے، چار حصوں پر مشتمل ہے، یہ دراصل بچوں کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر بچوں کے لئے لکھی گئی ہے، ویسے عام آدمی کے لئے بھی مفید ہے۔
- قاموس الفقہ: یہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی تیار کردہ فقہی انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں حروف تہجی کی ترتیب سے فقہی احکام کو جمع کیا گیا ہے، شروع کتاب میں فقہی اصطلاحات کی وضاحت کے ساتھ تاریخ فقہ اسلامی، اصول فقہ، قواعد فقہیہ مقاصد شریعت اور چاروں فقہی مذاہب کے تعارف وخصوصیات اور اہم کتابوں کے تعارف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔
- مجموعہ قوانین اسلام: یہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن (پاکستان) کی مرتب کردہ ہے، 6/جلدوں میں ہے۔
- شافعی فقہ: شافعی عالم مولانا محمد ایوب ندوی بھٹکلی کی تالیف ہے، دو جلدوں میں ہے۔
- آسان فقہ: یہ مولانا یوسف اصلاحی کی تصنیف ہے، بچوں کے مزاج و مذاق کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کی گئی ہے۔

آپ آگے کی سطروں میں پڑھیں گے کہ فقہ کے خاص ابواب سے متعلق، جن میں عبادات، معاملات، معاشرتی مسائل، سلطانی احکام، معاشی مسائل داخل ہیں کتابیں لکھی گئیں اور بچوں سے متعلق بھی فقہی کتابیں ترتیب دی گئیں، اس کے علاوہ مزید مختلف موضوعات پر کتابوں کے ساتھ ساتھ نئے مسائل پر بھی متعدد کتابیں تالیف کی گئیں۔

عبادات: اس موضوع کے متعلق متعدد کتابیں ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

- تحفۂ نماز: مولانا عبدالسمیع قاسمی کی کتاب ہے، 90/صفحات پر مشتمل ہے، مسائل کے ساتھ احادیث بھی ذکر کر دی گئی ہیں، اور کتاب کے آخر میں محدثین فقہاء کا بھی تذکرہ ہے۔
- کتاب الصلوٰۃ: یہ مولانا ہادی علی بدایونی کی تصنیف ہے، کتاب کے آخر میں قربانی اور حج کا بھی مختصر تذکرہ ہے۔
- آئینہ نماز: یہ کتاب مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کی تصنیف ہے، جس میں تین چوتھائی نماز کا بیان، بقیہ طہارت ونجاست، زکاۃ، حج اور رمضان کے احکام کے علاوہ اذکار شب قدر، مصارف زکاۃ، قربانی کے احکام اور مسافر آخرت کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

- احکام مسافر: مصنف مفتی انعام الحق قاسمی ہیں، کتاب 336 رصفحات پر مشتمل ہے۔
- رفیق سفر: یہ مختصر اور جامع رسالہ مولانا سید اصغر حسین دیوبندی کا ہے، 24 رصفحات پر مشتمل ہے، رسالہ کے آخر میں مفتی محمد شفیعؒ نے چند مسائل کا اضافہ فرمایا ہے۔
- احکام الصلاۃ فقہ شافعی میں: یہ مولانا عبدالعزیز لجی قاسمی کی تصنیف ہے، مصنف کا تعلق شافعی مسلک سے ہے، کتاب تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے، اس میں فقہ شافعی کے مطابق نماز کے تفصیلی احکام کا ذکر ہے۔
- مسائل امامت: مفتی حبیب الرحمٰن کی تالیف ہے، اس پر حاشیہ مفتی سعید احمد پالنپوری کا ہے، اس کتاب کی ترتیب میں مستند کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔
- مسائل سجدہ سہو: یہ مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی کی مشہور کتاب ہے، اپنے موضوع پر کتاب نہایت اہم اور مفید ہے، کتاب کی ضخامت 104 رصفحات میں ہے۔
- سجدے-احکام ومسائل: یہ مولانا فضل الرحمٰن قاسمی کی کتاب ہے جس میں سجدۂ نماز، تلاوت، شکر اور سہو کے مسائل کا بیان ہے۔
- آداب اذان واقامت: یہ مولانا مفتی امین کی تالیف ہے، اس میں مؤلف نے اذان واقامت کی اہمیت وفضیلت بیان کرنے کے ساتھ ضروری مسائل کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔
- اذان خطبہ کا صحیح محل: اس کے مصنف مولانا بدر احمد مجیبی ندوی ہیں، یہ کتاب دراصل ''اذان خطبہ کہاں ہو'' نامی کتاب کا جواب ہے، 135 رصفحات پر مشتمل ہے، دانش کدہ پھلواری شریف پٹنہ سے 1410ھ میں شائع ہوئی ہے۔
- اسلام میں نماز جمعہ کا حکم: یہ مولانا محمد رئیس ندوی کی تصنیف ہے، 478 رصفحات پر مشتمل ہے، اس میں مسلک اہل حدیث کی پوری نمائندگی کی گئی ہے، شہر اور دیہات میں قیام جمعہ سے متعلق تفصیلی بحث ہے۔
- احکام میت: یہ مولانا عبدالحی کی تالیف ہے، اس میں موت سے پہلے موت کے وقت اور موت کے بعد سے متعلق احکام سے بحث کی گئی، مزید ان موقعوں پر بدعات وخرافات کا بھی جائزلیا گیا ہے۔
- سفر آخرت: یہ محمود عالم (کلکتہ) کی کتاب ہے، اس میں موت سے کچھ پہلے اور موت کے بعد کے شرعی احکام کا بیان ہے، مزید اس موقع سے رسم ورواج اور خرافات کا بھی شرعی جائزہ لیا گیا ہے۔
- تجہیز وتکفین: یہ مولانا راشد حسین ندوی کی کتاب ہے جو دراعرفات رائے بریلی سے شائع ہوئی ہے۔
- رؤیت ہلال: اس نام سے تین اہم کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، ایک مفتی شفیعؒ صاحب کی، جس میں رؤیت ہلال سے متعلق فقہی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔ دوسری مولانا محمد میاں صاحبؒ کی ہے، جس میں خاص طور پر جدید وسائل وذرائع کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے، تیسری مولانا برہان الدین سنبھلی کی ہے، جس میں ریڈیو، فون، ٹی وی اور وائرلیس وغیرہ کے ذریعہ رؤیت ہلال کی خبر اور اختلاف مطالع پر تفصیلی مدلل بحث ہے۔
- مسئلہ ہلال: یہ شاہ وصی اللہؒ کا علمی کتابچہ ہے، مصنف کے اس کتابچہ کے ذریعہ رؤیت ہلال کی بابت لوگوں کے درمیان جو نزاع پیدا ہوگئی تھی، اس کتاب سے اس کو دور کرنے میں مدد ملی۔
- کتاب العشر والزکاۃ: یہ مولانا عبدالصمد رحمانی کی شاہکار تصنیفات میں سے ہے، اس میں خاص طور پر ہندوستان کی زمین کے عشری اور خراجی ہونے کے بارے میں محققانہ کلام ہے۔

- اسلام کا نظام اراضی مع فتوی الہند: اس کتاب کے مرتب مفتی شفیعؒ ہیں، یہ کتاب فقہی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔
- اسلام کا نظام عشر وزکاۃ: یہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی تالیف ہے، یہ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں زکاۃ عشر کے علاوہ واجب ونفل صدقات اور زکاۃ کے اجتماعی نظام پر بھی بحث کی گئی ہے، اسی سلسلہ کی مولانا محمد نافع عارفی قاسمی کی کتاب ''مزارعت کے شرعی احکام'' ہے، 107 رصفحات پر مشتمل کتب خانہ نعیمیہ دیوبند سے چھپی ہے۔
- فی سبیل اللہ، اور مصارف زکاۃ: یہ دونوں رسالے مولانا عتیق احمد بستوی کے ہیں، اپنے موضوع پر مفصل ومدلل گفتگو کی گئی ہے۔
- احکام الزکاۃ والصدقۃ: یہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ہے، جسے مفتی محمد زید مظاہری وندوی نے مرتب کیا ہے، جس میں مسائل کے ساتھ فضائل اور اصلاحی گفتگو بھی ہے، 104 رصفحات کی ہے، 1419ھ میں ادارہ تالیفات اشرفیہ (باندہ) سے شائع ہوئی ہے۔
- اسلام میں زکاۃ کا نظام، زکاۃ کے مستحق کون؟ زکاۃ اور مصالح عامہ، زکاۃ کے اجتماعی نظام کی اہمیت، کیا زکاۃ علماء کو دی جاسکتی ہے؟ یہ مختلف کتابیں اور رسالے مولانا شہاب الدین ندوی کے ہیں، جو معترضین کے جواب اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے لکھے ہیں، یہ کتابیں فرقانیہ اکیڈمی بنگلور سے شائع ہوئی ہیں۔
- روزہ فضائل ومسائل: یہ مولانا سید محمد عبدالرشید ندوی کی تالیف ہے، جس میں روزہ سے متعلق اہم مسائل آگئے ہیں، اور بعض جدید مسائل کا بھی ذکر آیا ہے۔
- رمضان کے شرعی احکام: یہ مولانا محمد مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی کی تالیف ہے، اس میں رویت ہلال، روزہ، تراویح، وتر، تہجد، اعتکاف، شب قدر، صدقہ فطر اور عید الفطر کے کثیر الوقوع اور جدید مسائل خاص طور پر ذکر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔
- غنیۃ المناسک: یہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی کتاب ہے، اس کتاب کو اہل علم کے حلقہ میں استناد کا درجہ حاصل ہے۔
- آپ حج کیسے کریں؟: یہ مولانا منظور نعمانیؒ کی تصنیف ہے، بہت مقبول اور متداول کتاب ہے، جو آسان وعام فہم اور ضروری احکام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حجاج کرام کے لئے بہت مفید ہے، مصنف نے اسی کا ایک خلاصہ ''آسان حج'' کے نام سے بھی کیا ہے، جو پاکٹ سائز پر دستیاب ہے۔
- معلم الحجاج: اس کے مصنف مولانا سعید احمد صاحب مظاہر العلوم سہارنپور ہیں، اس کتاب پر دوسرے متعدد اکابر علماء نے نظر ثانی فرمائی ہے، حج کے مسائل کے احاطہ کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب حج کے موضوع پر نہایت جامع کتاب ہوگئی، اور حجاج کرام کے لئے کامل رہنما کا درجہ رکھتی ہے، یہ مکتبہ اشاعت العلوم مفتی محلّہ سہارنپور سے بار بار چھپ چکی ہے۔
- احکام الحج: مفتی شفیعؒ اس کے مصنف ہیں، یہ نہایت قیمتی اور لوگوں کے لئے بہت مفید ہے۔
- ایضاح المناسک: یہ مولانا مفتی شبیر احمد صاحب (مرادآباد) کی تالیف ہے، حوالہ جات کے اہتمام کے ساتھ مسائل حج کا مفید انتخاب ہے۔
- رفیق حج وعمرہ: یہ مختصر سا کتابچہ ہے، جسے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے مرتب فرمایا ہے، جس میں عمرہ اور حج کے پانچ ایام کے افعال سے متعلق ضروری اور کثیر الوقوع مسائل مراجع کے حوالہ کا اہتمام کے ساتھ جمع کر دیئے گئے ہیں اور حج سے متعلق نئے پیش آمدہ مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

- تقدس حج: مرتب ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی ہیں، یہ ان مقالات کا مجموعہ ہے جو تقدس حج کانفرس لکھنو منعقدہ 1987ء کے موقع پر پیش کئے گئے تھے، یہ کتاب 239 رصفحات پر مشتمل ہے، 1988ء میں لکھنو سے شائع ہوئی ہے۔
- تحفة الحجاج: یہ مولانا معین الدین اکرمی ندوی کی تصنیف ہے، اس میں پہلے فضائل حج سے متعلق صحیح احادیث ذکر کی گئی ہیں، اس کے بعد احکام ذکر کئے گئے ہیں، خواتین سے متعلق مسائل کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں اہم دعاؤں کا بھی ذکر ہے۔
- رہبر حج: یہ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تصنیف ہے، جس کی ضخامت 80 رصفحات ہے، 1419ھ میں شائع ہوئی ہے، مصنف نے بعد نماز فجر وعصر طواف کی دو رکعت پڑھنے کا مسئلہ اور کثرت سے عمرہ کا مسئلہ، دو مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔
- غنیة الناسک فی بغیة المناسک: یہ مولانا محمد حسن شاہ مہاجر مکی کی کتاب ہے، اس میں حج وعمرہ کے مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پہلی بار مطبع خیریہ میرٹھ سے 1344ھ میں شائع ہوئی تھی، دوسری بار پاکستان سے 1417ھ میں طبع ہوئی ہے، کتاب کی ضخامت 415 رصفحات ہے۔

معاملات:

اس خاص موضوع سے متعلق بہت سی کتابیں ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

- سود: سود سے متعلق مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی مشہور ومقبول کتاب ''سود'' ہی کے نام سے ہے، اسی طرح مولانا عبیداللہ اسعدی کی ''الربا'' ہے، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی ''غیر سودی بینک کاری'' ہے، مولانا محمد شفیق قاسمی کی ''سود اور مروج سودی معاملات'' ہے، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی کی کتاب ''ربا اور مضاربت'' لوگوں کے درمیان ہے، اس کے دو حصے ہیں، دوسری بار 1996ء میں اسلام آباد پاکستان سے چھپی ہے، ایک کتاب مفتی زید مظاہری ندوی کی مرتب کردہ ''سود، رشوت، قرض کے شرعی احکام'' کے نام سے ہے، جو دراصل حضرت تھانویؒ کے افادات سے ماخوذ ہے، اور 1415ھ میں ادارہ افادات اشرفیہ باندہ سے شائع ہوئی ہے۔
- بیع مرابحہ اور اسلامی بنک کاری: یہ دراصل مولانا شہاب الدین ندوی کا مقالہ ہے، کتابچہ کی شکل میں 1990ء میں فرقانیہ اکیڈمی بنگلور سے شائع ہوا ہے۔
- آداب معاملات: یہ 176 رصفحات پر مشتمل کتاب ہے، مصنف ابومسعود اظہر ندوی ہیں، کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں عام معاملات کا ذکر ہے، جب کہ دوسرے حصہ میں خاص معاملات اور حقوق کا بیان ہے، تیسری بار 2000ء میں مکتبہ اشاعت القرآن دہلی سے شائع ہوئی ہے۔
- حقوق اور ان کی خرید وفروخت: یہ مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی کی کتاب ہے، جس کی ضخامت 223 صفحات ہے، کتابی شکل میں کتب خانہ نعیمیہ دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔
- اسلامی قانون میں تحدید مدت اور قبضہ کے تصورات: یہ ڈاکٹر ساجد الرحمٰن صدیقی کی تصنیف ہے، کتاب کی ضخامت 192 رصفحات ہے، شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد (پاکستان) سے شائع ہوئی ہے، اس کتاب کی ترتیب میں چاروں بستان فقہ سے استفادہ کیا گیا ہے، اور جہاں فقہی اصطلاحات آئی ہیں، ان کی مناسب وضاحت کردی گئی ہے۔

معاشرتی مسائل:

اس خاص موضوع پر بھی بہت سی کتابیں دستیاب ہیں، ان میں سے اہم کتابیں حسب ذیل ہیں:

- الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ: یہ مولانا اشرف علی تھانوی کی شاہکار کتاب ہے، جس میں بہت سے مسائل میں فقہ مالکی کو اختیار کیا گیا ہے، اس طرح امت کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے فقہی توسع کا دروازہ کھولا اور اہل علم کو غور وفکر کی ایک نئی راہ دکھائی۔
- آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی نگرانی میں پرسنل لا سے متعلق مرتب شدہ ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' 529 صفحات پر مشتمل نہایت اہم ہے۔
- اسلام کا قانون نکاح: یہ مولانا شہاب الدین ندوی کی تصنیف ہے، 280 صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مسائل کے ساتھ زوجین کے حقوق وفرائض اور فلسفۂ نکاح پر بھی مبسوط بحث کی گئی ہے۔
- اسلام اور نکاح: یہ مفتی نسیم احمد قاسمی کی تالیف ہے، 200 صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مسائل کے ساتھ اس موقع سے مروجہ رسوم [illegible] کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔
- [illegible] پر ایک نظر: یہ مولانا شہاب الدین ندوی کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جو رسالہ کی شکل میں فرقانیہ اکیڈمی بنگلور سے شائع ہوا، اس [illegible] نے ثابت کیا ہے کہ تعدد ازدواج مسلمانوں کے بہ نسبت دوسری قوموں میں زیادہ پایا جاتا ہے، تعدد ازدواج ہی کے نام سے مولانا [illegible] رحمانی کا بھی ایک رسالہ، جو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد سے چھپا ہے۔
- حقوق زوجین: یہ مولانا [illegible] ندوی کی تصنیف ہے، اس میں حقوق کے علاوہ نکاح کے مقاصد، عورت کی عزت وعصمت اور طلاق کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں، کتاب کی ضخامت 112 صفحات ہے، عظیم بک ڈپو دیوبند سے 1984ء میں چھپی ہے، اسی نام سے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی بھی ایک کتاب ہے۔
- حرمت مصاہرت: یہ مفتی سعید احمد پالنپوری کی تحقیقی کتاب ہے، جس میں احناف کے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔
- طلاق وتفریق: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب ہے، اس میں طلاق وخلع کے احکام اور اسباب فسخ وتفریق پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسی موضوع پر ایک کتاب [illegible] ''فسخ وتفریق'' مولانا عبد الصمد رحمانی کی ہے، جس میں اسباب فسخ وتفریق پر تفصیلی گفتگو ہے۔
- اسلام کا قانون طلاق [illegible] ندوی کی کتاب ہے، اس میں اسلام کے نظام طلاق وعدت سے متعلق آیات واحادیث اور مسائل کا بیان [illegible] صفحات ہے، 1988ء میں فرقانیہ اکیڈمی بنگلور سے طبع ہوئی ہے۔
- اسلام کا مکمل نظام طلاق: [illegible] قاسمی (قاضی شریعت امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ) کی تالیف ہے، اس میں طلاق دوسری قوموں میں [illegible] اور فقہی مسائل درج کیے گئے ہیں اور مزید فسخ وتفریق کا احکام بھی ذکر کئے گئے ہیں، کتاب کی ضخامت 223 صفحات ہے [illegible] ء میں دار المؤلفین دیوبند سے شائع ہوئی ہے، مفتی نسیم احمد قاسمی نے ''اسلام کا نظام طلاق'' کے نام سے بھی کتاب تصنیف کی [illegible] جس میں بڑی حد تک احکام کا احاطہ ہے اور حوالہ جات کا اہتمام بھی، کتاب کی ضخامت 200 صفحات ہے، مرکزی نشر [illegible] پھلواری شریف پٹنہ سے چھپی ہے، ''طلاق'' کے نام سے مولانا مختار احمد ندوی کی کتاب 39 صفحات پر مشتمل ہے، 1994ء میں الدار السلفیہ بمبئی سے طبع ہوئی ہے، مولانا محمد رئیس ندوی نے ''تنویر الآفاق فی مسئلۃ الطلاق'' کے نام سے 551 صفحات پر مشتمل مفصل کتاب تصنیف کی، جو ادارۃ البحوث الاسلامیہ جامعہ سلفیہ بنارس سے 1987ء میں چھپی ہے، اس میں [illegible] ایک مجلس کی تین طلاق پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔
- مولانا عامر عثمانی نے ''ایک مجلس میں تین طلاق'' نامی کتاب لکھی اور جمہور علماء کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی، یعنی ایک مجلس کی تین طلاق تین ہی طلاق واقع ہوگی، کتاب کی ضخامت 388 صفحات ہے، جس کی اشاعت 1998ء میں کتب خانہ نعیمیہ سے عمل میں آئی

ہے، مولانا شہاب الدین ندوی نے بھی ''تین طلاق کا ثبوت'' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی، جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاق تین ہی واقع ہوگی، کتاب 54 صفحات پر مشتمل ہے، 1988 میں فرقانیہ اکیڈمی بنگلور سے طبع ہوئی ہے۔

❁ نفقہ: اس موضوع پر مختلف علماء نے کتابیں لکھی ہیں، چنانچہ مولانا محمد عمیر صدیق ندوی نے ''مطلقہ عورت کا نان ونفقہ اور سپریم کورٹ کا فیصلہ'' کے نام سے 92 رصفحات پر کتاب لکھی، 1988ء میں طبع ہوئی، مولانا محمد رئیس ندوی نے ''نفقہ مطلقہ'' نامی کتاب 48 رصفحات پر مشتمل لکھی، جو 1985ء میں مطبع سلفیہ بنارس سے چھپی ہے، مولانا شہاب الدین ندوی نے بھی ''شریعت اسلامیہ کی جنگ نفقہ مطلقہ کی روشنی میں'' کے نام سے کتاب لکھی۔

❁ احکام میراث پر مولانا سید حسین دیوبندی کی ''مفید الوارثین'' اور ''میراث المسلمین'' اہم کتابیں ہیں، مفتی محمد نسیم احمد قاسمی کی ''اسلام کا نظام میراث'' بھی قابل ذکر ہے، مولانا محمود حسن گنگوہی نے فتاوی محمودیہ میں فرائض پر ایک پورا رسالہ لکھ کر شامل کیا ہے، مفتی رشید احمد لدھیانوی کی ''قانون وراثت'' ہے، مولانا منفعت علی نے ''رسالۂ فرائض'' مرتب کیا، مولانا محمد ایوب ندوی نے تقسیم میراث، 184 رصفحات کی کتاب لکھی، جس میں حنفی اور شافعی دونوں مسالک کے اختلاف کو بھی ذکر کیا ہے۔

❁ سلطانی احکام: علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبی کی ساتویں جلد اسی موضوع پر ہے، مولانا اسحاق سندیلوی ندویؒ نے ''اسلام کا سیاسی نظام'' نامی کتاب لکھی، انہوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے مطالبہ کے پس منظر میں یہ کتاب ترتیب دی، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے نظر ثانی فرمائی، اور جا بجا حاشیہ بھی لگایا تھا، 1957ء میں دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی ہے، مولانا اسحاق سندیلوی ندوی ہی کی دوسری کتاب ''اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاح عالم'' ہے جو 58 رصفحات کی ہے، مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے طبع ہوئی ہے، مصنف نے واضح کیا کہ پوری دنیا کی سلامتی اسی نظام کو قبول کرنے میں ہے۔

❁ مولانا عبد السلام ندوی کی کتاب ''اسلامی قانون فوجداری'' ہے، یہ کتاب دراصل فارسی زبان میں ایک قلمی نسخہ مولانا سلامت علی خان کے قلم سے بنام ''کتاب الاختیار'' تھا، یہ کتاب اسی کا ترجمہ وتشریح ہے، مفتی محمد زید مظاہری نے مولانا اشرف علی تھانوی کے افادات سے ''اسلامی حکومت ودستور مملکت عقل ونقل کی روشنی میں'' ترتیب دی، جو 648 رصفحات پر مشتمل 1418ھ میں ادارہ افادات اشرفیہ باندہ سے شائع ہوئی ہے، ''دستور مملکت قرآن کی روشنی میں'' یہ کتاب مفتی محمد شفیع کی منتشر تحریروں کا مجموعہ ہے، مرتب مفتی محمد زید مظاہری ندوی ہیں، مولانا رئیس احمد جعفری ندوی نے ''سیاست شرعیہ'' کے نام سے کتاب تصنیف کی، جس میں خلافت اور حکومت اسلامی کی خارجہ پالیسی خاص طور پر زیر بحث آئی ہے، صفحات کی تعداد (567) ہے، 1959ء میں پہلی بار ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے چھپی ہے، حضرت تھانوی کے افادات سے مفتی زید مظاہری ندوی نے ''مروجہ سیاست کے شرعی احکام'' کا مجموعہ تیار کیا، جس میں فقہی نقطۂ نظر سے گفتگو کی گئی ہے، کتاب 85 رصفحات کی ہے، 1410ھ میں ادارہ افادات اشرفیہ باندہ سے چھپی ہے، مولانا مناظر احسن قاسمی نے ''اسلام کا قانون تعزیر'' کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا، 205 رصفحات پر مشتمل ہے، اس میں خاص طور پر اسلامی تعزیرات کا دوسرے مذاہب سے تقابل کرتے ہوئے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

معاشیات:

❁ اسلام کا معاشی نظام اور جدید نظام معیشت کے تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب ''اسلامی معاشیات'' ہے، اس موضوع پر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی ''اسلام کا اقتصادی نظام'' ہے، مفتی محمد شفیعؒ کا رسالہ ''اسلام

کا نظام تقسیم دولت'' ہے، مفتی صاحب کی کتاب ''مسئلہ سود'' بھی ہے، مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا مقالہ ''تجارتی سود'' ہے، نیز مولانا کی کتاب ''اسلام اور جدید معیشت'' ہے۔

- مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی کتاب ''اسلام کا قانون اجرت'' ہے اس میں اجیر خاص سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے، یہ کتاب پہلی بار 1983ء میں لاہور (پاکستان) سے چھپی، پھر تاج کمپنی دہلی سے چھپی ہے، مفتی داؤد صاحب مظاہری کی کتاب ''دینی خدمات اور معاوضہ'' ہے، قرآن وحدیث آثار صحابہ وتابعین اور اقوال ائمہ کی روشنی میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے، کتاب کی ضخامت 246/صفحات ہے۔ مولانا ذکر اللہ ندوی نے ''معاشی مشکلات کا اسلامی حل'' کے نام سے رسالہ 32/صفحات پر مشتمل لکھا ہے، جو یونائیٹیڈ پریس لکھنو سے طبع ہوا ہے، مولانا کاظم ندوی نے ''تجارت اور اسلام'' کے نام سے کتاب تصنیف کی ہے، جس میں تجارت کی اہمیت اور طریقہ کار پر زیادہ زور دیا گیا ہے، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری نے ''کمرشیل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت'' ترتیب دی، یہ دراصل تین اصحاب قلم کے مقالات کا مجموعہ ہے، جس میں کمرشیل انٹر سٹ کو جائز قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

بچوں کی فقہ اور بچوں سے متعلق فقہی کتابیں: بچوں کی نفسیات اور ان کی شعوری سطح کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان میں کئی کتابیں مرتب کی گئی ہیں، جن میں چند کا تذکرہ آپ نے پہلے پڑھا ہے، اسی طرح مولانا سراج الدین ندوی نے ''ہماری فقہ'' کے نام سے مرتب کی، جس میں توحید اور عبادات کے مسائل کو تفصیل سے بیان کیا ہے، اور طہارت کے مسائل بھی کافی آگئے ہیں، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے بھی ''آسان فقہ'' (اول) مختصر سا رسالہ ترتیب دیا ہے، جو صرف طہارت کے مسائل پر مشتمل ہے، 63/ صفحات ہیں، یہ رسالہ 1953ء میں مکتبہ دین ودانش مکارم لکھنو سے طبع ہوا ہے، مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی نے ''نماز کیا ہے'' مختصر رسالہ 40/صفحات پر مشتمل مرتب کیا، جو 1419ھ میں لکھنو سے طبع ہوا ہے، اس میں نماز کے مسائل کے ساتھ طہارت کے مسائل بھی آگئے ہیں، مولانا عبدالقیوم نے ''اسلام کیا سکھاتا ہے؟'' رسالہ لکھا، جس میں عقائد وعبادات کے ساتھ ساتھ معاشرت، معاملات اور تجارت وغیرہ کے مسائل کو آسان زبان میں بیان کیا ہے، 88/صفحات پر مشتمل 1952ء میں بارہ بنکی (یوپی) سے طبع ہوا ہے، مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے بھی ''اسلامی تعلیم'' کے نام سے چار جلدوں میں بچوں کے لئے آسان سیٹ تیار کیا ہے، یہ کتاب 1967ء میں پہلی بار ندوہ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے چھپی، اور بہت سے دینی مدارس میں داخل نصاب ہے۔

بچوں سے متعلق فقہی کتابوں میں مولانا نثار احمد ندوی قاسمی کی کتاب ''جنین کے احکام'' ہے، جس میں مصنف نے نئے پرانے مسائل کو جمع کر دیا ہے، اس کی ضخامت 103/صفحات ہے، مولانا محمد نعمت اللہ ناظم قاسمی نے ''بچے۔ حقوق واحکام'' نامی کتاب تصنیف کی ہے، جس کی ضخامت 396/صفحات پر ہے، کتب خانہ نعیمیہ سے چھپ چکی ہے۔

متفرق مسائل:

کچھ اور فقہی موضوعات ہیں جن پر علماء نے کتابیں لکھی ہیں اور وہ یہ ہیں:

- اسلام کا قانون شہادت: یہ مولانا محمد متین ہاشمی کی کتاب ہے، جس میں 264/صفحات ہیں، آخر میں دو ضمیمے شامل ہیں، پہلے ضمیمہ میں قصاص وحدود کے تمہیدی مباحث اور دوسرے ضمیمہ میں 48 مصنفین، فقہاء اور محدثین کے احوال موجود ہیں، کتاب کی ضخامت 471/صفحات ہے، اس کی اشاعت دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور سے عمل میں آئی ہے۔

- مولانا ڈاکٹر نور محمد غفاری کی کتاب ''اسلام کا قانون محاصل'' اپنے موضوع پر جامع ہے، اس میں اسلامی مملکت کے نظام محاصل کی پوری تفصیل موجود ہے، ساتھ ہی حضرت محمد ﷺ، آپ کے خلفاء اوران کے تبعین حکام کے طرز عمل کو بھی پیش کیا گیا ہے، کتاب کی ضخامت 175/صفحات ہے، اس کی اشاعت مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور سے ہوئی ہے۔
- ایک کتاب ''اسلامی قانون اراضی'' ہے جس کے مصنف جناب نصرت علی اشیر ہیں، اس میں زراعت کی تاریخ اور مسائل دونوں کا تذکرہ ہے، کتاب 119/صفحات پر مشتمل ہے، اور مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری سے طبع ہوئی ہے۔
- ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب نے ''اسلام کا قانون وقف'' کے نام سے کتاب تالیف کی، جس میں وقف سے متعلق تمام تر تفصیلات ومسائل کے احاطہ کی کوشش کی گئی ہے، کتاب تیرہ (13) ابواب پر ہے، ضخامت 281/صفحات ہے، اوراس کی اشاعت بھی مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری لاہور سے ہوئی ہے۔
- وقف کے موضوع پر ایک دوسری کتاب ''اسلام کا نظام وقف'' ظفر عالم ندوی کے قلم سے ہے جو مجلس صحافت ونشریات دارالعلوم ندوۃ العلماء سے 2013ء میں شائع ہوئی ہے اس کتاب کی ضخامت 200 صفحات ہے۔
- القضاء فی الاسلام: مولانا عبدالسلام ندوی کی تالیف ہے، اس میں اسلام کے عدالتی نظام کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، یہ کتاب 92/صفحات پر مشتمل ہے 1948ء میں پہلی باردارالمصنفین اعظم گڈھ سے چھپی ہے۔
- اس سلسلہ میں مولانا عبدالصمد رحمانی اور قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کی کتابوں کا ذکر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔
- مفتی زید مظاہری ندوی نے حضرت تھانویؒ کے افادات سے ''غیر اسلامی حکومت کے شرعی احکام'' نامی رسالہ مرتب کیا، جو 95/صفحات پر مشتمل ادارہ افادات اشرفیہ باندہ سے شائع ہو چکا ہے، اس میں دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث کے ساتھ سود کے بارے میں بھی کلام کیا گیا ہے۔
- ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے ''حقیقت رجم ایک تنقیدی جائزہ'' کتاب لکھی، جس میں جمہور علماء کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے احادیث رجم پر اشکالات کا جائزلیا گیا ہے، کتاب 112/صفحات پر مشتمل ہے 1996ء میں مکتبہ فردوس پبلیکیشنز دہلی سے طبع ہوئی ہے۔
- مولانا مجیب اللہ ندوی نے بھی ''ثبوت رجم'' نامی کتاب لکھ کر معترضین کے اشکالات کا جائزلیا اور مسئلہ رجم کو اجماعی مسئلہ قرار دیا، کتاب 90/صفحات پر مشمل ہے، اور 1994ء میں دارالتالیف والترجمہ اعظم گڈھ سے شائع ہوئی ہے۔
- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے ''حلال وحرام'' کے نام سے کتاب تصنیف کی، پہلی باردارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد سے طبع ہوئی، اس کے بعد کتب خانہ نعیمیہ دیوبند سے طباعت عمل مین آئی۔
- تصویر کے مسئلہ پر مفتی شفیعؒ نے ''تصویر کے شرعی احکام'' کے نام سے کتاب لکھی۔
- مولانا اسحاق سندیلوی ندویؒ نے ''تصویر علم وعقل کی روشنی میں'' رسالہ لکھا ہے۔ یہ رسالہ 48/صفحات پر مشتمل ہے۔
- مولانا یوسف بنوریؒ نے چھ سوالات کے جوابات داڑھی سے متعلق دیئے تھے، وہی مجموعہ ''داڑھی کا مسئلہ'' کے نام سے طبع ہوا، مولانا حفظ الرحمٰن ندوی نے ''داڑھی کی شرعی حیثیت'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا، 80/صفحات پر مشتمل ہے، دارالکتاب الاسلامی اعظم گڈھ سے طبع ہوا ہے۔

- مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری نے ''داڑھی اور انبیاء کی سنتیں'' کے نام سے کتاب لکھی، جس میں بشمول داڑھی کے مسئلہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنتوں کا جائزہ لیا گیا ہے، مولانا محمد حسن مرادآبادی نے اپنے رسالہ ''تبیین الحجة فی اعفاء اللحیه'' لکھا۔ یہ رسالہ 37 رصفحات پر مشتمل ہے، 1917ء میں لجنۃ العلماء مرادآباد سے شائع ہوا ہے۔
- پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے ''اسلام میں اہانت رسول'' نامی کتاب لکھی، جس میں اہانت رسول کی سزا قتل کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کیا، جس پر امت کا اجماع ہے، یہ رسالہ 64 رصفحات پر مشتمل ہے، اور 1989ء میں اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن دہلی سے طبع ہوا ہے۔
- مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری ندوی نے ''اسلام اور موسیقی'' نامی کتاب تصنیف کی، جس میں سماع کے تعلق سے تفصیلی گفتگو ہے، کتاب کی ضخامت 216 رصفحات ہے، پہلی بار 1956ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے طبع ہوئی ہے۔
- مولانا حفظ الرحمٰن اعظمی نے ایک اہم کتاب ''تمباکو اور اسلام'' کے نام سے لکھی، جس میں مؤلف نے تمباکو کی حقیقت، اس کی علمی و تاریخی پس منظر، اور اس کے بارے میں فقہاء کے رجحانات کو واضح کیا، کتاب کی ضخامت 164 رصفحات ہے، اور جمعیۃ الاصلاح جے پور (راجستھان) سے شائع ہوئی ہے۔
- مولانا قاضی محمد حسن ندوی اور مولانا اخلاق حسین کریمی کی مشترکہ تصنیف ''اسلام میں دعاء کا نظام مع مسائل واحکام'' ہے، جس میں مختلف موقعوں سے ماثور دعائیں اور احکام ومسائل کو جمع کیا گیا ہے، کتاب کی ضخامت 157 رصفحات ہے، اور کتب خانہ نعیمیہ سے اس کی طباعت عمل میں آئی ہے۔
- مولانا شاہد حسین نے ''عیادت سے تعزیت تک قرآن وحدیث کی روشنی میں'' کتاب تالیف کی اس میں عیادت، وصیت، غسل میت وغیرہ تعزیت تک موٹے موٹے مسائل کا ذکر ہے، کتاب 79 رصفحات پر مشتمل ہے اور 2001ء میں فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی
- ''اسلام اور جدید ذرائع ابلاغ'' یہ مولانا مجتبیٰ حسن قاسمی کی مرتب کی ہوئی ہے، جس میں ذرائع ابلاغ کی مختلف صورتوں سے متعلق فقہی احکام کا جائزہ لیا گیا ہے، فحش ویڈیو کے ذریعہ حرمت مصاہرت اور دعوت دین کے لئے ذرائع ابلاغ کے استعمال وغیرہ پر تفصیلی بحث ہے، کتاب کی ضخامت 170 رصفحات ہے۔
- ''اسلام اور ماحولیات'' مولانا محمد جہانگیر حیدر قاسمی کی تصنیف ہے، اس میں فضائی، آبی اور صوتی آلودگی وغیرہ سے متعلق اسلامی آداب اور فقہی احکام بیان کئے گئے ہیں۔
- مولانا محمد ابرار نے ''حیوانات کے فقہی احکام'' کتاب لکھی ہے، جس میں جانوروں کی زکاۃ، خرید وفروخت اور ان کے اجزاء بدن سے متعلق فقہی احکام مفصل بیان کئے گئے ہیں، کتاب کی ضخامت 7 4 3 رصفحات پر ہے۔
- مولانا منور سلطان ندوی نے خواتین کے شرعی احکام پر تقریباً 550 صفحات میں ایک مفصل کتاب لکھی جو پہلی بار 2008 میں شائع ہوئی۔

نئے مسائل پر کتابیں:

اس سمت علماء ہند نے بھی قدم بڑھایا، اور بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، چنانچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''حوادث الفتاوی'' اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، مفتی شفیعؒ کے مقالات کا مجموعہ جواہر الفقہ ہے، جس میں پانچ جلدوں میں رؤیت ہلال، جدید

آلات کے استعمال، کرنسی، اعضاء کی پیوند کاری اور الیکشن وغیرہ موضوعات پر بحث کی گئی ہے، مفتی نظام الدین کی ''منتخبات نظام الفتاویٰ'' بھی جدید مسائل پر ہے، قاضی مجاہد الاسلامؒ قاسمی کی ایک کتاب ''چند اہم فقہی مسائل'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے، نئے مسائل پر جن علماء نے قلم اٹھایا ان میں ایک مولانا برہان الدین سنبھلی ہیں، آپ کی کتاب ''موجودہ مسائل کا شرعی حل'' متعدد بار طبع ہو چکی ہے، بینک انشورنس اور سرکاری سودی قرضے'' کے عنوان سے آپ کے مقالات کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے، اسی طرح ایک اور تحریر ''جدید میڈیکل مسائل فقہ اسلامی کی روشنی میں'' میں طبع ہو چکی ہے، اسی سلسلہ کی کوشش مولانا بدر الحسن قاسمی کی کتاب ''عصر حاضر کے فقہی مسائل'' ہے اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی پانچ کتابیں ''عبادات اور چند اہم جدید مسائل'' ''اسلام اور جدید معاشرتی مسائل''، ''اسلام اور معاشی مسائل'' اسلام اور جدید میڈیکل مسائل'' کے نام سے کتب خانہ نعیمیہ نے طبع کیا ہے، مفتی شبیر احمد قاسمی نے ''ایضاح النوادر'' کے نام سے دو جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی، جس میں تجارت، شیرز اور انشورنس وغیرہ اہم موضوعات شامل ہیں۔

سماجی مسائل پر لکھی جانے والی کتابوں میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی ''طلاق وتفریق''، مولانا عبید اللہ اسعدی کی ''تحدید نسل''، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ''اسلام اور ضبط ولادت''، مولانا منت اللہ رحمانی کی ''فیملی پلاننگ اور اسلام'' اہم ہے۔

یہ انفرادی کاموں کا ذکر تھا، اجتماعی تحریروں میں مختلف فقہی اداروں کے سیمیناروں کے مجموعے مقالات ومجلّات کی شکل میں آرہے ہیں، وہ بھی جدید مسائل کے سلسلہ میں ہیں، اس سلسلہ میں اردو زبان میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا دہلی کا کام سب سے نمایاں ہے، وہاں سے متعدد مجموعہ مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

18.5 خلاصہ

ہندوستانی علماء کی خدمت علوم اسلامیہ کے میدان میں وسیع، متنوع اور بڑی عظیم رہی ہے، فقہ کے میدان میں ان کا کام زیادہ نمایاں ہے متعدد زبانوں میں فقہی کتابیں عہد بہ عہد سامنے آئیں، ساتھ ہی اہم عربی فقہی کتابوں کو اردو میں منتقل بھی کیا ہے، چنانچہ انہوں نے نور الایضاح مختصر القدوری، ہدایہ، کنز الدقائق، شرح وقایہ، درمختار، موسوعہ فقہیہ کویت، فقہ الزکاۃ، فتاوی معاصرۃ اور مجلۃ الاحکام العدلیہ کو اردو میں ترجمہ کرکے اس زبان کو علمی وتحقیقی زبان بنا دیا، دوسری طرف انہوں نے اردو زبان میں فقہی کتابیں راست تصنیف کیں، اور ہر نوع کی، عمومی بھی اور خصوصی بھی، یعنی ایسی کتابیں جن میں فقہ کے تمام ابواب کا احاطہ کیا گیا، جیسے اسلامی فقہ، علم الفقہ، اور قاموس الفقہ وغیرہ، اور خاص موضوعات پر الگ الگ کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، جیسے عبادات کے باب میں آئینہ نماز، تحفۂ نماز، احکام مسافر، مسائل سجدہ سہو، سجدے، احکام ومسائل، اسلام میں نماز جمعہ کا حکم، احکام میت، رؤیت ہلال، رمضان کے شرعی احکام، اسلام کا نظام عشر وزکاۃ، معلم الحجاج، رفیق حج وعمرہ وغیرہ، معاملات میں: سود اور مروج سودی معاملات، بیع مرابحہ اور اسلامک بنک کاری، آداب معاملات، اسلامی قانون میں تحدید مدت اور قبضہ کے تصورات وغیرہ۔ معاشرتی مسائل میں: مجموعہ قوانین اسلامی، اسلام کا قانون نکاح، حقوق زوجین، حرمت مصاہرت، الحیلۃ الناجزۃ، کتاب الفسخ والتفریق، طلاق وتفریق، اسلام کا قانون طلاق، تین طلاق کا ثبوت، مطلقہ عورت کا نان ونفقہ، نفقہ مطلقہ اور اسلام کا نظام میراث وغیرہ۔ سلطانی احکام میں: علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبی کی ساتویں جلد، اسلام کا قانون فوجداری، ہندوستان میں امارت شرعیہ اور اسلام کا

قانون تعزیر وغیرہ۔ معاشیات میں : اسلامی معاشیات، اسلام کا اقتصادی نظام، اسلام کا قانون اجرت، مضاربت ، احکام وتطبیقات، مرابحہ، احکام وتطبیقات، اجارہ، احکام وتطبیقات، اورسلم واستصناع، احکام وتطبیقات وغیرہ، بچوں کی فقہ میں : ہماری فقہ، تعلیم الاسلام، آسان فقہ اور اسلامی تعلیم وغیرہ، زمین اور زمین کی پیداوار سے متعلق: اسلام کا قانون محاصل، اسلام کا نظام زراعت۔ قضاء سے متعلق: اسلامی عدالت، آداب قضاء، اور القضاء فی الاسلام وغیرہ۔ اسی طرح دیگر متفرق مسائل پر متفرق کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں: حقیقت رجم ایک تنقیدی جائزہ، ثبوت رجم، حلال وحرام، تصویر کے شرعی احکام، داڑھی کی شرعی حیثیت، اسلام میں اہانت رسول، تمباکو اور اسلام، اسلام اور جدید ذرائع ابلاغ، حیوانات کے فقہی احکام، کچھ نئے مسائل پر اہم کتابیں منظر عام پر آئی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں: جدید فقہی مسائل 5 رجلدیں، حوادث الفتاویٰ، جواہر الفقہ، چند اہم فقہی مسائل، موجودہ مسائل کا شرعی حل، عصر حاضر کے فقہی مسائل، تحدید نسل، اور فقہی مجلات وغیرہ۔

18.6 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس تیس سطروں میں دیجئے۔

1. اردو میں کتب فقہ کی ترجمہ شدہ کتابوں پر روشنی ڈالئے۔
2. اردو میں عمومی کتب فقہ کا تعارف کرائیے۔
3. اردو میں خاص خاص موضوعات پر لکھی جانے والی فقہی کتابوں کا تذکرہ کیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ پندرہ سطروں میں دیجئے۔

1. اردو میں کتب فقہ میں سے پانچ کا تعارف کرائیے۔
2. اردو میں معاشی موضوعات پر لکھی جانے والی تین کتابوں کا تعارف کرائیے۔
3. نئے مسائل پر لکھی گئی کتابوں پر روشنی ڈالتے ہوئے، کسی تین کتابوں اوران کے مصنفین کے نام بتائیے۔

18.7 فرہنگ

کثیرالوقوع	کثرت سے پیش آنے والا
زوجین	میاں بیوی
مبسوط	مفصل
ماثور	منقول
مسلم	تسلیم شدہ
اغلاق	پیچیدگی

18.8 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

کتاب	مصنف
1. قاموس الفقہ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
2. فقہ اسلامی۔تدوین وتعارف	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
3. اردو زبان میں علوم اسلامی کا سرمایہ	ترتیب: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد
4. ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابناء ندوہ کی فقہی خدمات	مولانا منور سلطان ندوی
5. فضلاء دیوبند کی فقہی خدمات	آفتاب غازی قاسمی/عبدالحسیب قاسمی

اکائی 19 : فقہ بدلتے حالات میں

اکائی کے اجزاء

19.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ زمانہ وحالات کی تبدیلی سے کس طرح فقہی مسائل میں تبدیلی ہوتی ہے؟ اور کیا اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کھلا رہے گا؟ نیز وہ یہ بھی جان سکیں کہ ہندوستان میں اجتماعی اجتہاد کے مراکز کہاں کہاں ہیں؟ اوران مراکز میں جو نئے مسائل زیر بحث آئے ہیں ان کے چند نمونوں سے بھی واقف ہوسکیں۔

19.2 تمہید

اس اکائی میں بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں چند مسائل پیش کئے جائیں گے، اور یہ بتایا جائے گا کہ اجتہاد کا دروازہ اپنی چند شرائط کے ساتھ ہر زمانہ میں کھلا ہے، ہر زمانہ میں زمانہ کے مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھنے والے علماء پیدا ہوتے رہیں گے، نیز اجتماعی اجتہاد کے مراکز کا تعارف بھی پیش ہوگا، اور ان مراکز میں حل ہونے والے مسائل میں سے چند نمونے بھی پیش ہوں گے، ساتھ ہی ان میں فقہاء کے جدید رجحانات کی وضاحت بھی کی جائے گی۔

19.3 بدلتے مسائل

بعض فقہی مسائل میں بعض وجوہات کی بنیاد پر تبدیلی آتی رہتی ہے، عام طور پر اخلاقی، تمدنی اور سیاسی حالات کی تبدیلی، مقامات کی تبدیلی، عرف اور تعامل کی تبدیلی، معاشی نظام میں تبدیلی اور نئے وسائل کی پیدائش سے بعض احکام و مسائل میں از سرِ نو غور و فکر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور ان میں تغیر آتا ہے۔

اصولی طور پر کفار کی طرف سے مسلمانوں کے لئے امیر کی تولیت اور ان کا انتخاب درست نہیں؛ بلکہ مسلمانوں ہی میں سے ہم مذہب و ہم عقیدہ کی طرف سے ہوگی؛ لیکن جب سیاسی حالات بدل جائیں تو فقہاء نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لئے اور ان کو انتشار اور بکھراؤ سے بچانے کے لئے ان حالات میں کافر کی طرف سے بھی کوئی امیر متعین کردیا جائے تو وہ قابل قبول ہوگا۔

ووٹ کی ایک حیثیت توکیل کی ہے، اس اعتبار سے ووٹ سے منتخب شخص کا عمل ووٹ دینے والے کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے، ہندوستان یا اس جیسے جمہوری ممالک میں علماء نے مسلمانوں کے لئے ووٹ دینے کو ضروری قرار دیا ہے؛ کیوں کہ ایک جمہوری ملک میں ووٹ ایک بہت بڑی طاقت ہے؛ اس لئے بحیثیت شہری اپنے حقوق کی وصولیابی کے لئے اور سرگرم سیاسی نمائندوں میں سے زیادہ قابل اعتبار نمائندہ کا انتخاب خود اپنے مفاد میں ہے، اور اس کے لئے وقت دینا ایک قومی ذمہ داری ہے۔

ناپاک چیزوں کی خرید و فروخت اصل میں جائز نہیں ہے؛ لیکن بعد میں تعامل ہوگیا کہ بعض ناپاک چیزوں کی بھی خرید و فروخت کی جانے لگی، تو فقہاء نے اس کی اجازت دے دی؛ کیوں کہ قدیم زمانہ میں ناپاک چیزوں سے انتفاع کی صورت دریافت نہیں ہوئی تھی، اس لئے ناپاک چیزوں کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دیا، اب جب کہ بعض ناپاک چیزوں سے انتفاع ممکن ہوگیا تو اسکی خرید و فروخت کو جائز قرار دیا، جیسے جانوروں اور انسانوں کے فضلات زمین کی کھاد کے لئے اور اس کی قوت پیداوار کو بڑھانے کے لئے کارآمد ہیں اور لوگوں کا اس پر تعامل بھی ہے۔ اسی بنیاد پر شہد کی مکھی اور ریشم کے کیڑوں کی خرید و فروخت جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ لوگوں کے انتفاع کا باضابطہ ذریعہ ہیں، حالاں کہ قدیم فقہاء کے یہاں ان کی خرید و فروخت درست نہیں تھی؛ کیوں کہ ان کے یہاں یہ چیزیں قابل انتفاع نہیں سمجھی جاتی تھیں اور متاخرین کے یہاں وہ تعامل کی وجہ سے قابل انتفاع ہوگئیں، اس لئے انہوں نے اس کی بیع کی اجازت دیدی۔ اسی طرح آج کل مشینوں کی خرید پر وارنٹی دی جاتی ہے کہ ایک سال اسکی مرمت کی وارنٹی ہوگی، اصولی اعتبار سے یہ ایسی بیع ہے جس میں مرمت کی گارنٹی کی شرط لگی ہوئی ہے، اور ایسی بیع فاسد ہوتی ہے؛ لیکن تعامل کی وجہ سے اس معاملہ کو فقہاء نے درست قرار دیا ہے۔

نئے وسائل کی پیدائش کی وجہ سے شکلیں بدل جاتی ہیں، ان کی وجہ سے احکام بھی بدل جاتے ہیں، جیسے: سانپ کے چمڑے کی دباغت کا مسئلہ ہے، پہلے زمانہ میں ایسی مشینیں نہیں تھیں کہ باریک چمڑے کی دباغت ہوسکے، آج ایسے چمڑے کی دباغت ہوتی ہے، ایسی مشینیں آگئی ہیں کہ بھینس وغیرہ کے موٹے چمڑے کی کئی کئی تہیں کردی جاتی ہیں اور باریک چمڑے کی دباغت بڑی آسانی سے ہوجاتی ہے، لہذا سانپ کے چمڑوں کی خرید و فروخت درست ہوگی؛ کیوں کہ اس کی دباغت ممکن ہوچکی ہے، قدیم زمانہ میں ممکن نہیں تھی اس لئے اس کی خرید و فروخت بھی درست نہیں تھی۔ پوسٹ مارٹم اصل کے اعتبار سے درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ انسانی

احترام وشرافت کے مغائر ہے؛ لیکن جرائم کی تحقیق کے لئے فقہاء نے پوسٹ مارٹم کی اجازت دی ہے، پہلے زمانہ میں پوسٹ مارٹم کے ذریعہ جرائم کی تحقیق ممکن نہیں تھی۔قرآن نے لباس وپوشاک کی ذمہ داری شوہر کے ذمہ رکھی ہے (بقرۃ:۲۳۳) البتہ مقدار اور نوعیت متعین نہیں کی اور نہ اس کو مکمل طور پر متعین کرنا ممکن ہی ہے، لہذا یہ حالات، مقامات، عرف وتعامل اور موسموں کے اعتبار سے مختلف ہوگا اور اس کی نوعیت میں تبدیلی آتی رہے گی۔

19.4 اجتہاد کی روایت

اجتہاد وتقلید کے بارے میں آپ اکائی 16 میں پڑھ چکے ہیں۔یہاں صرف اتنا بتانا ہے کہ اجتہاد کی روایت شروع اسلام سے ہی چلی آرہی ہے اور اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کھلا رہے گا، گو اب اجتہاد مطلق کی ضرورت باقی نہیں رہی تاہم نئے مسائل کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا، قرآن وحدیث کی نصوص محدود ہیں، زندگی کے مسائل لامحدود ہیں، لامحدود کو محدود کے ذریعہ منضبط اور مقید نہیں کیا جاسکتا، سوائے اس کے کہ اجتہاد کیا جائے، اسی وجہ سے فقہاء نے جزوی اجتہاد کو روا رکھا ہے تا کہ ہر زمانہ میں نت نئے مسائل کا حل پیش کیا جاسکے۔اسلام اپنے اندر قیامت تک آنے والے مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور صنعتی انقلاب کے دور میں بھی اسلام لوگوں کی رہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، یہ دعوی اسی وقت کیا جاسکتا ہے اور درست ہوگا جبکہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے، مطلب یہ ہے کہ اسلام کے اندر ایسے اصول وقواعد اور کلی احکام ہیں کہ جن کی روشنی میں ہر طرح کے نئے مسائل کا حل ممکن ہے، اسی اساس پر آج نئے مسائل حل ہوتے آرہے ہیں اور قیامت تک حل ہوتے رہیں گے۔رسول اللہ ﷺ نے کئی موقعوں پر اجتہاد کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ آپ کے اجتہاد کی تائید وحی سے ہوجاتی تھی؛ چنانچہ آپ ﷺ نے روزے سے متعلق ایک خاتون کے سوال کا جواب اجتہاد سے اس طرح دیا کہ اللہ کا دَین زیادہ قابل ادائیگی ہے (بخاری، حدیث نمبر: 1953)، دیکھئے آپ ﷺ نے دَین پر روزہ کو قیاس کیا۔

بعض صحابہ کرام نے آپ ﷺ کی موجودگی میں بھی اجتہاد کیا ہے، آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں تو اجتہاد کیا ہی ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو خود اجتہاد کرنے کی اجازت دی تھی بلکہ مزید دعا بھی فرمائی، اسی طرح غزوہ بنوقریظہ کے موقع سے بنوقریظہ کے معاملہ میں حضرت سعد بن معاذؓ کا فیصلہ کرنا واضح مثال ہے۔اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ نے خوب اجتہاد کیا، حضرت عمرؓ کے یہاں اجتماعی اجتہاد کا مرکز تھا، آپ کے بعد صحابہ کرام مختلف دور دراز شہروں میں پھیل گئے اور وہاں اپنی اپنی فقہ وفتاوی کے مراکز قائم کئے اور نئے مسائل میں اجتہاد کیا، ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اس سلسلے کو قائم رکھا، اس طرح بہت سے فقہی مسالک وجود میں آئے۔

19.5 اجتماعی اجتہاد کے مراکز

یقیناً سائنسی ترقی سے جہاں بہت سی سہولتیں انسان کو فراہم ہوئیں وہیں مشکلات بھی پیدا ہوئیں، خاص طور پر بیسویں صدی میں دنیا ایک چھوٹی سی بستی بن گئی، صنعتی انقلاب نے زندگی کا رخ بدل دیا، اور آئے دن نت نئے مسائل اسلام کے لئے چیلنج بن کر

سامنے آنے لگے: معاشی اور اقتصادی امور میں نئی ترقیات نے نئے مسائل پیدا کردئے، دوسری طرف ایسے جامع علماء کا فقدان ہوگیا جو علم وتحقیق کی بنیاد پر ان مسائل کو حل کرسکیں اور جن کا تنہا فتوی بھی مسلم معاشرہ میں قابل قبول ہو۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اجتماعی غور وفکر کی بنیاد ڈالی جائے اور اصحاب فقہ وفتاوی اور باہمی تبادلہ خیال کے ذریعہ ان مسائل کا ایسا حل نکالیں جو اصول شرع سے ہم آہنگ اور فکری شذوذ سے پاک ہو۔ تاکہ امت کی صحیح سمت رہنمائی ہوسکے، اس پس منظر میں اجتماعی غور وفکر کا رجحان پیدا ہوا اور اس عہد میں خوب پروان چڑھا، جس میں مختلف فقہی مذاہب سے استفادہ کرتے ہوئے درپیش مشکلات کا شرعی حل پیش کرنے کی کوششیں کی گئیں، چنانچہ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی کانفرنس منعقدہ 1384ھ میں مجمع الفقہ الاسلامی کے قیام کی تجویز ڈاکٹر مصطفی زرقاء نے پیش کی جو مقبول ہوئی اور مجمع کی تشکیل عمل میں آئی، اس مجمع کے تحت دسیوں فقہی سیمینار ہوچکے ہیں اور بہت سے نئے مسائل زیر بحث آچکے ہیں، ان خطوط پر 1983ء میں (O.I.C) جدہ کے تحت فقہ اکیڈمی کی تشکیل ہوئی، اس اکیڈمی کے 14 سے زائد سیمینار ہوئے ہیں اور کئی درجن مسائل زیر بحث آئے ہیں، اسی مقصد کے تحت پاکستان میں مفتی محمد شفیع اور مولانا محمد یوسف بنوری وغیرہ نے ,,مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' کی بنیاد رکھی تھی، اسی طرح یورپ میں ''یوروپی افتاء کونسل'' قائم ہے، جس کا مرکز آئرلینڈ ہے اور جس کا مقصد نئے مسائل کو حل کرنا ہے، اسی مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے ہندوستان میں بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء نے مجلس تحقیقات شرعیہ قائم کیا، جمعیۃ علماء ہند نے ادارۃ المباحث الفقہیۃ کی بنیاد رکھی، اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا قائم فرمائی۔ ان اداروں کے علاوہ اور بھی متعدد ادارے قائم ہوئے ہیں۔

☆ **مجلس تحقیقات شرعیۃ ندوۃ العلماء لکھنؤ:**

اس کے بانی مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ہیں، جس کی تاسیس 1381ھ مطابق 1963ء میں عمل میں آئی، اس کے ناظم یکے بعد دیگرے مولانا محمد تقی امینی اور مولانا محمد اسحاق سندیلوی رہ چکے ہیں، ان دونوں حضرات کے بعد مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب مقرر ہوئے۔

اجتماعی غور وفکر کی شکل میں زمانہ شناس، بالغ نظر اور فقہی بصیرت کے حامل علماء کو جمع کرنا اور لوگوں کے سامنے نئے مسائل کا شرعی حل پیش کرنا اور فقہی مشکلات میں ان کی رہنمائی کرنا مجلس کے قیام کا بنیادی مقصد تھا، چنانچہ اس عظیم مقصد کے لئے پورے ملک سے مختلف مکاتب فکر کے چیدہ باکمال فقہاء، ماہرین فقہ علماء اور دانشوران سے مجلس تشکیل دی گئی، جن میں بنیادی ارکان مجلس اس طرح تھے: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا منظور نعمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مولانا فخر الدینؒ، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ، مولانا عمران خان ندویؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، مولانا اویس نگرامی ندویؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مولانا رضا احمد انصاریؒ، مولانا تقی امینیؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰنؒ، مولانا اسحاق سندیلوی ندوی، مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا عبدالصمد رحمانیؒ، مولانا عبدالرحمٰن پالنپوری، مولانا شاہ عون احمد قادریؒ، مولانا مجیب اللہ ندویؒ، مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ۔

مجلس کی بحث وتحقیق کا طریقہ کار یہ تھا کہ مجلس کے ذمہ داران سب سے پہلے ان نئے مسائل کی فہرست تیار کرتے جن کا شرعی حل دریافت کرنا مطلوب تھا، پھر ان میں سے کسی ایک مسئلہ کا انتخاب عمل میں آتا اور اس کی جزوی وذیلی تفصیلات سوالات کی شکل

میں تمام اراکین کے پاس بھیج دی جاتیں، اس کے بعد جب تمام اراکین کی طرف سے اس کے جوابات جمع ہو جاتے، تو تمام اراکین مجلس جمع ہوتے اور اس مسئلہ سے متعلق دیے گئے جوابات کی روشنی میں اجتماعی غور وفکر کرتے، دلائل کی تنقیح ہوتی اور طویل بحث ومباحثہ کے بعد کسی ایک نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی، پھر اس کے بعد ایک اجتماعی فیصلہ کے طور پر اس کو عوام کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ یہی اجتماعی فیصلہ فقہ کی اصطلاح میں اجتماعی اجتہاد کہلاتا ہے۔

مجلس کے چند فیصلے: مجلس نے جدید مسائل کے لئے جو اجتماعی اجتہاد کا طریقہ اختیار کیا تھا، اس کے مطابق چار مسائل پر غور وخوض ہوسکا اور اجتماعی فیصلے منظر عام پر آسکے، گرچہ یہ سلسلہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا، البتہ جن مسائل کی بابت فیصلے ہوئے وہ اپنے زمانے کے بڑے اہم تھے، اور فیصلے بھی بڑے معتدل ومتوازن ہوئے، اس طرح اس مجلس نے آنے والے علماء کے لئے اجتماعی اجتہاد کی راہ دکھائی اور ہندوستان میں اجتماعی غور وفکر کی ایک نئی روایت قائم ہوئی، جن مسائل کے متعلق فیصلے ہوئے ہیں وہ یہ تھے: انشورنس کا مسئلہ، رویت ہلال کا مسئلہ، نس بندی کا مسئلہ اور سرکاری قرضوں کا مسئلہ۔

☆ ادارۃ المباحث الفقہیۃ:

جمعیۃ علماء ہند انگریزوں سے مقابلہ کے لئے 1919ء میں قائم ہوئی، اس جمعیۃ نے مفتی محمد میاں صاحبؒ کی تحریک پر ادارۃ المباحث الفقہیۃ کی بنیاد 1970ء میں رکھی، اور مفتی محمد میاں صاحبؒ ہی اس کے نگراں وذمہ دار تاحیات رہے، اور اپنے زمانہ میں رویت ہلال اور حق تصنیف کی بیع وغیرہ موضوعات پر غور وفکر کرنے کے لئے علماء کو جمع فرمایا، آپ کے وصال کے بعد یہ سلسلہ تھم سا گیا، پھر مولانا اسعد مدنیؒ کی مسلسل تحریک پر مجلس عاملہ نے اپنی ایک تجویز کے ذریعہ 1990 میں ادارۃ المباحث الفقہیۃ کو دوبارہ بحال کیا، اور اجتماعی غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور چار فقہی سیمینار ہوئے، اور وہ اس طرح:

پہلا سیمینار: سہ روزہ مورخہ 22-24/رجب 1411ھ م 8-10/فروری 1991ء بعنوان: غیر سودی رفاہی ادارے اور سوسائٹیاں، دیوبند میں منعقد ہوا۔

دوسرا سیمینار: دوروزہ مورخہ 22-21/جمادی الاولیٰ مطابق 28-29/نومبر 1991ء، بعنوان: اسلامی نظام قضاء اور ہندوستان، دیوبند ہی میں منعقد ہوا۔

تیسرا سیمینار: سہ روزہ مورخہ 7-9/1993ء کو مدراس میں منعقد ہوا، مرکزی موضوع ,,شیئرز وایکسپورٹ،، تھا۔

چوتھا سیمینار: دوروزہ دیوبند میں مورخہ 24-25/اکتوبر 1994ء کو بعنوان ''دوسرے مسلک پر فتوی اور عمل کے حدود وشرائط، منعقد ہوا۔

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا:

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ہندوستان کے ممتاز اہل علم کے ساتھ لے کر 1989ء میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، کی بنیاد رکھی، اور وسیع سطح پر نئے پیدا ہونے والے فقہی مسائل پر غور وفکر کے لئے ایک عظیم الشان پلیٹ فارم مہیا کیا، جس نے نہ صرف پورے ہندوستان بلکہ بیرون ملک کے اہم فقہاء اور ارباب افتاء کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس کے بائیس فقہی سیمینار ہو چکے ہیں، ان سیمیناروں میں مختلف فقہی ابواب کے تحت متعدد موضوعات زیر بحث آئے ہیں، وہ فقہی ابواب اوران کی تعداداس طرح ہے:

(الف) اصولی مسائل:4،(ب) عبادات:28،(ج) معاشرتی مسائل:17(د) معاشی مسائل:28،(5) میڈیکل مسائل:13، (و) جدید آلات وذرائع :3،(ز) متفرقات:6، اصولی مسائل کے تحت اہم موضوعات یہ ہیں''شریعت میں ضرورت وحاجت کی رعایت اوراس کے حدود''،شریعت میں عرف وعادت کا اعتبار اوراس کے اصول وقواعد وغیرہ،عباداتی مسائل کے تحت اہم موضوعات اس طرح ہیں: انقلاب ماہیت اور طہارت ونجاست اور حلت وحرمت پر اس کا اثر''،''پراویڈنٹ فنڈ پر زکاۃ''،''روزہ میں جدید طریقہ علاج کا استعمال''،سماجی مسائل کے تحت اہم موضوعات کس طرح ہیں:''فون، ریڈیو کانفرنسنگ اور انٹرنیٹ کے ذریعہ نکاح''،''مسلم وغیر مسلم تعلقات''اور''نشہ آور اشیاء اوران کے شرعی احکام''وغیرہ،معاشی مسائل کے تحت اہم موضوعات اس طرح ہیں:''جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عقود ومعاملات''،کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت''،''کمپنیوں کے مشیرز ے بینک سے جاری ہونے والے مختلف کارڈ وغیرہ طبی مسائل کے تحت اہم موضوعات اس طرح ہیں:''اعضاء کی پیوندکاری'' کلوننگ، ایڈز، جینیٹک ٹسٹ، ڈی این اے ٹسٹ، یوتھینیز یا اور پلاسٹک سرجری وغیرہ ان کے علاوہ متعدد اہم موضوعات ہیں ان موضوعات سے اندازہ لگانا آسان ہے کہ اکیڈمی نے کتنے اہم اور تازہ ترین موضوعات کو اپنے بحث وتحقیق کا موضوع بنایا ہے اوراس سلسلہ میں کامیابی کے ساتھ تجاویز پاس کی ہیں۔

ان سیمیناروں میں جن جزئیات پر بحث ہوئی ہے، ان میں بحیثیت مجموعی ۳۵ مسائل پر فیصلے کئے گئے ہیں، یہ فیصلے سیمیناروں کی ترتیب پر بھی اور فقہی ترتیب پر بھی شائع ہو چکے ہیں، ان سیمیناروں میں جو مقالات پیش کئے گئے ہیں ان کی تعداد 3055 ہے، اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جن اہل علم اور افتاء نے شرکت کی ہے، مجموعی طور پر ان کی تعداد 1186 ہے، بیرون ملک سے سیمینار میں شرکت کرنے والے فضلاء کی تعداد 52 ہے، جن کا تعلق دنیا کے بیس ملکوں سے ہے، اب تک ان سیمیناروں کے مقالات پر مشتمل 77 مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جو بحیثیت مجموعی 46388 صفحات پر مشتمل ہیں، ان کے علاوہ متعدد مجلّات کے عربی وانگریزی ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں، نیز تجاویز عربی، انگریزی اور فارسی کے علاوہ ہندوستان کی اکثر اہم مقامی زبانوں میں بھی طبع ہو چکی ہیں۔

فقہی سیمینار اوراس کا طریقہ کار: اس سلسلہ میں سب سے پہلا مرحلہ سیمینار کے لئے زیر بحث آنے والے موضوعات کے انتخاب کا ہوتا ہے، اس کے لئے سیمینار میں شریک ہونے والے شرکاء سے آئندہ سیمینار کے موضوعات کے لئے تحریری رائے لی جاتی ہے، اب تک مختلف سیمیناروں میں جو عنوانات آئے ہیں ان کی مکمل فہرست مرتب کردی گئی ہے، اکیڈمی کی مجلس علمی بھی عنوانات کے سلسلہ میں اپنا مشورہ پیش کرتی ہے، جس میں پورے ملک سے ممتاز اہل قلم اور اہل علم شامل ہوتے ہیں، پھر مجلس منتظمہ ان تمام آراء کو سامنے رکھ کر اور عالمی اور ملکی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آئندہ سیمینار کے لئے موضوعات کا انتخاب کرتی ہے، کوشش کی جاتی ہے کہ یہ موضوعات مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق اور موجودہ حالات وضروریات سے زیادہ مطابقت رکھنے والے ہوں۔

اس کے بعد اس موضوع سے متعلق قابل بحث نکات پر مشتمل سوال نامہ اکیڈمی مرتب کرتی ہے اور اسے ملک و بیرون ملک کے فقہاء، ارباب افتاء اور اسکالرس کے پاس بھیجا جاتا ہے، اگر سوال کا تعلق کسی سائنسی ایجاد، یا سماجی و معاشی مسئلہ سے ہو تو اس کے عملی اور سائنسی پہلو پر ان شعبوں کے ماہرین سے مقالات لکھائے جاتے ہیں اور یہ مقالات اگر انگریزی میں ہوں تو ان کا اردو ترجمہ کرایا جاتا ہے اور یہ بھی علماء وارباب افتاء کے پاس بھیجا جاتا ہے؛ تاکہ صورت مسئلہ پوری طرح واضح ہو جائے اور وہ اس کی تفصیلات سے واقف ہو جائیں، ہندوستان میں اہل سنت کے تمام مکاتب فکر سے متعلق اہم درسگاہوں کے ارباب افتاء، نیز ان تمام شخصیتوں کے نام یہ دعوت نامہ جاتا ہے، جو تصنیف و تالیف، تدریس، قضاء یا اور کسی جہت سے فقہ اسلامی سے مربوط ہوں۔

اہل علم کی طرف سے جو مقالات آتے ہیں، ان کی بڑی تعداد ہوتی ہے؛ اس لئے اکیڈمی کا شعبہ علمی ان مقالات کی اس طرح تلخیص کرتا ہے کہ ہر مسئلہ میں تمام مقالہ نگاروں کی رائے آجائے، اگر اتفاق ہو تو متفقہ رائے اور اختلاف ہو تو اختلاف رائے کا اظہار کیا جائے اور مقالہ نگاروں نے کتاب وسنت سے جو استدلال اور فقہاء کی عبارتوں سے جو استشہاد کیا ہو، اختصار کے ساتھ اس کا بھی ذکر ہو، یہ تلخیص سیمینار کے موقع سے شرکاء کو فراہم کی جاتی ہے؛ تاکہ انہیں بحث کرنے میں سہولت ہو۔

پھر موضوع کے مختلف پہلوؤں کے لئے مقالات کی معنوی کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے ''عارض'' مقرر کیا جاتا ہے، اس پہلو سے متعلق تمام مقالات کی فوٹو کاپی انہیں فراہم کی جاتی ہے، وہ ان مقالات میں پیش کئے ہوئے نقاط نظر کو مرتب کرتے ہیں اور ان کے دلائل اور اسباب ووجوہ کا بھی ذکر کرتے ہیں، شرکاء سیمینار خود اپنی تحقیق ومطالعہ، مقالات کی تلخیص اور عارض کی بحث کو سامنے رکھتے ہوئے اظہار خیال کرتے ہیں اور تمام ہی شرکاء کو بحث میں حصہ لینے کی اجازت ہوتی ہے اور اس کے لئے خاصا وقت دیا جاتا ہے۔

اس موقع سے صورت مسئلہ کو واضح کرنے کی ذمہ داری ماہرین کو دی جاتی ہے اور اسی لئے زیر بحث موضوع کی مناسبت سے چند ماہرین بھی سیمینار میں شریک ہوتے ہیں، جو تصویر مسئلہ میں اپنی ماہرانہ رائے سے علماء کو معلومات فراہم کرتے ہیں، بحث مکمل ہونے کے بعد اس مسئلہ پر تجویز مرتب کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنادی جاتی ہے، اس کمیٹی کے انتخاب میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ یا تو انہوں نے اس موضوع پر بہتر مقالہ لکھا ہو یا نمایاں طور پر بحث میں حصہ لیا ہو، یا ان کو فتوی نویسی کا قدیم تجربہ ہو، اگر بحث کے دوران اتفاق رائے نہیں ہوسکا تو اس میں دونوں آراء کے حامل نمائندہ افراد کو شامل کیا جاتا ہے، اب یہ کمیٹی مقالات اور بحث کے دوران آنے والے نکات کو سامنے رکھتے ہوئے مزید تبادلۂ خیال کے بعد تجویز مرتب کرتی ہے، جس کو سیمینار کے مندوبین کی عمومی اختتامی مجلس میں پیش کیا جاتا ہے اور بعض اوقات اس مرحلہ میں بھی جزوی ترمیمات کی جاتی ہیں، سب کمیٹی کی مرتب کی ہوئی تجویز لوگوں پر مسلط نہیں کی جاتی، جس تجویز پر اتفاق ہوا ہے، اسے متفقہ حیثیت سے ذکر کیا جاتا ہے، جس میں شرکاء کی غالب ترین اکثریت کی ایک رائے ہو اور ایک دو اشخاص کو اختلاف ہو، ان میں پہلی رائے کو بحیثیت تجویز ذکر کرتے ہوئے اختلاف رکھنے والے حضرات کے نام ذکر کئے جاتے ہیں، صرف اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جاتا، اگر دونوں نقطۂ نظر کے حاملین کی مناسب تعداد ہو تو تجویز میں اختلاف رائے کا ذکر کرتے ہوئے دونوں نقاط نظر کو مساوی درجہ دیا جاتا ہے اور ہر رائے کے قائلین میں معروف، نمایاں اور اہم شخصیتوں کا بھی ذکر کردیا جاتا ہے، پھر جن الفاظ میں تجاویز سیمینار میں پاس ہوتی ہیں، بعینہ اسی طرح ان کو طبع کیا جاتا ہے۔

19.6 چند معاصر مسائل اور فقہاء کے رجحانات

1. معاصر مسائل بے شمار ہیں، اور دن بہ دن ان میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، لیکن ان میں چند اہم موضوعات اور ان کے سلسلہ میں فقہاء کے رجحانات آپ کے سامنے ہیں:

کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور افراط زر کی صورت میں اس کی قوت خرید تیزی سے گر جاتی ہے، اس پس منظر میں سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت حال کی وجہ سے شرعاً گنجائش ہوگی کہ دیون یعنی مؤخر مطالبات مثلاً: قرض، مہر، ادھار خریداری کی رقم اور وقت پر ادا نہ ہونے والی تنخواہوں کی ادائیگی کو قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کر دیا جائے اور کیا ایسے کسی اشاریہ کی ترتیب اور اس کے ذریعے ادائیگیوں میں انضباط ممکن بھی ہے، اور کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ عامۃ الناس کے درمیان ادائیگیوں کے لئے ایسے معیار مقرر کرنا جن کی بنیاد دقیق فنی اصولوں پر ہو، باہمی مستقل تنازعہ کا موجب ہوگا، نیز یہ کہ اس طرح سو روپے کے بدلے پانچ سو روپے کی ادائیگی سود کے دروازے کو کھولنے کا ذریعہ بنے گی؟

اس سلسلہ میں دور حاضر کے فقہاء کے رجحانات مختلف ہیں، بعض عرب و ہند کے علماء کا رجحان جواز کا ہے جب کہ جمہور علماء عرب و ہند کا رجحان عدم جواز کا ہے، جواز کے قائلین کا کہنا ہے کہ مؤخر بقایا جات کی وصولی کے لئے کرنسی کو قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنے میں مماثلت معنوی اور مالیت کے اعتبار سے برابری ہوگی، صرف صوری و ظاہری اعتبار سے مساوات کی صورت میں یہ بات نہیں پائی جائے گی۔

عدم جواز کے قائلین (جمہور علماء) کا استدلال قرآن و حدیث اور قدیم فقہاء کی تصریحات ہیں، استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ مؤخر مطالبوں کی ادائیگی کو کرنسی کی قیمتوں کے اشاریہ سے وابستہ کرنے میں عین سود یا سود کی مشابہت ضرور پائی جاتی ہے، اور یہ دونوں ہی حرام و ناجائز ہیں، اللہ تعالی نے سود کو صاف لفظوں میں حرام قرار دیا ہے (البقرہ: 279،257) اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اموال ربویہ میں کمی بیشی کو حرام و ناجائز قرار دیا ہے۔ (مسلم، حدیث نمبر: 4057، حدیث نمبر: 4069، بخاری، حدیث نمبر: 2201) اور چاروں مذاہب کے قدیم فقہاء کی تصریحات سے مذکورہ بالا صورت ناجائز ٹھہرتی ہے؛ کیونکہ تمام ہی فقہاء نے لکھا ہے کہ دیون کی ادائیگی میں جو چیز جس نوع کی جتنی مقدار میں ادھار لی گئی ہو، اتنی ہی مقدار میں اسی کے مثل ادا کرنا ضروری ہے۔

1407ھ میں ایک سیمینار اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور عالمی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد نے مشترکہ طور پر منعقد کیا تھا، جس کی تجویز یہ ہے:

سیمینار میں حاضر تمام علماء نے اس بات کی توثیق کی ہے کہ سود اور قرض کی احادیث میں جو برابری ضروری قرار دی گئی ہے وہ شرعی جنس اور قدر یعنی وزن، ناپ اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں، اور یہ بات احادیث کے ذریعہ پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جو احادیث اموال ربویہ کے تبادلہ کے وقت عمدہ اور گھٹیا کے وصف کو غیر معتبر قرار دیتی ہیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے۔

ذمہ میں ثابت شدہ دیون چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں ان کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کردینا جائز نہیں بایں طور کہ عاقدین عقد بیع یا عقد قرض کے وقت اس کرنسی کو جس کے ذریعہ عقد بیع یا عقد قرض کررہے ہیں کسی سامان کے ساتھ منسلک کر کے یہ شرط ٹھہرائیں کہ مدیون ادائیگی کے وقت اس سامان کی قیمت موجودہ کرنسی میں ادا کرے گا (یہ جائز نہیں ہے)''۔

2. ہندوستان میں سود کی حلت اور حرمت کے بارے میں علماء کا اختلاف پایا جاتا ہے، بعض علماء ہند نے سود لینے کو جائز قرار دیا ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے، اور دارالحرب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں سے سود لینا درست ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ اور محمدؒ کی رائے ہے، جبکہ جمہور علماء دارالحرب میں بھی سود کو حرام قرار دیتے ہیں، یہی رائے احناف میں سے امام ابو یوسفؒ کی ہے، اس کے قائل امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بھی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دارالحرب میں سود کی حلت اور حرمت کے بارے میں فقہاء کا اختلاف پایا جاتا ہے، اور ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے؛ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان پر دارالحرب کی تعریف صادق نہیں آتی ہے، اس لئے کہ دارالحرب وہ ملک ہے جہاں کافروں کو امن حاصل ہو اور مسلمان امن سے محرومی کے ساتھ اپنے مذہبی حقوق وعبادات اور جمعہ وعیدین کی علانیہ انجام دہی سے قاصر ہوں، البتہ ہندوستان پر دارالامن کی تعریف صادق آرہی ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ دارالامن وہ ملک ہے جہاں کلیدی اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو؛ لیکن مسلمان مامون ہوں، مسلمان دعوت دین کا فریضہ انجام دے سکتے ہوں، اور ان اسلامی احکام پر جن کے نفاذ کے لئے اقتدار ضروری نہ ہو عمل کرسکتے ہوں۔ اس رو سے دیکھا جائے تو ہندوستان دارالامن کے حکم میں آتا ہے۔ اس لئے یہاں امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے مطابق بھی سود حلال نہیں ہوگا۔

3. کمرشیل انشورنس: جس کی بنیادی طور پر تین صورتیں ہوتی ہیں: لائف انشورنس، ذمہ داریوں کا انشورنس اور املاک کا انشورنس، انشورنس کے شرعی حکم کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، علماء کی ایک قلیل تعداد اس کو جائز قرار دیتی ہے ان علماء میں شیخ مصطفی زرقاء، شیخ علی خفیف، اور ہندوستان کے اہل علم میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں؛ لیکن اکثر علماء عرب اور ہندوپاک نے اس کو کئی وجوہ سے ناجائز قرار دیا ہے۔

جن بعض علماء نے جائز قرار دیا ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ انشورنس ایک نیا مسئلہ ہے، جس کا قرآن وحدیث میں ذکر نہیں ہے، اور ایسے معاملات جن کے بارے میں کتاب وسنت میں نہ حلت کی صراحت ہو اور نہ ہی ممانعت کی، تو ان کے بارے میں دو اصول ہیں، ایک یہ کہ اس میں مصلحت کا پہلو ہو تو وہ جائز ہوگا ورنہ ناجائز، اور انشورنس میں لوگوں کی مصلحت ومفاد ہے، دوسرے جن امور کے بارے میں اجازت یا ممانعت منقول نہ ہو ان کے بارے میں اصل مباح ہونا ہے، فقہی قاعدہ ہے: '' الأصل فی الاشیاء الإباحة'' لہذا اس قاعدہ کے تحت انشورنس کی صورتیں جائز ہوں گی۔

یقیناً یہ بات درست ہے کہ جن اشیاء کے بارے میں قرآن وحدیث میں صراحت نہ ہو تو ان میں مصلحت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا، اور اشیاء میں اصل مباح اور جائز ہونے کے قاعدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو جائز تصور کیا جائے گا؛ لیکن جو لوگ کمرشیل انشورنس کو ناجائز وحرام قرار دیتے ہیں ان کے یہاں انشورنس میں قمار، اس کی بعض صورتوں میں سود اور غرر پائے جاتے ہیں؛ اس لئے یہ ان امور میں سے نہیں ہے جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں صراحت نہ ہو کہ اس پر ''مصلحت'' اور ''اشیاء میں اصل اباحت ہے'' کا اطلاق ہوسکے۔

جمہور علماء انشورنس کو ناجائز قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ لائف انشورنس میں ایک مقررہ مدت تک پالیسی ہولڈر زندہ رہا تو جمع شدہ رقم پر ایک بڑی رقم اضافہ کے ساتھ اس کو ملتی ہے، یہ اضافی رقم سود ہے، اس طرح وہ تمام صورتیں جن میں کمپنی اضافہ کے ساتھ رقم واپس کرتی ہے، سود کے زمرہ میں آجاتی ہے۔

''غرر'' کے دو معنی آتے ہیں، ایک دھوکہ کے، ظاہر ہے کہ انشورنس کی تمام صورتیں پہلے سے واضح ہوتی ہیں، کوئی بھی صورت پالیسی ہولڈر پر پوشیدہ نہیں رہتی ہے؛ اس لئے اس میں دھوکہ تو نہیں ہے، البتہ دوسرا معنی ''خطر'' کا ہے وہ یہاں پایا جاتا ہے، خطر سے مراد یہ ہے کہ فریقین میں سے کسی کے لئے نفع ایسی شرط پر موقوف کر دیا جائے جن کا ہونا اور نہ ہونا غیر یقینی ہو، اور معاملہ کی ایسی صورت قمار شمار ہوتی ہے جس کو قرآن کی تعبیر میں ''میسر'' کہا گیا ہے (مائدہ: 90)، مشہور مفسر اور فقیہ ابوبکر جصاص کا بیان ہے کہ ''اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ قمار حرام ہے''، مخاطرہ، بھی قمار ہی کی ایک صورت ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: مخاطرہ قمار ہے،، ظاہر ہے کہ انشورنس کی تمام ہی صورتوں میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔

4. انسانی اعضاء کی پیوند کاری: خود انسان اپنے کٹے ہوئے حصہ کی اپنے جسم میں پیوند کاری کر سکتا ہے یا نہیں، گو اس میں ہمارے متقدمین فقہاء کا اختلاف پایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ نے ناجائز قرار دیا ہے، ان کے نزدیک کٹے ہوئے حصہ کو دفن کرنا ضروری ہے، جب کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک درست ہے؛ اس لئے کہ انسان کا خود اپنے عضو سے فائدہ اٹھانے میں اس کی اہانت نہیں ہے، اسی پر فتویٰ ہے۔

اس سے متعلق دوسرا مسئلہ ایک انسان کے اعضاء کی دوسرے انسان کے جسم میں پیوند کاری کا ہے، اس کے بارے میں دور حاضر کے فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، علماء کی ایک جماعت نے مطلق ناجائز قرار دیا ہے، اور بعض دوسرے علماء نے عام حالات میں ناجائز اور اضطرار و ضرورت کی صورت میں جائز کہا ہے، ان کے سامنے فقہ کے مشہور قواعد ہیں: الضرورات تبیح المحظورات (ضرورت کی وجہ سے ناجائز چیزیں جائز قرار پاتی ہیں)، المشقة تجلب التيسير (مشقت پیدا ہو جائے تو یسر و آسانی کی راہ اختیار کی جاتی ہے)، ان قواعد کے پیچھے وہ آیات ہیں جن میں اضطرار کی حالت میں جان بچانے کے لئے حرام چیزوں کے استعمال کا ذکر ہے، اسی طرح حالت اکراہ میں کلمۂ کفر کہنے کی اجازت دی گئی ہے۔

جن لوگوں نے دوسرے کے اعضاء سے پیوند کاری سے منع کیا ہے، انہوں نے فرمایا: چونکہ انسان کے علیحدہ شدہ اعضاء ناپاک ہو جاتے ہیں اور انسان خود اپنے جسم کا مالک نہیں ہے؛ بلکہ وہ امین ہے؛ لیکن دیکھا جائے تو فقہاء نے ضرورت کے وقت انسانی ضرورت کی رعایت رکھتے ہوئے ان امور کو مباح قرار دیا ہے؛ چنانچہ امام ابو یوسفؒ نے ناپاک چیزوں سے علاج کو درست قرار دیا ہے اور اسی پر فتوی ہے، علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ صاحبین کے نزدیک علاج کے لئے گھوڑے کے گوشت اور اونٹ کے پیشاب کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح فقہاء نے اپنے جسم میں ایسے تصرف کی اجازت دی ہے جو کسی نص صریح سے متعارض نہ ہو۔

منع کرنے والوں کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ انسان مکرم و معزز ہے اس کی اہانت درست نہیں، اس کے اعضاء سے انتفاع اور اس کی خرید و فروخت اس کی شان تکریم کے خلاف اور اہانت ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں انسانی اعضاء کی پیوند کاری اہانت میں داخل ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں، اول یہ کہ اہانت کا معیار اور حدود کیا ہیں؟ تو قرآن

وحدیث میں اس کی واضح تحدید نہیں ملتی، اس لئے یہ عرف وعادت پر محمول ہوگا، جیسا کہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اس کی صراحت کی ہے۔اورعرف وعادت کی صورتیں زمانہ وحالات اور علاقہ کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں اور بدلتی رہتی ہیں، عین ممکن ہے کہ جن فقہاء نے انسانی اعضاء سے انتفاع کو منع کیا ہے ان کے زمانہ میں یہ عمل توہین تصور کیا جاتا تھا، اوراس دور میں انسانی اعضاء سے انتفاع کے ایسے طریقے رائج نہیں ہوئے تھے کہ شائستہ طور پر انسانی اجزاء سے انتفاع کیا جاسکے جیسا کہ موجودہ دور میں رائج ہوچکے ہیں، اس لئے اس دور میں اس عمل کو توہین تصور نہیں کیا جاتا ہے؛ بلکہ عطیہ کے طور پر اعضاء دینے والا اپنے آپ کو باعزت محسوس کرتا ہے اور لوگ بھی اسے عزت دیتے ہیں اور اس کی قدرومنزلت میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا ہے؛ اسی وجہ سے بعض لوگ اپنی نیک نامی کے لئے اس قسم کی وصیت بھی کر جاتے ہیں، موجودہ زمانہ میں اعضاء انسانی سے انتفاع کے ایسے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں جن میں انسانی اہانت نہیں ہے، اور نہ ہی عرف میں اس کو اہانت سمجھا جاتا ہے؛ اس لئے اصولی طور پر ان کو درست اور جائز ہونا چاہئے۔ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے بہ ضرورت جبکہ اس میں اہانت انسانی نہ ہوتو جائز قرار دیا ہے۔مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے لکھا ہے کہ دوسرے فقہی نظائر کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جان کے تحفظ اور بقا کے لئے قابل احترام چیزوں کی اہانت بھی قبول کی جاسکتی ہے۔

نیز موجودہ زمانہ میں اعضاء کی پیوندکاری طبی اعتبار سے اتنی زیادہ ترقی یافتہ ہے کہ اس میں اب جان کی ہلاکت یا ضرر شدید کا اندیشہ باقی نہیں رہا بلکہ بہت ہی محفوظ طریقہ پر اس عمل کو انجام دیا جاتا ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے دوسرے فقہی سیمینار منعقدہ دہلی بتاریخ 8-11 ردسمبر 1989ء نے اس موضوع پر فیصلہ کیا ہے، وہ درج ذیل ہے:

1. ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی انسان کے جسم میں بوقت حاجت استعمال کیا جانا جائز ہے۔
2. اعضاء انسانی کا فروخت کرنا حرام ہے۔
3. اگر کوئی مریض ایسی حالت میں پہونچ جائے کہ اس کا کوئی عضو اس طرح بیکار ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر اس عضو کی جگہ کسی دوسرے انسان کا عضو اس کے جسم میں پیوند نہ کیا جائے تو قوی خطرہ ہے کہ اس کی جان چلی جائے گی، اور سوائے انسانی عضو کے کوئی دوسرا متبادل اس کمی کو پورا نہیں کرسکتا، اور ماہر قابل اعتماد اطباء کو یقین ہے کہ سوائے عضو انسانی کی پیوندکاری کے کوئی راستہ اس کی جان بچانے کا نہیں ہے، اور عضو انسانی کی پیوندکاری کی صورت میں ماہر اطباء کو ظن غالب ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی اور متبادل عضو انسانی اس مریض کے لئے فراہم ہے، تو ایسی ضرورت، مجبوری اور بے کسی کے عالم میں عضو انسانی کی پیوندکاری کے ذریعہ اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا مریض کے لئے مباح ہوگا۔
4. اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ اگر اس کے دو گردوں میں سے ایک گردہ نکال لیا جائے تو بظاہر اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گردہ اگر نہیں بدلا گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے تو ایسی حالت میں اس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دیکر اس کی جان بچائے۔

19.7 خلاصہ

بعض فقہی مسائل میں زمانہ وحالات، عرف وعادت، نئے وسائل کی پیدائش اور بدلتے معاشی نظام کی وجہ سے تبدیلی آتی ہے، سیاسی حالات کی تبدیلی کے نتیجہ میں کافر حکمراں کی طرف سے مسلمانوں کے امیر کے انتخاب کو درست قرار دیا گیا، ہندوستان اور اس جیسے جمہوری ممالک میں ووٹ دینا ضروری ہے، ناپاک چیزوں کی خرید وفروخت کو لوگوں کے عرف وتعامل کی وجہ سے جائز قرار دیا گیا جب کہ ان سے انتفاع ممکن ہو جائے۔

نئے وسائل کی پیدائش سے مسائل کی شکلیں بدل جاتی ہیں، دیکھئے پہلے زمانہ میں باریک چمڑے کی دباغت مشکل تھی؛ لیکن موجودہ دور میں بالکل آسان ہوگئی، اسکی وجہ سے سانپ کے چمڑے کی خرید وفروخت درست قرار پائی؛ کیوں کہ اسے دباغت دے کر اس سے انتفاع ممکن ہو گیا، اسی طرح جرائم کی تحقیق کے لئے پوسٹ مارٹم کو فقہاء نے جائز قرار دیا۔

نئے مسائل کے حل کے لئے ہر زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت پڑی ہے اور آئندہ بھی اس کی ضرورت رہے گی؛ کیوں کہ زمانہ کی تیز رفتاری کے ساتھ جدید مسائل بھی اسی رفتار سے پیدا ہو رہے ہیں اور اسلام کی ابدیت اور اس کی پائیداری کے لئے نئے مسائل کا حل پیش کرنا بے حد ضروری ہے، اور یہ اجتہاد اور قیاس کے بغیر ممکن نہیں، پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے اجتہاد سے کام لینے کی روایت عہد رسالت سے آج تک رہی ہے، اور آئندہ بھی رہے گی، دور جدید میں اجتماعی غور وفکر کا رواج فروغ پا رہا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے؛ کیوں کہ اس میں انحراف کی گنجائش کم رہتی ہے اور صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے، ہندوستان میں اجتماعی اجتہاد کے تین اہم مراکز قائم ہوئے: مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، جمعیۃ علماء ہند کے تحت ادارہ مباحث فقہیہ۔ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا جو اس وقت سرگرم عمل ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی ادارے کام کر رہے ہیں۔

معاصر مسائل میں ایک مسئلہ دیون کی ادائیگی قیمتوں کے اشاریہ سے مربوط کرنے کا ہے، بعض معاصر علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے جب کہ اکثر علماء نے ناجائز قرار دیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ: جو چیز جس مقدار میں ادھار لی گئی ہو، اتنی ہی مقدار میں اس کا مثل ادا کرنا ضروری ہے۔

ہندوستان میں سود کی حلت کے بارے میں علماء ہند کا اختلاف ہے، بعض علماء نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیتے ہوئے سود مسلم اور غیر مسلم سب سے لینے کو جائز قرار دیا ہے، لیکن اکثر علماء ہند ہندوستان کو دار الحرب قرار نہیں دیتے ہیں بلکہ دار الامن کہتے ہیں اور یہاں سود کے لین دین کو حرام قرار دیتے ہیں۔

کمرشیل انشورنس کی تین صورتیں ہوتی ہیں: لائف انشورنس، ذمہ داریوں کا انشورنس اور املاک کا انشورنس، بعض علماء عرب وہند نے انشورنس کی ان تینوں ہی صورتوں کو جائز کہا ہے، جب کہ اکثر علماء عرب وہند نے اس کو ناجائز وحرام قرار دیا ہے؛ کیوں کہ ان میں قمار، سود اور غرر پائے جاتے ہیں جو کہ کسی معاملہ کو شرعاً حرام وناجائز بنا دیتے ہیں۔

اعضاء کی پیوند کاری یعنی ایک انسان کے عضو کو دوسرے انسان کے جسم میں پیوند کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، تاہم اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے دوسرے سیمینار میں چند شرطوں کے ساتھ اس کو بوقت ضرورت جائز قرار دیا گیا ہے، البتہ عطیہ کی صورت میں نہ کہ خرید وفروخت کے ذریعہ۔

19.8 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس تیس سطروں میں دیجئے:

1. بدلتے حالات میں پیدا ہونے والے چند نئے مسائل پر روشنی ڈالئے۔
2. نئے مسائل کے حل میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے طریقہ کار کا تعارف کرائیے۔
3. اعضاء کی پیوند کاری کے بارے میں معاصر اہل علم کی رایوں کا جائزہ لیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ پندرہ سطروں میں دیجئے:

1. معاصر دور میں اجتہاد کی روایت پر روشنی ڈالئے۔
2. کاغذی نوٹ کے ذریعہ ادائیگی کے مسئلہ پر بحث کیجئے۔
3. مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ اور ادارۃ المباحث الفقہیہ کا تعارف کرائیے۔

19.9 فرہنگ

منصوص	جس مسئلہ کے بارے میں قرآن یا حدیث میں صراحت موجود ہو۔
غیر منصوص	وہ مسئلہ جس کے بارے میں قرآن یا حدیث میں صراحت موجود نہ ہو۔
تاویل	ایک لفظ میں کئی معنوں کا احتمال ہو، ان میں سے ایک کو غلبہ گمان کی بنیاد پر ترجیح دینا نہ کہ یقین کی بنیاد پر۔
یکساں	برابر
تغیر	تبدیلی
وصال	وفات
امیر کی تولیت	امیر مقرر کرنا
فقدان	نایاب ہونا
ہدف	نشانہ
ارباب افتاء	مفتیان، فتوی دینے والے
عارض	پیش کرنے والا
اموال ربویہ	وہ مال جن میں کمی بیشی سے سود کی شکل پیدا ہو جائے

دیون — مؤخر مطالبات یعنی جن کی ادائیگی کا مطالبہ دیر سے ہو فوری نہ ہو

یسر — آسانی

عضو، جمع اعضاء — جسم کا ایک حصہ

19.10 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. جدید فقہی مسائل — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
2. فکر اسلامی۔ معاصر فقہ اسلامی نمبر — مرتب: محمد اسعد قاسمی
3. فضلاء دیوبند کی فقہی خدمات — مولانا آفتاب غازی قاسمی ، مولانا عبدالحسیب قاسمی
4. ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابناء ندوہ کی فقہی خدمات — مولانا منور سلطان ندوی

بلاک:4 تصوف

فہرست

اکائی 20 : تعارف تصوف

اکائی کے اجزاء

20.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد طلبہ تصوف کے معنی ومفہوم کو سمجھ لیں۔ تصوف کے آغاز وارتقاء، اس کی بنیادی خصوصیات، تصوف کے مقاصد، صوفیانہ فکر کے ارتقاء اور تصوف کے تاریخی ادوار سے واقف ہوجائیں۔ چونکہ تصوف کا ارتقاء ایک باضابطہ فن کی حیثیت سے ہوا تھا اور فنون کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں، اور ہرفن کا انحصار ان اصطلاحات کی تفہیم پر ہوتا ہے اس لیے طلبہ کی آسانی کے لیے تصوف کی بنیادی اصطلاحات کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

20.2 تمہید

تصوف کا آغاز ایک تحریک کے طور پر ہوا تھا جب عہد بنی امیہ میں دولت کی فراوانی اور اسی کے ساتھ اقتدار کے لیے رسہ کشی

شروع ہوئی تو بہت سے نیک نفوس ایسے تھے جنھوں نے اپنے آپ کو کلیۃ اس حریفانہ معرکہ آرائی سے علیحدہ کر کے ذکر وفکر اور عبادات وانابت میں لگا لیا، اس طرح تصوف کی داغ بیل پڑی اور تصوف کا ارتقاء شروع ہوا، آئندہ صفحات میں تصوف کے معنی ومفہوم، اس کی خصوصیات اور مقاصد اور تصوف کے تاریخی ادوار پر گفتگو کی جائے گی اور طلبہ کی آسانی کے لیے اس کے آخر میں تصوف کی بنیادی اصطلاحات کی مختصر وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔

20.3 مفہوم وآغاز

تصوف کے لغوی معنی صوف پہننے کے آتے ہیں، لیکن اصطلاح میں یہ ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے، صوفی مصنّفین اور تصوف کے تاریخ نویسوں نے اس موضوع پر بہت تفصیل سے کلام کیا ہے اور اس کے معنی ومفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے مدلول ومصداق کو بھی بیان کیا ہے۔

بعض علماء اور کچھ مستشرقین کا خیال ہے کہ تصوف روح اسلامی کے لیے اجنبی اور کلیۃ ایک درآمد شدہ چیز ہے، وہ اس کی بنیادیں یہودیت، عیسائیت، یونان، ہندومت، بدھ مت اور قدیم ایرانی افکار میں تلاش کرتے ہیں۔

کچھ جدید مصنّفین اور بعض مستشرقین ایسے بھی ہیں جو تصوف کی اتنی آفاقیت کے قائل ہیں کہ وہ دین ودنیا سبھی کو محیط ہے۔

بعض علماء تصوف کو ہی حقیقی اسلام اور دین اسلام کی روح کا معتبر ترین اظہار مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں تصوف ہی حقیقی اسلام ہے اور تصوف ہی اسلام کا مغز ہے، باقی شریعت کی حیثیت صرف پوست کی ہے۔

کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے تصوف اور اسلام میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ جو کچھ قرآن وسنت کے موافق ہو، اسے تسلیم کر لیا جائے اور جو خلاف ہو، اسے رد کر دیا جائے۔

تصوف کا اہم ترین مسئلہ بلکہ وہ مسئلہ جس پر تصوف سے متعلق سارے مباحث کی بنیاد ہے وہ صوفیہ کا اللہ کے بارے میں تصور ہے، اس تصور کی وجہ سے علماء کے ایک گروہ نے صوفیہ پر تنقید کی ہے، اگلے صفحات میں ہم نے کوشش کی ہے کہ تصوف کو اس کے صحیح مدلول ومصداق اور اس کے متعلقہ مباحث کے ساتھ معروضی انداز میں پیش کریں۔

20.3.1 تصوف کا معنی ومفہوم

لفظ تصوف کی اصل کے بارے میں صوفیہ کے مختلف اقوال ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ صوفی ''صفا'' سے مشتق ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''اصحاب صفہ'' سے ماخوذ ہے، بعض اسے ''صف اول'' سے ماخوذ بتاتے ہیں، چونکہ صوفیہ صف اول کا اہتمام کرتے ہیں اس لیے انھیں صوفیہ کہا گیا۔

کچھ کہتے ہیں کہ چونکہ صوفیہ کا باطن صاف ہوتا ہے اس لیے وہ صوفی کہلاتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ صوفی وہ ہے جس کا دل غیر اللہ سے پاک وصاف ہو، یعنی صفائی کی نسبت سے صوفی کہلائے۔ کچھ کا خیال ہے کہ چونکہ صوفی اللہ تعالیٰ کی صفات سے متصف ہوتا ہے اس اتصاف کی وجہ سے صوفی کہلائے۔

اجلہ صوفیہ نے صوفی کی اسی طرح کی توجیہات کی ہیں؛ مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں کہ صوفی، مصافات سے ماخوذ ہے اس کا مطلب ہے وہ بندہ جسے حق نے صاف کیا۔ شیخ ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں کہ تصوف صفائی سے ماخوذ ہے، چنانچہ صفائی ہر زبان میں قابل تعریف ہے اور گدلا پن جو اس کی ضد ہے قابل مذمت ہے، اس کی تائید میں ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ باہر نکل کر آئے تو آپ کا رنگ بدلا ہوا تھا، فرمایا دنیا کی صفائی جاتی رہی اور کدورت باقی رہ گئی، اس لیے اب ہر مسلمان کے لیے موت ایک تحفہ ہے۔ یہی بات شیخ علی ہجویری نے بھی لکھی ہے، لیکن یہ معنی سے زیادہ حسن تعلیل ہے۔ ورنہ تصوف صف اول یا صفا یا صفہ سے لغوی اعتبار سے مشتق نہیں ہوسکتا، خود صوفیہ نے اس اشتقاق کو بعید از قیاس اور خلاف لغت کہا ہے، البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ معناً ان الفاظ کا اطلاق صوفیہ پر ہوسکتا ہے، چنانچہ امام قشیری نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور شیخ شہاب الدین سہروردی نے بھی لکھا ہے کہ لغوی طور پر صوفی صفہ سے مشتق نہیں ہوسکتا، البتہ معناً درست ہے؛ چونکہ صوفیہ کا حال بھی اہلِ صفہ کی طرح ہے، شیخ ابوبکر الکلاباذی نے بھی ان توجیہات کو معنوی بتایا ہے۔

جس طرح لفظ صوفی کے لیے یہ معنوی نسبتیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح ان کے ظاہری احوال کی بنا پر ان کے ورنام بھی رکھے گئے تھے، مثلاً ان کو گوشہ گیری اور غاروں میں رہنے کی وجہ سے ''شکفتیہ'' کہا گیا۔ چونکہ ''شکفت'' غار کو کہتے ہیں۔یعنی غار والے، اور وطنوں سے دور رہنے کی وجہ سے ان کو غرباء کہا جاتا ہے، کثرت اسفار کی وجہ سے ان کو سیاح کہا جاتا ہے، اہلِ شام ان کے بھوکا رہنے کی وجہ سے ان کو ''جوعیۃ'' کہتے ہیں، ان کے دل کی نورانیت کی وجہ سے ان کو ''نوریہ'' کہا جاتا ہے۔

2.3.2 تصوف کیا ہے؟

یہ تقریباً محقق ہے کہ تصوف کا لغوی ترجمہ اون/اونی کپڑا پہننا ہے اور اس کی دیگر تاویلات دراصل حسن تعلیل ہیں، لیکن بطور اصطلاح تصوف کے معنی اس کی لغوی بحث سے واضح نہیں ہوتے۔ مختلف صوفیہ نے مختلف انداز میں اس کی تشریح کی ہے؛ لیکن وہ تمام کی تمام حدود کے زمرے سے خارج ہیں، وہ تصوف کے کسی ایک پہلو یا ایک سے زائد پہلوؤں کی نشاندہی تو ہوسکتی ہے نفس تصوف کی نہیں، مثلاً:

شیخ جنید فرماتے ہیں:

1. تصوف یہ ہے کہ حق تعالیٰ تجھے تیری ذات کے ساتھ فنا کردے اور اپنی ذات کے ساتھ زندہ رکھے۔
2. تصوف دراصل دنیا اور اسباب دنیا سے دور رہنے کا نام ہے۔
3. تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز سے تعلق نہ ہو۔
4. تصوف قلب کا دنیا اور اس کے لواحقات سے پاک کرنا، بشری صفات کی نفی کرنا، نفسانی خواہشات سے بچنا، روحانی صفات اختیار کرنا، حقیقت کے علوم سے تعلق رکھنا اور ان اشیاء کا اختیار کرنا جو ابدیت کے لیے اولیٰ ہیں، اور تمام امت کے لیے خیر خواہی کرنا، اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونا اور شریعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا نام ہے۔
5. تصوف جبر وقہر کا نام ہے، اس میں کوئی صلح نہیں ہوتی۔

ابوالحسین نوری کہتے ہیں:

1. تصوف تمام نفسانی خواہشات سے منقطع ہونے کا نام ہے۔

2. تصوف اسم یا علم کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اخلاق ہیں۔

3. تصوف، جو کچھ بھی پاس ہو اس کو خرچ کر دینے کا نام ہے۔

3. ہر نفسانی خواہش کے ترک کر دینے کا نام تصوف ہے۔

شبلیؒ کہتے ہیں:

1. تصوف محبت اور تالف کا نام ہے۔

2. اللہ کے ساتھ بغیر غم کے بیٹھنا تصوف ہے۔

3. مخلوق سے کٹ کر حق تعالیٰ کے ساتھ متصل ہونے کا نام تصوف ہے۔

4. تصوف جلا دینے والی بجلی ہے۔

ابوحفص کہتے ہیں: ''تصوف ادب کا نام'' ہے۔

سہیل بن عبداللہ تستریؒ کہتے ہیں کہ: ''صوفی وہ ہے جو گدلے پن سے صاف ہو، فکر سے پُر ہو اور بشریت سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ متصف ہو جائے، نیز اس کے سامنے سونا اور مٹی برابر ہو جائیں۔

تصوف کی ایک تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ تصوف حقائق کے علم کا نام ہے۔ مثلاً معروف کرخی (200ھ/816ء) نے فرمایا، التصوف الاخذ بالحقائق والیاس بما فی ایدی الخلائق (تصوف حقائق کو لینے اور جو مخلوق کے ہاتھ میں ہے اس سے مایوس ہو جانے کا نام ہے)۔ اس عبارت میں لفظ حقائق کو غیبی حقائق کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے اور بعد کے صوفیہ نے تو بالعموم اسی مفہوم میں لیا ہے، مثلاً امام غزالی (505ھ/1111ء) اور ابن عربی (638ھ/1240ء) کے یہاں تصوف دراصل غیبی حقائق کو جان لینے یا ان کی تصدیق کر لینے کا نام ہے، تصوف کی تعریف کا ایک دوسرا رجحان یہ ہے کہ تصوف فناء اور بقاء کے تجربہ سے گذرنے کا نام ہے۔ یہ تعریف متعدد صوفیہ سے منقول ہے۔ ملا جامی (898ھ/1493ء) نے بھی یہی لکھا ہے کہ ولایت فنا فی اللہ اور بقاء باللہ کا نام ہے۔ شیخ مجدد الف ثانی نے بھی تصوف کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ؛ ولایت عبارت از فناء وبقاء است (ولایت فناء اور بقاء سے عبارت ہے)۔

اس طرح عام طور پر صوفیہ نے تصوف کی تعریف میں فناء و بقاء کو بنیادی اہمیت دی ہے۔

فناء اور بقاء کے تجربے کو اگر تصوف قرار دیا جائے تو اس میں ایک اہم افادی پہلو یہ ہے کہ جو لوگ تصوف پر اعتراض کرتے ہیں ان کا اعتراض درحقیقت اشراقی یا عرفانی تصوف پر ہوتا ہے جس میں یہ دعویٰ موجود ہے کہ وہ غیب کو نبوت کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے جان سکتے

ہیں، یا ان پر غیب الغیب منکشف ہوگیا ہے؛ لیکن فناء و بقاء کا تجربہ ایک معروضی تجربہ ہے، اس کا مذہب سے کوئی ٹکراؤ نہیں، سالک ان مراحل سے گذرتا ہے، اور اس کے سامنے نبوت کی حقیقت بھی موجود رہتی ہے وہ نبوی تعلیمات سے انحراف نہیں کرتا، بلکہ فناء کے تجربہ کی تاویل کر کے اس کو نبوت کے ماتحت کرتا ہے۔ قاضی زکریا انصاری (متوفی: 929ھ) تصوف کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> ''تصوف وہ علم ہے جس کے ذریعے تزکیہ نفوس، صفائی اخلاق اور ظاہر و باطن کو آباد کرنے اور سنوارنے کے احوال کو جانا جاتا ہے تاکہ ابدی سعادت حاصل ہو سکے''

اس تعریف میں نہ صرف جنس و فصل کے ساتھ تصوف کی حد کو بیان کیا گیا ہے بلکہ اس کے غایت و مقصد کو بھی واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

صوفیاء کے نزدیک تصوف وہی ہے جیسے حدیث جبریل میں ''احسان'' کیا گیا ہے اور اس احسان کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ: اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو اور اگر ایسا نہ کر سکو تو یوں کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس حدیث میں احسان کے دو درجے بیان کئے گئے ہے پہلا درجہ یہ ہے کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اس کو مشاہدہ کہتے ہیں، اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اور اس درجے کو مراقبہ کہتے ہیں، اور درجہ مراقبہ سے درجہ مشاہدہ کے سفر کو سلوک کہتے ہیں جو تصوف کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

20.4 بنیادی خصوصیات

صوفیہ کرام نے تصوف کی حقیقت اور اسکی خصوصیات بیان کرتے ہوئے بھی بوقلموں اسلوب اختیار کیا ہے، مثلاً رویم بن احمد کہتے ہیں: ''تصوف کی بنیاد تین چیزوں پر ہے فقر و افتقار کو مضبوط پکڑنا، بذل و ایثار کے ساتھ متصف ہونا، اور کسی چیز سے تعرض کرنے یا کسی چیز کے اختیار کرنے کو ترک کر دینا۔ بشر بن الحارث کہتے ہیں ''صوفی وہ ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل صاف ہو''۔ سہل بن عبداللہ تستری فرماتے ہیں: ''صوفی وہ ہے جو کدورت سے پاک ہو، فکر سے پر ہو، لوگوں سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو جائے اور اس کی نظر میں سونا اور مٹی کی قیمت برابر ہو''۔ ابوالحسین نوری نے کہا کہ: ''تصوف نہ تو رسوم و اعمال کا نام ہے نہ علم کا، یہ تو حسن خلق کا نام ہے''۔ شیخ جنید نے فرمایا کہ: ''تصوف اللہ تعالیٰ سے بے غرض محبت کا نام ہے''۔

صوفیہ کے مختلف اقوال کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف صوفیہ کے یہاں ایک عمل اور ایک منہاج کا نام ہے، اس کا فکر اور خیال سے زیادہ تعلق نہیں ہے، بلکہ عمل اور نیت سے ہے، یہ درست ہے کہ ایک سطح پر فکر و تصورات بھی تصوف کا موضوع ہوتے ہیں اور صوفیہ کے بعض حلقوں میں عرفان، مشاہدہ اور غیبی حقائق کے اظہار کی بات کہی جاتی رہی ہے، لیکن یہ تصوف کا عمومی رنگ نہیں ہے، تصوف کا عمومی رنگ عمل ہے اور عمل کے ساتھ باطنی کیفیات جیسے خلوص نیت وغیرہ کی اس میں خاص اہمیت ہے۔

اجلہ صوفیہ جیسے شیخ جنید کے یہاں صوفیہ کے مکاشفات اور مشاہدات کا تذکرہ بہت کم ہے، ان کا پورا زور اس پر ہے کہ تصوف دراصل انسان کی تربیت اور اس کے اندر روحانی صفات پیدا کرنے کا نام ہے، تصوف ایسے ذکر کا نام ہے جس کے ساتھ فکر وابستہ ہو، ایسے عمل کا نام ہے جس میں ریاء کا شائبہ بھی نہ ہو، ایسی عبادت کا نام ہے جس میں نفسانی خواہشات سے کلیۃً اجتناب ہو، یعنی بندہ

کامل طور پر اپنے رب کا مطیع ہو جائے اور اس کی پوری زندگی اس طریقہ کے تابع ہو جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا، اسی کا نام تصوف ہے۔ چنانچہ شیخ جنیدؒ نے تصوف کے ذریعہ حاصل ہونے والے فوائد کا تذکرہ کرتے ہوئے خلوص عمل اور اتباع شریعت کو خاص اہمیت دی ہے۔

صوفیہ کے یہاں اتباع رسول کی بنیادی اہمیت ہے، چنانچہ شریعت محمدیہ کو ترک کر کے کوئی شخص راہ سلوک پر گامزن نہیں ہوسکتا، تصوف کی پہلی شرط اتباع شریعت ہے اور صوفیہ نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں سب سے زیادہ اہم اتباع شریعت ہے، عبادات سے لے کر اکل حلال تک تمام چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، ان کو چھوڑ کر کوئی اور راہ قابل قبول نہیں ہے، اس کی کسی قدر تفصیل آگے آرہی ہے۔

صوفیہ اپنے افکار کو مبرہن کرنے کے لیے انبیاء سابقین کی نمایاں صفات کو بھی بطور استعارہ استعمال کرتے رہے ہیں، مثلاً صبر ایوب، سیاحت عیسیٰ وغیرہ، شیخ جنیدؒ نے بھی ان تلمیحات کو اپنے تصور تصوف کی وضاحت کے لیے استعمال کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے، اور یہ آٹھ خصائل آٹھ انبیاء کے امتیازی وصف رہے ہیں، اس لیے سالک کو چاہئے کہ ان خصائل کو حاصل کرنے کے لیے ان کے اعلیٰ ترین نمونہ کو اپنا آئیڈیل اور نمونہ بنائے۔ اس طرح سالک سلوک کی اعلیٰ وارفع منزل تک پہنچ سکے گا، شیخ جنید نے فرمایا:

> ''تصوف آٹھ خصائل پر مبنی ہے: سخاوت، رضا، صبر، اشارہ، قربت، اون پہننا، سیاحت اور فقر، سخاوت حضرت ابراھیمؑ جیسی، رضا حضرت اسحاق جیسی، صبر حضرت ایوب جیسا، اشارہ حضرت زکریا جیسا، قربت حضرت یحیٰ جیسی، اون پہننا حضرت موسیٰ جیسا، سیاحت حضرت عیسیٰ جیسی اور فقر حضرت محمد مصطفیٰ صلوات اللہ علیھم اجمعین جیسا''۔

شیخ جنیدؒ کی نظر میں تصوف دراصل اعمال شریعت کو ان کے معیار مطلوب کے مطابق انجام دینے کا نام ہے، اس طرح صوفی راہ سلوک کی منزلیں طے کر کے اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں وہ سراپا خیر بن جاتا ہے، اس کے اخلاق اعلیٰ ترین اخلاق بن جاتے ہیں، اس کا قلب آئینہ کی طرح شفاف ہو جاتا ہے۔ شیخ جنیدؒ نے ایک مرتبہ فرمایا: تصوف انسان کی طبیعت کے اندر موجود نفس کی کامل تزکیہ اور انسان کے ظاہر کے حسن خلق کا نام ہے، یعنی باطن یہ ہے کہ نفس تمام عیوب سے پاک ہو جائے اور ظاہر یہ ہے کہ اخلاق اچھے ہو جائیں۔

اس لیے صوفی ایسا شخص ہوتا ہے جو نہ صرف خود خوبیوں کا مجسمہ بن جاتا ہے بلکہ اس کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ اگر برائیاں بھی اس سے منسوب کی جائیں تو وہ خوبیوں کے ساتھ پیش آئے، اگر اس کو مطعون کیا جائے تب بھی اس کی طرف سے بھلائی کا رویہ ہی ظاہر ہو۔ شیخ جنید نے فرمایا ہے کہ: صوفی کی مثال زمین کی سی ہے کہ اس میں قبیح چیزیں ڈالی جاتی ہیں، لیکن اس سے جو کچھ نکلتا ہے وہ بہترین غذا ہوتی ہے، یا اس کی مثال اس زمین کی سی ہے جس کو نیک وبدسب روندتے ہیں، یا اس کی مثال بادل کی سی ہے جس کا پانی سب کو سیراب کرتا ہے۔

20.5 مقاصد تصوف

تصوف اپنے باطن کی اصلاح اور ظاہر شریعت پر مکمل عمل پیرا ہونے کا نام ہے حضرت ابویزید بسطامی فرماتے ہیں: ''اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اس کو اس قدر کرامات دی گئی ہیں کہ وہ ہوا میں اڑتا ہے تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ، یہاں تک کہ یہ دیکھ لو کہ وہ امر و نہی اور حدود شریعت کی حفاظت میں کیسا ہے۔ اسمٰعیل بن جنید کہتے ہیں کہ امر و نہی پر صبر کرنا تصوف ہے۔ ابو عثمان حیری کہتے ہیں: دھوکے سے محفوظ، سلف اور پابندی شریعت کا راستہ ہے۔ حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ: اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اس آسمان کے نیچے کوئی اور علم ہمارے اس علم سے زیادہ شرف والا ہے تو میں اس علم اور اس علم والوں کی طرف دوڑ کے جاؤں گا؛ تا کہ ان سے وہ علم سن سکوں، اور اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے اس وقت کے مقابلے میں جو ہم اپنے شیوخ اور ساتھیوں کے ساتھ گزارتے ہیں کوئی اور اچھا وقت ہے، یا ہمارے مسئلوں اور ہماری صحبتوں سے زیادہ اچھی کوئی صحبت ہے تو میں اٹھ کر اس تک چلا جاؤں''۔ تو گویا شیخ جنید اپنے اس قول میں اپنے تجربہ کا اس طرح اظہار کر رہے ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس سے زیادہ اہم کوئی علم نہیں ہے، ان کا عندیہ ہوتا ہے کہ ہم فقہ ظاہر کو ترک کر کے فقہ باطن کی طرف آئے ہیں جو ہمارے نزدیک سب سے بہتر ہے، یعنی یہ تصوف فقہ باطن ہے اور باطن کی اصلاح اسی پر مبنی ہے، اور مطلوب حقیقی صرف رسوم کی اصلاح نہیں بلکہ باطن کی اصلاح ہے۔ اگر وہ نہ ہوگی تو ظاہری رسوم کچھ کام نہیں آئیں گی، تصوف دراصل ان ظاہری رسوم کی روح اور جان ہے۔ تصوف کے ذریعہ ظاہری اعمال جو ہر حال میں مطلوب ہیں زندہ ہو جاتے ہیں۔ شیخ جنید تصوف کے اتنے معترف تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا کہ: ''میں سالوں ایسے لوگوں کے ساتھ رہا جو ایسے علوم میں بحث کرتے تھے جن کو میں سمجھتا تھا نہ جانتا تھا کہ وہ کیا ہیں، لیکن میں نے ان پر انکار نہیں کیا اور جو کچھ مجھے بتایا جاتا اس کو میں بغیر جانے بھی قبول کر لیتا تھا''۔

صوفیہ کرام نے بڑی وضاحت سے بار بار ذکر کیا ہے کہ تصوف شریعت اسلامی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، شریعت کے بہتر اتباع کا نام ہی تصوف ہے، ان کا خیال ہے کہ صرف اتباع سنت کا راستہ ہی ایسا راستہ ہے جس کے ذریعہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ تمام راستے مسدود ہیں۔ عبدالرحمٰن سلمی نے طبقات الصوفیہ میں لکھا ہے کہ شیخ جنید نے فرمایا کہ: مخلوق کے لیے تمام راستے مسدود ہیں، سوائے اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کا اتباع کیا جائے، جو اس طریقے کو لازم پکڑ لے تو اس کے لیے خیر کے تمام راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک اور مرتبہ فرمایا کہ: ہمارا یہ علم کتاب وسنت کے اصولوں سے مقید ہے۔ اور ایک مرتبہ فرمایا کہ ہمارا یہ علم کتاب وسنت سے مضبوط ہے، جو شخص راہ سلوک اختیار کرنے سے قبل قرآن نہ پڑھے، حدیث نہ لکھے اور فقیہ نہ ہو تو اس کی اقتدا جائز نہیں ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ: ہمارا یہ علم حدیث کے ذریعہ مستحکم ہے۔ تاریخ بغداد میں راوی نے لکھا ہے کہ شیخ جنید یہ بات اکثر کہا کرتے تھے۔

صوفیہ کرام اعمال شریعت جیسے نماز، روزہ، تلاوت اور حج و زکوٰۃ کو بطیب خاطر انجام دیتے تھے، نماز کے سلسلہ میں ایک عظیم صوفی حضرت جنید بغدادی نے فرمایا: ''ہر چیز کا ایک امتیاز ہوتا ہے اور نماز کا امتیاز تکبیر اولیٰ ہے۔'' شیخ سہروردی نے لکھا ہے کہ شیخ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ نیت کا مقام تکبیر اولیٰ ہے اور وہی نماز کی ابتدا ہے، اسی طرح روزہ کے بارے میں فرمایا کہ: ''روزہ نصف سلوک ہے''۔

صوفیہ کرام کو نمازوں میں خشوع وخضوع اور یکسوئی کا احساس اس قدر رہتا تھا کہ اگر نماز میں کوئی دنیاوی وسوسہ پیدا ہو جاتا تو اس نماز کو دوبارہ ادا کرتے تھے۔

احمد بن جعفر بن ہانی سے مروی ہے کہ انھوں نے شیخ جنید سے دریافت کیا: ''ایمان کی علامت کیا ہے''؟ شیخ نے جواب دیا: ''ایمان کی علامت یہ ہے کہ تو جس پر ایمان لایا ہے اس کی اطاعت کرے اور وہ کام کرے جو اس کو پسند ہوں اور جن سے وہ راضی ہو، نیز فانی اور زائل ہونے والی چیزوں سے تعلق منقطع کرلے''۔

عبادت صرف نوافل اور ذکر و اوراد کا نام نہیں ہے؛ بلکہ دلی کیفیات کا بھی نام ہے، دل میں اللہ کا خوف آخرت کی جوابدہی کا یقین اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور وفکر بھی عبادت ہے، شیخ جنید نے اس کو بھی عبادات میں شمار کیا ہے، اور اس کو ذکر خفی کہا ہے، فرماتے ہیں۔

شیخ جنید سے تصوف کے بارے میں پوچھا گیا، انھوں نے جواب دیا: دل کا مخلوقات کی محبت سے خالی ہونا، طبعی اخلاق (رذیلہ) سے جدائیگی اختیار کرنا، انسانی صفات کو بے اثر کرنا، نفسانی خواہشات سے اجتناب کرنا، روحانی صفات کا پیدا کرنا، علوم حقائق سے تعلق کرنا، جوابدی طور پر درست ہے اس کو اختیار کرنا، ساری امت سے خیر خواہی کرنا، حقیقتاً اللہ تعالیٰ سے عہد وفا استوار کرنا اور شریعت میں رسول اللہ کی سنت کی اتباع کرنا۔

اس بات کو شیخ جنید نے ایک اور جگہ اس طرح کہا کہ: ''ان کی خاموشی خوف خدا سے عبارت ہوتی ہے''۔

معلومات کی جانچ

1. تصوف کا لفظی معنی کیا ہے؟
2. اہل صفہ کن کو کہتے ہیں؟
3. ''تصوف ادب کا نام ہے'' یہ قول کس کا ہے؟
4. طبقات الصوفیہ کس کی تصنیف ہے؟

20.6 صوفیانہ فکر کا ارتقاء

پہلی صدی ہجری میں تصوف کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی تھی، اور دوسری صدی کے ختم تک بھی فناء و بقاء یا توحید وجودی وغیرہ اصطلاحات کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا، اور صوفیہ میں خرقہ پہننا، شطحات کا صدور، سکر و مدہوشی، جذب وانبساط، قبض وبسط وغیرہ کا رواج بھی تقریباً نہیں تھا، البتہ اسی عہد میں ایسے دواعی شروع ہوگئے تھے جو بعد میں مخصوص صوفیانہ فکر کا پیش خیمہ ثابت ہوئے اور تصوف کی اصل بنیاد انہی تصورات پر قائم ہوئی، ان میں سے ایک اہم تصور محبت الٰہی کا خاص تصور تھا، تصوف کی تاریخ میں لفظ ''محبت'' بڑی اہمیت کا حامل ہے، سلوک کا سفر ہی دراصل محبت الٰہی سے شروع ہوتا ہے، قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ سے محبت

کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، صوفیہ نے اس کو قبول کیا اور سلوک کی بنیاد اسی کو بنایا، لیکن صوفیہ نے محبت کو اس دائرے سے آگے بڑھایا جس کا ذکر قرآن میں ہے، قرآن میں محبت الٰہی کا طریقہ اور اظہار یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت کی جائے: ''قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعوانی یحببکم اللّٰہ'' (کہیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو)۔

صوفیہ نے اس کو آگے بڑھا کر عشق کے درجہ تک پہنچایا اور اس کو پیدا کرنے کے لیے ذکر و مراقبہ کا راستہ اختیار کیا۔ دوسری صدی میں اگر چہ اس کے خدوخال بہت واضح نہیں تھے لیکن محبت کے ساتھ عشق کا ذکر بھی ہوتا تھا۔

عبدالواحد بن زید نے حضرت حسن بصری سے ایک مرسل روایت بیان کی ہے جو حدیث قدسی کے انداز پر ہے، اس کا مفہوم یہ ہے: ''جب بندہ صرف میرے ساتھ مصروف ہو جاتا ہے تو میں اس کی نعمت اور لذت اپنے ذکر میں رکھ دیتا ہوں، اور جب اس کی لذت و نعمت میرا ذکر بن جاتا ہے تو وہ مجھ سے عشق کرنے لگتا ہے، اور میں اس سے عشق کرنے لگتا ہوں، اور جب وہ مجھ سے عشق کرنے لگتا ہے اور میں اس سے عشق کرنے لگتا ہوں تو اس کے اور میرے درمیان سے حجاب اٹھ جاتا ہے اور میں اس کی نظروں کے سامنے آجاتا ہوں''۔

یہ روایت محدثین کے نزدیک ثابت نہیں ہے؛ لیکن عبدالواحد جو اس کے راوی ہیں یہ ان کے فکر کی ترجمان ہے، انھوں نے ذکر کو محبت کا ذریعہ بتایا اور محبت کی غایت عشق الٰہی کو قرار دیا ہے، اور عشق کا نتیجہ حجابات کے مرتفع ہو جانے کو قرار دیا ہے۔

عبدالواحد بن زید کی یہ روایت واضح طور پر تصوف کے اس تصور کا نقطہ آغاز ہے جس کے زیر اثر بعد میں صوفیہ نے وحدۃ الوجود کا اثبات کیا اور بعض سے شطحات کا بھی صدور رہا۔

حضرت ابراہیم بن ادہم نے محبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ: اگر بندوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کیا ہے، تو کھانا پینا کم ہو جائے لباس پر توجہ کم ہو جائے، فرشتوں کو دیکھو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں تو صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں، حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے جب سے پیدا ہوئے یا تو سجدے میں ہیں یا قیام میں یا رکوع میں۔

ابراہیم بن ادہم نے ایک اور اہم بات کہی ہے کہ: ''اے اللہ تو جانتا ہے کہ اگر مجھے تیری محبت مل جائے تو پھر میرے نزدیک جنت کی قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگی''۔

یہ وہی بات ہے جو اس سے آگے بڑھ کر رابعہ العدویہ نے کہی تھی، رابعہ ابراہیم ادہم کی معاصر ہیں ان کا مشہور جملہ اکثر تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے کہ: ''میں چاہتی ہوں کہ جنت کو جلا دوں اور جہنم پر پانی ڈال کر اسے بجھا دوں؛ تاکہ لوگ بغیر کسی لالچ یا خوف کے خدا کی عبادت کریں''۔

دوسرا تصور جس کا اس دور میں آغاز ہوا وہ زہد کا ہے، زہد بھی صوفیہ کے بنیادی تصورات میں ہے، بے شمار آیات و احادیث میں دنیا و مافیہا سے زہد کی ترغیب دی گئی ہے، شیخ ابن قیم لکھتے ہیں کہ: ''قرآن دنیا میں زہد کی ترغیب اور دنیا کی بے قیمتی اور بے حیثیتی کے ذکر سے بھرا ہے'' زہد فی الدنیا کے موضوع پر مشتمل احادیث کا شمار ناممکن ہے۔ کتاب و سنت میں زہد کی بے حد فضیلت وارد ہوئی ہے، سلف نے زہد کے موضوع پر باضابطہ کتابیں لکھیں ہیں۔

ابراہیم بن ادہم کہتے ہیں کہ زہد تین طرح کا ہوتا ہے: زہد فرض، زہد فضیلت اور زہد سلامت، زہد فرض حرام چیزوں سے بچنا، زہد فضیلت حلال چیزوں سے اجتناب کرنا اور زہد سلامت، شبہات سے اجتناب کرنا۔ شقیق بلخی نے زہد کے بارے میں فرمایا کہ تین عادتیں زاہد کا تاج ہیں، ایک تو یہ کہ وہ خواہشات سے اعراض کرے نہ کہ خواہشات کی پیروی، دوسرا یہ کہ اپنے دل سے زہد کی راہ اختیار کرے اور تیسرا یہ کہ جب بھی خالی ہو اپنی قبر کو یاد کرے اور قیامت کے مناظر کو یاد کرے۔ زہد سے متعلق حضرت شقیق کے بہت سے اقوال ہیں، انھوں نے زہد کے لیے ایک اور لفظ استعمال کیا ہے اور وہ ہے لفظ قلت، ان سے پوچھا گیا کوئی شخص اصحاب قلت میں سے ہے یہ کیسے معلوم ہوگا؟ انھوں نے جواب دیا: جب کوئی شخص دنیا سے کوئی چیز اس طرح ڈر ڈر کر لے کہ اگر نہیں لے گا تو گناہگار رہوگا تو سمجھ لو کہ وہ اصحاب قلت میں سے ہے۔

شقیق بلخی کی تحریروں میں یہ عندیہ بھی واضح نظر آتا ہے کہ زہد میں درجہ بندی ہے اور کچھ زاہد دوسرے زاہدوں کے مقابلے میں زیادہ بلند مقام کے حامل ہیں، لکھتے ہیں:

> ''اللہ کے سب سے قریب زاہد وہ ہیں جو اللہ سے زیادہ ڈرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند زاہد وہ ہیں جن کے اعمال اچھے ہیں، اللہ کے نزدیک سب سے افضل زاہد وہ ہیں جو ان چیزوں کی طرف سب سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز زاہد وہ ہیں جو متقی ہیں، مکمل زہد والے وہ ہیں جن کے دل سخی ہیں اور جو اپنے سینوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور سب سے زیادہ کامل زاہد وہ ہیں جن کا یقین پختہ اور زیادہ ہے''۔

شقیق بلخی نے زاہد اور راغب کی تقسیم کرتے ہوئے ان کے درمیان بعد المشرقین قرار دیا ہے، فضیل بن عیاض نے بھی زہد کی فکر کو تقویت دی اور انھوں نے زہد کو قناعت کے ہم معنی قرار دیا، فرمایا: ہر خیر کی کنجی قناعت ہے اور قناعت دراصل غناء ہے۔ وہ دعا مانگا کرتے تھے کہ: اے اللہ! مجھے دنیا میں زاہد بنا چونکہ زہد ہی ہر خیر کی کنجی ہے اور اسی سے ہمارے تمام اعمال اور ہمارے دلوں کی اصلاح ہوگی۔

لفظ ''معرفت'' کا بھی مخصوص استعمال اس دور میں شروع ہوگیا تھا، معرفت کے معنی ہیں پہچاننا، صوفیہ کے یہاں معرفت سے مراد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی ہے، صوفیہ نے معرفت اور عارف کے الفاظ ایسی کیفیات کے لیے استعمال کیے ہیں جن میں سالک اپنا امتیاز اور تشخص ختم کر کے ذات واحد کے مشاہدہ میں غرق ہوجاتا ہے۔ ابتداء میں معرفت کا اطلاق صرف اس پر ہوتا تھا کہ بندہ رب کو پہچان لے اور اس کی جہالت دور ہوجائے، بعد میں یہ لفظ سالک کی مخصوص کیفیات کے لیے استعمال ہونے لگا۔

مالک بن دینار نے فرمایا کہ اہل دنیا نے ایک بہت ہی عمدہ چیز کو چکھا ہی نہیں، لوگوں نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔

شقیق بلخی نے معرفت پر بہت زور دیا ہے اور انھوں نے معرفت کو وہ رنگ عطا کیا جو تصوف کا امتیاز ہے، انھوں نے فرمایا کہ معرفت چار طرح کی ہوتی ہے:

(1) اللہ کی معرفت: یعنی یہ جاننا کہ اللہ کے سوا نہ کوئی فائدہ دے سکتا ہے اور نہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔

(2) معرفت نفس: یعنی یہ یقین رکھنا اور جاننا کہ تیرا نفس نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ فائدہ، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔

(3) امر اور نواہی کی معرفت: یعنی یہ جاننا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا تیری ذمہ داری ہے اور تیرا رزق اس کی ذمہ داری ہے اور اخلاص کے ساتھ بغیر کسی طمع یا لالچ کے عمل کرنا۔

(4) اللہ تعالیٰ کے اور اپنے دشمنوں کی معرفت: یعنی یہ جاننا کہ تیرا ایک دشمن ہے اور جب تک تو اس سے جنگ نہ کرے گا، تیری عبادتیں قبول نہ ہوں گی۔

صوفیہ کرام کے یہاں زہد، محبت اور معرفت کے ساتھ ''توکل'' کی بڑی اہمیت ہے۔

دراصل توکل ایک بڑی اسلامی خوبی ہے، قرآن پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، اور یہ کہ جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے اللہ اس کے لیے کافی ہے، حدیث میں بھی توکل کی بڑی فضیلت آئی ہے، صوفیہ نے ابتداء سے ہی توکل کے بارے میں کلام کیا ہے، توکل زہد سے وابستہ ہے، توکل کے بنا زہد کا تحقق نہیں ہوسکتا اس لیے زہد کی تعریف، اس کی دعوت اور اس کے تقاضے بیان کرنے کا لازمی مطلب توکل کی دعوت بھی ہے جو زہد کی روایت کے ساتھ ہی شروع ہوگئی۔

صوفیہ کے یہاں توکل کا مفہوم اپنی ابتداء میں وہی ہے جس کی طرف قرآن وحدیث میں دعوت دی گئی ہے، لیکن بعد میں یہ تصور ایک انتہاء کی طرف گامزن ہوا اور بہت سے نام نہاد صوفیہ نے اسقاط الوسائط کا نام توکل رکھ دیا، توکل کی تعریف کرتے ہوئے شقیق بلخی نے لکھا ہے: ''توکل یہ ہے کہ تیرا دل اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر مطمئن ہو جائے''۔

یہ وہ اہم تصورات ہیں جن کے تصوف کی تاریخ پر بڑے اثرات ہیں اور دوسری صدی میں ان کو ایک مخصوص امتیاز اور تشخص مل گیا تھا جو اگلی صدی میں پروان چڑھنے والے ایک پورے فکری منہاج کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

تیسری صدی میں تصوف کے اندر فلسفیانہ فکر کی آمیزش شروع ہوگئی اور معرفت اور محبت کے جو تصورات دوسری صدی میں پروان چڑھے تھے اس صدی میں ان کے اندر فلسفیانہ رنگ شامل ہوا اور ان کی الگ انفرادیت قائم ہوگئی، ڈاکٹر ابوالوفا الغنیمی التفتازانی نے لکھا ہے کہ تیسری صدی میں تصوف کے پانچ امتیازات قائم ہوئے:

1. اخلاق وسلوک 2. ذوقی معرفت 3. فناء اور اس کے مختلف معانی 4. طمانیت یا سعادت 5. اشاراتی زبان

بعد کے ادوار میں بھی تصوف کے یہ امتیازات قائم رہے۔

اسی کے ساتھ اس عہد میں تصوف کی فکر میں ایک اور مسئلہ زیر بحث رہا تھا، اور وہ تھا توحید کا مسئلہ، صوفیہ نے توحید کے اثبات اور توحید کی نوعیت پر اپنے صوفیانہ ذوق اور اشاراتی زبان میں گفتگو کی ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ فکری سطح پر تصوف کو جو چیزیں فقہاء اور محدثین کے عام منہاج سے ممتاز کرتی ہیں وہ صرف دو ہیں: ایک توحید دوسری فناء وبقاء۔

فناء اور بقاء کے تصور کا آغاز بھی تیسری صدی میں ہوا، اس صدی میں متعدد صوفیہ نے اپنے ذوق کے مطابق فناء کی تعریف کی اور بعض نے فناء کو حلول تک پہنچا دیا، مثلاً حلاج نے فناء کی اس طرح تشریح کی کہ وہ حلول کے مترادف ہوگئی، لیکن عام صوفیاء نے فناء کے اس تصور پر سخت نکیر کی اور ہر دور میں نظریہ اتحاد وحلول کا رد کیا۔

بعض صوفیہ جس کو خالص عشق الٰہی کہتے ہیں یعنی جنت کی خواہش اور جہنم سے خوف کے بغیر صرف اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا، یہ فکر دراصل اسی تیسری صدی میں پروان چڑھی، علی بن موفق البغدادی (۲۶۵ھ/۸۷۸ء) کے یہاں اس کا تذکرہ ملتا ہے، حالانکہ یہ فکر کسی نہ کسی شکل میں دوسری صدی کے اندر بھی موجود تھی جیسا کہ ذکر ہو چکا لیکن اس کو بعد میں فروغ ہوا۔

تصوف کی تاریخ میں یہ بھی ایک نئی فکر تھی جس کو ابتدائی عہد میں قبولیت نہیں ملی؛ لیکن بعد میں یہ فکر مختلف لوگوں میں مقبول ہوگئی، اس تصور نے دراصل دین اسلام کی ترجیحات کو متاثر کیا، چونکہ ایسی عبادت جس کا کوئی مقصد نہ ہو اور ایسی بندگی جس میں جنت کی طلب نہ ہو۔ ایسی خشیت جس میں خوف نہ ہو اور جہنم سے ڈرنے کا جذبہ نہ ہو، وہ بہر حال اسلام میں مطلوب نہیں ہے، پورا قرآن اور حدیث کا سرمایہ آخرت کے سود وزیاں پر مبنی ہے۔

اہل تصوف محبت کے اس تصور کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ اللہ سے محبت صرف اللہ کے لئے ہو، نہ صرف جنت کی لالچ یا جہنم کے خوف سے؛ کیونکہ بندوں کی محبت کا مستحق حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، اللہ کی محبت تمام ماسوی سے زیادہ ہونا ایمان کا مطلوب ہے، اس کے ذریعہ جہنم کے خوف اور جنت کی خواہش کی نفی مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف اس امر کا اثبات مطلوب ہے کہ اللہ کی محبت اور اس کی عبادت صرف اس کی ذات کے لئے اور اس کی رضاء کے حصول کے لئے ہے جو تمام غایات کی غایت ہے۔

اسی دور میں ابو سعید الخراز نے فناء وبقاء کے بارے میں گفتگو شروع کی اور ابو صالح حمدون القصار نے ملامتی مذہب اختیار کرلیا۔

شیخ جنید بغدادی کے استاد سری سقطی نے تصوف کی اشاعت اور اس کو دوسرے علاقوں تک پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا، ان کے ایک شاگرد موسیٰ انصاری نے مرو اور خراسان میں اور ابو علی روذباری نے مصر میں اور محمد بن عبد الوہاب الثقفی نے نیشا پور میں اس کی اشاعت کی۔

صوفیہ کی خانقاہوں کا ظہور بھی اسی صدی میں شروع ہوا، علامہ جامی کے ایک اندراج سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود شیخ جنید بغدادی نے بھی خانقاہ قائم کی تھی، لیکن اگر یہ روایت درست نہ ہو تب بھی ابراہیم مصری کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کے لیے خانقاہ قائم کی گئی تھی جس کو رباط کہا جاتا تھا۔ صاحب نفحات الأنس لکھتے ہیں کہ: پہلی خانقاہ ابو ہاشم صوفی نے رَلّہ (فلسطین) میں قائم کی، سفیان ثوری نے ان سے استفادہ کیا تھا۔ تیسری صدی سے پانچویں صدی کے درمیان تصوف کی تمام اصطلاحات کا رواج شروع ہوگیا تھا اور صوفیہ ان مخصوص اصلاحات میں گفتگو کرنے لگے تھے، جیسے وقت، مقام، حال، قبض، بسط، ہیبت، انس، تواجد، جمع، فرق، فناء وبقاء، غیبت وحضور، صحو اور سکر، محو واثبات، مستور وتجلی، کشف، مشاہدہ، لوائح، طوامع، لوامع، قرب وبعد، شریعت، حقیقت، طریقت وغیرہ۔

معلومات کی جانچ

1. زہد کا کیا معنی ہے؟
2. پہلی خانقاہ کہاں قائم کی گئی؟
3. معرفت کا لغوی معنی کیا ہے؟
4. ابراہیم بن ادہم کے نزدیک زہد کتنی طرح کا ہوتا ہے؟

20.7 تاریخی ادوار

تصوف کی تاریخ کو مختلف مؤرخین نے مختلف زمانوں میں تقسیم کیا ہے، عصر حاضر میں تصوف کے نامور محقق پروفیسر شاہد علی عباسی نے تصوف کے ارتقاء کو چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے، پہلا دور عہد صحابہ، دوسرا دور حضرت حسن بصری اور ان کے معاصرین و مسترشدین کا، تیسرا زمانہ نویں صدی عیسوی سے بارہویں صدی کا ہے جس میں تصوف کے بیشتر افکار اور ان کی امتیازی خوبیاں وجود میں آئیں، چوتھا زمانہ تصوف میں جذب وسلوک کے آغاز کا ہے، پانچواں دور تصوف کے سلاسل کے آغاز کا دور ہے۔ اور چھٹا دور پندرہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک کا ہے۔ یہ تقسیم بھی ایک اہم تقسیم ہے؛ لیکن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تصوف کے ادوار کو صرف چار ادوار میں بلکہ زیادہ صحیح تعبیر استعمال کریں تو چار الوان میں تقسیم کیا ہے۔

بعض مؤرخین نے تصوف کے ادوار کو اس طرح بیان کیا ہے:

تصوف کا پہلا دور: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجلہ صحابہ کا عہد

تصوف کے پہلے دور کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوتا ہے اور عہد صحابہ تک جاری رہتا ہے۔ اس دور کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں سالکین کی توجہ شریعت کے ظاہری اعمال پر زیادہ رہی، ان لوگوں کو باطنی زندگی کے تمام مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذریعہ ہی حاصل ہوتے تھے، چنانچہ ان بزرگوں کا احسان یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے، ذکر وتلاوت کرتے تھے، روزہ رکھتے تھے، حج کرتے تھے اور زکوٰۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے۔ یہ بزرگ خدا تعالیٰ سے قرب وحضور کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر واذکار کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے تھے، بے شک ان اہل کمال بزرگوں میں جو محقق ہوتے ان کو نماز اور ذکر واذکار میں لذت ملتی، اور قرآن مجید کی تلاوت سے متاثر ہوتے، مثلاً زکوٰۃ محض اس لیے نہ دیتے تھے کہ زکوٰۃ دینا خدا کا حکم ہے بلکہ خدا کے حکم کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی بخل کے روگ سے بچاتے، اور نیز جب وہ اپنے آپ کو دنیاوی کاموں میں منہمک پاتے تو انھیں اس کا احساس ہوتا، چنانچہ وہ دل کو کاروبار دنیا سے ہٹانے کے لیے زکوٰۃ دیتے اور اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام کو بجالانے میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ الغرض یہ بزرگ محض خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام ادا نہ کرتے؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی تھی، یہ بزرگ جنت کی خواہش رکھتے تھے اور جہنم سے خائف رہتے تھے، کشف وکرامات اور خوارق عادات بھی ان سے کم ہی ظاہر ہوتے تھے، سرمستی اور بے خودی کی کیفیت بھی ان پر شاذ ونادر ہی طاری ہوتی تھی، اور اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصداً نہیں، بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا تھا، شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں تصوف کا یہ دور ''احسان'' کا دور ہے، یعنی اس دور کا تصوف دراصل احسان تھا۔

تاریخ تصوف کا دوسرا دور: 61ھ سے تیسری صدی ہجری کے آغاز تک

تاریخ تصوف کا دوسرا دور تقریباً 61ھ یعنی حضرت حسن بصری کے عہد سے شروع ہوتا ہے اور تیسری صدی ہجری کے آغاز تک جاتا ہے۔

تقریباً دوسو برسوں پر محیط یہ دور تصوف کی تشکیل کا ابتدائی مرحلہ ہے، اس دور میں بنو امیہ کا پورا دورِ حکومت اور بنو عباس کا دور عروج شامل ہیں، اس دور کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تحریک تصوف نے نہ تو باضابطہ کوئی شکل اختیار کی تھی نہ ہی تصوف کی اصطلاحات وضع ہوئی تھیں، اس دوران حضرت حسن بصری، حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت مالک بن دینار وغیرہ ایسے بڑے بزرگانِ دین گزرے ہیں جنھوں نے اس زمانے میں مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی حد سے زیادہ دنیاداری سے نہ صرف بے زاری کا اظہار کیا بلکہ اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی، ان لوگوں نے خود کو امورِ دنیا اور حکمت کے کاموں سے دور رکھا، مسلمانوں کی اصلاح کی کوئی منظم اور بھرپور تحریک چلانے کے بجائے ان بزرگوں نے اپنے زمانے کے مخصوص سیاسی ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے، دنیا کے خراب ماحول سے خود کو الگ رکھا، گوشۂ عافیت میں عبادت وریاضت کو اپنا شعار بنایا، ان بزرگانِ دین پر خدا کا خوف ہر وقت غالب رہتا تھا۔

تیسرا دور: تیسری صدی کے آغاز سے چوتھی صدی کے نصف تک

تحریک تصوف کا دوسرا دور تیسری صدی ہجری کے بیشتر اور چوتھی صدی ہجری کے نصف اول پر محیط ہے، اگرچہ یہ زمانہ مسلمانوں میں فلسفے اور عقلیت سے مرعوبیت کا زمانہ ہے، مسلمانوں کے اندر ان علوم کے فروغ کے سبب عقائد و مذہب سے متعلق مختلف طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے تھے، اس دور کے بزرگانِ دین میں حضرت بایزید بسطامی حضرت ذوالنون مصری اور حضرت جنید بغدادی بہت زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن اس دور کے مسلم بزرگانِ دین نے مذہب اور اس کی تعلیمات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بجائے دل کی کیفیت پر زیادہ زور دیا، ان کے خیال میں انسان صراطِ مستقیم کی تلاش میں عقل کے گھوڑے دوڑانے کے بجائے اگر اپنے اندرون میں جھانک کر دیکھے تو زیادہ آسانی کے ساتھ راہِ راست پر گامزن رہ سکے گا۔ ان بزرگانِ دین نے یونانی وایرانی عقلیت پسندی کا مقابلہ عشقِ الٰہی سے کرنے کی کوشش کی۔

چوتھا دور: چوتھی صدی کے نصف سے پانچویں صدی تک

تحریک تصوف کا چوتھا دور چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی ہجری پر مشتمل ہے، یہ عباسی خلافت کا دورِ زوال ہے، اس دوران مسلم دنیا پورے طور پر انتشار کا شکار تھی، اس زمانے میں مسلم دنیا کے مختلف علاقوں میں ان کی چھوٹی چھوٹی خودمختار حکومتیں وجود میں آگئی تھیں جو اکثر اوقات باہم دست وگریبان بھی رہتی تھیں، آپسی اختلاف وانتشار اور خانہ جنگیوں کے اس دور میں تحریک تصوف کو مزید جلا ملی، اور اس نے دنیاداری کے خلاف دنیا بے زاری کی باضابطہ تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس دور کے صوفیہ میں ابونصر سراج، ابوطالب مکی وغیرہ مشہور ہوئے ہیں۔ تحریک تصوف کے اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اسی زمانے میں تصوف کی اصطلاحات مقبول ہونی شروع ہوئیں، اس زمانے میں صوفیہ کے حلقے اور گروپ وجود میں آئے اور بعض لوگوں نے صوفی تحریک کو ہی عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش کی۔ البتہ اس دور میں بھی باضابطہ صوفی سلسلوں کا آغاز نہیں ہوا تھا، اسی دور میں پہلی مرتبہ ایسی کتابیں منظرِ عام پر آئیں جن میں تصوف کے بنیادی تصورات ملتے ہیں، مثال کے طور پر شیخ ابونصر سراج کی تصنیف ''کتاب اللمع'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں صوفیاء کرام نے اصلاحِ باطن پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

پانچواں دور: پانچویں صدی سے ساتویں صدی تک

تحریک تصوف کا پانچواں دور چھٹی صدی ہجری اور ساتویں صدی ہجری پر مشتمل ہے، اس دور میں تصوف نے باضابطہ اور منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی اور یہ اپنے دور کے سماج کی اہم ضرورت بن گیا، چونکہ یہ دور بھی مسلم دنیا کا دور خلفشار ہے، اس میں مسلمانوں کی باہمی چپقلش اور کشمکش نے انھیں اتنا زیادہ کمزور کر دیا کہ منگولوں نے مسلم دنیا کے ایک بڑے حصے کو تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے بلاد و امصار کی ایسی تباہی نہ دیکھی تھی اور نہ ہی ان میں اتنے بڑے پیمانے پر ہلاکتیں ہوئی تھیں، اس خون خرابے نے مسلم دنیا میں مایوسی اور دنیا کی بے ثباتی کا ایک ایسا ماحول پیدا کیا جو تحریک تصوف کے لیے انتہائی سازگار تھا؛ لہٰذا تصوف اور صوفی خیالات کو مسلم دنیا میں سب سے زیادہ فروغ اسی زمانے میں حاصل ہوا، زیادہ تر صوفی سلسلوں کا قیام اسی زمانے میں عمل میں آیا اور اسی دوران وہ مسلم دنیا کے اطراف و اکناف میں پھیلے۔ اس دور کے صوفیاء میں مولف رسالہ قشیریہ شیخ ابوالقاسم قشیری، فارسی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب ''کشف المحجوب'' کے مصنف شیخ علی ہجویری، سلسلہ قادریہ کے بانی اور فتوح الغیب کے مولف سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی، صاحب احیاء العلوم امام محمد الغزالی، فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ جیسی تصوف کی بنیادی کتابوں کے مصنف شیخ محی الدین ابن عربی، بانی سلسلہ سہروردیہ اور عوارف المعارف جیسی تصوف کی معرکۃ الآراء کتاب کے مصنف حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی زیادہ مشہور ہیں۔ اسی دور میں تصوف کو سب زیادہ عوامی مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ ایک ایسے وقت میں جب مسلمانوں کا سیاسی نظام پورے طور پر بکھر چکا تھا اور ان کی سیاسی وحدت پارہ پارہ ہو چکی تھی، یہ صوفیاء کرام اور ان کی جماعت تھی جس نے مسلم معاشرے کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگانے کا بیڑہ اٹھایا، اس کے اندر اصلاح و درستی کی تحریک کو آگے بڑھایا اور صوفی سلسلوں کے باضابطہ قیام کے ذریعے ایک ایسا روحانی نظام جاری کیا جس میں مرید کی اصلاح و تربیت کی اور اس کو معاشرہ کا ایک بہتر فرد بنانے کی سعی کی گئی۔

اسی عہد میں صوفیہ کے مختلف سلسلے قائم ہوئے جن کی وجہ سے تصوف باضابطہ ایک نظام بن گیا، اس عہد میں قائم ہونے والے چند اہم صوفی سلسلے حسب ذیل ہیں:

1. سلسلہ قادریہ - بانی حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی
2. سلسلہ سہروردیہ - بانی حضرت ضیاء الدین ابونجیب عبدالقاہر سہروردی اور ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردی
3. سلسلہ چشتیہ - بانی خواجہ ابواسحاق چشتی
4. سلسلہ نقشبندیہ - بانی خواجہ بہاؤ الدین محمد نقشبند
5. سلسلہ رفاعیہ - بانی سید احمد الرفاعی
6. سلسلہ شاذلیہ - بانی ابوالحسن علی الشاذلی
7. سلسلہ فردوسیہ - بانی شیخ الاسلام نجم الدین کبریٰ

تصوف کی تاریخ کا چھٹا دور: ساتویں صدی سے تا حال

تصوف کے سلاسل قائم ہو جانے کے بعد تصوف محض طریقہ تربیت نہیں رہا؛ بلکہ باضابطہ ایک نظام بن گیا اور نظام کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خرابیاں بھی اس میں در آئیں، مختلف سلاسل کے بعض افراد میں باہم نبرد آزمائی کا آغاز ہوا، ہر سلسلے کے اندر بھی ان کے کچھ متبعین میں اختلافات رونما ہوئے اور یہ سلسلے مزید تقسیم ہوتے گئے، جن میں بیشتر وقت کی گرد بن گئے اور تاریخ کا حصہ بن گئے، بہت سے ابھی بھی موجود ہیں، اس کے درمیان بعض جلیل القدر صوفیہ جن میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی زیادہ مشہور ہیں، اور بعض دوسرے صوفیہ نے اس کی گنجائش نکالی کہ ایک ہی سالک بیک وقت کئی سلسلوں سے وابستہ ہوسکتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1. شاہ ولی اللہ نے تصوف کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا ہے؟
2. تصوف کا دوسرا دور کب سے شروع ہوتا ہے؟
3. مسلمانوں کی عقلیت سے مرعوبیت تصوف کے کس دور کی خصوصیت ہے؟
4. سلسلہ فردوسیہ کا بانی کون ہے؟

20.8 اہم اصطلاحات تصوف

اتصال :وصل خداوندی جو ذات واحد کے ساتھ انتہائی قرب کی حالت ہے۔

احدیت :ذات باری تعالیٰ کا وہ مرتبہ جہاں وہ تعینات سے بلند ہوتی ہے۔

اختیار :اختیار حق کو اپنے اختیار پر مقدم جاننا۔

اخلاص :مخلصانہ اور بے لوث عبادت کرنا۔

ارادت :کسی کا مرید ہونا، کسی سے عقیدت کا تعلق رکھنا۔

ازل :جس کی ابتداء نہ ہو۔

استتار :اللہ تعالیٰ کا خود کو چھپانا اس کی ضد تجلی ہے۔

استدراج :مخالف شریعت کسی خرق عادت کا ظاہر ہونا۔

اعتبارات :مفروضات یا عقلی تفہیم کے اعتبارات، جن کے ذریعے کسی بات کی تفہیم کرائی جائے۔

اشتیاق :عشق دوامی۔

اعیان :علمی صورتوں کا نام ہے۔

اعیان ثابتہ :موجودات یعنی وجود محض نے عدم محض پر اپنا عکس ڈالا تو چیزیں موجود ہو گئیں، یہ اعیان ثابتہ کہلاتی ہیں۔

القاء :ذھن میں کوئی بات ڈالنا۔

امر :اس کا مطلب ہوتا ہے حکم یا معاملہ' اصطلا حا اللہ تعالیٰ کے احکام کو امر کہا جاتا ہے۔

ایمان بالغیب :ماورائی حقائق پر بغیر دیکھے ایمان لانا۔

بارقہ :سالک پر ظاہر ہونے والی پہلی تجلی۔

برزخ :درمیانی حالت، یا تصور شیخ کا مرحلہ۔

بسط :اس کے معنی ہیں کھلنا، وسیع ہونا۔صوفیہ کی اصطلاح میں خوشی، مسرت، فرحت اور انبساط کی کیفیت کو بسط کہتے ہیں۔اس کی ضد قبض کہلاتی ہے۔

بعدوقرب :ذات حق کے مشاہدہ سے دوری کو بعد اور قربت کو قرب کہتے ہیں۔

بیعت :اس عہد کو کہتے ہیں جو ایک مرید اپنے مرشد سے اس کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کرنے کے لیے کرتا ہے۔

پاس انفاس :سالک کا اپنے سانسوں پر نظر رکھنا۔اس کی مختلف قسمیں ہیں جو شغل پاس انفاس کہلاتی ہیں۔اور تصوف کے طریقوں میں الگ الگ ہیں۔

پیر :مرشد، رہنما، سالک جس کے ہاتھ پر بعیت کرتا ہے اور جسکی نگرانی میں راہ سلوک طے کرتا ہے۔ پیر کی تین قسمیں ہیں: (1) پیر صحبت (2) پیر تعلیم (3) پیر خرقہ۔

تجلی :ذات الٰہی کا جلوہ، اس ذات کا یا اس کی صفات کا مختلف صورتوں میں ظاہر ہونا۔

تجلیہ :دل کا انوار ربوبیت سے بھر جانا۔

تحلیہ :ظاہر کا انوار باطن سے مزین ہو جانا۔

تخلیہ :دل کا غیر اللہ سے خالی ہونا۔

توحید :اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا۔تصوف کی اصطلاح میں لفظ توحید جس طرح اللہ تعالیٰ کو ایک جاننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس طرح بعض کے نزدیک وحدت وجود کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

توحید فعلی :یہ شہود یا اعتقاد کہ ہر فعل کا فاعل اللہ ہے۔

ثبات :سالک کا سفر سلوک طے کرنے کے بعد معبود حقیقی سے واصل ہو جانا، ابدی سکون۔

ثبوت :دوام، علم میں کسی چیز کا ثابت کرنا۔

جذب :جذب کے دو معنی ہیں: ایک سالک کا خدا کی ذات میں گم ہو کر اپنی انفرادیت اور تشخص کو ختم کر دینا، اور دوسرا معنی ہے: خدا کا بندے کو اپنی طرف کھینچنا۔

جمال :تجلی حق کو جمال کہتے ہیں۔

جمع :وصل و اتحاد، وہ کیفیت جس میں سالک خدا کے ساتھ متصل ہو جاتا ہے اور دوئی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

جمع الجمع :اس کے معنی ہیں جمع کی بھی جمع' سلوک میں جمع کی حالت کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

چلہ معکوس :بعض صوفیہ سر نیچے کر کے کنویں میں لٹک جاتے تھے، بالعموم صوفیہ نے اس کو پسند نہیں کیا۔

اکائی 21 : نمائندہ صوفیاء

اکائی کے اجزاء

21.1 مقصد

اس اکائی میں تاریخ اسلامی کے ان اکابر صوفیہ کا تعارف کرایا گیا ہے جنہوں نے تصوف کو تشکیل اور ارتقاء کے مراحل سے گزارا، اس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کے سامنے اجلہ صوفیہ کی شخصیت کا تعارف آجائے، ان کے بنیادی افکار اور تاریخ تصوف میں ان کے مقام ومرتبہ سے واقفیت ہوجائے۔

21.2 تمہید

اس اکائی میں ابتدائی عہد کے اجلہ صوفیہ کے احوال وکوائف، ان کی بنیادی تعلیمات اور ان کے افکار کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ طلبہ کے سامنے ایک نظر میں تصوف کے ارتقاء کے عوامل اور اس ارتقاء میں جن لوگوں کا اہم کردار رہا ہے ان کا تعارف آجائے۔

21.3 حسن بصری (642-728ء)

حضرت حسن بصری صوفیہ کے درمیان بڑی مرکزی شخصیت ہیں، ابونعیم نے بھی ان کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا ہے اور ان کا کلام بھی جمع کیا ہے، حسن بصری کے یہاں اگرچہ علم القلوب والخواطر کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے لیکن ان کا زور استدلال عقل پر ہے، اور وہ اپنے مواعظ میں لوگوں کو عقلی اور شعوری زہد وعبادت کی دعوت دیتے ہیں، اس طرح گویا ان کے یہاں زہد کے ساتھ کلام کی روایت بھی برابر موجود ہے، حسن بصری کو صوفیہ اپنا سرخیل مانتے ہیں، صوفیہ کے اکثر سلاسل حسن بصری کی ذات میں مجتمع ہوجاتے ہیں۔ اس لیے ان کا تذکرہ ذرا تفصیل سے کرنا مناسب ہوگا۔

حسن بصری کی اصل کے بارے میں بہت سے اقوال مروی ہیں جن کے ذکر کی زیادہ افادیت نہیں ہے، ان کی ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی، بڑے ہوکر آپ جہاد میں شریک ہوئے اور کابل اور زابلستان کے علاقے میں جنگوں میں شرکت کی، ایک عرصہ تک خراسان میں بدیع بن زیاد الحارثی کے کاتب رہے، کچھ عرصہ قاضی بھی رہے۔ پھر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور وعظ ونصیحت اور تعلیم وتعلم کے لیے یکسو ہوگئے۔

حسن بصری بڑے زبردست عالم اور مفسر قرآن تھے، تفسیر میں ان کی آراء خصوصی اہمیت سے نقل کی جاتی ہیں؛ لیکن ان کا اصل میدان پند ونصیحت ہے، انہوں نے بہت وعظ کہے، ان کے متعدد اقتباسات مختلف کتابوں جیسے حلیۃ الاولیاء، کشف المحجوب، آداب الحسن البصری وغیرہ میں منقول ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے نام ان کے بہت سے خطوط محفوظ ہیں جن میں ان کی وعظ ونصیحت لکھی ہیں۔

ان کے مواعظ ونصائح حکمت سے پر ہیں، زبان پر ان کو بڑی قدرت تھی، بصرہ میں خصوصاً اور عام مسلمانوں پر عموماً ان کے بڑے اثرات تھے، فتنوں کے موقعے پر انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی اور بہت سے قتل وخون کو ٹالا، بدلتے ہوئے سیاسی منظرنامے کی وجہ سے وہ سیاست سے کنارہ کش ہوگئے تھے اور لوگوں کو بھی اسی کی تعلیم دیتے تھے، ان سے ایک مرتبہ کسی نے یزید بن

مہلب کے فتنے کے بارے میں پوچھا کہ اس فتنے میں مسلمان کیا کریں، انہوں نے جواب دیا کہ دونوں گروہوں میں سے کسی کا بھی ساتھ نہ دیں۔ لوگوں نے کہا کہ امیرالمومنین کا بھی ساتھ نہ دیں؛ تو بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ ہاں امیرالمومنین کا بھی ساتھ نہ دیں۔ یعنی اس فتنے کے موقعے پر سیاست سے مکمل علاحدگی اختیار کرلیں۔

وہ فرماتے تھے کہ اپنی دنیا آخرت کے بدلے فروخت کردو، یہ نفع کا سودا ہے، اپنی آخرت دنیا کے عوض فروخت مت کرو کیوں کہ اس میں دونوں جگہ گھاٹا ہے۔ اسلام کے بارے میں فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ باطن میں آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کے لیے جھک جائے اور ظاہر میں مسلمان اور معاہد اس سے محفوظ رہیں۔ انہوں نے فقہاء پر بھی تنقید کی ہے، عمران القصیری سے مروی ہے کہ انہوں نے حسن بصری سے کوئی بات دریافت کی اور ان کو بتایا کہ اس میں فقہاء کی رائے یہ ہے۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ کیا تم نے کسی فقیہ کو دیکھا ہے؟ فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو دنیا میں زہد کا رویہ اختیار کرے، اپنے دین کی نگرانی کرے اور ہمیشہ اپنے رب کی عبادت میں لگا رہے۔

ابوطالب مکی نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے: ''اس کو مسلمانوں کے اموال کا لالچ نہ ہو اور ان کی جماعت کی خیرخواہی مطلوب ہو''۔

انہوں نے معاصر فقہاء پر تنقید کی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے معیار مطلوب کے مطابق فقیہ تھے، چنانچہ سفیان بن عیینہ سے ایوب سختیانی نے کہا کہ اگر تم حسن بصری کو دیکھ لیتے تو کہتے کہ تم نے آج تک کسی فقیہ سے ملاقات ہی نہیں کی۔

تزہد/تصوف کی روایت کو قائم کرنے اور اس کے لیے بنیاد فراہم کرنے میں حسن بصری کا کردار وہی ہے جو تصوف کو تشکیل دینے میں شیخ جنید کا ہے، ابوطالب مکی نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> سب سے پہلے اس علم کی بنیاد حسن بصری نے رکھی، اور اس میں زبان کھولی، اس کے معانی پر کلام کیا، اس کے انوار ظاہر کیے، وہ اس میں ایسی گفتگو فرماتے تھے جیسی کسی سے نہیں سنی گئی۔ اس عہد میں لفظ تصوف بطور گروہی علامت کے استعمال نہیں ہوا۔ البتہ اون پہننے کا رواج شروع ہو چکا تھا اور عیسائی راہب بھی بالعموم یہی لباس پہنتے تھے، لیکن مسلمانوں میں اکثر زہاد اس لباس کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ زہاد کے سردار خواجہ حسن بصری نے مالک بن دینار کو اونی کپڑا پہنے ہوئے دیکھا تو کہا کہ یہ لباس تم کو کیوں پسند ہے؟ یہ اون تمہارے جسم پر آنے سے قبل کسی بھیڑ کے جسم پر رہی ہوگی۔ یعنی محض لباس کوئی امتیازی وصف نہیں ہے۔

صوفیہ کرام حضرت حسن بصری کے واسطہ سے حضرت علی کے ساتھ جو راویت ملاتے ہیں اگرچہ سَنَد کے اعتبار سے وہ معتبر نہیں ہے، شاہ ولی اللہ اور دوسرے محدثین نے ان دونوں کے لقاء کو تسلیم نہیں کیا ہے؛ لیکن وہ روحانی روایت جو حضرت علی کی ولایت اور حضرت حسن بصری کی ولایت کے درمیان ہے اس کے لیے کسی ظاہری سند کی ضرورت بھی نہیں ہے، اس لیے صوفیہ کی روایت اگرچہ سنداً ثابت نہیں ہے لیکن معنوی اعتبار سے وہ ثابت ہے، اور اسی معنوی نسبت سے تصوف کے سلاسل حضرت علی کے واسطہ سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک جاتے ہیں۔ جمہور صوفیہ دونوں کے لقاء کے قائل ہیں۔

چونکہ حضرت حسن بصری کے زمانے میں زہد کی روایت تھی اور اونی لباس پہننے کا رجحان پوری طرح رواج نہیں پایا تھا؛ اس لیے حضرت حسن بصری نے اونی لباس نہیں پہنا، بلکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اونی لباس پر تنقید بھی کی؛ لیکن ان کی تنقید کا مقصد یہ تھا کہ

لوگ صرف ظاہری لباس کو ہی سب کچھ نہ سمجھ لیں، اصل اہمیت لباس کی نہیں عمل کی ہے، لباس تو صرف ایک شکل ہے، اگر دل روحانیت سے خالی ہوتو اونی لباس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اگر صرف اون کے اندر کوئی خوبی ہوتی تو اس کا اظہار پہلے بھیڑ کے اندر ہونا چاہیے تھا؛ چونکہ انسان کے جسم پر آنے سے قبل یہ اون کسی بھیڑ کے جسم پر رہی ہوگی۔

حضرت حسن بصری کی چند نصیحتیں یہ ہیں:

انہوں نے ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ساتھ ہے تو کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، اور اگر اللہ ساتھ نہیں تو پھر امید کس سے وابستہ کی جائے۔

ایک دفعہ بعض افراد نے حضرت سے عرض کیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مخلوق کو نصیحت اس وقت کرنی چاہیے جب انسان خود صاحب عمل ہو جائے اور اس میں کوئی کمی نہ رہے۔ حضرت حسن . ری نے جواب دیا کہ دراصل شیطان انسان کے دل میں وساوس ڈال کر اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے باز رکھنا چاہتا ہے۔

21.4 رابعہ بصریہ (717-801ء)

حضرت رابعہ بصریہ، بصرہ کی رہنے والی تھیں اور آل عتیک کی آزاد کردہ باندی تھیں، سفیان ثوری رحمۃ اللہ ان سے مسائل دریافت کرتے تھے، ان کی باتوں پر بھروسہ کرتے تھے اور ان سے نصیحت سنتے تھے اور دعا کرانے کے متمنی رہتے تھے، رابعہ کے علوم وحکمت کو سفیان ثوری اور شعبہ نے روایت کیا ہے۔

جعفر بن سلیمان سے روایت ہے کہ سفیان الثوری نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا: مجھے ادب سکھانے والی کے پاس لے چلو جس سے جدا ہو کر مجھے راحت نہیں ملتی۔ جب ہم رابعہ کے پاس گئے تو سفیان نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا: اللھم انی اسئلک السلامۃ۔ تو رابعہ رونے لگیں، انہوں نے پوچھا آپ کیوں رونے لگیں تو جواب دیا کہ: مجھے آپ نے رُلایا ہے۔ پوچھا: وہ کیسے؟ فرمایا آپ کو معلوم ہے کہ سلامتی یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اسے چھوڑ دیا جائے، اور یہ ہو نہیں سکتا چونکہ لوگ دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

شیبان الابلی کہتے ہیں کہ میں نے رابعہ کو کہتے سنا کہ ہر چیز کا ایک پھل ہوتا ہے اور معرفت کا پھل اعتراف ہے۔ یہی راوی یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا: میں استغفار میں قلت صداقت سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔

ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا: رسول اللہ سے تمھاری محبت کا کیا عالم ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے؛ لیکن مجھے خالق کی محبت نے مخلوق کی محبت سے پھیر رکھا ہے۔ حضرت رابعہ نے ایک دن رباح کو دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے بچے کو بوسہ لے رہے ہیں، حضرت رابعہ نے پوچھا: کیا تم اس بچے سے محبت کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ حضرت رابعہ نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتی تھی کہ غیر اللہ کی محبت کے لیے آپ کے دل میں کوئی جگہ ہے، تو رباح بے ہوش ہو کر گر پڑے، جب ہوش میں آئے تو کہا: ''بلکہ یہ تو رحمت ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔''

جعفر سے روایت ہے کہ محمد بن واسع رابعہ کے پاس گئے، وہ جھوم رہی تھیں، انہوں نے پوچھا: آپ کیوں جھوم رہی ہیں؛ انہوں نے جواب دیا کہ: میں رات اپنے رب کی محبت میں مدہوش ہو گئی تھی، جب صبح ہوئی تو میں اس کے خمار میں ہوں۔

حضرت سفیان ثوری نے حضرت رابعہ سے پوچھا کہ بندے کو اس کے رب سے قریب کرنے والی چیز کیا ہے؟ تو حضرت رابعہ رونے لگیں اور فرمایا کہ مجھ جیسی سے یہ سوال کیا جا رہا ہے۔ پھر جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والی چیز یہ ہے کہ اللہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ بندہ دنیا و آخرت میں اس کے سوا کسی چیز سے محبت نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا: ہائے غم! حضرت رابعہ نے کہا: جھوٹ مت بولو، یہ کہو: ہائے غم کی کمی! چونکہ اگر تم سچ مچ غم زدہ ہوتے تو یہاں آرام سے نہ رہتے۔

حضرت رابعہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میرا غم یہ نہیں ہے کہ مجھے غم ہے، بلکہ میرا غم یہ ہے کہ مجھے غم ہی نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت رابعہ کا گذر بصرہ میں ایک آدمی کے پاس سے ہوا جس کو بدکاری کے جرم میں سزا دی گئی تھی۔ حضرت رابعہ نے فرمایا کہ اس زبان پر میرے ماں باپ قربان ہوں جس سے تو ''لا الہ الا اللہ'' کہتا تھا (یعنی تیرے عمل نے تیرے قول کو باطل کر دیا)۔

ایک مرتبہ صالح مری نے ان کے سامنے کہا کہ جو دروازہ کھٹکھٹائے گا اس کے لیے دروازہ کھل جائے گا، انہوں نے جواب میں کہا کہ دروازہ تو کھلا ہوا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ کون اس میں داخل ہوتا ہے۔

حضرت رابعہ بصریہ کے یہ وہ حالات ہیں جو ابوعبدالرحمٰن السلمی نے ذکر النسوۃ الصوفیات المتعبدات میں لکھے ہیں، اس کے علاوہ حضرت رابعہ کے بارے میں مستند معلومات نہیں ہیں، حالانکہ حضرت رابعہ کا تذکرہ بعد کے بہت سے مصنفین نے کیا ہے؛ لیکن ان کے پیش نظر تذکرۃ الاولیاء (فریدالدین عطار) ہے، جس میں عام طور پر غیر محتاط واقعات نقل کیے گئے ہیں۔

حضرت رابعہ بصریہ کے سلسلہ میں ایک مشکل اور بھی ہے، وہ یہ کہ رابعہ نام کی متعدد خواتین ہیں؛ تذکرہ نگاروں نے ان خواتین کو آپس میں خلط ملط کر دیا ہے۔ ابوعبدالرحمٰن السلمی نے اپنی کتاب میں رابعہ نام کی چار صوفی خواتین کا ذکر کیا ہے جبکہ علامہ جامی نے نفحات الانس میں دو رابعہ نام کی خواتین کا تذکرہ ہے، ایک رابعہ العدویہ اور دوسری رابعہ الشامیہ جو احمد بن ابی الحواری کی اہلیہ تھیں۔ امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں رابعہ العدویہ اور رابعہ بنت اسماعیل دونوں میں التباس کر دیا ہے، ابوعبدالرحمٰن السلمی نے رابعہ کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ آل عتیک کی آزاد کردہ باندی تھیں، والد کا نام یا خاندان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا؛ البتہ ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ ابوعبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ رابعہ العدویہ اور رابعہ الشامیہ دونوں کے والد کا نام اسمٰعیل ہے؛ لیکن ابو عبدالرحمٰن کی مطبوعہ کتاب میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔

صوفی خواتین میں سب سے مشہور اور بڑا نام حضرت رابعہ بصریہ کا ہے، ان پر مستقل کتابیں موجود ہیں، اردو، عربی اور انگریزی میں کئی تحقیقی کتابیں لکھی گئیں، بلکہ قدماء میں ابن الجوزی نے ایک مستقل کتاب تصنیف بھی جس کا تذکرہ انہوں نے صفۃ الصفوۃ میں کیا ہے۔ لکھا ہے:

> **قد اقتصرت ههنا على هذا القدر من اخبار رابعة؛ لانى قد افردت لها كتابا جمعت فيه كلامها و اخبارها .**
>
> (یہاں میں نے رابعہ کے صرف اتنے ہی حالات لکھے ہیں اس لئے کہ میں نے اس کے احوال کے بارے میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے)۔

لیکن زیادہ تر کتابوں میں استناد کا مسئلہ ہے، بہر حال مختلف کتابوں میں ان کی کچھ مناجات اس طرح لکھی ہیں:

رابعہ بصریہ نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ نماز و دعا میں گزار دیا، جب وہ سو جاتیں تو اٹھ کر اپنے نفس کو لعنت ملامت کرتیں کہ وہ اتنی دیر مولی سے کیسے غافل رہیں، جب عشاء کی نماز سے فارغ ہوتی تو چھت پر چڑھ جاتیں، قمیض اور دوپٹہ لپیٹ لیتیں اور کہتیں:

''پروردگار ستارے روشن رہ گئے۔ لوگ سو گئے، بادشاہوں نے دروازے بند کر لیے ہر حبیب اپنے حبیب سے محو خلوت ہے اور میں یہاں تیرے سامنے کھڑی ہوں...''۔

پھر ساری رات نماز پڑھتی رہتیں حتی کہ فجر ہو جانے پر تلاوت کلام پاک میں مصروف ہو جاتیں، اور جب روشنی پھیل جاتی تو اس طرح مناجات کرتیں:

''اے خدا رات گزر گئی دن آ گیا، کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ تو نے میری عبادت قبول کر لی یا رد کر دی، تیری عزت کی قسم، میرا یہی طریقہ رہے گا جب تک تو مجھے جواب نہیں دے گا یا میری مدد نہ کرے گا قسم ہے تیری عزت کی اگر تو مجھے اپنے دروازے سے دھتکار بھی دے گا تو میں نہ ٹلوں گی؛ کیونکہ میرے دل میں تیری محبت گھر کر گئی ہے''۔

رابعہ پر جب نیند غالب آ جاتی اور وہ ذرا سو جاتیں تو فوراً جاگ اٹھتیں، ڈری ہوئی، گھبرائی ہوئی، اللہ سے دعائیں مانگتی ہوئی پھر وہ اس طرح سے فریاد کرتیں:

''لوگ سو گئے، غافل مدہوش ہو گئے اور رابعہ بے چاری تیرے سامنے کھڑی ہے، تیری نگاہ اسے سونے نہیں دیتی، قسم ہے تیری عزت و حرمت کی نہ میں دن میں سوؤں گی اور نہ رات میں مگر یہ کہ نیند غالب آ جائے حتی کہ تجھ سے آ ملوں''

حضرت رابعہ بصریہ کی مناجات اور ان کے اشعار کافی مشہور ہیں؛ لیکن ان کی زیادہ تر چیزوں کا ان کی طرف استناد ثابت نہیں ہے، وداد السکاکینی نے ان کی بہت سی مناجات نقل کی ہیں۔

21.5 شقیق بلخی (م 810ء)

شقیق بلخی خراسان کے رہنے والے تھے اور قبیلہ ازد سے نسبی تعلق تھا؛ اس لیے الازدی کہلاتے تھے، ابتداً یہ بہت دولت مند آدمی تھے، ان کے پوتے علی بن محمد بن شقیق روایت کرتے ہیں کہ ان کے دادا شروع میں بہت امیر تھے، ان کے پاس تین سو گاؤں کی جاگیر تھی، تجارت بھی کرتے تھے اور تجارت کے سلسلے میں مختلف علاقوں کے اسفار بھی کرتے تھے، تصوف اور زہد کی طرف ان کی طبیعت کے میلان کے سلسلے میں کئی واقعات ملتے ہیں، ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ وہ تجارت کے سلسلے میں ''ترکوں'' کے علاقے میں گئے ہوئے تھے، جہاں ان کا قیام تھا وہاں کے لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ شقیق ان کے معبد میں گئے، وہاں دیکھا کہ اس مذہب کا پیشوا سر اور داڑھی کے بال منڈوائے ہوئے سرخ ارغوانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہے، شقیق نے اس سے کہا کہ یہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ غلط ہے، ان چیزوں کا بھی اور تمہارا بھی ایک خالق ہے ایک بنانے والا ہے اور کوئی اس جیسا نہیں، دنیا و آخرت اسی کی

ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کو رزق دینے والا ہے۔ معبد کے خادم نے کہا کہ تمہارے قول اور عمل میں تضاد ہے۔ شقیق رحمۃ اللہ نے پوچھا کیسے؟ اس نے جواب دیا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھارا ایک خالق و رازق ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، حالاں کہ تم طلب رزق میں یہاں آئے ہوئے ہو، اگر آپ اپنی بات میں صادق ہوتے تو جو تمہیں رزق دے رہا ہے وہ وہاں بھی دیتا اور تم مصیبت سے بچے رہتے، شقیق فرماتے ہیں کہ میرے زہد کا سبب اس ''ترکی'' کا یہ کلام ہے، اس کے بعد شقیق واپس آئے اور سارا مال و منال صدقہ کر کے طلب علم میں لگ گئے۔

شقیق بلخی کے استاد ابراہیم بن ادھم تھے، لیکن مصادر کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شقیق نے زہد اور تصوف کی طرف مائل ہونے کے بعد ابراہیم بن ادہم کی صحبت اختیار کی تھی، ابن الملقن نے یہ قصہ اس طرح لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شقیق حج کو گئے، وہاں ابراہیم سے ملاقات ہوئی - ابراہیم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ طریقہ کہاں سے سیکھا: شقیق نے بتایا کہ ایک مرتبہ میں تجارت کے لیے جا رہا تھا ایک جگہ میں نے ایک چڑیا دیکھی جس کے پنکھ ٹوٹے ہوئے تھے اور ایک ویران جگہ پڑی تھی، میں نے سوچا کہ میں یہ دیکھوں کہ اس کو کہاں سے کھانا ملتا ہے، اسی اثنا میں ایک دوسری چڑیا آئی اس کی چونچ میں دانا تھا اس نے وہ دانہ اس چڑیا کی چونچ میں رکھ دیا، مجھے اس نظارے سے عبرت حاصل ہوئی اور میں نے کمانا چھوڑ دیا اور عبادت میں لگ گیا۔ ابراہیم بن ادھم نے یہ سن کر شقیق سے کہا کہ تم نے وہ چڑیا بننا پسند کیوں نہیں کیا جس نے اس پر بریدہ چڑیا کو دانا دیا تھا، اس طرح تم اس سے افضل ہو جاتے، کیا تم نے سنا نہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے افضل ہوتا ہے'' (حدیث، مسند احمد)، مومن کی علامت یہ ہے کہ وہ ہر معاملہ میں دو درجوں میں سے اعلیٰ درجہ کا انتخاب کرے، اس طرح وہ ابرار کے درجے کو پہنچ جاتا ہے، شقیق نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو بوسہ دے کر کہا کہ آپ ہمارے استاد ہیں۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم بن ادھم سے شقیق کی ملاقات اور صحبت بہت طویل نہ رہی ہوگی؛ چونکہ اس کے بعد ابراہیم بن ادہم شام چلے گئے تھے اور شقیق کے شام جانے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا؛ دوسری بات یہ ہے کہ یہ ملاقات اس وقت کی ہے جب شقیق بلخی خود راہ تصوف اختیار کر چکے تھے اور لوگوں میں یک گونہ شہرت بھی حاصل کر چکے تھے۔

شقیق بلخی کے بارے میں عام طور پر تذکرہ نگاروں نے یکے از مشاہیر مشائخ خراسان اور کبار مشائخ خراسان جیسے الفاظ لکھے ہیں، ان کے مریدین اور مسترشدین میں حاتم اصم کے علاوہ عبدالصمد بن یزید، محمد بن ابان المستملی اور حسن بن داؤد البلخی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

حاکم نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ شقیق تین سو مریدوں کے ساتھ نیشاپور آئے، یہ زمانہ مامون کی امارت کا تھا، مامون نے ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا؛ لیکن انھوں نے منع کر دیا تو لوگوں نے مامون کی شفارش کی۔ ابن العماد نے بھی ان کے ایک سفر میں تین سو مریدوں کے ساتھ ہونے کا تذکرہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا حلقہ ارادت کافی وسیع تھا؛ لیکن ان کے اقوال عام طور پر حاتم اصم سے مروی ہیں، طبقات الصوفیہ میں ان کے 27 مقولے نقل کیے ہیں، سب حاتم اصم کی روایت سے ہیں، حاتم اصم ان کے سب سے مشہور شاگرد ہیں، خود بھی بڑے پائے کے صوفی تھے اور شقیق بلخی سے بہت طویل عرصہ تک تعلق رہا، خود کہا ہے کہ میں تیس سال شقیق بلخی کے پاس آتا جاتا رہا، جس جنگ میں شقیق شہید ہوئے اس میں حاتم ان کے ساتھ تھے اور ان کی شہادت کے

واقعہ کے راوی بھی وہی ہیں، ان کے پوتے علی بن محمد بن شقیق کے حوالے سے بھی بعض تذکرہ نگاروں نے ان کے بارے میں کچھ معلومات درج کی ہیں، حسن بن داؤد بلخی نے بھی ان کے اقوال روایت کیے ہیں۔

شقیق بلخی کی وفات کے سلسلے میں سبھی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ کولان کی جنگ میں ترکوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

شقیق بلخی کے یہاں توکل پر بڑا زور تھا، غالباً اپنی ہنگامہ خیز معاشی زندگی کو ترک کرنے کے نتیجہ میں ان کے اندر توکل کی فکر زیادہ بڑھ گئی اور یہ فکر اتنی حاوی ہوئی کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کو اس حوالے سے ذکر کیا ہے۔

شقیق بلخی توکل کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''توکل یہ ہے کہ تیرا دل اللہ تعالٰی کے وعدے پر مطمئن ہو جائے''۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر تم کو کسی کے بارے میں یہ دیکھنا ہو کہ کوئی شخص کیسا ہے تو دیکھ لو کہ اللہ تعالٰی کے وعدے اور انسانوں کے وعدے میں سے کس وعدے پر اس کا دل زیادہ مطمئن ہے۔

شقیق بلخی نے توکل کی چار قسمیں بیان کی ہیں:

1. توکل علی المال
2. توکل علی النفس
3. توکل علی الناس
4. توکل علی اللہ

مال پر توکل کی تفسیر یہ ہے کہ تم کہو کہ جب تک یہ مال میرے پاس رہے گا، مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ نفس پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر بھروسہ کرے۔ اور لوگوں پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ ہر ضرورت میں لوگوں پر اعتماد کرے۔ اور اللہ تعالٰی پر توکل مطلب یہ ہے کہ تم یہ جانو کہ اللہ تعالٰی نے تم کو پیدا کیا ہے، تمہارے رزق کا ضامن اور کفیل وہی ہے، وہ تمہیں کسی کا محتاج نہیں کرے گا اور تم اس بات کو اس کی اپنی زبان میں یوں کہو ''والذی یطعمنی و یسقین'' (سورۃ الشعراء 79)، یہ توکل علی اللہ ہے اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: ''وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین'' (المائدہ 23)، ''و علی اللہ فلیتوکل المؤمنون'' (المائدہ 11)، ''ان اللہ یحب المتوکلین'' (آل عمران 159)۔

شقیق بلخی کے یہاں توکل پر اتنا زور ہے کہ بسا اوقات وہ ترک وسیلہ تک پہنچ جاتے ہیں، اس کی مثال چڑیا کا قصہ ہے جو اوپر گزر چکا ہے؛ لیکن شاید ابراہیم بن ادہم کی تربیت کے بعد انھوں نے ترک وسیلہ کو چھوڑ دیا ہو؛ البتہ اس سے ان کے معیار توکل میں کوئی کمی نہیں آئی، وہ فرماتے تھے کہ جو تمھارا رزق ہے وہ ہر حال میں تم کو ہی ملے گا، کسی کو نہیں مل سکتا اس لیے انسان کو اللہ پر توکل کرنا چاہیے، اور انھوں نے بعض قرآنی آیات سے استشہاد کیا ہے کہ توکل ایمان کا تقاضا ہے اور مومنین کی صفت ہے، اور اللہ تعالٰی بھی ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس پر توکل کرتے ہیں۔

توکل صرف اللہ تعالیٰ پر کرنا چاہیے اور دراصل توکل کی پہچان ہی یہ ہے کہ توکل ہے کس پر؟ شقیق بلخی فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ دیکھنا چاہے کہ اس کی معرفت الٰہی کس درجہ پر ہے تو یہ دیکھے کہ اس کا دل کس پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے کیے ہوئے وعدوں پر یا انسانوں کے وعدوں پر۔

یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ شقیق بلخی کے عہد میں لفظ تصوف کا رواج نہیں تھا، البتہ اون پہننے کی روایت پڑ چکی تھی، اس عہد میں لفظ زاہد یا محب کا استعمال ہوتا تھا، شقیق بلخی نے بھی کہیں لفظ تصوف کا استعمال نہیں کیا ہے بلکہ وہ لفظ زہد کا استعمال کرتے ہیں۔

شقیق بلخی کی نظر میں زہد، رغبت کی ضد ہے، فرماتے ہیں: زاہد اور راغب کی مثال ان دو آدمیوں کی سی ہے جن میں سے ایک مشرق کی طرف جا رہا ہو اور دوسرا مغرب کی طرف، کیا ان کے درمیان کوئی متفقہ بات ہے؟ ان کے مقاصد مختلف ہیں، راغب یہ دعا مانگتا ہے کہ: اے اللہ مجھے مال، اولاد اور دولت عطا فرما اور مجھے میرے دشمنوں کے مقابلے کامیاب فرما، اور ان کے شر اور حسد، زیادتی، مصیبت اور آزمائش مجھ سے دور فرما۔ زاہد کی دعا یہ ہوتی ہے کہ: اے اللہ مجھے ڈرنے والوں کا علم اور عمل کرنے والوں کا خوف عطا فرما، متوکلین کا علم، مومنین کا توکل، صبر کرنے والوں کا شکر اور شکر کرنے والوں کا صبر، اور مغلوب ہو جانے والوں کی فروتنی اور عاجزی کرنے والوں کی انابت اور سچوں کا زہد عطا فرما، اور مجھے ان شہدا میں شامل فرما یا جو زندہ ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے۔ یہ اس کی دعا ہے، دونوں کی دعائیں الگ الگ ہیں اور بخدا دونوں کے راستے جدا جدا ہیں اس طرح شقیق بلخی زاہد یعنی صوفی کو دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز کرتے ہیں، یعنی جو شخص زاہد ہوگا اس کی فکر کا محور پورے طور پر اللہ تعالیٰ کی خشیت، اس پر توکل، صبر اور انابت ہوگا اور اس کی منزل شہدا میں شامل ہونا ہوگا، یعنی آخرت میں کامیابی ہی اس کی زندگی کا اصل محرک ہوگا، اور اس کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ آخرت میں سب سے اعلیٰ مقام حاصل کرے، جو مقام ان شہدا کا ہے جن کو قرآن نے کہا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور کھلائے پلائے جاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں شقیق بلخی راغب کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو تبع ہوئی و ہوس کے لیے ہوتا ہے، جس کی فکر کا محور اس کی دنیا کی زندگی ہوتی ہے، دنیا میں مال و اولاد کا حصول اور مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات حاصل کرنا ہی اس کی زندگی کا محور ہوتا ہے، آخرت کی فکر اس کے دائرہ فکر میں شامل نہیں ہوتی۔

اس طرح شقیق بلخی کے نزدیک جو آخرت میں اعلیٰ درجات حاصل کرنے کی فکر میں یہ زندگی گزارے وہ زاہد ہے، اور جس کی فکر کا دائرہ اس دنیا میں ہی محدود ہو وہ راغب ہے۔

شقیق بلخی کی نصیحتوں میں سب سے زیادہ زور فکر آخرت پر ہے، شقیق بلخی کی نظر میں اہل طاعت ہی زندہ لوگوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں گناہ گار تو مردوں کی مانند ہیں۔ سالک کو ہمہ وقت اس فکر میں رہنا چاہیے کہ مرنے کے بعد کی تیاری پوری رہے، فرماتے تھے کہ موت کی ایسی تیاری کرو کہ جب موت آ جائے تو یہ احساس نہ رہے کہ کاش اور مہلت ملتی۔

شقیق بلخی کے نزدیک عقل مند آدمی وہ ہے جو ہر وقت ان تین حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں رہے۔

1. اپنے پچھلے گناہوں پر ہر وقت خوف زدہ رہے۔

2. ہر وقت اگلے لمحے کی فکر میں لگا رہے۔

3. انجام کار سے ہر وقت خائف رہے؛ چونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کس چیز پر ہوگا۔

معلومات کی جانچ

1. حسن بصری نے کس خلیفہ کو خطوط لکھے؟

2. رابعہ بصریہ کس خاندان کی آزاد کردہ تھیں؟

3. شفیق بلخی کے استاد کون تھے؟

21.6 حارث بن اسد محاسبی (781-857ء)

حارث بن اسد محاسبی، ابوعبداللہ صوفیہ کے مشائخ کبار میں شمار ہوتے ہیں، ان کی کتاب ''الرعایہ لحقوق اللہ'' تصوف کی اولین کتاب ہے، شیخ جنید اور بہت سے بڑے صوفیہ کے استاذ ہیں، بصرہ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں وفات پائی، یہ سنی متکلم تھے، بعض لوگوں نے ان کو علم کلام کے بانیوں میں لکھا ہے، شہرستانی نے ان کا تذکرہ امام مالک' امام احمد بن حنبل اور سفیان ثوری جیسے ائمہ کے ساتھ کیا ہے، انہوں نے امام شافعی سے تلمذ اختیار کیا، امام احمد بن حنبل نے ان پر سخت تنقید بھی کی ہے، ابن حجر نے ان کو مقبول رواۃ میں شمار کیا ہے۔ الرعایہ کے علاوہ ان کی بہت سی اور بھی کتابیں ہیں، جن میں کچھ شائع ہوگئی ہیں، فواد سیزگین نے ان کی 23 مطبوعہ/مخطوطہ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ شیخ جنید پر ان کے بڑے اثرات تھے، ان کی بعض مفصل تحریریں شیخ جنید کی روایت سے ملتی ہیں، Margrete Smith نے ان پر ایک مفصل کتاب Al-muhasibi:An Early Mystic of Baghdad کے نام سے لکھی ہے۔

حارث محاسبی کا پورا نام ابوعبداللہ الحارث بن اسد المحاسبی تھا، سنہ ولادت 170ھ اور سنہ وفات 243ھ ہے، انہوں نے اپنے عہد کے یگانہ روز لوگوں سے علم حاصل کیا، امام شافعی سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، یزید بن ہارون اور ان کے طبقے کے محدثین سے علم حدیث حاصل کیا۔ ان کے تلامذہ میں عباس بن مسروق، احمد بن عبدالجبار، حضرت جنید بغدادی، احمد بن قاسم بن نصر اور احمد بن عبداللہ بن میمون وغیرہ ہیں، زندگی کے بیشتر ایام درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور زہد وعبادت میں بسر کیے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کے بارے میں اکثر ایسے الفاظ لکھے ہیں جیسے کہ وہ بڑے عبادت گزار، صوفی، زاہد، فقیہ، متکلم، واعظ، محدث اور خوف خداوندی سے بکثرت رونے والے تھے، اللہ نے ان کی زبان میں بڑی کشش، فصاحت وبلاغت اور چاشنی رکھی تھی، اور وہ لوگوں سے پوری طرح اپنی بات منوالیا کرتے تھے؛ لیکن ابوعبداللہ (حارث محاسبی) سوائے بھلائی کی بات اور نصیحت کے کچھ اور نہیں کہتے تھے۔

حارث محاسبی کی کتابوں میں زیادہ سوالات وجوابات کی کیفیت ملتی ہے، اس کی وجہ، جیسا کہ حضرت جنیدؒ بغدادی نے لکھا ہے کہ وہ لوگوں کو (اور خاص طور پر حضرت جنید بغدادی کو) اپنے ساتھ جنگل میں لے جانے ان سے سوالات کرنے کا حکم کرتے اور ان

کے سوالات کا جواب دیتے، اسی طرح مختلف موضوعات پر سوالات و جوابات کا سلسلہ رہتا اور جب واپس گھر آتے تو ان سوالات اوران کے جوابات لکھ لیا کرتے تھے، اس لئے ان کی کتابوں میں سوال و جواب کا اسلوب زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے؛ بلکہ الرعایۃ لحقوق اللہ جو ان کی سب سے ضخیم کتاب ہے وہ تو سوالات و جوابات کے پیرائے میں ہی ہے۔

حارث محاسبی بڑے زاہد و متورع تھے، ان کے والد بہت امیر آدمی تھے، انہوں نے اپنی وفات کے وقت ستر ہزار درہم نقد چھوڑے؛ لیکن حارث محاسبی جو ان سے اختلاف رکھتے تھے انہوں نے اپنے والد کے ترکہ میں سے کچھ بھی نہیں لیا اور چونکہ خود بھی بڑے زاہد تھے اس لئے ساری زندگی عسرت و تنگ حالی میں بسر کردی، حتیٰ کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے پاس ایک چاندی کا سکہ بھی نہیں تھا۔

حارث محاسبی دین کے معاملے میں بڑے غیور تھے، ان کے عہد میں بھی وحدۃ الوجودی افکار پروان چڑھنے لگے تھے، ایک ابو حمزہ صوفی حارث محاسبی کے ساتھ ان کے گھر آئے، اتفاق سے ضمن میں ایک بکری تھی اس نے آواز نکالی ابوحمزہ نے کہا: لبیک یا سیدی، حارث محاسبی یہ سن کر غصہ ہو گئے، گھر سے چھری لے کر آئے اور ابوحمزہ سے کہا کہ اگر تم نے توبہ نہیں کی تو میں تم کو ذبح کردوں گا۔

حارث محاسبی کے چند اقوال حکمت یہ ہیں:

1. ہر چیز کا ایک جوہر ہوتا ہے اور انسان کا جوہر اس کی عقل ہے اور عقل کا جوہر صبر ہے۔
2. اس امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جن کو ان کی دنیا ان کی آخرت سے غافل نہ کردے اور ان کی آخرت ان کو ان کی دنیا سے غافل نہ کردے۔
3. حسن خلق نام ہے اذیت کو برداشت کرجانے، غصہ کا اظہار کم کرنے، چہرے کی بشاشت اور نرم گفتاری کا۔
4. جس آدمی کا باطن اخلاص اور نگرانی نفس کے ذریعہ اچھا ہو گیا، اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کو اتباع سنت اور مجاہدہ سے مزین کردے گا۔
5. ظالم کی چاہے لوگ تعریف کریں وہ ندامت میں ہے اور مظلوم کی چاہے لوگ مذمت کریں لیکن وہ سلامتی میں ہے۔

حارث محاسبی کی حسب ذیل کتابیں زیادہ معروف ہیں:

1. الرعایۃ لحقوق اللہ
2. رسالۃ المسترشدین
3. التوھم
4. آداب النفوس
5. شرح المعرفۃ
6. بدء من اناب الی اللہ
7. المسائل فی الزاھد
8. المسائل فی اعمال القلوب و الجوارح وغیرہ

21.7 ذوالنون مصری (796-859ء)

ذوالنون مصری کا اصل نام ثوبان بن ابراہیم (283-353ھ) ہے۔ ابوالفیض کنیت اور ذوالنون لقب ہے، اسحاق بن محمد انصاری کے غلام تھے، مصر کے ایک گاؤں اخیم میں پیدا ہوئے، سعدون مصری سے راہ سلوک میں مدد لی، علم حدیث میں امام مالک، لیث بن سعد اور ابن لہیعہ سے روایات کی، مختلف علوم کے ماہر تھے، لیکن تصوف میں ایک امتیازی شان پیدا کی، اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ صوفیہ کے احوال و مقامات اور باطنی تجربات پر سب سے پہلے انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا، اور اسی لئے مختلف حلقوں سے ان پر تنقید بھی ہوئی، الحاد و زندقہ کا الزام لگا اور نوبت قید و بند تک پہنچی، خلیفہ متوکل کے حکم سے محبوس کئے گئے، امیر مصر نے ان کو بلا کر ان کے عقائد وغیرہ کے بارے میں سوالات کئے تو وہ مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے متوکل کو لکھا کہ ان پر الزامات بے بنیاد ہیں۔ لیکن متوکل کو اطمینان نہیں ہوا، آخر خود اپنے دربار میں طلب کر کے ان سے سوالات کئے، تو وہ نہ صرف مطمئن ہوا بلکہ معتقد ہو گیا اور اکثر ان سے نصیحت سنا کرتا تھا۔

حضرت ذوالنون مصری نے طویل عمر پائی اور تقریباً 90 سال کی عمر میں 859ء میں ان کا انتقال ہوا، ذوالنون مصری جلیل القدر صوفی اور مجاہد تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو رئیس الصوفیہ کا خطاب دیا ہے، ان کا خیال تھا کہ انسان کی روحانی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ نفس امارہ ہے اور اس کا علاج نفس کشی ہے، اس لئے وہ سخت ریاضت اور نفس کشی پر زور دیتے تھے۔

حضرت ذوالنون فرماتے تھے کہ کلام کا دارومدار چار چیزوں پر ہے: اللہ برتر جلیل کی محبت، دنیا سے بغض، قرآن کی تابع داری اور اس بات سے ڈرتے رہنا کہ کہیں موجودہ حالت سے خدا تبدیل کر کے کفر کی حالت میں مبتلا نہ کر دے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ کو دوست رکھنے کی علامت یہ ہے کہ وہ اخلاق، افعال، اوامر اور سنن میں اللہ کے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل تابعدار ہوگا۔

ذوالنون مصری کی توبہ سے متعلق ایک واقعہ یوسف بن الحسین نے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن ذوالنون کی مجلس میں گیا، اس وقت ان کے پاس سالم المغربی آئے ہوئے تھے، انہوں نے ذوالنون سے دریافت کہا کہ ابوالفیض تمہاری توبہ کا کیا سبب تھا۔ فرمایا کہ یہ ایک عجیب واقعہ ہے جس کے سمجھنے کی تجھ میں طاقت نہیں ہے۔ سالم المغربی نے کہا کہ آپ کو خدا کی قسم مجھے ضرور بتائیے۔ ذوالنون نے کہا کہ میں نے قاہرہ سے نکل کر کسی بستی کا ارادہ کیا، راستہ میں ایک جنگل میں سو گیا، جب آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اندھی چنڈول اپنے گھونسلے سے زمین پر گر پڑی، پھر زمین پھٹ گئی اور اس میں سے دو کوزے نکلے، ایک سونے کا تھا اور دوسرا چاندی کا اور اس میں سے ایک میں تل تھے اور دوسرے میں پانی، چنڈول نے تل کھائے اور پانی پیا، یہ دیکھ کر میں نے کہا کہ میرے لئے اسی قدر کافی ہے، میں نے توبہ کر لی اور اللہ کے دروازے سے چمٹ گیا۔

ذوالنون مصری فرماتے تھے کہ سب سے برا انسان وہ ہے جسے خدا کا راستہ معلوم نہ ہو اور وہ کسی سے معلوم بھی نہ کرتا ہو۔

حضرت ذوالنون مصری ایک بار کسی مسجد میں خطاب فرما رہے تھے، ایک شہزادہ بھی وعظ سن رہا تھا، آپ نے دوران وعظ فرمایا کہ سب سے احمق آدمی وہ ہے جو کمزور ہے لیکن طاقتور سے لڑتا ہے، جو سب پر غالب ہے۔ یہ سن کر شہزادے کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ اس

دن تو چلا گیا۔ سیلن دوسرے دن پھر آیا اور ذوالنون مصری سے پوچھا کہ اللہ تعالی کی طرف جانے کا راستہ کون سا ہے؟ ذوالنون نے جواب دیا کہ دو راستے ہیں، ایک مختصر ہے دوسرا طویل ہے، مختصر راستہ گناہ، نفسانی خواہشات اور دنیا کے ترک کرنے کا نام ہے، اور طویل راستہ ماسوی اللہ سے قطع تعلق کر لینے کا نام ہے۔ وہ شہزادہ اس دن چلا گیا پھر دوسرے دن آیا اور صوفی بن کر ذوالنون کی خدمت میں رہنے لگا۔

حضرت ذوالنون مصری کے بارے میں ایک واقعہ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ ایک نوجوان اکثر آپ کے اوپر اور دیگر صوفیہ پر تنقید کرتا تھا، آخر ایک دن ذوالنون مصری نے ایک انگوٹھی اس نوجوان کو دی اور کہا کہ اسے نان بائی کے پاس گروی رکھ دو، وہ لے گیا؛ لیکن نان بائی نے اس کا ایک درہم سے زیادہ دینا منظور نہ کیا تو وہ واپس آ گیا، پھر حضرت نے اس کو جوہری کی دکان پر بھیجا، جوہری نے اس انگوٹھی کی قیمت ایک ہزار درہم دے دی۔ ذوالنون مصری نے اس سے فرمایا کہ صوفیہ کے بارے میں تمہارا علم اس نان بائی کی طرح ہے، جو اس انگوٹھی کی قیمت نہ پہچان سکا، اس کے بعد اس نوجوان نے توبہ کر لی۔

21.8 ابراہیم بن ادھم (718-782ء)

ابراہیم بن ادھم تصوف کی تاریخ کی عجیب وغریب شخصیت ہیں۔ ان کی زندگی کے گرد اساطیر اور روایات کے اتنے ہالے ہیں کہ صحیح بات تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، اساطیری روایات کے دائرے میں ان کی زندگی ایک چیستان بن کر رہ گئی ہے، ڈاکٹر عبدالرحمن بدوی جو تاریخ تصوف کے زبردست عالم ہیں انہوں نے اس قصہ کے کچھ پہلوؤں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے اور عربی و فارسی کے علاوہ، ترکی ہندوستانی اور ملائی زبانوں میں جو ذخیرہ موجود ہے اس سب کا تجزیہ کیا ہے۔

ابراہیم بن ادھم کا پورا نام ابراہیم بن ادھم بن منصور بن یزید بن جابر التمیمی العجلی ہے، کنیت ابو اسحاق ہے، ان کا خاندان پہلے کوفہ میں رہتا تھا پھر ہجرت کر کے بلخ میں آباد ہو گیا، ابراہیم بن ادھم کی ولادت بلخ میں ہوئی، اور انہوں نے راہ سلوک میں پورے بلاد اسلامیہ کا سفر کیا، بغداد گئے، خراسان میں رہے، دمشق میں طرطوس میں قیام کیا، مصر گئے، غرض پوری زندگی سیر وسیاحت میں بسر کر دی اور آخر میں رومیوں کے خلاف ایک جہاد میں شہید ہو گئے۔

ابراہیم بن ادھم کے بارے میں جو مشہور قصہ ہے وہ تصوف کے اکثر تذکروں میں لکھا ہے، اگرچہ اس میں جزوی اختلافات ہیں؛ لیکن قصہ کی اصل روح اور تفصیلی واقعات ایک ہیں، قصہ بصیغۂ متکلم وارد ہوا ہے، یعنی حضرت ابراہیم بن ادھم نے خود بیان کیا ہے، ابونعیم اصفہانی کی حلیۃ الاولیاء میں یہ قصہ اس طرح بیان ہوا ہے:

> ''میرے والد خراسان کے بادشاہوں میں سے تھے اور بلخ میں رہتے تھے، مجھے شکار کا شوق تھا ایک دن میں شکار کے لئے گیا، مجھے ایک خرگوش یا ایک ہرن نظر آیا، میں نے اس کے پیچھے اپنا گھوڑا چھوڑ دیا، اچانک میرے کانوں میں آواز آئی کہ: ''تم اس کام کے لئے نہیں بنائے گئے اور نہ اس کام پر مامور ہو''۔ میں رکا ادھر ادھر دیکھا کوئی نظر نہیں آیا تو میں اس کو اپنا واہمہ سمجھ کر پھر آگے بڑھا، پھر وہی آواز آئی میں پھر رکا؛ لیکن پھر کوئی نظر نہیں آیا تو پھر گھوڑے کو آگے بڑھایا، تیسری دفعہ وہ آواز

میرے گھوڑے کی زین سے آئی اور میں ایک دم متنبہ ہوگیا کہ یہ کوئی غیبی ماجرا ہے اس لئے میں نے عہد کیا کہ اب زندگی میں کبھی بھی خدا کی نافرمانی نہیں کروں گا، میں گھر آیا گھوڑا چھوڑا، والد کے ملازم چرواہے سے کپڑے لئے اور عراق کی طرف نکل گیا، وہاں ایک عرصہ تک رہا۔ لیکن مطلوب حاصل نہ ہوا تو لوگوں سے مشورہ کیا، انہوں نے شام کی طرف رہنمائی کی، وہاں بھی ایک عرصہ تک رہا، پھر طرطوس گیا، وہاں مجھے ایک باغ میں ملازمت کرنے کا موقعہ ملا، میں انار کے باغات میں ملازمت کرتا تھا، اتفاق سے ایک دن مالک باغ آیا اور اس نے سب سے بڑے اور سب سے میٹھے انار کی فرمائش کی، میں بڑا انار توڑ لے آیا لیکن وہ کھٹا نکلا، مالک بہت ناراض ہوا کہ تم میرے انار کھاتے ہو لیکن ابھی تک تمہیں کھٹے اور میٹھے کی تمیز نہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے آج تک آپ کا انار کھایا ہی نہیں۔ تو وہ اور غصہ ہوا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ ہاں تم تو بڑے ابراہیم بن ادھم ہو۔ لیکن اس کو خیال بھی رہا اور اس نے مسجد میں اس کا تذکرہ کیا، وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں ابراہیم بن ادھم ہوں۔ اس لئے پوری جماعت مجھ سے ملنے کے لئے باغ میں آئی، میں ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا، اور موقعہ پا کر باغ سے نکل بھاگا اور روم کے علاقے میں پناہ لی''۔

ابراہیم بن ادھم کے اس قصہ میں بعض اور راویوں نے بھی اضافے کئے ہیں، لیکن اصل روایت یہی ہے، لیکن حضرت ابراہیم بن ادھم سے اس پورے عرصہ میں بہت سے لوگوں کی ملاقات ہوئی ہے، اس لئے ان کا وجود مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ اس عہد میں خراسان کے اندر ادھم نام کا کوئی بادشاہ ہی نہیں تھا وغیرہ، لیکن یہ امکان ہے کہ ان کے والد کوئی بڑے جاگیردار یا چھوٹے امیر اور حاکم رہے ہوں جنھیں عمومی تاریخ میں جگہ نہیں ملی۔ عبدالرحمٰن بدوی نے ان سے متعلق تمام روایات کا محاکمہ کیا ہے اور فارسی تذکروں میں اس پر جو تخیل کی پرواز دکھائی گئی ہے اس پر تنقید بھی کی ہے۔

ابراہیم بن ادھم کی تعلیمات ابتدائی عہد کے تمام تذکروں میں موجود ہیں، ان کا سب سے مفصل تذکرہ قدماء کے یہاں حلیۃ الاولیاء میں ملتا ہے، ان کے علاوہ دیگر تذکروں میں بھی ان کی تعلیمات ملتی ہیں، امام ابوالقاسم قشیری نے الرسالہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم فرمایا کرتے تھے: اگر تم دن کو روزہ اور رات کو قیام لیل نہ کر سکو تب بھی کوئی بات نہیں، وہ اکثر فرماتے تھے کہ: خدایا! مجھے اپنی نافرمانی کی ذلت سے نکال کر اپنی تابعداری کی عزت کی طرف منتقل کر دے۔

احمد خضرویہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن ادھم نے طواف کرتے ہوئے ایک شخص سے کہا: تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ جب تک تم چھ گھاٹیاں طے نہ کر لو تو تو صالحین کا رتبہ حاصل نہیں کر سکتے:

1. ناز ونعمت کا دروازہ بند کر دو اور سختی کا دروازہ کھول دو۔
2. عزت کا دروازہ بند کر دو اور ذلت کا دروازہ کھول دو۔
3. آرام وراحت کا دروازہ بند کر دو اور کوشش کا دروازہ کھول دو۔
4. نیند کا دروازہ بند کر دو اور کوشش کا دروازہ کھول دو۔

5. مالداری کا دروازہ بند کر دو اور فقر کا دروازہ کھول دو۔

6. زندگی کا دروازہ بند کر دو اور موت کی تیاری کا دروازہ کھول دو۔

ابراہیم بن ادھم کا ایک خط جس کو حلیۃ الاولیاء میں نقل کیا گیا ہے، اس خط میں حضرت ابراہیم بن ادھم نے بطور نصیحت لکھا ہے کہ:

''میں تم کو تقوی کی وصیت کرتا ہوں اور یہ بات ذہن نشین کر لو کہ جس بندہ نے حقوق الٰہی اور فرائض الٰہی کی نگہبانی کر لی اور لوگوں کی دل آزاری سے بچا، بے شک وہ بہت ہی نصیب والا صاحب فہم و فراست ہے، اور جس نے اپنے نصیب کو بالائے طاق رکھ کر حقوق الٰہی کو پامال کیا لوگوں کے حقوق کو چھینا اور صاحب حق کو ذلیل و رسوا کیا، اسکا معاملہ رب العزت کی عدالت میں پیش ہے، ہم اللہ تعالی سے پناہ و عافیت کا سوال کرتے ہیں۔

اگر تجھ سے ہو سکے تو اس شخص کی صحبت اختیار کرو جو اللہ تعالی سے ڈرتا ہو اور رضامندی اور غصہ دونوں حالتوں میں خدا کی اطاعت کرو۔ ضروری ہے کہ لایعنی باتوں سے بچو، اپنے نفس کی حفاظت کرو، جہاں تک ہو سکے اپنے لیے کام کرو چونکہ تمھارے لیے کوئی دوسرا کام نہیں کرے گا۔ جو شخص آخرت کا طلب گار رہتا ہے اس سے کم از کم اہل دنیا تو راحت میں رہتے ہیں، نہ وہ دنیا داروں کو طلب دنیا میں دھوکہ دیتے ہیں اور نہ مزید ذلیل کرتے ہیں اور خود بھی ذلیل نہیں ہو سکتے اور نہ دھوکہ کھا سکتے ہیں اور نہ وہ اہل دنیا سے دنیا چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ لوگ ایک دوسرے کے حقوق نہیں چھین سکتے، ہر صاحب حق کے حق کو ادا کرنے والا اللہ سبحانہ وتعالی ہے؛ البتہ لوگوں کی کوششوں کو اس کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے، تم قیامت میں خدا کے سامنے اس طرح حاضری دو کہ کسی کا ظلم تمھارے ساتھ وابستہ نہ ہو۔

حضرت ابراہیم بن ادھم کا انتقال بحیرہ روم کے ایک جزیرے میں ہوا جہاں وہ ایک سرحدی چوکی کی نگرانی میں مصروف تھے۔

21.9 ابو یزید بسطامی (804-874ء)

ابو یزید بسطامی اپنے عہد کے جلیل القدر صوفی تھے، آپ نسلاً ایرانی تھے، آپ کے دادا صاحب حیثیت رئیس تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا۔ ابو یزید کا اصل نام طیفور بن عیسیٰ بن شروشان تھا، ان کے والد عیسیٰ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، ان کے پانچ بچے ہوئے تین بیٹے اور دو بیٹیاں اور خدا کی قدرت کہ ان کی سب اولاد نہایت متقی اور پرہیزگار ہوئی، ابو یزید کو تو شہرت لازوال حاصل ہوئی، ابو یزید بچپن ہی سے تنہائی پسند اور عبادت گزار تھے، بلکہ ان سے بچپن سے ہی حیرت انگیز واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے تھے، لوگ ان سے دعا کراتے، بیماریوں میں دم کرواتے اور ان کو فائدہ بھی ہو جاتا، اور اسی طرح شروع میں ہی ان کی شہرت پورے علاقے میں پھیل گئی تھی۔

ابو یزید کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انہوں نے تین سو اساتذہ کی خدمت میں رہ کر علم و تربیت حاصل کی۔ ان کے آخری استاد امام جعفر صادق تھے، دو سال ان کی خدمت میں رہے اور ان کے لئے پانی بھرنے کا کام کرتے تھے اس لئے طیفور سقا کے نام سے مشہور تھے۔

ابو یزید کے بارے میں بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ وہ ناخواندہ تھے؛ لیکن خدا نے ان کو علم وفضل کے جس مقام پر پہنچایا تھا وہ بے مثال تھا؛ حضرت جنید بغدادی نے ان کے ملفوظات کی شرح لکھی، اور احمد بن خضرویہ اور اس عہد کے اجلہ صوفیہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر، ان کے ملفوظات سنتے تھے اور ان ملفوظات کی روشنی میں اپنی زندگی کی اصلاح اور اپنے نفس کا تزکیہ کرتے تھے۔

خود ابو یزید نے بھی کبھی اپنی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا؛ بلکہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ معرفت کیسے حاصل کی؟ تو فرمایا کہ: ''پیٹ کو بھوکا اور بدن کو ننگا رکھ کر''۔

منصور بن عبداللہ کہتے تھے کہ میں نے ایک بسطامی شخص سے سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے ابو یزید سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ میں نے تیس سال مجاہدہ کیا، مگر علم اور اس پر عمل کرنے سے بڑھ کر کسی چیز کو مشکل نہیں پایا۔ اگر علماء میں اختلاف نہ ہوتا تو میں ایک ہی اجتہاد پر رہ جاتا اور مسائل میں علماء کا اختلاف رحمت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا سے نکلنے پہلے ابو یزید نے تمام قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔

ایک دفعہ ابو یزید نے اپنے بھائی سے کہا: ''آ چل اس شخص کو دیکھیں جس نے اپنے آپ کو ولی مشہور کر رکھا ہے۔ اور یہ شخص لوگوں میں اپنے زہد کی وجہ سے مشہور تھا اور دور دراز سے لوگ اس کے پاس آتے تھے، جب ہم اس کے پاس گئے تو وہ گھر سے نکلا اور مسجد میں داخل ہوا اور قبلے کی جانب تھوک پھینکا، یہ دیکھ کر ابو یزید واپس چلے آئے اور اسے سلام بھی نہ کیا اور فرمایا کہ: یہ شخص تو آداب نبویؐ میں سے ایک ادب کا بھی امین نہیں تو جس ولایت کا یہ مدعی ہے اس کا کیسے امین ہو سکتا ہے؟ اسی سند سے ایک روایت یہ ہے کہ ابو یزید نے کہا میں نے ارادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کروں کہ مجھے کھانے اور عورتوں کی مصیبت سے نجات دے، پھر خیال کیا کہ میرے لئے یہ درخواست کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ سے اس قسم کی درخواست نہیں کی، لہٰذا میں نے یہ درخواست نہیں کی، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے عورتوں کی مصیبت سے بچا لیا، یہاں تک کہ مجھے خیال ہی نہیں ہوتا کہ عورت سامنے آئی ہے یا دیوار۔

ابو یزید نے ایک مرتبہ فرمایا زہد کی کوئی منزل نہیں، میں نے عرض کیا کیوں؟ فرمایا: اس لئے کہ صرف تین دن تک زہد میں رہا، چوتھے دن اسی سے نکل آیا اور پھر ماسوی اللہ سے زہد کیا، جب چوتھا دن ہوا تو اللہ کے سوا کچھ باقی نہیں رہا، میں دیوانہ وار پھرنے لگا۔ اچانک ہاتف کی آواز سنائی دی، اے بایزید! تو ہمارے ساتھ رہنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ میں نے کہا: میں تو یہی سوچتا ہوں۔ پھر ایک کہنے والے کو سنا کہہ رہا ہے کہ تو نے اپنا مقصد پا لیا۔

ابو یزید بسطامی کے ایک مرید نے نصیحت کرنے کی درخواست کی؛ تو حضرت نے فرمایا کہ اگر تمھارے اندر کوئی بری عادت ہو تو اس کو اچھی عادت سے بدلنے کی کوشش کرو، اور اگر کوئی تمھاری اعانت کرے تو پہلے خدا کا شکر ادا کرو اور پھر معطی کا شکر ادا کرو۔ ایک اور مرید کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ آسمان کو دیکھو، اس نے آسمان کی طرف دیکھا، حضرت نے پوچھا: اس کا خالق کون ہے؟ مرید نے کہا: اللہ۔ حضرت نے فرمایا کہ بس اسی سے ڈرتے رہو؛ کیونکہ وہ تمھارے ہر حال سے باخبر ہے، اور ہمیشہ ایسے لوگوں کے ساتھ رہو جو اگر تم بیمار ہو جاؤ تو تمھاری تیمارداری کریں، اگر تم سے غلطی ہو جائے تو معاف کر دیں اور حق بات تم سے کبھی نہ چھپائیں۔

ایک مرتبہ فرمایا: بندہ درجہ کمال کو اسوقت پہنچتا ہے جب اپنے عیوب کو پہچان لیتا ہے اور مخلوق سے دل اٹھا لیتا ہے، اس وقت اللہ تعالی اس کو اس کی ہمت کے موافق اپنا قرب نصیب فرماتے ہیں، یعنی اس پر معرفت کا فیضان ہونے لگتا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ: یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ انسان خدا کو پالے اور پھر اس سے غافل ہو جائے۔ یعنی جو لوگ ایمان کا دعوی کرتے ہیں اور پھر بھی خدا سے غافل سمجھتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دعوی ایمان میں پورے طور پر سچے نہ ہوں۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ: جو شخص اللہ تعالی کو جانتا ہے: وہ اللہ کے ذکر کے سوا اپنی زبان کو کسی اور ذکر میں نہیں کھولتا۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ جس کو اللہ رب العزت دوست رکھتا ہے اس کو تین خصلتیں عطا فرماتا ہے: سخاوت دریا جیسی، شفقت آفتاب جیسی اور تواضع زمین جیسی۔

معلومات کی جانچ

1. حارث محاسبی کی سب سے مشہور تصنیف کون ہے؟
2. رسالہ المسترشدین کس کی کتاب ہے؟
3. ذوالنون مصری کا اصل نام کیا تھا؟
4. ابراہیم بن ادھم کا انتقال کہاں ہوا؟
5. ابو یزید بسطامی کے آخری استاد کون تھے؟

21.10 جنید بغدادی (826-910ء)

شیخ جنید گروہ صوفیہ کے سردار اور بڑے زبردست عالم، فقیہ صوفی اور خطیب تھے، تصوف کی پوری تاریخ پر ان کے زبردست اثرات ہیں، انہوں نے تصوف کو ایک نئی جہت عطا کی اور تصوف کو ایسا رخ اور منہاج دیا کہ بعد میں چند متصوفین کی بعض بے اعتدالیوں کے باوجود متفقہ طور پر تمام صوفیہ دائرہ شریعت سے باہر نہ جاسکے اور تصوف کی اس حقیقت کو مبرہن کرتے رہے کہ تصوف شریعت سے ماوراء کچھ نہیں ہے، جو کچھ ہے شریعت کے دائرے میں ہی ہے۔

شیخ جنید کے آباء واجداد نہاوند کے رہنے والے تھے؛ لیکن مستقل بود و باش بغداد میں اختیار کر لی تھی، ان کے والد شیشہ بیچنے کا کام کرتے تھے اس لیے قواریری کہلاتے تھے۔ اور خود شیخ جنید نے کچے ریشم کی تجارت اختیار کی، کچے ریشم کو عربی میں خز کہتے ہیں، شیخ جنید اس لیے الخزاز کہلاتے تھے۔ ان کی دکان بازار میں تھی۔ شیخ جنید کی ولادت 210/826 میں ہوئی تھی، ان کی تعلیم و تربیت سب بغداد میں ہوئی، شروع سے ہی اپنے ماموں سری سقطی کی نگرانی میں رہے، بغداد میں علماء و فضلاء کا مجمع تھا، انہوں نے بڑے پائے کے علماء سے اکتساب فیض کیا، امام احمد بن حنبل سے تلمذ اختیار کیا، ابو عبید قاسم بن سلام سے حدیث پڑھی، حارث محاسبی سے کلام کی روایت حاصل کی، امام شافعی کے مخصوص شاگرد حسن بن محمد الزعفرانی سے اور امام ابو ثور کلبی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی، صرف 20 سال کی عمر میں امام ابو ثور کے حلقے میں فتوی دینے لگے تھے۔

تصوف کی روایت ایک بڑی تعداد سے حاصل کی، ان کے ماموں سری سقطی کے علاوہ ابراہیم آجری، ابوحمزہ بغدادی اور محمد بن علی القصاب وغیرہ ۲۶؍لوگوں سے تصوف کے رموز ونکات حاصل کیے۔

ان کے اساتذہ کی تعداد بہت ہے؛ لیکن تلامذہ کی تعداداور بھی زیادہ ہے، اوران کے تلامذہ میں بھی بڑے بڑے مشائخ علماء اورفقہا شامل ہیں، جیسے مشہور شافعی فقیہ قاضی ابن سریج ان کے شاگرد تھے، صوفیہ میں ممشاد دینوری، ابوبکر شبلی، ابو محمد مرعشی، عمرو بن عثمان مکی، ابوالحسن المزین، ابوعلی الرودباری وغیرہ بہت سے مشائخ نے ان سے ارادت وتلمذ اختیار کیا تھا ان کے تلامذہ میں جونام دستیاب ہوسکے ان کی تعداد 112 ہے۔

شیخ جنید علم وحال کے جامع تھے، ان کے معاصراور بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان کی بڑی تعریف کی ہے، مختلف علوم میں بھی ان کو بڑی مہارت تھی امام غزالی اور بعض دوسرے لوگوں نے فقہ سے متعلق شیخ جنید بغدادی کی بعض رائیں نقل کی ہیں؛ لیکن اصلاً وہ ایک صوفی تھے ان کے ہر رنگ پر تصوف کا رنگ غالب ہے، انہوں نے قرآن مجید کی بہت سی آیات اور متعدد حدیثوں کی صوفیانہ تشریحات کی ہیں۔

شیخ جنید بغدادی خلوت نشین یا عزلت گزیں صوفی نہیں تھے؛ بلکہ مکمل سماجی ذمہ داریاں اٹھاتے تھے دوست احباب بھی تھے اوران کے سماجی تعلقات بھی بہت وسیع تھے، بیماروں کی عیادت کرتے، غریبوں کی مدد کرتے اور دیگر مواقع پر لوگوں کے ہمراہ رہتے۔

شیخ جنید بغدادی کا انتقال 297 / 910 میں ہوا، ان کی وفات ماہ شوال میں جمعہ کے دن شام کو ہوئی اور اگلے دن بروز ہفتہ دفن کیے گئے، عبداللہ انصاری نے صراحت کی ہے کہ نمازِ جنازہ ان کے بیٹے نے پڑھائی۔ ویسے توان کی پوری زندگی زہدوعبادت سے عبارت تھی؛ لیکن آخرعمر میں عبادت سے انہماک زیادہ بڑھ گیا تھا، 90؍سال سے زیادہ کی عمر تھی لیکن اپنے معمولات پوری طرح اداکرتے رہے، جب ان کے مرض میں شدت ہوئی تولوگ بڑی تعداد میں عیادت کے لیے آنے لگے؛ لیکن ان کے معمولات میں فرق نہیں آیا ابن عطا کہتے ہیں کہ ایک دن میں گیا تو نزع کا سا عالم طاری تھا میں نے سلام کیا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، تھوڑی دیر بعد جواب دیا اور فرمایا کہ میں اپنے ورد میں مشغول تھا۔ شیخ جنید بغدادی کی وفات پر پورا بغداد اُمڈ آیا، مختلف مؤرخین نے نمازِ جنازہ میں شریک لوگوں کی تعداد 60 ہزار لکھی ہے۔

شیخ جنید بغدادی ایک عالم صوفی اور مربی تھے۔ انہوں نے وعظ وخطبہ کے ذریعہ اپنے افکار کی اشاعت کی، اپنا حلقہ قائم کرکے لوگوں کی تربیت کی اور خطوط کے ذریعہ اپنے افکار کی اشاعت دوسرے علاقوں تک کی، لیکن تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، تصنیف کے نام پر ان کے چند رسائل دستیاب ہیں، اولین مصنفین نے بعض ایسی کتابوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو اس وقت دستیاب نہیں ہیں۔ مثلاً امام قشیری نے ایک کتاب جوابات مسائل الشامعین کا ذکر کیا ہے، ابونصر سراج نے کتاب المناجاۃ کا تذکرہ کیا ہے، علی ہجویری نے تصحیح الارادہ کا ذکر کیا ہے؛ لیکن یہ سب کتابیں مفقود ہیں اس وقت ان کے صرف چند رسالے موجود ہیں۔

ان رسالوں کے علاوہ ان کے تقریباً بیس خطوط مکمل یا ناقص شکل میں موجود ہیں اوران کے ملفوظات بھی مختلف کتابوں میں موجود ہیں۔

شیخ جنید بغدادی کے تصوف کا طرہ امتیاز صحو ہے، یعنی راہ سلوک میں جو سکر یا مدہوشی سالک پر طاری ہوتی ہے وہ شیخ جنید کی نظر میں کم تر درجہ ہے، سالک کو ہوشمند رہنا چاہئے اگر اس پر سکر یا مدہوشی کا غلبہ جمع کے نتیجہ میں ہو بھی جائے تو اس کو فرق ثانی کی طرف عروج کرنا چاہئے ورنہ اس کا سلوک ناقص رہے گا۔ شیخ جنید نے سکر کو جنون سے تعبیر کیا ہے اور اصحاب سکر صوفیہ کو مجنون کہتے ہیں۔

سکر کے نتیجہ میں سالک کی زبان سے ایسے کلمات کا صدور ہوتا ہے جن کے ظاہر کی دلالت خلاف شرع لگتی ہے، اس کو شطح کہتے ہیں، شیخ جنید شطحات کے بہت خلاف نہیں ہیں، سالک پر یہ کیفیت طاری ہوسکتی ہے اسی لیے شطحات کی بنیاد پر کسی کو مطعون بھی نہیں کیا جاسکتا، بشرطیکہ اس کا سکر حقیقی ہو اور شطحات کا صدور غیر اختیاری ہو، البتہ اگر شطحات شعوری کوشش کا نتیجہ ہیں تو شیخ جنید ان پر سخت تنقید کرتے ہیں، خود شیخ جنید سے شطحات کا صدور نہیں ہوا بعض حضرات نے چند جملے نقل کیے ہیں لیکن وہ شطح نہیں ہیں۔

21.11 حسین بن منصور حلاج (858-922ء)

حسین بن منصور حلاج، ابوالمغیث (244/309-858/922) مشہور صوفی ہیں، اصحاب سکر میں شمار ہوتا ہے، اجلہ صوفیہ کی خدمت میں رہے؛ لیکن بعد میں ان کے بعض افکار کی وجہ سے ان پر صوفیہ نے تنقید کی اور شیخ جنید نے تو ان کو اپنی مجلس سے نکال دیا۔ عطار نے اس موقع پر طویل کلام کیا ہے، قدیم مراجع میں ان پر حلولی عقائد کا الزام ہے۔ حلاج نے ہندوستان سمیت عالم اسلام کے مختلف علاقوں کا سفر کیا، مختلف سیاسی اور دینی الزامات کے تحت جیل گئے، رہا ہوئے، جیل سے فرار بھی ہوئے، آخر عمر میں پھر جیل گئے، آٹھ سال جیل میں رہنے کے بعد پھانسی کی سزا پائی۔ L.Massignon نے اپنی پوری زندگی حلاج کے مطالعہ میں صرف کردی۔ ان کی کتاب La Passion d'al-Hallaj al L'order des Halladjiyah بہت مشہور ہے، اس کا انگریزی ترجمہ The Passion of Hallaj کے نام سے Herbert Massion نے چار جلدوں میں کیا ہے۔

حلاج کے بارے میں ان کے متعدد معاصر لوگوں نے لکھا ہے، خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں ان پر بہت تفصیل سے لکھا ہے اور حلاج کے بیٹے سے براہ راست معلومات حاصل کی ہیں، حلاج کی وفات کے سو سال بعد ایک کتاب اخبار الحلاج لکھی گئی، اس میں بھی ان کے حالات کافی تفصیل سے ملتے ہیں؛ لیکن سب سے زیادہ تفصیل سے فریدالدین عطار نے تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے، ان کے لقب حلاج کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے عطار نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ منصور حلاج نے ایک کپاس کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جس سے فوراً ہی بنولہ الگ ہوگیا، اسی کرامت کی وجہ سے وہ الحلاج یعنی دھنیا کہلاتے ہیں، ایک دوسری روایت بھی ہے جس کو خطیب بغدادی نے بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ واسط میں ایک دھنیے کے پاس گئے اور اس کو کسی کام سے بھیجنا چاہا، اس نے کام کی زیادتی کی بنا پر معذرت کی، حسین بن منصور نے کہا کہ تم میرے کام سے جاؤ میں تمہارے کام میں مدد کروں گا اور جب وہ ان کا کام کر کے واپس آیا تو دیکھا کہ اس کا سارا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کے بعد یہ حلاج کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ابن منصور حلاج کی پیدائش واسط میں ہوئی، ان کے والد بیضاء کے رہنے والے تھے؛ لیکن واسط میں آکر آباد ہوگئے تھے، حلاج نے کم عمری میں ہی تعلیم کی تکمیل کرلی، اس کے بعد سہیل بن عبداللہ تستری کے مرید ہوگئے، کچھ عرصہ بعد بصرہ میں

حضرت حسن بصری کے قائم کردہ مدرسہ میں تعلیم کی تکمیل کے لئے گئے، یہاں ان کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہوئی جن پر حکومت سے بغاوت کا الزام تھا، حسین سے بھی پوچھ گچھ کی گئی اور پریشان ہوکر انہوں نے بصرہ چھوڑ دیا اور بغداد جا بسے، وہاں انہوں نے ابو یعقوب اقطع کی بیٹی سے شادی کی اور عمرو بن عثمان مکی کے مرید ہوگئے۔ اس دوران حلاج نے کئی سفر کئے اور بعض وجوہات کی بنا پر ان کے پیر سے ان کے تعلقات خراب ہوگئے، اس سے قبل انہوں نے حضرت جنید بغدادی کی محفل میں بھی جانا شروع کردیا تھا، بلکہ باضابطہ مرید ہوگئے تھے، لیکن بغداد سے سفر کرنے کے بعد ان کے بارے میں بدگمانیاں بہت پیدا ہوگئیں، خاص طور پر ہندوستان کے سفر کے بارے میں لوگوں کا تاثر تھا کہ وہ جادو سیکھنے کے لئے ہندوستان گئے تھے، بہرحال ان کے پیر عمرو بن عثمان مکی نے ان کو اپنی محفل سے نکال دیا اور ان کے استاد حضرت جنید بغدادی نے بھی ان پر پابندی لگادی، بلکہ حضرت جنید بغدادی نے حلاج کی مخالفت شروع کردی، اخبار الحلاج کے اندراجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت جنید بغدادی کی مخالفت کی وجہ سے کئی ایسی مجالس جہاں حلاج بھی موجود تھے، دونوں کے مریدین میں جھگڑے تک نوبت پہنچ گئی۔ اس دوران حلاج کے خلاف ابن داؤد اصفہانی نے فتوی دیا، وہ گرفتار ہوئے، لیکن ایک سال جیل میں رہنے کے بعد فرار ہوگئے اور بغداد چھوڑ دیا۔ بعد میں خفیہ طور پر بغداد آئے؛ لیکن کچھ لوگوں کی مخبری پر گرفتار کرلئے گئے، تقریباً آٹھ سال جیل میں رہے، اس دوران ان پر مقدمہ چلتا رہا اور تحقیقات ہوتی رہیں، آخر علماء کی ایک بڑی جماعت نے مختلف مذہبی اور سیاسی الزامات کی بنا پر ان کے قتل کا فیصلہ کیا اور 27/ مارچ 922 کو دریائے دجلہ کے کنارے حلاج کو پھانسی دے دی گئی۔

حسین بن منصور حلاج تاریخ اسلامی کی انتہائی متنازع شخصیت ہیں، ایک گروہ ان کو صوفی مانتا ہے، ایک گروہ ان پر طرح طرح کے اعتراضات کرتا ہے، ایک مشہور بات یہ ہے کہ حلاج نے "انا الحق" کہا تھا اس لئے اس کو پھانسی دی گئی تھی؛ لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے۔

حسین بن منصور حلاج نے اپنی زندگی میں متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ابن ندیم نے ان کی کتابوں کی تعداد 46 لکھی ہے، ان کی دستیاب کتابوں میں: کتاب الطّواسین، اور دیوان الحلاج بہت مشہور ہیں، ان دونوں کو لوئس یسینیون نے ایڈٹ کرکے شائع کردیا ہے۔

کتاب الطّواسین میں بڑی پیچیدہ عباراتیں ہیں، ان سے کوئی واضح مفہوم اخذ کرنا بہت مشکل ہے، البتہ امام ابوالقاسم القشیری نے ان کے بعض خیالات کی ترجمانی ہے۔

21.12 محی الدین ابن عربی (1240-1165ء)

ابوبکر محی الدین محمد بن علی جو شیخ الاکبر اور ابن اعربی کے نام سے مشہور ہیں، مُرسیہ جو اندلس کے جنوب مشرق میں واقع ہے، میں 560ھ 1165ء میں پیدا ہوئے، 568ھ میں وہ اپنے وطن سے اشبیلیہ چلے آئے جو اس وقت علوم کا بہت بڑا مرکز تھا اور یہاں تیس سال رہ کر بڑے بڑے علماء سے تحصیل علم کیا۔

38 برس کی عمر میں بلاد مشرق کی طرف روانہ ہوئے اور پھر اپنے وطن کبھی واپس نہ گئے، آپ پہنچے، وہاں کچھ عرصے قیام کیا، پھر دمشق گئے، اس کے بعد ایشیائے کوچک اور مشرق قریب کی طرف سیر سیاحت کے لئے نکلے جس میں مکہ معظمہ، بیت المقدس، بغداد اور حلب گئے۔ آخر 638ھ 1240ء میں دمشق میں جہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، انتقال ہوا۔

ابن عربی کی شخصیت ایک ایسی شخصیت ہے جس کو لے کر پوری ملت اسلامیہ میں اختلاف وافتراق پیدا ہوا، بعض لوگوں کے نزدیک ابن عربی کی شخصیت قابل قدر و وقعت ہے، ان کے نزدیک وہ ولی کامل، قطب عالم اور علم باطنی میں ایسے مستند ہیں کہ اس میں کلام ہی نہیں ہوسکتا، ان کے مداح میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء ہیں، مثلاً:

مجد الدین الفیروز آبادی، الفخر الرازی، الجلال السیوطی اور عبدالوہاب الشعرانی وغیرہ۔

بعض لوگوں نے ان کو ملحد قرار دیا ہے ان میں ابن تیمیہ اور امام ذہبی وغیرہ ہیں۔

آج بھی ان کی تصنیفات کے متعلق یہ متضاد رویہ اپنایا جاتا ہے، بعض لوگ تصوف میں قدم رکھتے ہی ان کی تصنیفات کے مطالعہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، بعض لوگ ان کے مطالعہ سے منع کرتے ہیں۔

ابن عربی نے بڑی تعداد میں کتابیں تصنیف کی ہیں ان کی تعداد میں اختلاف ہے، بعض لوگوں نے ان کی کتابوں کی تعداد 500 تک بتائی ہے۔

انھوں نے اپنے بعد بڑی کثرت میں کتابوں کا ذخیرہ چھوڑا ہے، یہ کتابیں اس زمانے کے تمام علوم پر حاوی ہیں، لیکن بیشتر کا موضوع تصوف ہے، اس وسیع و بسیط موضوع کے علاوہ حدیث، تفسیر، سیرت النبی، ادب جس میں ان کی متصوفانہ شاعری بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ طبعیات اور علوم انسانیت پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ چند کتابوں کو چھوڑ کر ان کی اہم تصنیفات بلاد مشرق، مکہ اور دمشق میں لکھی گئیں، ان میں فتوحات، فصوص اور تنزلات قابل ذکر ہیں، یہ ابن عربی کی پختہ ترین فکر کی آئینہ دار ہیں، جو آخری بیس سالوں میں لکھی گئیں، ان کی چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

1. الفتوحات المکیہ فی اسرار المالکیہ و الملکیہ۔

یہ کتاب مکہ میں 489ھ میں لکھی، یہ ایک ضخیم، اہم اور آخری کتاب ہے۔

2. فصوص الحکم:

اس کی تالیف 627ھ میں ہوئی اس پر مولانا اشرف علی تھانوی نے تنقید لکھی ہے۔

3. انشاء الدوائر

4. الکبریت الاحمر

5. ترجمان الاشواق

6. شجرة الکون

ابن عربی کے اسلوب میں یکسانیت نہیں ہے، ان کا اندازِ بیان اور اندازِ فکر بدلتا رہتا ہے، وہ کبھی واضح اور سلیس اور کبھی دقیق اور مبہم اسلوب اختیار کرتے ہیں، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ جن چیزوں پر قلم اٹھاتے ہیں، وہ مذہبی اعتبار سے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے یہاں شاعرانہ رنگین بیانی اور سادہ نثر بھی پائی جاتی ہے، ترجمان الاشواق کی بعض نظموں کو عربی کی اعلیٰ ترین متصوفانہ نظموں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ابن عربی ایک صوفی فلسفی ہیں، فلسفی اس اعتبار سے ہیں کہ مادے کے بارے میں ایک معین نظریہ پیش کرتے ہیں اور صوفی فلسفی اس اعتبار سے ہیں کہ اپنے تصورات کو تصوف کا لباس پہناتے ہیں۔

ابن عربی کے متعلق ابن سدی کا یہ قول قابلِ قدر ہے۔

كان ظاهری المذهب فی العبادات و باطنی النظر فی الاعتقادات۔

وہ بنیادی اصول جس پر ابن عربی کے متصوفانہ فلسفہ کی بنیاد ہے، وہ عقیدۂ وحدۃ الوجود ہے، اس کو مجمل طور پر چند الفاظ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''بزرگ و برتر ہے وہ ذات جس نے سب اشیا پیدا کی ہیں اور جو خود ان کا جوہر۔ (فتوحات)

یہ عقیدۂ وحدۃ الوجود کی ایسی صورت ہے، جس کی رو سے تمام عالم اشیاء اس حقیقت کا سایہ ہے اور جو اس کے پیچھے مخفی ہے، یعنی حقیقت صرف ایک ہے اور یہ عالم اشیاء محض ایک واہمہ ہے۔

ابن عربی کے نزدیک خدا کی ذات ایسی واجب الوجود اور غیر شرکت پذیر حقیقت ہے جو ہماری فکر و بیان کی گرفت میں نہیں آسکتی؛ لیکن دوسری طرف وہ ایک ایسی ذات ہے جس پر ایمان لایا جاتا ہے اس سے محبت کی جاتی ہے اور اس کی عبادت کی جاتی ہے۔

مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر سے کلام الٰہی کائنات میں معقول اور زندہ اصل ہے، اور ابن عربی جس کو حقیقۃ الحقائق کے نام سے یاد کرتے ہیں، متصوفانہ اور روحانی نقطۂ نظر سے یہ حقیقۃ المحمدیہ کے مترادف ہے، جس کی اعلیٰ ترین اور مکمل ترین تجلی انسان کامل میں ملتی ہے اور انسان کامل میں تمام انبیاء اور اولیاء اور خود نبیؐ شامل ہیں۔

انسان کامل ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اسرار الٰہیہ منعکس ہوتے ہیں، وہ ایسی واحد تخلیق ہے جس میں تمام صفات الٰہیہ ظاہر ہوتی ہیں، انسان کامل خلاصۂ کائنات (عالم اصغر) ہے، خدا کا نائب ہے، انسان کامل وہ ذات صفتی ہے جسے خدا کی صورت میں بنایا گیا ہے۔

ابن عربی کے فلسفہ کی جڑیں اسلامی تصوف اور الٰہیات میں گہری چلی گئی ہیں۔

21.13 شیخ شہاب الدین سہروردی (1145-1235ء)

ابو حفص شہاب الدین عمر بن محمد البکری سہروردی، تصوف کے امام اور اجلہ مشائخ میں شمار ہوتے ہیں، آپ کی عوارف المعارف کو تصوف کی تاریخ میں امتیازی مقام حاصل ہے اور آپ کا جاری کردہ سلسلہ سہروردیہ تصوف کے اہم ترین سلاسل میں سے

ایک شمار کیا جاتا ہے، ان کی مرکزیت اور قطبیت کا یہ عالم تھا کہ بلاد و امصار کے صوفیہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اکتساب فیض کرتے تھے اور اس لئے آپ کو شیخ الشیوخ کا خطاب عطا کیا گیا۔

ماہ رجب 539 ہجری میں آپ کی ولادت ہوئی اور محرم الحرام 632ء میں وفات ہوئی، بغداد میں پیدا ہوئے اور ساری عمر اس شہر میں بسر کردی۔

شہاب الدین سہروردی نے اپنے وقت کے نہایت قابل اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور خاص طور پر قرآن وحدیث کے علاوہ علم کلام سے مناسبت پیدا کی؛ لیکن ان کے عہد تک علم کلام ایک زوال آمادہ موضوع بن گیا تھا اور محض جدلی اور منطقی طرز گفتگو کا رہین منت تھا، اس کا عملی رشتہ اور معاشرہ پر اس کے عملی اثرات ختم ہو چکے تھے، امام غزالی کے بعد تو علم کلام کی وقعت ویسے بھی بے معنی ہو گئی تھی، شہاب الدین سہروردی کو بھی اس کا احساس ہوا اور انہوں نے علم کلام کی ذہنی موشگافیوں کی تنگنائے سے باہر قدم نکال کر علم تصوف کی سرمدی فضاؤں میں اپنے فکر کی جولانگاہ تلاش کی، کہتے ہیں کہ حضرت پیران پیر غوث اعظم دستگیر نے دعا بھی کی تھی کہ اللہ شہاب الدین عمر کے علم کلام کا شوق ختم کردے، اور شریعت وتصوف کی طرف ان کو مائل کردے۔

شہاب الدین سہروردی کے چچا شیخ ابوالنجیب ضیاء الدین سہروردی بھی اپنے وقت کے جید صوفی تھے اور انہوں نے بغداد میں ہی شہر سے ہٹ کر ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی تھی، ان کی کتاب آداب المریدین اب بھی مشہور ہے، شہاب الدین سہروردی اپنے چچا سے مرید بھی ہوئے اور ان کے جانشین بھی بنے، ان کی خانقاہ کو انہوں نے باضابطہ ایک سلسلہ میں تبدیل کردیا اور سلسلہ سہروردیہ شروع ہوا۔

سہروردیہ سلسلہ کو شروع سے ہی بڑے جلیل القدر مریدین وتلامذہ ملتے رہے، خود شہاب الدین سہروردی کے مریدین میں شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی، صوفی حمید الدین ناگوری اور شیخ نجیب الدین علی جیسے اساطین شامل رہے ہیں۔

شہاب الدین سہروردی نے متعدد کتابیں لکھیں، ان میں اعلام الہدی، رشف النصائح اور بہجت الاسرار کے علاوہ عوارف المعارف بڑی مشہور کتاب ہے، اس کا تفصیلی تذکرہ الگ سے آرہا ہے، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور 63/ابواب پر مشتمل ہے، پہلی جلد کے زیادہ تر موضوعات تصوف اور صوفیہ سے متعلق ہیں، اور دوسری جلد کے زیادہ تر موضوعات میں مذہبی فرائض، ان کی درست طریقے پر ادائیگی اور اصلاح باطن وغیرہ ہیں۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کے نزدیک تصفیہ قلب وتزکیہ نفس کا واحد ذریعہ اتباع سنت رسول ہے، جو شخص اس چشمہ سے جتنا زیادہ سیراب ہوگا اس کا تزکیہ نفس اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ شیخ سہروردی کی نظر میں تمام اسلامی علوم، تفسیر اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، کلام، معانی، بلاغت، غرض تمام علوم جو فہم شریعت میں کام آتے ہیں، وہ سب تصوف میں ممد ومعاون ہیں، مقدمات تصوف ہیں، تصوف کے خلاف نہیں ہیں۔ خلقت کی اصل رسول اللہ کی ذات ہے، ساری کائنات اس کے طفیل وجود میں آئی ہے، جو شخص جتنا زیادہ رسول اکرم کی حیات طیبہ سے مناسبت رکھے گا اس کے اعتبار سے وہ علم وفضل میں زیادہ ہوگا۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی فرماتے تھے کہ سب سے افضل عمل شکر ہے لیکن عبادات کے مقابلے میں لوگ شکر کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور شکر کا اصل مصدر قلب ہے، اس لیے قلب سے وہی کام لو جس کے لیے وہ بنا ہے، زمین میں صاحبان دل ہی اللہ تعالی کے محبوب ہیں اور اللہ اس کو پسند نہیں فرماتا کہ قلوب میں غیر اللہ کی پرستش کی جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ

مذہبی سیادت اور دنیاوی جاہ ومنصب سب ان کو حاصل تھا، انہوں نے عظمت ورفعت کی ان بلندیوں کو اچانک خیر باد کہہ دیا اور گوشہ گمنامی میں جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، یہ امام صاحب کی زندگی کا عجیب وغریب واقعہ ہے، اور اس واقعہ نے ہی درحقیقت ان کی زندگی کا رخ اس طرف پھیرا جہاں سے ایک نئے امام غزالی کا طلوع ہوتا ہے۔

وہ تمام دنیاوی علائق کو ترک کر کے اور کامل یکسو ہو کر عبادت وریاضت اور چلہ ومراقبہ میں لگ گئے، بغداد میں رہ کر یہ یکسوئی میسر نہیں آسکتی تھی، اس لیے خاموشی کے ساتھ بغداد کو چھوڑا اور دمشق چلے گئے، جہاں دو سال تک ان کا معمول تھا کہ جامع اموی کے غربی مینار پر چڑھ کر دروازہ بند کر لیتے اور سارا دن ذکر ومراقبہ میں مصروف رہتے، دو سال کی سخت ریاضت ومحنت کے بعد غالباً ان کو یک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا، وہاں سے نکل کر وہ یروشلم گئے، پھر حج کا ارادہ کیا اور حجاز کے سفر پر روانہ ہوئے، دو سال یہاں قیام رہا پھر مصر اور سکندریہ کا سفر کیا، اور دس سال کی ایک طویل علمی سیاحت کے بعد بغداد پہنچے۔ وہاں تدریسی ذمہ داریاں پھر منتظر تھیں۔ نظام الملک کا انتقال ہو چکا تھا فخر الملک ان کی جگہ وزیر تھے، انہوں نے امام صاحب کو وہی مقام دیا جو ان کے والد نے دیا تھا لیکن جلد ہی محرم الحرام 500ھ میں فخر الملک کو بھی ایک باطنی نے شہید کر دیا، اس کے بعد امام غزالی بھی دوبارہ ہر چیز ترک کر کے طوس یعنی اپنے وطن چلے گئے، جہاں انہوں نے ایک خانقاہ اور ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا اور اس میں درس وتدریس اور وعظ وتذکیر کرتے ہوئے ۱۴/ جمادی الثانی 505ھ مطابق دسمبر ۱۱۱۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

امام صاحب کی کنیت ابوحامد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کوئی بیٹا ہو گا؛ لیکن کتب تذکرہ میں ان کی صرف چند بیٹیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

معنوی اولاد ان کے تلامذہ ہیں، ان کی تعداد یقیناً ہزاروں میں ہو گی؛ چوں کہ ان کے حلقہ درس میں چار سو طلبہ بیک وقت ہوتے تھے اور انہوں نے ایک طویل عرصہ تک تدریس کے فرائض انجام دئے، کتب تذکرہ میں ان کے چند ممتاز تلامذہ کے نام ملتے ہیں جن میں ایک نام احمد بن تومرت ہے۔ جس نے اسپین میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔

امام غزالی کا اصل کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں، انہوں نے صرف 54 سال کی عمر پائی، اس میں بھی دس سال وہ سیر وسیاحت میں رہے اس دوران صرف ایک کتاب لکھی اور آخر کے پانچ سال بھی انہوں نے عزلت گزینی میں بسر کیے، اس طرح اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انہوں نے بیس سال کی عمر میں تصنیف وتالیف کا آغاز کیا تھا تو گویا یہ سارا کارنامہ صرف 30 سال میں مکمل کیا۔

ان کی مصروف ترین زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد اور بھی بعید از قیاس لگتی ہے پھر تصنیفات میں تنوع بہت ہے، قرآن، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، تصوف اور حکمت شریعت کے علاوہ، فلسفہ، ردفلسفہ، منطق اور عقلی علوم پر انہوں نے بصیرت افروز کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی وہ تصنیفات جن کا شہرہ اور جن کی افادیت آج بھی مسلم ہے، ذرج ذیل ہیں۔

احیاء علوم الدین ان کی سب سے مشہور کتاب ہے، یہ کتاب حکمت شریعت میں ہے، اس میں امام صاحب نے فلسفہ ومذہب کو باہم آمیز کر کے اسلامی عقائد کو عقلی استدلال اور مذہبی رسوم کو زندہ عملی نمونے کے طور پر پیش کیا ہے، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ایک ہزار سال گزرنے کے بعد بھی یہ عالم اسلام کی چند منتخب کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اور متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

تہافۃ الفلاسفہ امام غزالی کی دوسری مقبول ترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے فلاسفہ کے بنیادی مسلمات اور ان کی حقیقت کا جائزہ لیا ہے، اس کے ساتھ ہی ایک اہم کتاب معیار العلم بھی ہے۔ یہ کتاب دراصل فلاسفہ کے ذرائع علم کا تنقیدی جائزہ ہے۔

کیمیاء سعادت بھی امام غزالی کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب تصوف کی اہم کتاب ہے، اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ امام صاحب نے یہ کتاب اپنی مادری زبان فارسی میں تحریر کی تھی، جب کہ اس کے علاوہ دیگر کتابیں بالعموم عربی میں لکھی گئی ہیں۔

فقہ اور اصول فقہ میں المستصفی اور وسیط، وجیز اور بسیط مشہور ہیں۔ تصوف میں مشکوٰۃ الانوار، معراج السالکین اور جواہر القرآن مشہور ہیں۔ کلام میں القول الجمیل، التفرقہ بین الاسلام والزندقہ اور الجام مشہور ہیں۔

اور امام غزالی کی فکری سوانح عمری ''المنقذ من الضلال'' باوجود اپنے مختصر حجم کے نہایت معرکہ آراء کتاب ہے، اس کتاب کے بھی مختلف زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔

امام غزالی نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ اس وقت کے مروجہ اسلامی معاشرے پر دینی نقطۂ نظر سے تنقید کی، معاشرے کی خرابیوں کو بیان کیا، کورانہ تقلید کو نشانہ تنقید بنایا، مذہب کی حقیقت اور اہمیت کو بیان کیا، کلامی موشگافیوں اور فقہی حیلہ کاریوں پر تنقید کی۔

معلومات کی جانچ

1. جنید بغدادی کو خراز کیوں کہا جاتا ہے؟
2. جنید بغدادی کا انتقال کب ہوا؟
3. کس صوفی کو شیخ اکبر کہا جاتا ہے؟
4. فصوص الحکم کس کی تصنیف ہے؟
5. سلسلہ سہروردیہ کا بانی کون ہے؟
6. کس کتاب کو امام غزالی کا شاہکار کہا جاتا ہے؟

21.15 شیخ عبدالقادر جیلانی (1077-1166ء)

حضرت خواجہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جو عوام میں غوث پاک یا بڑے پیر صاحب کے نام سے معروف ہیں، علم و حکمت، شریعت و طریقت اور سلوک و معرفت کے امام تھے، تصوف کے چار مشہور سلسلوں میں سے سلسلہ عالیہ قادریہ کے بانی تھے، برصغیر ہند و پاک اور عالم عرب میں عراق و شام کے عوام پر آپ کے زبردست اثرات رہے ہیں۔ آپ کی ذات بابرکت کے فیضان سے ہزاروں لوگوں کو سلوک کے منازل طے کرنے میں مدد ملی اور لاکھوں لوگوں نے آپ کے فیضان سے راہ انابت اختیار کی، آپ کی ذات گرامی کا فیضان وقت کی ہر رفتار کے ساتھ وسعت اور عظمت حاصل کرتا رہا اور آپ کے ذریعہ جاری کردہ سلسلہ قادریہ کے حلقہ اثر میں آکر بلاد و امصار کے لوگ توبہ اور انابت کے راستہ پر گامزن ہوتے رہے۔

تھے اتنے ہی امراء وسلاطین پر بھی تھے، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ سے ایسے اعتدال وتوازن سے متصف تھی جس میں بلند وپست اور ادنا واعلا کے تمام تضادات از خود تحلیل ہو جاتے ہیں۔ شمس تبریز سے ملاقات کے بعد مولانا کی دنیا بدل گئی اور ان کے جہان باطن میں ایسا انقلاب برپا ہوا جس نے ان کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ اسلام کی علمی تاریخ کے دھارے کو بھی بدل کر رکھ دیا، اس توفیق عشق سے پہلے تک مولانا روم محض درس وتدریس، وعظ وارشاد اور فتوانویسی میں مصروف رہتے تھے، سماع اور بالخصوص شاعری سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، شمس تبریز کے ساتھ تعلق کے بعد وہ نہ صرف سماع کے دلدادہ ہو گئے، بلکہ شاعری کا ایسا سلسلہ شروع بھی ہوا جس نے فارسی شاعری کی تاریخ کا ایک نیا نقش قائم کر دیا۔

مولانا رومی کی ذہنی وفکری تربیت ان کے والد شیخ بہاء الدین نے کی تھی جو اپنے زمانے کے جید علماء میں تھے، ان کے علمی اثرات کا یہ عالم تھا کہ جس شہر اور قریے سے گذرتے تھے وہاں کے خواص وعوام سب شہر کے باہر ہی ان کے استقبال کے لئے منتظر رہتے تھے، اہل اقتدار ان سے کس قدر متاثر تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا بہاء الدین بغداد پہنچے تو بادشاہ روم کیقباد کے کچھ سفارت کار وہاں موجود تھے، یہ لوگ مولانا کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان کے خطاب کی طاقت سے مسخر ہو کر ان کے حلقہ بگوش ہو گئے، مولانا بہاء الدین کیقباد کی درخواست پر ہی قونیہ پہنچے تو کیقباد نے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ ان کا استقبال کیا، شہر پناہ کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور پیدل چلتا ہوا آیا اور مولانا کو ایک شاندار مکان میں ٹھہرایا، انہی مولانا بہاء الدین کے ہاں 702ء میں جلال الدین رومی کی ولادت ہوئی۔

ظاہر ہے مولانا رومی جیسے حساس اور روحانی طور پر بیدار شخص نے بہت سا علم اور معرفت لاشعوری طور پر اپنے گھر کے ماحول اور اپنے والد کی نسبت سے حاصل کی ہوگی، یہ ایک ایسی عطائے خاص ہے جو دنیا کے کسی بھی مکتب سے حاصل نہیں ہوسکتی، ان کی ابتدائی تعلیم اپنے وقت کے زبردست بزرگ اور عالم سید برہان الدین کے زیر سایہ ہوئی، انہوں نے شروع میں مولانا رومی کو تمام ظاہری علوم کی تعلیم دی اور اس کا منتہی بنا دیا، اور مولانا بہاء الدین کی وفات کے بعد انہیں باطنی اور روحانی علم سے بھی سرفراز کیا۔ شیخ بہاء الدین جب نیشا پور پہنچے تو وہاں فرید الدین عطار سے ان کی ملاقات ہوئی، کہا جاتا ہے کہ شیخ عطار نے مولانا جلال الدین رومی کو دیکھا تو ان کے پرُ جلال مستقبل کی پیش گوئی کی اور اپنی کتاب 'اسرار نامہ' بطور تحفہ عنایت کی، مولانا رومی اس کتاب کو حد درجہ عزیز رکھتے تھے۔

والد کے انتقال کے وقت مولانا کی عمر چوبیس سال تھی، وہ اس وقت تک علوم ظاہر وباطن میں کمال حاصل کر چکے تھے، مگر اس کے باوجود علم کی طلب ایسی تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی، چنانچہ پہلے لارندہ گئے اور وہاں ایک سال قیام کر کے حلب پہنچے جہاں انہوں نے کئی مدارس میں تحصیل علم کی، حلب میں کئی اسباب کے تحت ان کی شہرت بہت بڑھ گئی اور حد درجہ مرکز توجہ بن گئے تو ایک روز چپکے سے دمشق روانہ ہو گئے، دمشق میں انہوں نے اس زمانے کے ممتاز علماء سے فیض حاصل کیا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ دمشق میں مولانا رومی کو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی، شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ صدر الدین قونوی وغیرہ سے خوب قربت حاصل رہی اور علمی مذاکرات کا موقع ملا۔

دمشق سے واپس آکر مولانا نے قونیہ میں مسند درس وارشاد سنبھالی اور ایک عالم ان سے فیض یاب ہونے لگا، اس وقت قونیہ علماء وفضلا کا ایک بڑا مرکز تھا، خود مولانا کے مدرسے میں طلبہ کی تقریباً چار سو تھی۔ اس زمانے میں مولانا کی علمی سرگرمیاں درس وتدریس کے علاوہ وعظ وتذکیر اور فتوانویسی پر مشتمل تھیں۔

اسی دوران جب مولانا کی عمر تقریباً چالیس سال تھی انہیں شمس تبریز کا دیدار ہوا اور شمس تبریز کی نگاہ نے ان کے دل ودماغ اور باطن کی دنیا کو تہہ وبالا کردیا، انہوں نے درس وتدریس اور وعظ وغیرہ کا سلسلہ یک قلم ترک کردیا اور ایک گہرے استغراق اور جذب کے عالم میں رہنے لگے، اس کے بعد کا جو سلسلہ واقعات ہے وہ مولانا روم اور تصوف کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے جس سے اہل علم واقف ہیں۔ مولانا کا اپنی کیفیات میں غرق ہوتے چلے جانا، ان کے مریدوں کا شمس تبریز سے ناراض ہونا، شمس تبریز کا اچانک کہیں چلے جانا، مولانا کا صدمۂ ہجر سے گذرنا اور شمس تبریز کی تلاش میں جانا، شمس کی واپسی اور اس کے بعد پھر ہمیشہ کے لئے چلے جانا، مولانا کا دوبارہ ان کی تلاش میں نکلنا اور مایوس ہوکر واپس آنا، پھر شیخ صلاح الدین کے زیراثر آنا وغیرہ واقعات تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں جنہیں کوئی بھی پڑھ سکتا ہے، دراصل اہمیت ان واقعات کی اتنی نہیں ہے جتنی کہ ان اثرات کی جو ان واقعات کے تحت مولانا رومی کے شعور وشخصیت پر مرتب ہوئے، ان اثرات میں اہم ترین اثر یہ ہوا کہ مولانا کے ہاں شاعری کا سلسلہ شروع ہوگیا، شمس تبریز پہلی بار غائب ہوئے تو اس دوران مولانا نے بہت سی وصالیہ غزلیں کہیں، مگر مرشد کے دوسری بار غائب ہونے کے بعد ان کی غزلوں میں شدید حزنیہ لہجہ پیدا ہوگیا جس میں ہجر کے اضطراب کا جذبہ بہت نمایاں ہے، لیکن مولانا کی قلب ماہیت کا عظیم ترین اثر ان کی مثنوی کی صورت میں ظاہر ہوا جو ان کے بعد تمام عالم میں مثنوی معنوی کے نام سے معروف ومقبول ہوئی۔

روحانی انقلاب برپا ہونے سے پہلے تک مولانا رومی کی زندگی زبردست عالمانہ جاہ وجلال کا مظہر تھی، جب بھی گھر سے نکلتے تھے تو امراء اور طلبہ کا ایک بڑا گروہ ساتھ ہوتا تھا، ان کا بیشتر وقت مناظرے اور مجادلے میں گذرتا تھا اور اس فن میں وہ دوسرے علماء سے بہت آگے تھے، مگر باطنی انقلاب سے گذرنے کے بعد ان پر ایک عجیب وغریب خودرفتگی اور گم شدگی کا عالم طاری رہتا تھا، سخت ریاضت اور مجاہدہ کرتے تھے، سپہ سالار جو برسوں ان کے ساتھ رہے، کہتے ہیں کہ انہوں نے مولانا کو کبھی بھی شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، اکثر جاگتے اور عبادات میں غرق رہتے تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سوجاتے تھے۔ مولانا اکثر روزہ رکھتے تھے اور بعض روایتوں کے مطابق لگاتار دس بیس بیس دن تک کچھ بھی نہیں کھاتے تھے، نماز کا یہ عالم تھا کہ سپہ سالار کے مطابق ایک رات عشاء کے وقت نیت باندھی اور دو رکعتوں میں صبح ہوگئی، ایک اور روایت کے مطابق ایک بار مولانا رومی نماز میں اس قدر روئے کہ چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے پوری طرح بھیگ گئے اور چوں کہ شدید ٹھنڈ تھی اس لئے چہرے اور دارھی پر برف جم گئی۔

مولانا رومی کی تین تصانیف معروف ہیں، فیہ مافیہ، دیوان شمس تبریز اور مثنوی۔ فیہ مافیہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کو لکھے تھے، ان خطوط میں مولانا نے کچھ اپنی ذاتی زندگی اور بیشتر حقائق ومعارف کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ دیوان شمس تبریز ان غزلوں کی کتاب ہے جو مولانا نے شمس تبریز سے منسوب کرکے لکھی ہیں۔ مثنوی ہی دراصل مولانا کی وہ عظیم شعری تخلیق ہے جس نے ان کے نام کو لوح وقت پر ہمیشہ کے لئے رقم کردیا ہے، اس کتاب نے فارسی ادب کے دیگر تمام فن پاروں کو شہرت اور مقبولیت کے معاملے میں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے، مثنوی میں 6662 اشعار ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ نقشبندیہ سلسلہ کو حضرت مجدد الف ثانی نے بڑی جدو جہد کر کے پورے ہندوستان اور بلاد اسلامیہ میں پھیلایا۔ اس سلسلہ میں حکومت سے روابط کو بھی ممنوع نہیں سمجھا جاتا تھا، اس لیے حضرت مجدد الف ثانی نے معسکر کے دوران قیام خود جہانگیر کو بھی متاثر کرنے کی کوشش اور بہت سے دیگر امراء کو بھی خطوط لکھ کر اور بالمشافہ بھی اس پر آمادہ کیا کہ وہ اسلام کی اشاعت میں تعاون کریں، چنانچہ ایسے بہت سے خطوط آپ کے مجموعہ خطوط میں شامل ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے بعد خواجہ معصوم ان کے جانشین ہوئے اور انھوں نے بھی اس سلسلے کی اشاعت کی، انہوں نے بھی اپنے والد کا طریقہ اختیار کیا اور مختلف علاقوں میں اپنے مریدین کو خطوط کے ذریعہ منظم کیا، ان کے مکاتیب کا مجموعہ مکتوبات خواجہ معصوم کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

حضرت خواجہ معصوم کے بعد اس سلسلہ میں مرزا مظہر جان جاناں ایک عظیم شخصیت گذرے ہیں، ان کے علاوہ شاہ غلام علی بھی اس سلسلے کے بڑے اولیاء میں سے ہیں، اس سلسلے میں اور بھی کئی نامور شخصیات گذری ہیں، لیکن اس سلسلہ کو جو وسعت حضرت خواجہ سرہندی کے عہد میں ہوئی، وہ بعد میں نہیں ہوئی۔

سلسلہ چشتیہ میں جس طرح حکومت سے دور رہنے کو خاص اہمیت دی جاتی ہے، اس طرح سلسلہ نقشبندیہ میں حکومت شجر ممنوعہ نہیں ہے، بلکہ حکومت کو اور حکومت کے افراد کو دین کی اشاعت اور اپنے افکار کی توسیع کے لیے استعمال کیا گیا، بہت سے امراء اس سلسلہ سے وابستہ ہوئے اور اورنگ زیب عالمگیر کو تو اس سلسلہ سے بڑی عقیدت تھی، وہ خود خواجہ معصوم کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔

نقشبندیہ سلسلہ میں سب سے اہم کتاب شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات ہیں جو مکتوبات امام ربانی کے نام سے مشہور ہیں، یہ مکتوبات تین جلدوں میں ہیں اور حضرت کے کئی مریدوں نے مرتب کیے ہیں۔ ان کے علاوہ مکتوبات خواجہ معصوم سرہندی بھی اس سلسلہ میں خاص اہمیت کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے، متقدمین کی کتابوں میں سے الرسالہ القشیریہ کا مطالعہ بھی ان کے یہاں معمول میں رہا ہے۔

سلسلہ نقشبندیہ کے بنیادی افکار بانی سلسلہ نے حضرت عبدالخالق غجدوانی سے اخذ کیے تھے اور بعد میں ان میں کچھ اضافہ کر کے اس کو سلسلہ نقشبندیہ کا بنیادی نصاب اور اس کی بنیادی خصوصیت بنایا، حضرت عبدالخالق غجدوانی کے یہاں یہ آٹھ الفاظ تھے جو اصول ہشتگانہ کہلاتے ہیں: (1) ہوش دردم (2) نظر برقدم (3) سفر دروطن، (4) خلوت درانجمن (5) یاد کرد (6) بازگشت (7) نگاہ داشت (8) یادداشت، حضرت محمد بہاؤالدین نقشبند نے اس پر تین کلمات یا اصولوں کا مزید اضافہ کیا یعنی: (9) وقوف عددی (10) وقوف زمانی (11) اور وقوف قلبی۔

اس طرح نقشبندیہ سلسلہ میں یہ گیارہ بنیادی اعمال و افکار ہیں، ان کی مختصر تشریح اس طرح ہے:

(1) ہوش دردم : ایک بھی سانس بے خبری کے عالم میں نہ لیا جائے

(2) نظر برقدم : نظر اپنے قدموں پر رہے تاکہ حصول منزل میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے

(3) سفر دروطن : اپنے مقام پر رہتے ہوئے سفر اختیار کرنا

(4) خلوت درانجمن : محفل میں بھی اپنی لو صرف اللہ سے لگائے رکھنا

(5) یادکرد : دل وزبان سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنا

(6) بازگشت : دل ودماغ میں ہروقت اللہ کے ذکر کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہے

(7) نگاہ داشت : اپنے اعمال پر ہروقت نگرانی رکھنا،

(8) یادداشت : اللہ تعالیٰ کو ہروقت اور ہرحالت میں یادرکھنا

(9) وقوف زمانی : اپنے قول وفعل کا ہروقت تجزیہ کرتے رہنا

(10) وقوف عددی : ذکر کے شمار کے ذریعہ دماغ کو بھٹکنے سے روکا جائے

(11) وقوف قلبی : خدا کی یاداس طرح کی جائے کہ اس کے دل میں کوئی دوسرا خیال نہ آنے دیا جائے

حضرت عبدالخالق غجدوانی جن سے بانی سلسلہ نے یہ افکار اخذ کیے انھوں نے ایک موقعہ پر حضرت محمد بہاؤالدین نقشبند کو کچھ نصیحتیں کی تھیں، وہی نصیحتیں بانی سلسلہ نے بطور بنیاد تسلیم کرلیں، اوران میں ضروری ترمیمات بھی کیں، انھوں نے فرمایا کہ:

''تقویٰ کواپنا شمار بناؤ، وظائف وعبادات کی پابندی کرواور احوال کی نگہبانی، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، حقوق اللہ، حقوق الرسول، حقوق الوالدین، حقوق المشائخ کی ادائیگی کی سعی کرتے رہوتاکہ رضائے الٰہی سے مشرف ہوجاؤ.. قرآن مجید کی تلاوت بلند آواز سے یا آہستہ تفکر، خوف اور گریہ کے ساتھ پابندی سے کرو، تمام امور میں قرآن کی پناہ لوکہ وہ بندوں پر حق تعالیٰ کی حجت ہے، علم فقہ اکابر علم حدیث سے سیکھو، جاہل صوفیوں سے دور رہو کہ وہ دین کے راہزن ہیں، اہل سنت و الجماعت اور ائمہ سلف کے مسلک کو اختیار کرو، عورتوں، نوعمرلڑکوں، بدعتیوں اور دولت مندوں سے محبت مت رکھو، کیونکہ یہ دین کو برباد کردیتے ہیں، فقراء کی صحبت، خلوت نشینی، رزق حلال اور قناعت اختیار کرو، حق تعالیٰ کے جلال کا استحضار رکھو، یوم حساب کوفراموش نہ کرو، نہ کسی کی مدح سے مغرور ہواور نہ کسی کی مذمت سے غمگیں، لوگوں سے حسن خلق سے پیش آؤ، نہ اللہ کے عذاب سے بےخوف ہواور نہ اس کی رحمت سے ناامید ہو، کثرت سے نماز پڑھو، روزے رکھو، مشائخ کی خدمت کرو، ان میں سے کسی کا انکار نہ کرو؛ الا یہ کہ وہ مخالف شرع ہو، جوانمرد اور سخی بنو، بخل وحسد سے بچو، نفس کی ضرورتوں کا خیال رکھو، لیکن نفس کی عزت اور لایعنی کلام سے بچو، کم بولو، کم کھاؤ، اور کم سوؤ۔ سماع میں بہت نہ بیٹھو کہ سماع کی کثرت سے نفاق پیدا ہوتا ہے اور دل مردہ، سماع کا انکار بھی نہ کرو، سماع جائز نہیں مگر اس شخص کے لیے جس کا دل زندہ اور نفس مردہ ہو، چاہیے کہ تمہارا دل غمگین، بدن بیمار، آنکھیں اشکبار، عمل خالص، دعا مجاہدہ کے ساتھ، کپڑا پرانا، رفیق درویش، گھر مسجد، مال کتب دین، آرائش زہد اور مونس باری تعالیٰ ہو، اس شخص کی صحبت اختیار کر جس میں پانچ خصلتیں ہوں: (1) فقیری کو امیری پر ترجیح دے (2) دین کو دنیا پر ترجیح دے (3) ذلت کو عزت پر ترجیح دے (4) علم ظاہر وباطن کا جاننے والا ہو (5) موت کے لیے تیار ہو۔

یہ شیخ عبدالخالق غجدوانی کی نصیحتیں تھیں، بانی سلسلہ نے ان میں کچھ ضروری ترمیم اور حذف واضافہ فرما کر ان کو سلسلہ نقشبندیہ کے لیے دستور العمل بنادیا۔

طرہ امتیاز ہے، لیکن ان کے جانشین ان کے صاحبزادے ابوالفتح رکن الدین نے اپنے سلسلہ کی روایتی شناخت کو بحال کیا، حکومت سے بھی روابط استوار کیے اور عوام کی دادرسی میں وہ ایک طرح حکومت اور عوام کے درمیان پل کا کام کرتے تھے، ذاتی زندگی کی سادگی اور فقیر میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن شاہی دربار سے خلعتیں لے کر غریبوں میں تقسیم کرنا، اپنے سرکاری عہدے جن کا تعلق براہ راست عوام کی فلاح و بہبودی سے ہوتا تھا، جیسے صدر الصدور یا شیخ الاسلام کا عہدہ یا قاضیوں کا تقرر، ان پر اثر انداز ہوئے اور ان مناصب کے لیے بہتر لوگوں کا انتخاب کرنے میں حکومت کا تعاون کیا۔

سہروردیہ سلسلے کے ایک اور بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت جو سید جلال الدین سرخ پوش بخاری کے پوتے اور ابوالفتح رکن الدین کے مجاز تھے انھوں نے سلسلہ سہروردیہ کو پورے شمالی ہند میں پھیلایا، اور آپ کے خلفاء نے ہندوستان کے دیگر حصوں میں اس کی اشاعت کی، سلسلہ سہروردیہ کی ہندوستان کے اندر توسیع و اشاعت میں جن دوسرے بزرگوں کا اہم کردار رہا ان میں شیخ فخر الدین نے دکن میں اور سید برہان الدین قطب عالم نے گجرات میں اس سلسلے کی توسیع کی۔

سلسلہ سہروردیہ میں دو کتابوں کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، ایک شیخ ضیاء الدین عبدالقاہر کی کتاب آداب المریدین جو اس سلسلہ میں نصاب کا درجہ رکھتی ہے، اس کے علاوہ دوسری اہم ترین کتاب عوارف المعارف ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے میراث اسلامی کی مشہور ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور اس میں تصوف، سلوک کے آداب، اور خانقاہی نظام پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

ان دو کتابوں کے علاوہ کچھ ملفوظات اور دوسری کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے، تاہم اصل نصاب کی کتاب یہی دونوں ہیں۔

سہروردیہ سلسلہ کی بنیادی تعلیمات بالعموم وہی ہیں جو چشتیہ سلسلہ کی ہیں، دونوں سلسلوں کی بنیادی کتابیں بھی ایک ہی ہیں، لیکن کچھ امور میں اختلاف بھی ہے، مثلاً وحدۃ الوجود کا رویہ چشتی صوفیہ کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے؛ لیکن سہروردی صوفیہ بالعموم وحدۃ الوجود کا انکار کرتے ہیں، چند صوفیہ نے اس کو تسلیم کیا ہے لیکن سلسلہ میں بالعموم اس کو قبول حاصل نہیں ہوا۔

دوسرا بڑا اختلاف حکومت کے معاملے میں ہے، سہروردی صوفیہ حکومت سے تعلق رکھتے ہیں اور عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے اس تعلق کو استعمال کرتے ہیں، حکمرانوں سے خلعت بھی لیتے ہیں جبکہ چشتی صوفیہ حکومت سے دور رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

سلسلہ سہروردیہ کی دیگر تعلیمات میں سانس بند کر کے اللہ کے نام کا ورد کرنے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے ان کے یہاں ذکر جلی اور ذکر خفی دونوں جائز ہیں، اس سلسلے میں قرآن کی تلاوت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، سہروردیہ سلسلے میں فقر و فاقہ اور ترک دنیا کی بھی زیادہ اہمیت نہیں ہے، نفس کشی اور زہد و ریاضت پر بھی اس سلسلہ میں زیادہ زور نہیں دیا جاتا، بلکہ عام طور پر رمضان المبارک کے روزے رکھے جاتے ہیں اور نفل روزوں میں صرف کچھ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

مال و دولت کمانے کو اس سلسلہ میں راہ سلوک کے منافی نہیں سمجھا جاتا اور سالکین کو اپنے ہاتھ کی کمائی کھانے پر ابھارا جاتا ہے، اور درباروں سے خلعت و انعام لینے کو بھی سلوک کے منافی نہیں سمجھا جاتا، سماع کے سلسلے میں ان کا موقف کافی سخت ہے، اول تو اس کی اجازت ہی نہیں دیتے اور اگر اجازت ہے بھی تو اتنی شرائط کے ساتھ ہے کہ اس کو اجازت شمار کرنا ہی مشکل ہے، سماع کی جگہ وہ تلاوت قرآن مجید کی تلقین کرتے ہیں۔

سہروردی سلسلہ میں شعر ونغمہ کا ذوق بھی رہا ہے، اس سلسلہ کے بہت سے شیوخ شعری ذوق رکھتے تھے اور ابن الفارض جیسے عظیم صوفی شاعر کا تعلق بھی اسی سلسلہ سے تھا، شیخ سعدی شیرازی بھی اس سلسلہ سے وابستہ تھے۔ سہروردی سلسلے میں سیر وسیاحت کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے، اس سلسلہ کے بہت سے شیوخ نے بکثرت اسفار کیے، خود شیخ شہاب ابوحفص نے متعدد ملکوں کا سفر اختیار کیا، ہندوستان میں اس سلسلہ کے ایک بزرگ حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت اپنی سیاحت اور جہاں نوردی کے لیے ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے سہروردی صوفیہ بالعموم سلاطین وحکام سے قریبی تعلق رکھتے تھے، تاکہ مبادی ومسائل دین ان کے ذہن نشین کراتے رہیں، سلطان عادل کا مقام اور اس کی ذمہ داریاں یاد دلاتے رہیں، امانتوں کو ان کے مستحق تک پہنچانے میں سلاطین کی مدد کریں، امور سلطنت کی دینی اہمیت اور نوافل وکثرت عبادت پر موثر اور پر امن نظم ونسق کی برتری ذہن نشین کراتے رہیں، حاجت مندوں کی حاجت روائی، دینی عہدے مثلاً صدر الصدور یا شیخ الاسلام یا مفتی شرع یا قاضی یا محتسب پر مناسب لوگوں کے تقرر کی سفارش کریں، بیت المال اور اوقاف کے نظام کو حدود شرع کے مطابق امانت داروں کے سپرد کریں، وہ کبھی کبھی سماع کی محفل میں بھی شریک ہوتے تھے، لیکن یہ ان کا وطیرہ نہیں تھا، اور اس کو شعار بنانے کی انھوں نے سخت مخالفت کی ہے۔

مریدین کو علو ہمت کی طرف ترغیب دلاتے، ان کو اذکار واشغال، مجاہدہ، محاسبہ، مراقبہ، مشاہدہ، معائنہ اور مرتبہ احسان کے حصول کی طرف توجہ دلاتے، ساتھ ساتھ اپنی خانقاہوں میں اتنا اناج اور اتنا مال محفوظ رکھتے کہ ہنگامی حالات میں حوائج انسانی پوری ہوتی رہیں، بیش تر ہدایا پر ممتاز ترین علماء کی خدمات برائے تدریس حاصل کی جاتیں تاکہ وہ یکسوئی سے ذی استعداد طلبہ کو درجہ تحقیق تک پہنچادیں۔

22.6 قادریہ

غوث اعظم حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے تصوف کا سلسلہ قادریہ شروع کیا، یہ سلسلہ برصغیر کے مقبول ترین سلسلوں میں سے ایک ہے، سلطان جہانگیر اور ابوالفضل علامی دونوں نے اسی سلسلہ کی بزرگی اور عظمت کا تذکرہ کیا ہے۔

حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کا نام عبدالقادر اور لقب محی الدین تھا، غوث پاک یا غوث اعظم کے نام سے معروف ہیں، آپ ابھی بچے ہی تھے کہ والد ابوصالح موسی جنگی دوست کا انتقال ہوگیا، والدہ ماجدہ امۃ الجبار فاطمہ نے تعلیم وتربیت کی ذمہ داری سنبھالی اور ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے حصول کے لیے بغداد بھیجا جہاں مدرسہ نظامیہ میں آپ نے آٹھ سال تعلیم حاصل کی، حصول علم کے بعد باطنی تربیت آپ نے ابوالخیر حماد بن مسلم اور ابوسعید مبارک بن علی مخرمی سے حاصل کی گئی، سال سخت محنت وریاضت میں تکمیل تربیت کے بعد بغداد میں وعظ وارشاد کا سلسلہ شروع کیا، آپ کے وعظ میں ایسی تاثیر تھی کہ بہت جلد آپ کی شہرت دور دراز علاقوں تک پھیل گئی اور لوگ آپ کا وعظ سننے کے لیے پیدل اور سوار دونوں طرح آنے لگے، اور آپ کی مجلس وعظ جگہ کی تنگی کی وجہ سے کئی مرتبہ تبدیل کرنی پڑی، سلسلہ قادریہ کی اشاعت آپ کی زندگی میں ہی شروع ہوگئی تھی چنانچہ آپ کے مریدین میں محمد البطائحی نے اس طریقہ کی اشاعت شام میں کی، علی بن مزاد اس طریقہ کو لے کر یمن کے علاقے میں گئے، تقی الدین محمد الیونین

3. سلسلہ نقشبندیہ کے بانی کون ہیں؟

4. ہندوستان میں سلسلہ نقشبندیہ کی اشاعت کس کے ذریعے ہوئی؟

5. شہاب الدین سہروردی کی سب سے مشہور تصنیف کا کیا نام ہے؟

6. شیخ عبدالقادر جیلانی کے والد کا کیا نام تھا؟

22.7 شطاریہ

شطاری سلسلہ ان سلسلوں میں سے ہے جن کی روایت اب تقریباً معدوم ہے اور عہد وسطی میں بھی ان کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں، دائرۃ المعارف میں شطاری سلسلہ کو چالاکی اور عیاری سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے، چونکہ لفظ شطاری کے لفظی معنی چالاکی کے ہوتے ہیں، لیکن خود اس سلسلہ کے لوگ اپنے آپ کو شطاری اس لیے کہتے ہیں کہ بقول ان کے یہ لوگ دوسرے سلسلوں کے مقابلے میں زیادہ سرگرم اور تیز گام ہوتے ہیں۔

شطاری سلسلہ بایزید بسطامی کی طرف منسوب ہے، ہندوستان میں اس سلسلہ کا آغاز شیخ عبداللہ شطاری سے ہوتا ہے، وہ اپنے مرشد کی ہدایت پر ایران سے ہندوستان آئے اور مختلف علاقوں میں ہوتے ہوئے مانکپور گئے، پھر جونپور گئے اور آخر میں مالوہ چلے گئے، جہاں اس سلسلہ کو سازگار ماحول ملا اور وہاں اس کو بڑی ترقی حاصل ہوئی، اس سلسلہ کے دوسرے بڑے امام شیخ محمد علا ہوئے جو شیخ قاضی شطار کے نام سے مشہور ہیں، کہتے ہیں کہ جب شیخ عبداللہ شطاری بہار پہنچے تو انھوں نے شیخ محمد علا کو پیغام بھیجوایا کہ اس درویش نے اس خیال سے سیاحی اختیار کی ہے کہ اگر کلمہ توحید کے معنی کوئی اس سے بہتر جانتا ہے تو وہ مسافر کو تعلیم دے اور اگر ایسا نہ ہو تو بے مشقت وہ گنج توحید مسافر سے حاصل کرے، شیخ محمد علا نے جواب دیا کہ ایسے فضول گو اشخاص خراسان اور ایران سے بہت آتے ہیں، شاہ صاحب نے سن کر فرمایا کہ شیخ محمد علا کے کمالات کا ظہور مجھ ہی فضول گو کی تلقین پر منحصر ہے۔

اس کے بعد شاہ عبداللہ تو مانڈو کی طرف روانہ ہو گئے لیکن شیخ محمد علا کو خواب میں اشارہ ہوا کہ تمہاری گرہ کشائی شاہ عبداللہ سے وابستہ ہے، چنانچہ وہ وطن چھوڑ کر مانڈو روانہ ہوئے، شاہ صاحب کے دروازے پر تین روز کھڑے رہے، چوتھے روز وہ باہر تشریف لائے، سرزنش کی، امتحان لیا اور بالآخر خلعت خلافت سے سرفراز کر کے واپس روانہ کیا۔

شاہ عبداللہ شطاری کی وفات 1072 میں ہوئی، مزار مالوہ کے سابق دارالخلافہ مانڈو میں قلعہ کے اندر ہے، ان کے خلیفہ اعظم شیخ محمد علا المعروف شیخ محمد قاضن شطاری تھے، مرشد سے خرقہ خلافت پانے کے بعد انھوں نے باقی عمر اس سلسلے کی توسیع واشاعت میں بسر کی۔

شیخ محمد علا نے اپنا مرکز مظفر پور، بہار کو بنایا تھا، ان کے بعد ان کے بیٹے مخدوم منصور حلاج ان کے جانشین ہوئے، اور ان کے دوسرے بیٹوں، عبدالرحمٰن شطاری اور ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست شطاری نے بھی بہار کے مختلف علاقوں میں اس سلسلہ کی اشاعت کی، موخرالذکر کے مرید شیخ ظہور حاجی حمید بھی اس سلسلے کے بڑی نامور شخصیت تھے، ان کا مزار حاجی پور بہار میں ہے، انھوں نے دو

بچوں کی پرورش کی تھی، ان میں ایک شیخ بہلول شطاری کے نام سے معروف ہوئے اور دوسرے شیخ محمد غوث گوالیاری کے نام سے مشہور ہوئے۔

شیخ بہلول اور شیخ محمد غوث دونوں سگے بھائی تھے، مشہور ہے کہ یہ دونوں خواجہ فریدالدین عطار کی اولاد میں سے تھے، شطاری سلسلہ کو مقبول عام بنانے میں ان دونوں بھائیوں کا سب سے اہم کردار ہے، ہندوستان میں سلسلہ شطاریہ کے سب سے مشہور بزرگ شیخ محمد غوث شطاری تھے۔

شیخ محمد غوث شطاری کے مغل حکمرانوں سے اچھے روابط رہے، جب بابر نے گوالیار پر حملہ کیا تو اس وقت شیخ محمد غوث نے مغلوں کی مدد کی اور ان کی مدد سے ہی گوالیار فتح ہوا تھا، اس طرح ان کے روابط بابر کے ساتھ اچھے ہوگئے، اور ہمایوں ان کا مرید بن گیا، بدایونی نے ہمایوں کی عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمایوں بادشاہ کو ان دونوں بھائیوں سے بڑی عقیدت تھی۔

ہمایوں کو شیر شاہ نے شکست دی تو اس کے بعد شیخ محمد غوث کے لیے بھی مشکلات کا دور شروع ہوا شیخ نے اپنے اہل وعیال کے ساتھ گجرات کا رخ کیا، وہاں کئی مقامات پر رہے، اس دوران شیخ علی متقی الہندی صاحب کنزالعمال نے ان پر کفر کا فتوی لگایا، حاکم گجرات محمود شاہ نے شیخ وجیہ الدین گجراتی سے استصواب رائے کیا تو شیخ نے محمد غوث گوالیاری کے حق میں رائے دی اور ان کے مرید ہوگئے، اس واقعہ سے گجرات میں سلسلہ شطاریہ کی اشاعت کی راہ ہموار ہوگئی اور بڑی تعداد میں لوگ ان کے مرید ہوگئے۔

ہمایوں کے دہلی آنے کے بعد شیخ نے بھی دہلی کا رخ کیا اور اکبر کے دربار میں حاضری دی، لیکن اب بساط سیاست کچھ پیچیدہ تھی، اکبر صاحب اختیار نہیں تھا، شیخ گدائی ان کا مخالف، اس لیے ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ شیخ دل برداشتہ ہوکر گوالیار چلے گئے، اکبر کی طرف سے ان کو ایک کروڑ روپیہ کا عطیہ ملا، اس سے انھوں نے گوالیار میں ایک بڑی خانقاہ تعمیر کرائی اور سماع و وجد وتواجد کا سلسلہ شروع کیا۔

شیخ محمد غوث شطاری بڑے صاحب کمالات بزرگ تھے، انھوں نے تصوف اور عرفان کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی تھیں، ان کی تصنیفات میں رسالہ معراجیہ، جواہر خمسہ، کلید مخازن، وغیرہ بہت مشہور ہیں، اپنی ایک تصنیف بحرالحیوۃ میں انھوں نے ہندو مذہب کے راہبوں اور جوگیوں کے افکار ذکر کیے ہیں۔

شیخ محمد غوث کے بعد اس سلسلہ میں عبدالنبی شطاری اور غوثی مانڈوی (صاحب گلزار ابرار) مشہور ہوئے ہیں، اس سلسلہ کے دیگر مشہور لوگوں میں شاہ عبداللہ شطاری شیخ بہاؤالدین شطاری، اور شیخ بدھن جونپوری بہت مشہور ہوئے ہیں۔ شیخ زرق اللہ مشتاقی جو واقعات مشتاقی کے مصنف ہیں، اسی سلسلہ سے وابستہ تھے۔

شطاری سلسلہ میں کوئی مستقل تصنیف بطور نصاب شامل نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت پیر کو حاصل ہے، اس کے تلقین کردہ اذکار و اوراد کا اہتمام کیا جاتا ہے، شریعت کی پابندی کی جاتی ہے، دوران سلوک جنگلوں میں رہ کر سخت ریاضتیں کی جاتی ہیں، ان کے طریقہ میں سالکین کے امتحان کا یک عجیب وغریب طریقہ رائج ہے، جب کوئی شخص مرید ہونے آتا ہے تو اس کو کھانا اور سالن ایک ساتھ دیتے ہیں، اور اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، اگر ہ دونوں چیزوں کو ایک ساتھ ختم کرتا ہے تو سوچا جاتا ہے کہ وہ باصلاحیت شخص ہے چیزوں کا اندازہ کرلیتا ہے اس لیے اس کو مرید کرلیتے ہیں اور اگر

کوئی شخص اس نظم کو صحیح صحیح طور پر باقی نہ رکھ سکے، مثلاً کھانا ختم ہوجائے یا سالن پہلے ختم ہوجائے، تو اس شخص کو بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے لیکن اس کو اسرارہائے درونی میں شریک نہیں کرتے تھے۔

شطاری سلسلہ میں بادشاہوں سے قربت کو پسند کیا جاتا ہے، بیشتر شطاری صوفیہ یا تو خود اعلی سرکاری مناصب پر فائز تھے یا بادشاہوں سے خصوصی اور گھریلو قسم کے مراسم رکھتے تھے، شطاری سلسلہ کے صوفیہ خود بھی بادشاہوں کی سی شان وشوکت سے رہتے تھے، ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تو نقارہ بجواتے ہوئے جاتے، سامنے علم ہوتا خود شاہی لباس زیب تن کرتے اوران کے مریدین فوجی لباس میں ہوتے، اس طرح ان کے سلسلہ میں ظاہری شان وشوکت کو پسند کیا جاتا تھا، اور وہ بالکل بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔

دوران سلوک اس سلسلہ میں بھی سخت ریاضتیں کرائی جاتی تھیں سالکین جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں میں جاکر عبادت و ریاضت کرتے تھے، اوراس طرح ان کو مختلف تصرفات کی بھی قدرت حاصل ہوجاتی تھی، جو اس سلسلے کے بزرگوں کی طرف بکثرت منسوب ہیں۔

22.8 شاذلیہ

سلسلہ شاذلیہ کوئی مستقل بالذات سلسلہ اس معنی میں نہیں ہے جس طرح دیگر سلسلے ہیں۔ بلکہ یہ سلسلہ ایک طرح سے قادریہ سلسلہ کی توسیع ہے، اس کے بانی سید ابوالحسن شاذلی (1196۔1208) ہیں، انھوں نے حضرت عبدالسلام بن مشیش سے بیعت کی تھی جو قادریہ سلسلہ کے شیخ تھے، اس طرح یہ سلسلہ دراصل قادریہ ہی ہے، لیکن بعد میں ابوالحسن شاذلی کی قدآور شخصیت اوران کے بعض تفردات کی وجہ سے یہ سلسلہ بھی دوسرے سلسلوں کی طرح ایک مستقل سلسلہ بن گیا۔

ابوالحسن شاذلی کی ولادت تیونس کے ایک گاؤں شاذلہ میں ہوئی اس لیے وہ شاذلی نسبت سے مشہور ہوئے، شروع میں کیمیا گری کا شوق تھا لیکن جلد ہی یہ شوق ختم ہوگیا اور انسانوں کی کیمیا گری یعنی اصلاح باطن کی طرف متوجہ ہوئے، بلاد اسلامیہ کا طویل سفر کیا، حرمین کی زیارت کی، افریقہ گئے، مصر میں آپ کا قیام مدتوں رہا آپ کی مجلس میں علامہ عزالدین بن عبدالسلام، علامہ ابن دقیق العید، حافظ زکی الدین منذری صاحب ''الترغیب والترہیب''، ابن حاجب اور قاضی بدرالدین ابن جماعہ جیسے اساطین شریک ہوتے تھے، ابن دقیق العید فرماتے تھے کہ میں نے ابوالحسن شاذلی سے بڑا عارف باللہ نہیں دیکھا۔

شاذلیہ سلسلہ ہندوستان میں کم پھیلا اس کا زیادہ اثر افریقہ کے ممالک میں ہوا، مصر الجزائر اور تیونس میں اس سلسلہ کی بہت اشاعت ہوئی، اوران علاقوں میں اس سلسلہ کی خانقاہیں اوراس سے وابستہ مشائخ آج بھی موجود ہیں۔

شاذلیہ سلسلہ سے وابستہ اہم شخصیات میں ابوالعباس مرسی، یاقوت عرشی، محمد ابن صباغ، محمد وفا، علی بن وفا، جلال الدین سیوطی، عبدالوہاب شعرانی، داؤد ابراہیم اسکندری، ابن عباد وغیرہ مشہور لوگ ہیں، مشہور شاعر ابن عطا اسکندری بھی اس سلسلہ کے اہم لوگوں میں شامل تھے اور ہندوستان کے مشہور محدث علی متقی الہندی جنہوں نے ''کنزالعمال فی سنن الاقوال والافعال'' جیسی بلند پایہ کتاب تصنیف کی وہ بھی اس سلسلہ سے وابستہ تھے۔

سلسلہ شاذلیہ میں کوئی مخصوص کتاب تو بطور نصاب شامل نہیں ہے؛ البتہ خود ابوالحسن شاذلی کی مرتب کردہ ''حزب'' بہت مقبول ہے۔ بلکہ ان کی مرتب کردہ حزب البحر تو دیگر سلسلوں سے وابستہ لوگ بھی اپنے معمولات میں شامل رکھتے ہیں، اس کے علاوہ دیگر حزب الحمد، حزب اللطف، حزب الاخفاء، حزب النصر، حزب البر، حزب الکفایہ، حزب الشکوی وغیرہ شامل ہیں۔

سلسلہ شاذلیہ کے بنیادی اصول پانچ ہیں، جن کو اصول خمسہ کہا جاتا ہے: (1) ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرنا (2) اقوال وافعال میں سنت کی پابندی کرنا (3) بلندی و پستی میں خلق سے بے تعلق رہنا (4) چھوٹی بڑی ہر بات میں اللہ سے موافقت کرنا (5) خوش حالی اور بدحالی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا۔

ان کے علاوہ سید ابوالحسن علی شاذلی نے تقوی، کتاب وسنت میں بتائے گئے اوامر ونواہی کی پابندی اور مکارم حسنہ سے مزین ہونے کی بھی تلقین فرمائی، آپ کی تعلیمات میں کامل استقامت، صدق مع اللہ، حسن معاملہ، عبودیت تامہ، رعایت عامہ، علو ہمت، معرفت الٰہیہ، وصول میں پیش آنے والی رکاوٹوں پر عدم وقوف، مجاہدہ، یقین کبیر، ترک ارادہ، ترک تدبیر، تخلق باخلاق اللہ، اتباع سنت، غیر اللہ کی طرف عدم میلان، رضا بقضاء الٰہی، رجوع الی اللہ، توکل علی اللہ شامل ہیں، مواظبت علی الذکر کی بابت فرماتے ہیں کہ مدار اعمال یہی ہے، اس سے وصال ہوتا ہے اور اسی سے کامل درجہ کمال کو پہنچتا ہے۔

سلسلہ شاذلیہ میں ترک دنیا کی تعلیم نہیں دی جاتی، بلکہ دنیاوی وسائل کے اختیار کی ترغیب دی جاتی ہے، یہ سلسلہ رہبانیت کے خلاف ہے، ریاضت ومجاہدات اور تقشف پر اس میں زیادہ زور نہیں دیا جاتا؛ بلکہ بانی سلسلہ کی نصیحت ہے کہ شیخ وہ نہیں جو تجھے تھکا دینے والی چیزوں میں الجھادے، شیخ تو وہ ہے جو تیری راحت کا خیال کرے۔

22.9 رفاعیہ

سلسلہ رفاعیہ کے بانی سید احمد کبیر الرفاعی ہیں، ان کا پورا نام ابوالعباس محی الدین بن علی الرفاعی البطائحی (578-512) ہے، بطائح ایک علاقہ ہے اس میں قریات حسن نام کے مقام پر آپ کی ولادت ہوئی، سات سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، نانا نے پرورش کی، ان کے ماموں منصور بطائحی اپنے وقت کے اجلہ شیوخ میں شمار ہوتے تھے۔

قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد تحصیل علم کے لیے واسط کا رخ کیا اور شیخ علی واسطی اور شیخ عبدالملک حربونی سے علوم کی تکمیل کی۔ درسیات کی تکمیل کے بعد باطنی علوم اپنے ماموں سید منصور بطائحی سے حاصل کیے، 28 سال کی عمر میں تمام ظاہری اور باطنی علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد درس وتدریس اور ارشاد ومواعظ کا سلسلہ شروع کیا، آپ کے درس میں دور دراز سے اہل علم اپنے ذوق علم کی تشنگی دور کرنے آتے تھے اور آپ کے مواعظ میں بڑی تعداد میں لوگ حاضر ہوتے تھے۔

سید منصور بطائحی کی وفات کے بعد آپ اس سلسلہ کے شیخ بنے اور آپ کی طرف لوگوں کا رجوع اور بڑھ گیا، شیخ عبدالقادر جیلانی نے بھی آپ کی تعریف کی ہے، ان کی وفات کے بعد آپ کے حلقے میں لوگوں کی آمد ورفت بہت بڑھ گئی، علامہ ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ انھوں نے 10 شعبان کو ان کے حلقے میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں کا اجتماع دیکھا تھا، اور بھی معاصر تذکرہ نگاروں نے آپ سے مستفید ہونے والوں کی تعداد لاکھوں میں اور آپ کے خلفاء ومجازین کی تعداد ہزاروں میں لکھی ہے۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کے بارہ فرزندان گرامی نے اس سلسلہ کو مزید فروغ بخشا اور اس سلسلہ کو بلاد اسلامیہ میں پھیلایا، ہندوستان کے حصہ میں یہ دولت کافی تاخیر سے آئی، غالباً 1060 میں عہد عالمگیری میں ایک رفاعی شیخ سید عبدالرحیم رفاعی ہندوستان تشریف لائے، آپ سید احمد کبیر کی چودھویں پشت میں تھے، خود شہنشاہ اورنگ زیب آپ کی کرامات سے بہت متاثر ہوا، سید عبدالرحیم رفاعی نے سورت (گجرات) میں قیام فرمایا اور اس سلسلہ کو جنوب میں پھیلایا، بنگلور اور گجرات کے علاقوں میں اس سلسلہ کی متعدد خانقاہیں ہنوز موجود ہیں۔

ہندوستان میں اس سلسلہ کے لوگوں میں سید حمزہ رفاعی، سید رضی الدین رفاعی اور سید مصطفیٰ رفاعی بہت معروف ہوئے، چونکہ رفاعی سلسلہ میں دعوت وتبلیغ کی غرض سے شعبدہ بازی اور عجیب وغریب اعمال کا سرانجام دینا جیسے آگ پر چلنا، زہر پی لینا، یا ان پر ہتھیاروں کا اثر نہ ہونا وغیرہ معمول کے امور ہیں، اس لیے عوام میں اس سلسلہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ انھوں نے سید حمزہ رفاعی سے ان امور کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ دراصل اس طرح ہم عوام کو اپنے قریب کرتے ہیں اور جب لوگ قریب ہو جاتے ہیں تو پھر ان کو اسلام کی تلقین کرتے ہیں۔

سلسلہ رفاعیہ میں سخت ریاضت ومحنت کا دستور ہے، اس سلسلہ میں سید احمد کبیر کی مجالس رفاعیہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالحلیم شرر نے کیا، اس کے علاوہ الحکم الرفاعیہ، الاثار النافعہ اور الحکم الساطع وغیرہ آپ کے ملفوظات کے مجموعے ہیں، ان کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

سلسلہ رفاعیہ میں خرق عادات واقعات کے اظہار، شعبدہ بازی اور مداری فقراء جیسے اعمال کی انجام دہی سے اس سلسلہ کی اصل تعلیمات پر ایک طرح سے ذہول کا پردہ پڑ گیا ہے، ورنہ اس سلسلہ کے بانی نے خرق عادات واقعات کے اظہار کی مخالفت کی ہے اور ظاہر و باطن میں شریعت کے اتباع پر زور دیا ہے، صلہ رحمی اور خدمت خلق کی نہ صرف تلقین کی ہے بلکہ خود اس کا بے مثال عملی نمونہ پیش کیا ہے، اس سلسلہ کی تعلیمات کا خلاصہ کرتے ہوئے پروفیسر شاہد علی عباسی نے لکھا ہے:

> ''سید احمد کبیر نے زہد وتقوی، اخلاص کے ساتھ اتباع رسول، متشابہات قرآن میں تفویض اور محکمات پر عمل، ارکان اسلام کی پابندی، بدعات سے اجتناب اوامر ونواہی میں انکساری سے عمل، عظمت رسول اللہ کے قوی احساس، مراتب صحابہ کا خیال اور صحابہ کرام اور اہل بیت عظام سے محبت، لزوم صحبت ولی، حدود شریعت کی رعایت، غیر اللہ سے دل کی پاکی، کرامت کو اللہ کی نعمت و فضل جان کر بے نفس خوشی، تحدیث نعمت الٰہی، طلب کرامت اور دعاوی سے احتراز، ذکر دوام، التزام احسان، مجاہدات، محاسبات، مراقبات اور طاعات کا اہتمام، وقت، زبان اور قلب کی حفاظت، دل کو خوف، ظاہر کو ادب، نفس کو ذلت، انانیت کو محویت اور زبان کو ذکر کا لباس پہنانے، زمانہ سے واقفیت، صلحاء کے اعمال پر مداومت، سچے طالب حق بننے اور شریعت پر مضبوطی سے قائم رہنے، حقائق اشیاء کے علم، ایمان کے حقوق وتقاضوں کی ادائیگی، شریعت حقہ کی پیروی، تقاضائے نفس سے بے رخی، سچی معرفت کے حصول، خلوص نیت، ادب میں پختگی، محبت میں خلوص، عبودیت میں استحکام، ظاہر و باطن میں

للّٰہیت، عافیت کی قدر دانی، نفس وشیطان و دنیا وعقبیٰ چھوڑ کر اللہ کے سچے طالب بننے اور تقدیر الٰہی پر قائم رہنے، خوف و رجاء میں اعتدال، نفس ونفوس سے اوامر ونواہی شرع کی خوش خلقی سے تلقین، موت کی فکر، رحمتوں کے درمیاں قہر الٰہی سے آگہی پر جگہ جگہ زور دیا ہے۔

22.10 فردوسیہ

فردوسی سلسلہ ان سلاسل میں سے ہے جو دراصل مستقل بالذات سلسلے نہیں ہیں، بلکہ دوسرے سلسلوں سے نکلے ہیں، یہ سلسلہ سہروردیہ سلسلہ سے نکلا ہے، اس کی ابتداء کے بارے میں مشہور ہے کہ شیخ نجم الدین کبری فردوسی اور شیخ علاؤالدین طوسی کے درمیان رشتہ اخوت تھا، دونوں حضرات ضیاء الدین کی خدمت میں آئے اور یہ بات عرض کی کہ عمر بسر ہونے کو آئی لیکن ہمارا مقصود حاصل نہ ہوا، مجاہدے کیے لیکن مقصد ہاتھ نہ آیا، اب آپ ہی فرمائیں کہ ہم لوگ کیا کریں، شیخ ضیاء الدین نے نہایت الطاف سے فرمایا کہ میں بھی اس میں مبتلا ہوں، تدبیر یہ ہے کہ کہیں مرید ہو جائیں تا کہ اس کی برکت سے اپنی مراد کو پہنچیں، دونوں نے یہ کہا کہ جہاں آپ فرمائیں وہاں ہم لوگ مرید ہوں، شیخ ضیاء الدین نے شیخ وجیہ الدین ابوحفص کو بتایا تینوں حضرات شیخ وجیہ الدین کے مرید ہوئے، شیخ نے بیعت کے بعد شیخ ضیاء الدین سہروردی اور شیخ علاؤالدین طوسی کو خلافت وشجرہ دے کر فرمایا کہ تم دونوں اپنے اپنے شہروں میں جاؤ اور بندگان خدا کی رہبری کرو، اور شیخ نجم الدین کبری کا ہاتھ پکڑ کر شیخ ضیاء الدین کے حوالے فرمایا کہ ان کو اپنے ساتھ رکھو، تمہارا نام اس سے روشن ہوگا، شیخ ضیاء الدین نے بیعت کے ساتویں مہینہ خلافت دے کر فرمایا کہ تم مشائخان فردوس سے ہو۔

شیخ نجم الدین کبری کے ایک مرید اور خلیفہ شیخ باخرزی ہوئے، انھوں نے اس سلسلہ کی توسیع واشاعت کے لیے جدوجہد کی، اپنے ایک مرید خواجہ بدرالدین کو ہندوستان بھیجا، انھوں نے دہلی میں رہ کر اس سلسلہ کہ متعارف کرایا، خواجہ بدرالدین کے خلیفہ شیخ عماد فردوس ہوئے، ان کے بعد ان کے دو بیٹے خواجہ رکن الدین اور خواجہ نجیب الدین اس سلسلہ میں بہت مشہور ہوئے۔ خواجہ نجیب الدین کے ایک خلیفہ شرف الدین یحیٰ منیری بہت مشہور ہیں، انھوں نے ایک طویل عرصہ تک راجگیر کے جنگلوں میں ریاضت کی، اس کے بعد منیر شریف میں اپنی خانقاہ قائم کی، اس سلسلہ کی سب سے مشہور شخصیت وہی ہیں، ان کی قائم کردہ خانقاہ آج بھی مرجع انام ہے، ان کے بعد اس سلسلہ میں شیخ مظفر، ملک زادہ فضل الدین، مولانا نظام الدین، شیخ حسین اور قاضی شمس الدین بہت مشہور ہوئے، ان میں سے بعض خانقاہیں بھی قائم کیں اور اس سلسلہ کو بنگال تک پہنچایا۔

اس سلسلہ کی بنیادی تعلیمات یہ ہیں:

1. سالک کو انتہائی رحمدل ہونا چاہیے، اور بے باک و بے خوف ہونا چاہیے۔
2. سالک کو چاہیے کہ اگر اس پر ظلم کیا جائے تب بھی بردباری کے ساتھ اس کو برداشت کرے۔
3. سالک کو چاہیے کہ اپنے سوا ہر ایک کو ذی ہوش جانے۔

22.11 خلاصہ

اس اکائی کا خلاصہ یہ ہے کہ تیسری صدی سے چھٹی صدی کے درمیان عالم اسلام میں متعدد صوفیاء نے اپنے سلسلے قائم کئے، اوران صوفی سلسلوں نے عالم اسلام کے طول وعرض میں عظیم خدمات انجام دیں اور عام مخلوق کا رشتہ دین اور خدا سے جوڑے رکھا۔ درج بالا سطور میں مشہور صوفی سلسلوں، ان کے بانیوں اور ان کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی خدمات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

معلومات کی جانچ

1. سلسلہ شطاریہ کا آغاز کس سے ہوا؟
2. ابوالحسن شاذلی کی ولادت کس ملک میں ہوئی ؟
3. سلسلہ رفاعیہ کو ہندوستان میں لانے والے بزرگ کون تھے؟

22.12 نمونے کے سوالات

1. سلسلہ چشتیہ کا تعارف کرایئے اوران کی بنیادی تعلیمات بیان کیجیے۔
2. نقشبندیہ سلسلہ کی بنیادی تعلیمات کا تعارف کرایئے۔
3. شاذلیہ سلسلہ کی خدمات کا تعارف کرایئے۔
4. قادریہ سلسلہ کے بانی اوران کی تعلیمات پر روشنی ڈالیے۔
5. سہروردیہ سلسلہ کے آغاز وارتقاءاور ہندوستان میں اس کی خدمات کا تعارف کرایئے۔

22.13 فرہنگ

ملفوظات	اقوال وفرمودات جسے کوئی شاگرد یا مرید جمع کرے
فتوحات	نذرانے
صلح کل	سب سے اچھے تعلقات رکھنا
مداومت	ہمیشگی
جہری	بلند آواز سے
تصویب	درست ٹھہرانا
گلہ بانی	نگرانی وہدایت

شجرممنوعہ	جس کے قریب نہ جایا جائے
ترمیمات	تبدیلیاں
استوار کرنا	درست کرنا
منافی	مخالف
جہاں نوردی	دنیا بھر میں گھومنا
محی الدین	دین کو زندہ کرنے والے
لہوولعب	کھیل تماشہ
گنج	خزانہ
سرزنش	پھٹکار وملامت
استصواب رائے	رائے لینا
تفردات	انفرادیت
کیمیا گری	سونا بنانا یا بنانے کی کوشش کرنا رسونا بنانے کا علم
اوامر	جن کاموں کا حکم دیا گیا ہو
نواہی	جن کاموں سے منع کیا گیا ہو
خرق عادات	عادت کے خلاف کرنا
مرجع انام	زیارت گاہ عوام وخواص

22.14 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. الانتباہ فی سلاسل الاولیاء — شاہ ولی اللہ
2. تاریخ مشائخ چشت — خلیق احمد نظامی
3. سیر الاولیاء — میر خورد کرمانی
4. سیر العارفین — جمالی
5. گلزار ابرار — محمد غوثی شطاری
6. تاریخ تصوف — نریش ندیم
7. دائرہ معارف اسلامیہ، اردو

اکائی 23 : ہندوستان کے مشہور صوفیاء

اکائی کے اجزاء

23.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم ہندوستان کے بڑے صوفیہ ان کے احوال زندگی اوران کے کارناموں سے واقف ہوجائے، اس لئے اس اکائی میں کشمیر سے لے کر جنوب ہندتک بڑے صوفیہ کا تعارف کرایا گیا۔ اورانہوں نے ہندوستان میں تصوف کی اشاعت اورمختلف سلسلوں کے پھیلانے نیز ہندوستانی معاشرہ کی تشکیل میں جوغیر معمولی کردارادا کیا ہے اس کا بیان کیا گیا ہے۔

23.2 تمہید

ہندوستان میں تصوف کی آمد پانچویں صدی ہجری میں ہوئی اور پہلے صوفی جو ہندوستان تشریف لائے وہ تاریخ تصوف کے بڑے جلیل القدرامام تھے،ان کے بعد یہاں صوفیہ کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا اورمختلف سلسلوں سے وابستہ جلیل القدرصوفیہ نے ہندوستان کی سرزمین پراپنا اصلاحی اورتعمیری کردارادا کیا، آئندہ صفحات میں ہندوستان کے چندجلیل القدرمشہورصوفیہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

23.3 سیدعلی ہجویری

حضرت داتا گنج بخش سیدعلی ہجویری کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

سید ہجویر مخدوم امم
مرقد او پیر سنجر را حرم
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت
صبح ما از مہر او تابندہ گشت

(ہجویر کے سید جوقوموں کے مخدوم ہیں۔ ان کا مزار پیر سنجر یعنی حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے لئے ،حرم کا درجہ رکھتا ہے۔ پنجاب کی سرزمین ان کے دم سے زندہ ہوگئی اور ہماری صبح اس سورج سے روشن ہوگئی)

اور پیر سنجر یعنی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے ان کو خراج عقیدت اس طرح پیش کیا، حضرت خواجہ اجمیری نے ان کے بارے میں فرمایا:

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا

ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

(وہ گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا ہیں، ناقصوں کے لئے پیر کامل ہیں اور کاملوں کے لئے رہنما ہیں)

واقعہ یہ ہے کہ سید ہجویری حضرت شیخ علی بن عثمان الہجویری الجلابی سرزمین ہند کے لئے وہ باعث صد افتخار گوہر تابناک ہیں جن کی تابانی نے نہ صرف سرزمین ہند کو بلکہ پورے عجم عرب کو منور کیا ہے، یہ سعادت ہندوستان کی سرزمین کو اس طرح ملی کہ تاریخ تصوف میں پہلی فارسی کی تصنیف جس نے تصوف جیسے علم کو عربی زبان کی علمیت کے دائرے سے نکال کر فارسی زبان کی عوامیت میں داخل کیا اور مشرق کا ایک بڑا حصہ جہاں فارسی زبان ذریعہ اظہار تھی اس میں تصوف کا فروغ و نفوذ کیا، اس طرح تصوف کی وہ شعاع مہر افروز جو بغداد سے جاری ہوئی تھی اس کی ضیا پاشی ہندوستان ایران اور دوسرے فارسی زبان جاننے والے خطوں میں عام ہوئی اور تصوف کا فروغ عوامی سطح پر ہوا۔

حضرت داتا صاحب کا پورا نام علی بن عثمان الجلابی الغزنوی ثم الہجویری ثم لاہوری تھا، غزنیں میں پیدا ہوئے وہاں کے دو محلے ہجویر اور جلاب میں رہے، پھر لاہور آ کر آباد ہو گئے۔ تاریخ پیدائش متعین طور پر معلوم نہیں ہے، البتہ بعض شواہد کی بنا پر مختلف محققین نے 400 یا 401ھ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

حصول علم کے لئے انہوں نے بلاد اسلامیہ کا سفر کیا، ان کے اصل استاد تو شیخ ختلی تھے، لیکن ان کے علاوہ بہت سے مشائخ سے اخذ و استفادہ کیا اور استاذ امام ابوالقاسم قشیری جیسے جلیل القدر صوفی اور عالم کی صحبت میں بہت دن رہنے کا موقعہ ملا۔

کشف المحجوب میں ان مقامات کا تذکرہ ہے جہاں حضرت نے سیاحت کی، ان میں ماوراء النہر، آذربائیجان، بسطام، خراسان، کش، کمند، نیشاپور، بخارا، سمرقند، سرخس، طوس، فرغانہ، مرو، ترکستان اور ہندوستان شامل ہیں۔

حضرت کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن قرین قیاس 465ھ ہے، آپ کا انتقال لاہور میں ہوا اور آپ کا مزار پر انوار صدیوں سے زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت نے اپنی زندگی میں متعدد تصنیفی کام کئے، آپ کی تصنیفات ہیں:

1. دیوان شعر، اگرچہ دیوان کے بارے میں حضرت نے خود فرمایا کہ یہ کسی اور نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔
2. کتاب فناء و بقا
3. اسرار الخرق والمؤنات
4. الرعایۃ لحقوق اللہ

5. کتاب البیان لاہل العیان

6. بحر القلوب

7. منہاج الدین

8. ایمان

9. شرح کلام منصور

ان میں سے بعض مستقل کتابیں ہیں اور بعض بنیادی طور پر کشف المحجوب کے ابواب ہیں، تذکرہ نگاروں نے ان کو مستقل تصنیف کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔

لیکن حضرت داتا صاحب کا اصل کارنامہ اوران کی شاہکار تصنیف جس نے ان کو زندہ جاوید بنایا اور جوان کا امتیاز ہے وہ دراصل ''کشف المحجوب'' ہے، کشف المحجوب ایسی معرکہ آراء اور تاریخ ساز کتاب ہے جس سے پورا ایک عہد منسوب ہے، تاریخ تصوف میں جس کا ایک مستقل باب ہے اور جس نے سرزمین ہندوستان میں علم وتحقیق کی قندیل روشن کی، اس کتاب کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آج ایک ہزار سال بعد بھی اس سے لوگ اسی طرح استفادہ کرتے ہیں، اس پر بحث وتحقیق ہوتی ہیں، یونیورسٹیوں میں لگا تار اس پر تحقیق ہو رہی ہے، اور یونیورسٹیوں کے باہر بھی اس موضوع پر اور اس کے متعلقات پر تصنیفات کا سلسلہ جاری ہے۔

ڈاکٹر محمود عابدی نے اس کتاب کا ایک محقق ایڈیشن شائع کیا، جس کی خوبیوں کے بیان کے لئے مستقل تصنیف درکار ہے، ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس نے، ان پر کئی کتابیں لکھی ہیں، ایک کتاب ''شیخ سید علی ہجویری کے تفسیری نکات'' ہے، جو تصوف فاؤنڈیشن سے شائع ہوئی، اس میں انہوں نے کشف المحجوب پر پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم اے کے 14 مقالات کی فہرست دی ہے جو صرف پاکستان میں ہوئی ہیں، ان کے علاوہ ہندوستان میں بھی متعدد کام ہوئے ہیں۔

23.4 خواجہ معین الدین چشتیؒ

خواجہ اجمیری کا اصل وطن ایران کے صوبہ سجستان کا ایک قریہ سنجر یا سجز ہے، وہاں ان کی ولادت ہوئی۔ 13 سال کی عمر میں یتیم ہوگئے، ایک باغ ایک چکی وراثت میں ملی، خواجہ اس باغ کی نگہبانی کرنے لگے، اطمینان سے گذر ہوتی تھی لیکن دست قدرت نے خواجہ کو انسانوں کی نگہبانی کے لیے بنایا تھا اور اس کا انتظام بھی خود فرمایا دیا، ہوا یہ کہ ایک دن ان کے باغ میں ابراہیم قلندر نامی ایک بزرگ وارد ہوئے، خواجہ نے امکان بھران کی خدمت کی، بزرگ نے خوش ہوکر ان کو دعا دی اور کھلی کو دانتوں سے چبا کر خواجہ صاحب کو کھلا دیا، کھلی کا کھانا تھا کہ دل انوار الٰہی کی تجلیات سے جگمگا اٹھا اور دنیا کی ہر چیز بے وقعت ہوگئی، اور اس کے بعد بھلا ایسے شہباز کو باغ کی نگہبانی کب تک مقید رکھتی، انہوں نے وہ باغ اور چکی فروخت کر کے راہ خدا میں خرچ کردی اور توکلاً علی اللہ گھر سے نکل پڑے۔ سمرقند پہنچے یہاں کلام پاک حفظ کیا اور علوم ظاہری کی تحصیل میں لگ گئے۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد مرشد کامل کی تلاش میں قصبہ ہرون کا رخ کیا اور شیخ عثمان ہرونی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ڈھائی سال مرشد کی خدمت میں رہنے کے بعد مرشد کے ساتھ سیاحت کے لیے نکل پڑے، دس سال بلاد اسلامیہ کی سیاحت کی، اس سیاحت میں حرمین شریفین کی زیارت کی۔ مشہور ہے کہ بارگاہ رسالت میں حاضری دی تو ندا آئی کہ 'معین الدین ہمارا دوست ہے، ہم نے اس کو قبول کرلیا اور برگزیدہ بنالیا' اور واقعہ یہ ہے کہ خواجہ کو جو قبول حاصل ہوا اس نے فرمان رسالت کو حرف بحرف ثابت کر دیا۔

خواجہ اجمیری کی عمر اس دوران ۲۵ سال ہو چکی تھی، مرشد سے رخصت لے کر بغداد گئے، سنجان پہنچ کر شیخ نجم الدین کبریٰ کی خدمت میں رہے پھر بغداد میں چلہ کشی کی، سلسلہ سہروردیہ کے بانی شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں رہے۔ بغداد سے ہمدان آئے، پھر تبریز پہنچ کر شیخ جلال الدین تبریزی کی خدمت میں رہے، وہاں سے پھر مختلف بلاد و امصار کی سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان کا رخ کیا، پہلے لاہور میں قیام کیا، شیخ علی ہجویری کی درگاہ پر چلہ کشی کی اور پھر وہاں سے ملتان کا عزم کیا۔

خواجہ صاحب کو جو پیغام محبت سرزمین ہند میں پھیلانا تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ یہاں کی مقامی زبان سے واقف ہوتے، اس لیے انہوں نے مقامی زبان سیکھی اور پھر دہلی میں فروکش ہوئے، اس کے بعد اجمیر میں بود و باش اختیار کی۔ جہاں یک سوئی سے عبادت و ریاضت اور خلق خدا کی فیض رسانی میں لگ گئے۔

اجمیر میں اس وقت رائے پتھورا کی حکومت تھی، فقیر بے نوا سے صاحب شوکت راجا کو خوف کھانے کی کیا ضرورت تھی، لیکن خواجہ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے راجہ کو حسد ہونے لگا اور آخر وہ خواجہ کے درپئے آزار ہو گیا، لیکن اجمیر کا حکمراں اس پردیسی فقیر کو وہاں سے نہ نکال سکا اور دست قدرت نے خود اس راجہ کو ہمیشہ کے لیے اجمیر سے باہر کر دیا۔

خواجہ نے اجمیر میں رہ کر خلق خدا کی خدمت کی اور پیام امن عام کرتے رہے، ان کے دربار میں امیر و غریب اور راجہ و فوکر کی کوئی تفریق نہیں تھی، سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے اور ان کی خدمت میں سب لوگ بلا تفریق مذہب و ملت حاضر ہوتے، معاشرے کے دبے کچلے لوگ جن کی کوئی شناخت نہیں تھی جن کی کہیں رسائی نہیں تھی خواجہ کا دربار ان کے لیے زندگی بخش بن گیا۔

خواجہ کے مرشد نے وقت رخصت ان کو نصیحت کی تھی: 'اے معین الدین اب جب کہ تم نے فقیری اختیار کر لی ہے تو فقیروں کی طرح عمل کرنا، وہ اعمال یہ ہیں: غریبوں کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آنا، ناداروں کی خدمت کرنا، برائیوں سے اجتناب کرنا اور ابتلا و مصائب میں ثابت قدم رہنا'۔ خواجہ کی زندگی اس نصیحت کی عملی تفسیر بن گئی، خواجہ نے ہر مصیبت کو ثابت قدمی سے برداشت کیا اور ہر برائی سے اجتناب کیا، غریبوں کی دست گیری، ناداروں کی خدمت اور بے سہارا لوگوں کی حوصلہ افزائی کو اپنا وطیرہ بنالیا، حکمرانِ وقت کا استبداد بھی ان کے پایۂ ثبات میں لغزش نہ پیدا کر سکا اور ہر مصیبت کے سامنے جرأت و استقلال کا کوہ گراں ثابت ہوئے۔

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور مذہب سے قطع نظر مشترکہ اقدار، بلا تفریق مذہب و ملت باہمی الفت و یگانگت اور کمزوروں اور ناداروں کی دادرسی کی جو روایت خواجہ اجمیری نے قائم کی تھی وہ ہندوستان کی شناخت بن گئی۔ ان کے مریدوں نے مستقل سلسلہ قائم کر کے ان کے فیض کو پورے ہندوستان میں پھیلایا، ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی بنا آپ نے ڈالی اور اس کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کر دیا۔

خواجہ اجمیری انسانوں کے محسن تھے، انہوں نے ایسے رجال کار تیار کیے، جنہوں نے ان کے پیغام کو پورے ملک میں پھیلایا۔ ان کے بعض مریدوں نے ان کے ملفوظات اور ارشادات کو بھی جمع کر لیا تھا، اس طرح ان کے ملفوظات پر مشتمل تین کتابوں میں ان کے افکار بھی ہمارے سامنے موجود ہیں، یہ رسالے ہیں: 1. انیس الارواح، 2. رسالہ درکسب نفس، 3. دلیل العارفین۔

خواجہ نے ان میں بتایا ہے کہ سلوک کی راہ کیسے طے کی جائے اور سلوک کی غایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ تصوف نہ علم ہے اور نہ رسم، بلکہ ایسے اخلاق کا نام ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہو، سالک کی غایت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے صوری و معنوی اخلاق و محاسن کا جامع ہو، اس کی زندگی شریعت کی آئینہ دار ہو اور اس کا کردار اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہو، غریبوں کا حامی ہو، ناداروں کا معاون ہو اور کمزوروں کا خیر خواہ ہو۔

خواجہ فرماتے تھے کہ سلوک کے مراتب میں ارباب طریقت کے لیے مندرجہ ذیل دس شرائط کا ہونا لازمی ہے: 1. طلب حق، 2. طلب مرشد کامل، 3. ادب، 4. رضا، 5. محبت، 6. لایعنی چیزوں کا ترک کرنا، 7. تقویٰ، 8. استقامت، 9. کم کھانا اور کم سونا، 10. خلوت اختیار کرنا۔

اسی طرح راہ سلوک میں ان دس اعمال کا انجام دینا بھی ضروری ہے۔

1. کسی کو رنج نہ پہنچانا، 2. کسی کی برائی نہ کرنا، 3. تواضع اختیار کرنا، 4. ہر شخص سے محبت کرنا، 5. کسی کو حقیر نہ سمجھنا، 6. ہر کام میں تسلیم و رضا کا رویہ اختیار کرنا، 7. ہر مصیبت میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا، 8. قناعت اختیار کرنا، 9. توکل کرنا، 10. سوز و گداز اپنانا۔

اس طرح خواجہ نے اپنی شخصیت کے ذریعے اور اپنے ملفوظات کے ذریعے اپنے متوسلین کی ایسی تربیت کی جنہوں نے پورے ہندوستان میں ایک نئی روشنی پھیلا دی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید الدین گنج شکر، شیخ نظام الدین اولیاء، حضرت صابر کلیری، طوطی ہند امیر خسرو، چراغ دہلی خواجہ نصیر الدین، اردو نثر کے بانی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور غرض ایک طویل سلسلہ ہے جس نے حضرت خواجہ اجمیری کے چشمہ فیض سے سیراب ہو کر کتنے ہی تشنگان طریقت و معرفت کو سیراب کیا اور ملک میں ہم آہنگی، یک جہتی اور مشترکہ اقدار کو فروغ دیا، جن کی روایت آج بھی زندہ و تابندہ ہے، ان کا پیغام محبت آج بھی عام ہے اور ان کے چشمہ فیض کا فیضان آج بھی جاری ہے۔

23.5 شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی سلسلہ سہروردیہ کے عظیم فرزند اور دین و شریعت کے پیکر تھے، آپ کی ایک امتیازی شان یہ تھی کہ سلسلہ سہروردیہ کی نسبت خود بانی سلسلہ حضرت ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردی سے حاصل کی تھی اور اس امانت کو ہندوستان میں پھیلایا تھا۔

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کی ولادت ملتان میں ہوئی، ان کے والد اور نانا دونوں بڑے عالم تھے اور ان کی نگرانی میں انہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا، کلام الٰہی حفظ کر کے اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بلاد اسلامیہ کے سفر پر نکل کھڑے

ہوئے اور حدیث، تفسیر، فقہ اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کی، فلسطین، عراق، حجاز وغیرہ کا سفر کیا، اور آخر میں شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں حاضر ہو کر باطنی علوم کی تکمیل کی۔ شہاب الدین سہروردی نے آپ کو صرف سترہ دن اپنی تربیت میں رکھا اس کے بعد آپ کو اجازت دے دی۔ مرشد کی اجازت سے حضرت ملتان آ گئے اور تقریباً نصف صدی تک اپنا فیضان پھیلاتے رہے، حضرت کی خانقاہ ملتان کی مشہور ترین خانقاہوں میں سے تھی اس میں ہمہ وقت مریدین اور زائرین کا جمگھٹا رہتا تھا، اس کی عمارت بھی بڑی شاندار تھی جس میں ہر طرح کا مہمان خانہ بھی تھا، عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اس خانقاہ کی بڑی اہمیت رہی ہے، یہ خانقاہ صرف تصوف نہیں بلکہ سیاسی وسماجی اعتبار سے بھی بڑی اہم تھی۔

شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی نے ایک سرگرم روحانی، سیاسی اور سماجی زندگی بسر کی اور 7 صفر المظفر 661ھ مطابق 21 دسمبر 1262ء میں ملتان میں ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔

شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے سلسلہ کو زیادہ تر سندھ اور پنجاب میں فروغ حاصل ہوا، اس کے علاوہ ہرات، ہمدان، بخارا میں بھی ان کے مریدین بڑی تعداد میں تھے۔

بہاؤالدین زکریا ملتانی کا ان کے عہد کی سیاست پر بھی بڑا اثر تھا، سلطان شمس الدین التمش سے ان کے قریبی روابط تھے، انہوں نے سلطان کی مدد بھی کی تھی اور سلطان کا دیا ہوا لقب شیخ الاسلام بھی انہوں نے قبول کیا تھا، وہ بادشاہوں سے تحفے تحائف بھی لیتے تھے اور ان کو عوام میں تقسیم کر دیتے تھے، حضرت شیخ نے منگولوں کے حملے میں ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ اپنی جیب سے دے کر ملتان کو بچایا۔

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کی خانقاہ میں عام روایتی صوفیہ جیسا کچھ نہیں تھا، بلکہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور امیرانہ شان وشوکت تھی۔ دولت کی فراوانی تھی، غلہ کے گودام بھرے رہتے تھے، اس سلسلہ کے صوفیہ عام طور پر ریاضت ومجاہدات میں یقین نہیں رکھتے تھے بلکہ ظاہری شریعت کا اتباع کرتے تھے، نہ کثرت اذکار، نہ کثرت نوافل نہ بہ کثرت روزے، بلکہ اعتدال کے ساتھ زندگی گزارتے تھے سماع وغیرہ کے بھی خلاف تھے، سجدہ تعظیمی جو اس زمانے میں بھی ایک مباحثہ تھا اس کے سخت خلاف تھے، عام لوگوں اور قلندروں سے دور رہتے تھے اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، لیکن شریعت کے اتباع پر بہت زور تھا اور دین کی ترجیحات کی بڑی رعایت رکھتے تھے۔ دینی حمیت وغیرت بھی بہت زیادہ تھی، ایک مرتبہ ایک صوفی ملتان آئے، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی بھی ان سے ملنے گئے، انہوں نے از راہ تعلّی کہا کہ ابھی ابھی اللہ میاں میرے پاس بیٹھے تھے۔ حضرت بہاؤالدین کو یہ سن کر بہت غصہ آیا اور ان سے اتنے ناراض ہوئے کہ اس صوفی کو ملتان سے نکال دیا۔

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کی زندگی میں بڑے اتار چڑھاؤ آئے، شیخ جلال الدین تبریزی کے مقدمہ میں وہ حکم بنائے گئے اور سلطان شمس الدین التمش کی موجودگی میں انہوں نے اس تاریخی معاملہ میں فیصلہ دیا، مختلف اولیاء، مشائخ، علماء اور سرکاری حکام کے ساتھ ان کے سرد و گرم روابط رہے، غرض انہوں نے ایک ہنگامہ خیز زندگی بسر کی۔

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی فرماتے تھے کہ بندہ پر واجب ہے کہ سچائی اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اپنی عبادات واذکار کے ذریعہ غیر اللہ کی نفی کرے، اپنے احوال کو درست کرے اور اقوال وافعال میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے،

ضرورت کے سوا نہ کوئی بات کہے اور نہ کوئی کام انجام دے، ہر قول و فعل سے پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ سے التجا کرے اور اس سے نیک عمل کی توفیق مانگے۔

حضرت نے ایک مرتبہ فرمایا کہ بدن کی سلامتی قلت طعام میں اور روح کی سلامتی ترک گناہ میں اور دین کی سلامتی حضرت خیر الانام پر درود بھیجنے میں ہے۔

23.6 حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی برصغیر ہند کے ان مایہ ناز صوفیاء میں ہیں جن کو بلاشبہ عظمت ہندوستان کی کلاہ افتخار کے تابدار نگینوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی سرزمین پر حق کا پیغام سنایا اور اس تہذیب اور تمدن کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا جو عہد وسطیٰ کے ہندستان کا ایک مثالی تمدن ہے اور جس میں انسان کو بحیثیت انسان قابل تکریم سمجھا گیا، اس میں مذہبی، نسلی یا لسانی امتیازات کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہ رکھی گئی۔

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب جو ایک مثالی کثیر مذہبی معاشرے سے تشکیل پاتی ہے، اس کی تعمیر میں سب سے اہم کردار صوفیاء کا ہے اور صوفیاء کے سلاسل میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کو اولیت کو حاصل ہے، ان کے اولین خلفاء میں حضرت خواجہ قطب الدین کا نام بھی شامل ہے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی ولادت ترکستان کے علاقے میں اوش نامی شہر میں ہوئی، بچپن میں ہی آپ یتیم ہوگئے تھے۔ پانچ برس کی عمر میں آپ کی والدہ نے آپ کو پڑھنے کے لیے مدرسے میں بٹھایا، آپ کے استاد ابوحفص نام کے ایک نیک بزرگ تھے، انہوں نے رسمی علوم کی تکمیل کے ساتھ باطنی تربیت بھی کی، اور آپ اپنے استاد کی نگرانی میں ابتدا سے ہی ریاضت و مجاہدات میں مشغول ہوگئے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی عمر ابھی سترہ سال ہی تھی کہ خواجہ اجمیری کا اس نواح میں گذر ہوا، ان کے اوش میں قیام کے دوران خواجہ قطب الدین بھی حاضر خدمت ہوئے، مرشد نے اقبال مندی کے آثار اور طلب صادق کو دیکھ کر اپنے حلقہ ارادت میں شامل کرلیا اور بہت قلیل مرحلے کی تربیت میں مرشد کامل کی نگاہ کیمیا اثر نے مسترشد کی طلب صادق کو کندن کر دیا صرف سترہ سال کی عمر میں خرقہ خلافت پایا اور مرشد کے حکم سے اپنے وطن اوش میں ہی عبادت و ریاضت اور خلق خدا کی فیض رسانی میں لگ گئے۔

کچھ عرصے بعد جب خواجہ معین الدین چشتی وارد ہندوستان ہوئے تو اس کی خبر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو بھی اوش میں ملی، مرشد سے ملاقات کے شوق میں وہ بھی ہندوستان کی طرف چل پڑے، اس سفر میں شیخ جلال الدین تبریزی بھی ان کے ہمراہ تھے، راستہ میں حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ملاقات ہوئی اور جب دہلی پہنچے تو سلطان شمس الدین التمش نے بھی ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور دہلی میں قیام کی درخواست کی۔

حضرت نے پہلے کیلوکھڑی نام کے قصبے میں قیام فرمایا جو دہلی کے مضافات میں ایک بستی تھی، اس زمانہ میں دہلی اس جگہ کو کہا جاتا تھا جسے آج کل مہرولی کہتے ہیں، یہیں بادشاہ رہتا تھا، بادشاہ کا اصرار تھا کہ خواجہ قطب الدین بختیار دہلی میں قیام پذیر ہوں، آخر

اس کے اصرار پر حضرت نے مہرولی کے قریب قیام فرمانے کا ارادہ کرلیا جہاں آپ قیام پذیر ہوئے وہ جگہ اسی وقت سے حضرت قطب کے نام پر قطب صاحب کہلاتی ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اس وقت تک اجمیر جا چکے تھے، گویا مرید کی خواہش دیدار پوری نہ ہوسکی، اس لیے مرید نے اجمیر حاضری کی درخواست دی، لیکن خواجہ معین الدین چشتی خود ہی دہلی تشریف لے آئے اور اس طرح مرید کی زیارت کی خواہش بھی پوری ہوگئی۔

دہلی میں اس وقت نجم الدین صغری شیخ الاسلام تھے، وہ سماع کے سخت مخالف تھے، اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی صاحب سماع اور صاحب وجد بزرگ تھے، اس لیے وہ حضرت کے بڑے سخت خلاف تھے اور ان پر تنقید کرتے رہتے تھے لیکن عام طور پر صوفیاء سے ان کے اچھے روابط تھے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے بڑا پرانا تعلق تھا، جب حضرت دہلی تشریف لائے تو نجم الدین صغریٰ سے بھی ملنے گئے، نجم الدین نے حضرت سے درخواست کی کہ اپنے مرید یعنی خواجہ قطب الدین کو اپنے ہمراہ لے جائیں۔

خواجہ اجمیری چلتے ہوئے حضرت خواجہ قطب الدین کو اپنے ہمراہ لے کر چلے اور ایک منزل چلے بھی گئے، لیکن اہل دہلی کو ان سے بڑا تعلق خاطر تھا، وہ بھی ایک منزل تک ساتھ گئے اور خواجہ کی واپسی کے لئے اصرار کرتے رہے آخر ان کے اصرار پر حضرت نے ان کو دہلی میں رہنے کی اجازت دے دی۔

اس کے بعد ایک مرتبہ خود خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اجمیر تشریف لے گئے اور مرشد سے نیاز حاصل کیا کچھ دن ساتھ میں قیام بھی فرمایا، وقت رخصت مرشد نے پھر نصیحت کی کہ تمہارا مقام دہلی ہے، اس لیے تم دہلی میں ہی رہنا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی واپس دہلی تشریف لائے، اسی اثناء میں خواجہ اجمیری کا وصال ہوگیا اور حضرت نے اپنے مرشد کی وصیت کو حرز جاں بنا کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی، اور پھر مدت العمر دہلی میں ہی قیام پذیر رہے۔

حضرت خواجہ اگر چہ طریقہ جنید یہ کے متبع تھے اور بار بار فرماتے تھے کہ ہمارا طریقہ جنید یہ ہے، اس طریقہ میں صحو کی اہمیت ہوتی ہے اور سکر کو ناپسند کیا جاتا ہے، حسین بن منصور حلاج جو ایک سکران اور مجذوب صوفی تھے ان پر حضرت نے سخت تنقید کی ہے، لیکن خود حضرت بھی بڑے صاحب جذب صوفی تھے، آپ پر بالعموم مختلف کیفیات طاری رہتی تھیں اور اکثر ظاہری دنیا سے منقطع رہتے تھے، ان کے جذب کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ان کا ایک صاحبزادہ فوت ہوگیا، لوگ اسے دفن کر کے واپس آئے، حضرت بھی ساتھ تھے، اچانک گھر سے رونے کی آوازیں آئیں، پوچھا: یہ رونے کی آواز کیوں آرہی ہے، لوگوں نے عرض کیا حضرت مخدوم زادہ فوت ہوگیا ان کی والدہ رو رہی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ افسوس اگر مجھے پہلے اطلاع ہوتی تو اس کے لئے دعائے صحت کرتا۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اپنے وقت کے کبار صوفیاء میں شمار ہوتے ہیں، لیکن شیخ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بابا فرید الدین گنج شکر جیسے درِّ نایاب کی تربیت کی جو ہندوستان کے لیے ایک گوہر بے بہا ثابت ہوئے، ان کے ذریعہ ہندوستان میں صوفیاء کے دو عظیم سلسلے چشتیہ صابریہ اور چشتیہ نظامیہ کا فروغ ہوا، ان دونوں سلسلوں نے پورے ملک کو ایک وحدت میں پرو دیا، اور اس مشترکہ تمدن کی بنیا درکھی جو ہندوستان کا طرہ امتیاز ہے۔

حضرت خواجہ کے دیگر خلفاء میں قاضی حمید الدین ناگوری اور شیخ بدرالدین غزنوی وغیرہ شامل ہیں، شیخ کے ان خلفاء و متوسلین نے بلا لحاظ مذہب وملت ہر فرد کی خبر گیری کی اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ سب لوگوں کی اصلاح اور ان کے ظاہری و باطنی ارتقا کے لئے جدوجہد کی، خاص طور پر بابا فرید الدین کو تو لوگوں کے درمیان ایسا امتیاز اور ایسی مرجعیت حاصل ہوئی کہ سکھوں نے تو ان کو اپنی مذہبی مقدس کتاب آدی گرنتھ میں شامل کر کے خراج عقیدت پیش کیا۔

حضرت خواجہ قطب الدین کے ملفوظات ان کے مرید بابا فرید الدین گنج شکر نے جمع کیے ہیں، لیکن یہ ملفوظات صرف چند مجلسوں پر ہی مشتمل ہیں، ان ملفوظات میں کچھ تو حضرت کے سفر سلوک کی تفصیلات پر مشتمل ہیں، اور کچھ حصہ میں سالکین کو ہدایات دی گئی ہیں، ان ملفوظات کا نام فوائد السالکین ہے، اس کے علاوہ ایک دیوان بھی ان کی طرف منسوب ہے لیکن اس کا انتساب مشکوک ہے۔

فوائد السالکین میں ۷ صحبتوں کے ملفوظات ہیں اور 63 صفحات کا یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جو راہ سلوک کے رہرو کے لیے ایک جامع ہدایت نامہ ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ سالک کو کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا چاہیے، دنیا کی آلائش سے ہر وقت دور رہنے کی کوشش کرے، نمود و نمائش کے لئے کوئی کام نہ کرے کیوں کہ نمائش کے لئے کام کرنا زہر ہے اور راہ سلوک کے لئے تو بیحد مضر ہے۔

فرماتے تھے کہ سالک کو ہر وقت محبت الٰہی میں غرق رہنا چاہیے، اور جذب و سکر میں اس کا یہ حال ہو کہ اگر زمین و آسمان بھی اس کے سینے میں داخل ہو جائیں تو اس کو خبر نہ ہو۔ سالک کو جو بھی مصیبت پہنچے اس پر صبر کرنا چاہیے کیوں کہ اگر سالک راہ سلوک کی تکالیف پر فریاد کرتا ہے تو پھر اپنے دعوائے محبت میں سچا نہیں ہے۔

حضرت نے ایک دفعہ فرمایا کہ مشائخ طریقت نے بالاتفاق سلوک کے ایک سو اسی درجے رکھے ہیں لیکن اولیاء طریقہ جنیدیہ نے سو درجے اور صوفیائے طریقہ ذوالنون نے ستر درجے قائم کیے ہیں، مگر مشائخ چشتیہ سلوک کے صرف پندرہ درجے شمار کرتے ہیں، ان درجات میں ایک درجہ کشف و کرامت کا ہے، جن کے نزدیک سلوک میں ایک سو اسی درجے ہیں، ان میں اسی واں درجہ کشف و کرامت کا ہے، طبقہ جنیدیہ میں ستر واں، بصریہ میں تیسواں اور خواجگان چشت کے یہاں پانچواں درجہ ہے۔ اس درجے کو حاصل کرنے کے باوجود سالک کو کشف و کرامت میں اپنی ذات کو ظاہر کرنا نہیں چاہیے کیوں کہ اس کے اظہار سے بقیہ درجات سے وہ محروم ہو جاتا ہے۔

قطب صاحب نے اسرار الٰہی کو پوشیدہ رکھنے پر بڑا زور دیا ہے، فرماتے ہیں کہ راہ سلوک میں حوصلہ وسیع ہونا چاہیے کہ اسرار جاگزیں ہو سکیں اور فاش نہ ہونے پائیں، کیوں کہ جو شخص کامل ہوتا ہے وہ کبھی دوست کے اسرار کو فاش نہیں کرتا۔ چنانچہ قطب صاحب کا بیان ہے کہ وہ ایک مدت تک خواجہ معین الدین کی صحبت میں رہے؛ لیکن کسی حال میں بھی انہوں نے اسرار الٰہی ظاہر ہونے نہ دیے۔

23.7 بابا فرید الدین گنج شکر

حضرت بابا شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر ان عظیم اولیاء اللہ میں سے تھے، جنہیں خدا سے دلی عشق اور محبت تھی۔ وہ اپنے رب کی توصیف و تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

''وہ عقل کہاں جو تیرے کمال تک پہنچے، وہ روح کہاں جس کی رسائی تیرے جلال تک ہو۔ یہ مانا کہ
تو نے حسن پر سے نقاب اٹھادی مگر وہ آنکھ کہاں جو تیرے جمال کو دیکھ سکے''۔

بابا شیخ فرید گنج شکر کے لئے محبت خداوندی دنیا کی تمام راحتوں سے زیادہ عزیز اور لذت آمیز تھی اور فراق یار یعنی اپنے خالق سے دوری میں اپنی حالت کو وہ اس کوئل کی سی بتاتے ہیں کہ جس سے جب اس کے کالے ہونے کا سبب دریافت کیا گیا تو اس نے اس کی وجہ اپنے پریتم یعنی محبوب کے ہجر کو قرار دیا۔

کہا جاتا ہے کہ خدا کی محبت کا راستہ اس کے بندوں سے محبت کی منزل سے گزرے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا، پھر پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ 'تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے' اسی لئے صوفیائے کرام نے خدمت خلق کو محبت خداوندی کے لئے لازم مانا اور اس پر ہمیشہ عمل پیرا رہے۔ ان بندگان قدسی صفات نے فصل کے بجائے وصل کو اپنا مشن قرار دیا، اسی لئے بابا شیخ فرید کے یہاں بھی 'سوئی' کی بڑی قدر و قیمت ہے قینچی کی نہیں؛ کیوں کہ بابا فرید گنج شکر کا کام سینہ چاکان چمن کی رفوگری تھا نہ کہ انہیں کاٹنا، وہ مخلوق خدا کی دلداری و دلگیری کو 'حج اکبر' مانتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک کسی کا دل دکھانے والی بات اس لئے نہیں کہنی چاہئے کہ اس میں خدائے لم یزل بستا ہے، اور کسی کا دل اس لئے توڑنا نہیں چاہئے کہ سب انسان بیش بہا موتی ہیں۔

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کو بیعت کرنے کے بعد حضرت بابا فرید نے جو نصیحتیں کیں ان میں 'دشمنوں کو خوش کرنے' اور حق داروں کو حق دینے پر بہت زور دیا۔ آج یہ بات شاید ہمیں کچھ عجیب سی لگے کیوں کہ ہم جس دور میں جی رہے ہیں وہاں تو دوستی کی بھی بنیاد غرض وطلب' پر رکھی جاتی ہے، اور ہر حق اپنا سمجھا جاتا ہے دوسروں سے تو ہم صرف ادائیگی فرض کے طالب ہوتے ہیں، جب کہ بابا فرید نے جو منشور حیات پیش کیا اور جس پر وہ ہمیشہ عمل پیرا رہے وہ تو یہ تھا 'اے فرید جو تجھے اذیت پہنچائے تو اس کے جواب میں اس کو اذیت نہ پہنچا بلکہ اس کے گھر جا کر اس کے قدم چوم'۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کا تسلسل ہمیں بابا فرید کے نامور جانشین حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے یہاں ملتا ہے جب وہ کہتے ہیں: 'جو مجھے رنج دے وہ خوب راحت پائے، اس کے گلشن حیات کا ہر پھول بے خار ہو'۔

حضرت بابا فرید گنج شکر نے تحمل وانکساری اور خاکساری کی تعلیم دی اور سچائی کی طرف بلایا اور انسان جو خود فنا کا ڈھیر ہے مگر انا کا بارود بنا پھرتا ہے، اس کی اصلیت وحقیقت سے بھی اسے آگاہ کیا، انہوں نے کہا: 'انسان کو معرض وجود میں آنے میں تو (کم از کم) چھ ماہ کا عرصہ لگتا ہے، لیکن اس دنیا سے تعلق ٹوٹنے میں لمحہ بھر نہیں لگتا، یہ جسم خاک کا ڈھیر ہو جائے گا، اور پھر قبر کو ہی اس کا گھر بننا ہے'۔ وہ غافل انسان کو تنبیہ کرتے ہیں کہ 'دیکھ لو یکے بعد دیگرے تمام پرندے اڑ گئے اور تالابوں کو خالی کر گئے، یہ بھرے تالاب بھی آخر خشک ہو جائیں گے۔ اور تنہائی میں کنول کے پھول بھی مرجھا جائیں گے'۔ وہ دنیا کی نمائشی اور چند روزہ روحانی اور مادی آسائشوں کو ہی اپنا مقصود حیات بنالینے والوں کو یاد دلاتے ہیں: 'کارتک کے مہینوں میں کھیتوں میں اکثر کونجیں آتی ہیں، چیت کے مہینے میں جنگلوں میں آگ لگتی ہے، اور ساون کے مہینے میں بادل گرجتے اور بجلی چمکتی ہے۔ موسم سرما میں منکوحہ بیوی کی بانہیں اپنے شوہر کے گلے میں پڑی ہوئی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں؛ لیکن یہ سب فانی ہیں، یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انسان کو آخر اس دنیا کو خیر باد کہنا ہے...... زمین آسمان سے پوچھتی ہے کہ وہ ملاح کہاں گئے جو عام لوگوں کو دریا پار کراتے تھے؟ اس کا جواب ہے کہ نہ معلوم کہاں گئے۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ وہ اس وقت قبروں میں دفن ہیں'۔

اسی لئے بابا فرید کا مشورہ ہے کہ عقل لطیف رکھنے والے کو سیاہ اعمال کا ارتکاب نہیں کرنا چاہئے، دوسروں کی برائیاں دیکھنے کے بجائے اسے خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس جیسا سیہ اعمال کوئی دوسرا نہیں ہے، اس لئے ان کا مشورہ ہے کہ آدمی کو درویش صفت ہونا چاہئے اور اس کو چار باتیں اختیار کرنی چاہئیں:

1. اپنی آنکھوں کو بند کر لے کہ خدا کے بندوں کے عیوب نہ دیکھ سکے۔
2. کانوں کو بہرا کر لے کہ جو باتیں سننے کے لائق نہ ہوں ان کو نہ سن سکے۔
3. زبان کو گونگی کر لے کہ جو باتیں کہنے کے لائق نہ ہوں ان کو نہ کہہ سکے۔
4. پاؤں کو لنگڑا رکھے کہ جب اس کا نفس کسی غیر ضروری یا ناجائز کام کی طرف لے جانا چاہے تو نہ جا سکے۔

صوفیائے کرام کی روایت وتعلیم کے مطابق حضرت بابا فرید نے بھی اخلاص واخلاق اور احسان وسلوک کے لئے بھرپور کوشش کی، آپ نے مالک حقیقی سے وصل کو اصل مقصود قرار دیا اور کہا کہ اگر اپنے مالک سے ملنا چاہتا ہے تو راستے کی گھاس بن جا جو کاٹی اور پیروں سے روندی جاتی ہے، اور درختوں کی طرح بردبار ہو جا جو گرمی، سردی اور کلہاڑے کی ضرب جھیلتے ہیں۔ وہ پھر اخلاص و اخلاق پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں: 'بد انسان سے بھی نیکی کا برتاؤ کرو، اس کے لئے دل میں کسی قسم کا کینہ اور بغض مت رکھو، اگر اس طرح ہوگا تو انسان کسی بھی مرض میں مبتلا نہیں ہوگا، ہمیشہ تندرست رہے گا اور اپنے مقصد کو پالے گا'۔ وہ انسانوں کے باہمی معاملات میں مطلب پرستی اور فائدہ مندی کو نامناسب قرار دیتے ہیں، ان کا فرمان ہے: جہاں حرص وہوس ہے وہاں محبت کہاں؟ اگر حرص وہوی ہے تو ایسی محبت جھوٹی ہے جس پر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ کیوں کہ وہ تو جلد ہی مٹ جائے گی۔ ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں: باتوں سے تو سیکڑوں دوستی کی ڈینگ مارتے ہیں؛ لیکن حقیقی دوست ڈھونڈنے پر بھی نصیب نہیں ہوتا، میں تو حقیقی دوست اور غم خوار کی محبت میں گیلے اپلے کی طرح جلتا رہتا ہوں۔ اس لیے ان کی رائے میں ضروری ہے کہ انسان اپنے دل کو صاف وہموار کر کے راستے میں آنے والے تمام گڑھوں کو مسمار کر دے، ایسا کرنے سے ہی وہ اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچا سکتا ہے۔

ربوبیت اور انسانیت کے احترام کا یہ روحانی منشور حضرت بابا شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر نے ایک ایسے زمانے میں پیش کیا تھا جب کج کلاہی پر نازاں کوئی بھی بدمست کسی کی بھی آبرو کے درپے ہو جاتا تھا، جب فخر وغرور کے نشے میں اپنی جھوٹی آن کی برقراری وبحالی کے لئے بستیاں اجاڑی جاتی تھیں، لہلہاتے کھیت برباد کر دیے جاتے تھے، جب کھاد کی جگہ انسانی خون زمین کی غذا بنتا تھا اور انسانی سروں کی کھیتیاں کاٹی جاتی تھیں۔

معلومات کی جانچ

1. کشف المحجوب کس کی تصنیف ہے؟
2. شیخ علی ہجویری کہاں پیدا ہوئے؟
3. خواجہ معین الدین چشتی کے مرشد کون تھے؟

4. ہندوستان میں سہروردی سلسلے کو سب سے پہلے لانے والے کون بزرگ تھے؟

5. فوائدالسالکین کس بزرگ کے ملفوظات ہیں؟

23.8 محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ

سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء (متوفی 527ھ/ 1324ء) کو دہلی میں جو شہرت اور مقبولیت ملی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی، آج بھی دہلی میں اگر کوئی نام سب سے زیادہ کثرت سے بولا، لکھا اور پڑھا جاتا ہے تو وہ حضرت محبوب الٰہی کا نام نامی ہے خواہ اس کا ذکر بستی حضرت نظام الدین کے حوالے سے ہو، بنگلہ والی مسجد میں تبلیغی مرکز کے حوالے سے ہو، حضرت نظام الدین ریلوے اسٹیشن کے حوالے سے ہو یا پھر سلطان المشائخ کی آخری آرام گاہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے حوالے سے ہو۔ سلطان جی حضرت محبوب الٰہی کا خاندان وسطی ایشیا میں بخارا سے ہجرت کر کے لاہور ہوتا ہوا بدایوں پہنچا، جو اس زمانے میں قبۃ الاسلام کے نام سے مشہور تھا اور علماء وصوفیاء کی بڑی تعداد وہاں سکونت پذیر تھی۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بدایوں میں ہی ماہ صفر 436ھ کو خواجہ احمد کے گھر پیدا ہوئے، والدین نے محمد نام رکھا، صرف پانچ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، والدہ، جو بڑی ہی نیک اور عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں، نے نامساعد حالات کے باوجود ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داریاں اٹھائیں اور بلاشبہ حضرت محبوب الٰہی کی سیرت وشخصیت کی تشکیل میں سب سے اہم رول ان کی والدہ نے ادا کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد حضرت محبوب الٰہی سولہ برس کی عمر میں والدہ اور بہن کے ساتھ دہلی وارد ہوئے اور یہاں کے علماء اور فضلاء سے رسمی تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے شیخ طریقت بابا صاحب فریدالدین گنج شکر کے پاس اجودھن جا کر تصوف اور سلوک کی اعلیٰ منزلیں طے کیں، اجودھن سے جب لوٹنے لگے تو بابا صاحب نے انہیں دو نصیحتیں کیں جن پر وہ تمام عمر عامل رہے، ایک یہ کہ کسی سے قرض لینا تو جلد ادا کرنے کی کوشش کرنا، دوسرے اپنے دشمنوں کو ہر حال میں خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔

اجودھن سے واپسی کے بعد خواجہ صاحب زیادہ دنوں دہلی میں قیام نہ کر سکے؛ بلکہ دہلی کی نواحی بستی غیاث پور کو اپنے قیام سے رونق بخشی جو اب بستی حضرت نظام الدین کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں سے سلطان المشائخ نے روحانی وعلمی فیوض وبرکات کا وہ سلسلہ شروع کیا جو آج تک مختلف صورتوں میں جاری ہے، قیام گاہ سے متصل جماعت خانہ کی عمارت تھی جس میں مریدین اور جویان علم ومعرفت قیام پذیر ہوتے تھے، روزانہ چاشت کی نماز کے بعد حضرت محبوب الٰہی جماعت خانے میں قیام فرماتے اور مریدین کو سلوک ومعرفت کی باریکیوں کی تعلیم دیتے، ان کی اس مجلس میں علماء وصلحاء اور صوفیاء کا بہت بڑا اجتماع ہوتا تھا، ظہر کی نماز کے بعد بھی ایک مجلس ہوتی تھی البتہ اس کی نوعیت علمی ہوتی اور حضرت خواجہ صاحب اس میں زیادہ تر علمی مسائل پر گفتگو فرماتے۔

حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء حقیقی معنوں میں صوفی باصفا تھے، الخلق عیال اللہ (مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) کے اصول پر عمل کرتے ہوئے جو کچھ بھی ان کے پاس آتا مخلوق پر خرچ کر دیتے، بادشاہوں اور شہزادوں کے ہدیے قبول کرنے سے گریز کرتے۔ اپنے پیرومرشد کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مخالفوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کا رویہ اختیار کرتے یہاں تک کہ وہ بھی ان کے گرویدہ ہو جاتے، اپنے مریدین کے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے اور ہر وقت ان کے احوال کی اصلاح کے لیے فکرمند رہا کرتے، اسی طرح اپنے پیرومرشد کے عزیزوں اور ان کے مریدوں کا بھی خاص خیال رکھتے۔

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی ہی نہیں محبوب عام و خاص بھی تھے، ان کی مجلس میں سب کو بلا تفریق اور بغیر کسی پابندی کے رسائی حاصل تھی، خلق خدا اس کثرت سے ان کے دربار میں حاضری دیتی تھی کہ بادشاہوں کے درباروں کی رونق ماند پڑ جائے، ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

''شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا، اور گناہ گاروں کو خرقہ پہنچاتے اور ان سے توبہ کراتے تھے، اور اپنی مریدی میں قبول کرتے تھے، اور خاص و عام، غریب و دولت مند، بادشاہ و فقیر، عالم و جاہل، شریف و رذیل، شہری اور دیہاتی، غازی و مجاہد، آزاد و غلام سب کو طاقیہ، توبہ اور پاکی کی تعلیم دیتے تھے۔ اور یہ تمام لوگ چونکہ اپنے کو شیخ کا مرید سمجھتے تھے، بہت سے گناہوں سے باز آتے تھے، اور اگر کسی مرید سے لغزش ہو جاتی تھی تو پھر از سر نو بیعت کرتا اور شیخ اس کو توبہ کا خرقہ عطا کرتے۔ شیخ کی مریدی کی شرم تمام لوگوں کو بہت سی ظاہری و باطنی برائیوں سے روکے رکھتی تھی، عام طور پر لوگ تقلید و اعتقاد کی وجہ سے عبادت کی طرف رغبت کرتے تھے، مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بازاری، عامی، غلام، نوکر سب کے سب نماز ادا کرتے تھے اور حضرت کے اکثر مرید چاشت و اشراق تک کے پابند ہو گئے تھے''۔

حضرت محبوب الٰہی نے اس الوہی اور عوامی مقبولیت کے درمیان وحدت اللہ اور وحدت آدم کے آفاقی اسلامی پیغام کو اپنی ذات و حیات کا مرکز و محور قرار دیا اور ایک ایسی سماجی و تہذیبی حرکت پیدا کی جس سے روحانی تشنگی کے مارے ہوئے لوگ جوق در جوق غیاث پور کے چشمہ صافی کے گرد جمع ہو کر سیراب ہونے لگے، حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنی بے پناہ انسانی محبت، دردمندی اور وسیع المشربی کے زیر اثر مذہبی رواداری اور بقائے باہم کا ایک ایسا روح پرور اور فیض رساں ماحول پیدا کیا جس میں ہندوستان کی تہذیبی زندگی اسلامی طرز حیات کے ساتھ ہم آمیز ہوئی اور اس قربت سے ایک ایسا تہذیبی جلوۂ صدرنگ وجود میں آیا جس نے سماج و معاشرہ، تہذیب و ثقافت، زبان و ادب، شاعری و موسیقی، فن تعمیر اور عام طرز معاشرت ہر سطح پر اپنے اثرات قائم کئے اور ہندوستان کی مذہبی و تہذیبی زندگی ایک ایسی راہ اعتدال سے واقف ہوئی جسے آج ہم گنگا جمنی تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

23.9 شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیریؒ

شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰ منیری، اپنے وقت کے عظیم مصلح تھے، آپ کی اصلاحی مساعی کی جولانگاہ بہار کا علاقہ ہے، پٹنہ کے قریب ایک گاؤں منیر میں 661ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، خاندان فقیہوں کا تھا، گھر کا ماحول علم و دین سے معمور تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر مزید تعلیم کے لئے اپنے عہد کے اجلہ علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور بڑے انہماک اور یکسوئی سے تعلیم مکمل کی، ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد باطنی علوم کی طرف توجہ دی، دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء سے ملاقات کی، غالباً ان کے مشورے پر پانی پت شیخ شرف الدین قلندر پانی پتی کی بارگاہ میں پہنچے، لیکن اس زمانے میں حضرت پر غلبہ حال بہت شدید تھا، اس لئے واپس دہلی آئے اور شیخ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں رہ کر سلسلہ فردوسیہ سے وابستہ ہو گئے۔

بیعت واجازت کے بعد وطن کی طرف مراجعت کی لیکن ابھی سونے کا کندن ہونا باقی تھا اس لئے آرہ اور راجگیر کے جنگلوں میں سخت ریاضت ومجاہدہ میں مشغول ہوگئے، اور جب باطنی کیفیات کی تکمیل ہوگئی تو اس کے بعد لوٹ آئے اور لوگوں کی اصلاح و تربیت میں لگ گئے۔

حضرت شرف الدین یحیٰ منیری نے بہار شریف میں رہ کر تقریباً ساٹھ سال تک اسلام کی اشاعت اور لوگوں کی اصلاح و تربیت کی، آپ کی نگاہ کیمیا اثر سے ہزاروں لوگوں نے حق کا راستہ اختیار کیا، اور متعدد ہندو جوگیوں اور بڑے عالموں نے اسلام کی دولت سے مشرف ہوکر فلاح دارین کی دولت پائی۔

حضرت شرف الدین بن یحیٰ منیری کو تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا۔ اس لئے تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے اور خطوط و رسائل کے ذریعے بھی لوگوں کی اصلاح وتربیت فرماتے، آپ کے خطوط کے چار مجموعے موجود ہیں، مکتوبات صدی، مکتوبات دو صدی، مکتوبات بست وہشت اور فوائد رکنی۔ ان مکتوبات کے مجموعوں کے علاوہ آپ کی 25 کتابیں بھی موجود ہیں: معدن المعانی، مغز المعانی، بحر المعانی، فوائد عینی، خوان پر نعمت، تحفہ غیبی، مونس المریدین اور گنج لاتفنی کے علاوہ ارشاد الطالبین، ارشاد السالکین، شرح آداب المریدین، فوائد المعانی، مرأۃ المحققین وغیرہ۔ 782ھ میں آپ کی وفات ہوگئی۔

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری نے تصوف کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تصوف تو دین وایمان کی جان ہے۔ اہل طریقت کے یہاں تصوف کی تین قسمیں ہیں: صوفی، متصوف اور مشتبہ۔ صوفی وہ ہے جو اپنی ہستی کو فنا کر چکا اور اللہ کے ساتھ باقی ہے، خواہشات نفسانی کے قبضے سے باہر اور حقائق موجودات کا ماہر ہے۔ متصوف کی یہ شان ہے کہ ریاضت ومجاہدہ میں اس لئے مصروف وسرگرم رہتا ہے کہ صوفیوں کے مراتب حاصل کر سکے۔ اور قدم بہ قدم ان کی راہ چل کر اپنے معاملات ان کے ساتھ درست کرنا چاہتا ہے۔ اور مشتبہ کی یہ حالت ہے کہ اس میں صورتاً تو صوفیوں کے اکثر عادات ہوں مگر معناً نہیں، روزہ، نماز، درود ووظائف، ذکر واشغال یا اور کوئی عمل وہ اس غرض سے نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ سے ملے بلکہ ان تمام آرائشوں کا مقصد جاہ طلبی اور حظوظ نفسانی ہیں''۔

تصوف کی اس حقیت کے منکشف ہوجانے کے بعد اس امر کی گنجائش نہیں رہتی کہ ہم شریعت اور طریقت میں کوئی فرق کریں، حضرت مخدوم جہاں کے نزدیک ان میں نہ تو کوئی بیر ہے نہ تضاد اور نہ عناد؛ بلکہ ان کے بقول شریعت سے طریقت اور طریقت سے حقیقت حاصل ہوتی ہے، وہ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''جو شخص طریقت کی راہ کا طلب گار ہو اس کے پاس شریعت کی پونجی ضرور ہونا چاہئے تاکہ قصبہ شریعت سے شہر طریقت میں پہنچے۔ طریقت میں جہاں قدم درست ہوا ملک حقیقت میں پہنچ جانا آسان ہے۔ جس بے علم نے شریعت ہی کو نہیں سمجھا اور طریقت ہی سے شناسائی نہیں تو حقیقت تک کیوں کر رسائی ہوسکتی ہے اس لیے بے علم معرفت اور ناواقف شریعت کو اس راہ میں چلنے کی اجازت نہیں ہے''۔

حضرت مخدوم جہاں کے نزدیک علم کے بغیر کسی سالک کو اس کوچے میں قدم نہیں رکھنا چاہیے کیوں کہ اس کے بغیر وہ کافر و مجنون ہو جاتا ہے؛ لیکن یہاں علم سے مراد مکتب کی کرامت نہیں بلکہ وہ فیضان نظر ہے جو آداب ارادت مندی سکھاتا ہے، حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا نے فرمایا تھا کہ ہر شخص کو مرید ہونے سے پہلے اپنے پیر میں تین چیزیں لازماً دیکھ لینی چاہئیں: (1) علم (2) عقل (3) عشق۔ حضرت مخدوم جہاں بھی اس کے قائل ہیں کہ جو شخص راہ طریقت میں آنا چاہے اور درد طلب اس کا دامن پکڑے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا ایک رہبر بنالے، لیکن انہوں نے پیر کے انتخاب کے لئے جو شرطیں بتائیں وہ بھی بڑی سخت ہیں، لکھتے ہیں:

''پیر ایسا ہو کہ پیروں اور مشائخ کے نزدیک مشار الیہ اور ممتاز ہو۔ اس کی پیشوائی اور مقتدائی پر پیروں کا اتفاق ہو، مملکت خداوندی میں جائز التصرف، نافذ المشیت اور صاحب الاشراق ہو، جب ان صفتوں کا پیر مل جائے تو اس کی اقتدا کرے، پیر جتنے بھی راستے کے روڑے اور روکاوٹیں ہوں اس کی راہ سے ہٹا دے اور اس کے عیب اس کو دکھا دے اور راستے کی دشواریوں سے اس کو خبر دار کر دے تا کہ مرید پوری طرح اپنی خود آرائی سے باہر نکل آئے''۔

اپنی اس ہدایت کے ثبوت میں صاحب مکتوبات صدی نے صاحب المثنوی کے [illegible] پیش کئے ہیں، جن کا ترجمہ یوں ہے:

''ایسا پیر جو راہ فتنہ سے واقف اور تیرے لئے کار آمد ہے تا کہ ہر ایک کام میں وہ تجھے اپنی پناہ میں رکھے۔ تو ہرگز ہرگز راستے کے کنویں سے واقف نہیں۔ بغیر کسی دستگیری کے کنویں میں گر پڑنے کا ڈر ہے۔ کتنے دہکتی ہوئی آگ کے پہاڑ راہ میں ہیں۔ ان سے پار اترنا ہر شخص کا کام نہیں''۔

آج ایک بار پھر جب ہر راہ فتنوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے قلب ونظر کا فساد ہر فرد کو خودکشی کے راستے پر لیے جا رہا ہے، اور ہماری اجتماعی زندگی حادثوں کا پرشور ہجوم ہو کر رہ گئی ہے، سلامتی و عافیت، صبر و قرار اور امن و آشتی کا وہ راستہ یہی ہے جو طریقت وسلوک کی منازل سے شریعت کے سائے میں گزرتا ہوا ہمیں حقیقت تک پہنچاتا ہے اور انسان اسی کے ذریعے زندگی کے سراغ کو پاتا ہے۔

23.10 سید محمد حسینی المعروف بہ بندہ نواز گیسو دراز

مشائخ چشت نے سرزمین ہندوستان کو اپنی خدمات کی جولانگاہ بنایا، حضرت خواجہ غریب نواز اس سرزمین پر سلسلہ چشتیہ کو لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ آفتاب چشت کی مہربار شعاعوں نے پورے برصغیر کو منور کر دیا۔ سلسلہ چشتیہ کے ایک صوفی حضرت سید محمد الحسینی تھے جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے معروف ہیں، قدیم مشائخ کے برخلاف انہوں نے اپنے آپ کو صرف عملی تصوف تک نہیں محدود رکھا بلکہ تصوف کی علمی فضاؤں کو بھی منور کیا، ان کے اثرات و برکات جس طرح شمالی ہند میں پڑے اسی طرح جنوب اور دکن کا علاقہ بھی ان کی ضیاباری سے منور ہوا، ان کی عملیت نے ہندوستانی سماج کو عطر بیز کیا تو ان کی علمیت نے تصوف کے درو بست کی عقدہ کشائی کی اور اپنے مؤثر قلم سے تصوف کے غوامض و مشکلات کو حل کیا۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ تک دہلی کو مرکز بنائے رکھا اور پھر حالات نا مساعد ہوئے تو دکن تشریف لے گئے، گلبرگہ کو اپنا مستقر بنایا اور اسی خاک کے پیوند ہو کر اپنی برکات و

روایات کو ہمیشہ کے لیے اس سرزمین کا حصہ بنا دیا۔ آج بھی ان کے فیوض و برکات اس سرزمین پر جاری ہیں اور ان کی آخری آرامگاہ عقیدت مندوں کے لیے زیارت گاہ بنی ہے۔

حضرت سید محمد حسینی ۷۲۱ھ میں اجداد دہلی کے رہنے والے تھے اور مشائخ چشت سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے، ان کے والد اور نانا دونوں حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے، اس روایت کے اتباع میں خود حضرت بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، اس طرح چشتیہ سلسلے سے عقیدت کا تعلق ان کے مزاج اور خمیر کا حصہ بن گیا تھا، لیکن چار سال کی عمر تھی کہ حضرت کے والد کو دولت آباد (دیوگیر) جانا پڑا اور حضرت بھی دولت آباد چلے گئے، وہاں حضرت کے ماموں سید ابراہیم مستوفی صوبہ دار تھے، دنیاوی وجاہت کی اس فضا میں حضرت کو بہتر تعلیم و تربیت کے مواقع اور دیگر سہولیات میسر تھیں، لیکن گردش فلک ہمیشہ ایک رخ پر نہیں رہتی، ابھی حضرت کی عمر صرف دس سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ماموں نے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی؛ لیکن کچھ عرصہ بعد والدہ اور ماموں میں شکر رنجی ہو گئی اور وہ اتنی بڑھی کہ حضرت کی والدہ حضرت کو لے کر دہلی آ گئیں۔

دہلی میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا فیض جاری تھا، سید محمد حسینی گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضری دینے لگے، مرشد نے تلقین کی کہ اصلاحی تعلق استوار رکھو، لیکن ظاہری علوم کی تکمیل پہلے ضروری ہے اس لیے علم حاصل کرتے رہو۔ حضرت چراغ دہلی کے طریق تربیت میں تدریج کی بڑی اہمیت تھی، سالک پر ایک ساتھ بڑا بوجھ ڈالنا بسا اوقات اس کے لئے تباہ کن ہوتا ہے؛ اس لئے حضرت مریدین و متوسلین کو تدریج کے ساتھ اعمال کا عادی بناتے تھے اور بنیادی اعمال کی پابندی کے بعد پھر ریاضت و مشقت کراتے۔ سید محمد الحسینی کو زمانہ طالب علمی میں ہی نہایت حکمت کے ساتھ مختلف اعمال کا پابند بنایا اور اس کے ساتھ ظاہری علوم کی تکمیل بھی ہوتی رہی، حضرت چراغ دہلی کے اس تدریجی ترقی کے اصول کو خود سید محمد الحسینی نے بیان فرمایا جو ان کے ملفوظات جوامع الکلم میں موجود ہے، اس میں لکھا ہے:

> ''ایک بار اشراق کے بعد پابوسی کے لیے حاضر ہوا، حضرت خواجہ نے فرمایا: صبح کی نماز کے لیے جو وضو کرتے ہو، کیا وہ آفتاب کے طلوع ہونے کے بعد تک باقی رہتا ہے؟ میں نے عرض کی: جی ہاں، آپ کے صدقہ میں باقی رہتا ہے، فرمایا: اچھا ہو جو اسی وضو سے دوگانہ اشراق بھی پڑھ لیا کرو، میں نے کھڑے ہو کر عرض کی کہ آپ کے صدقہ میں پڑھوں گا۔ پھر فرمایا اسی کے ساتھ شکر النہار اور استخارہ بھی پڑھ لیا کرو، جب چند روز اس کی پابندی کر چکا تو ایک روز فرمایا، دوگانہ اشراق پڑھتے ہو؛ میں نے عرض کیا: بلا ناغہ پڑھتا ہوں، ارشاد فرمایا: اگر اسی میں چاشت کی بھی چار رکعت ملا دیا کرو تو نماز چاشت بھی ہو جایا کرے گی، میں نہیں کہتا کہ اور کسی وقت پڑھو، بلکہ بعد اشراق اسی وقت چاشت پڑھ لیا کرو تو چاشت بھی ہو جایا کرے گی۔
>
> میں ہمیشہ رجب میں روزے رکھا کرتا تھا، ایک بار پوچھا: کیا تم رجب میں روزے رکھا کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، پھر پوچھا: شعبان میں بھی؟ میں نے کہا: شعبان میں نو روزے رکھتا ہوں؟ فرمایا: اگر اکیس دن اور رکھ لیا کرو تو پورے تین مہینہ کے روزے ہو جایا کریں گے، میں نے

گزارش کی: آپ کے صدقہ میں رکھوں گا، میں نے اپنی والدہ سے کہا، وہ اس وقت تک حضرت شیخ سے بیعت نہیں ہوئی تھیں، مجھ پر برہم ہوئیں، کچھ سخت سست بھی کہا، میں نے ان سے عرض کیا، آپ جو چاہیں کہیں لیکن شیخ نے جو کچھ فرمایا ہے، اس پر عمل کرنے سے باز نہیں آؤں گا۔

میں رمضان کے بعد شش عید کے چھ روزے بھی رکھا کرتا تھا، ان ہی ایام میں ایک دن قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا، ارشاد فرمایا: ہمارے خواجگان صوم داؤدی نہیں رکھا کرتے تھے بلکہ صوم دوام رکھتے تھے، تم بھی صوم دوام رکھا کرو۔''

حضرت نے ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد مجاہدہ کی دنیا میں قدم رکھا اور حظیرہ شیر خاں میں ایک حجرے کے اندر مراقبہ اور مجاہدہ شروع کیا، حضرت کی اس محنت شاقہ اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے فیوض و برکات کا تذکرہ 'سیر محمدی' میں نہایت تفصیل سے آیا ہے۔

حضرت چراغ دہلی کی وفات کے بعد دہلی میں مشائخ چشت کی پائیگاہ حضرت سے منسوب ہوئی اور ایک طویل عرصہ تک حضرت اس مسند کرامت پر رونق افروز رہے، اس اثنا میں بہت سے واقعات پیش آئے ان پر شریعت کے جادہ مستقیم سے ہٹنے کا الزام بھی لگا اور فیروز شاہ تغلق نے اس کی خود تحقیقات کرائی لیکن آخر آپ کو سرخروئی حاصل رہی۔ حضرت کے ذوق سماع کو بھی مورد طعن بنایا گیا لیکن مخالفین کو تاب تکلم نہیں رہا اور حضرت مشکل مقام سے بعزت تمام گزر گئے۔

حضرت نے ستر سال کی عمر تک دہلی کو فیض یاب کیا اس کے بعد قدرت کو اس دریائے الطاف وعنایات کے لیے نئی سرزمین منتخب کرنا منظور ہوا، اس کے اسباب یہ بنے کہ ۸۰۱ھ میں امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کیا اور یہاں کا سکون واطمینان درہم برہم ہوگیا۔ حضرت نے اپنے مریدین وخدام کے ساتھ ترک وطن کا ارادہ فرمایا اور بہادر پور، گوالیار، چندیری، کھمبات، بڑودہ، سلطان پور اور دولت آباد ہوتے ہوئے گلبرگہ شریف تشریف لائے، ہر جگہ کے حاکموں نے آپ کا شاندار استقبال کیا، عوام وخواص نے آپ کی پذیرائی کی؛ لیکن لوگوں کے اصرار کے باوجود آپ کا سفر جاری رہا اور یہ سعادت سلطان فیروز شاہ بہمنی کے حصہ میں آئی کہ حضرت نے ان کے اصرار کو قبول فرمایا اور انہوں نے چند گاؤں نذر کیے تھے، حضرت نے ان کو بھی قبول فرمایا اور گلبرگہ میں اقامت گزیں ہوگئے۔

گلبرگہ میں بھی حضرت نے ایک طویل عرصہ بسر کیا اس دوران ایک خلق نے حضرت سے استفادہ کیا، حضرت مسلمانوں کو مرید کرتے اور ان کی اصلاح کرتے اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیتے اور تلقین ہدایت کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا اور آخر ۱۰۴ رسال کی عمر میں گلبرگہ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار گلبرگہ میں زیارت گاہ خلائق ہے اور یہ بزرگان دین کی کرامت ہی ہے کہ ان سے جو چیز وابستہ ہوجاتی ہے وہ باعظمت ہوجاتی ہے، جمال ہم نشین خاک پا کو بھی مشک و عنبر بنا دیتا ہے، وہ سرزمین حضرت سے منسوب ہوکر گلبرگہ نہیں رہی بلکہ گلبرگہ شریف بن گئی۔

حضرت محمد الحسینی مشائخ چشت میں پہلے صوفی ہیں جنہوں نے تصنیف و تالیف کو اپنا میدان بنایا، حضرت کے مرشد شیخ نصیر الدین چراغ دہلی بھی غالباً ان کے ذوق تصنیف سے واقف تھے، اس لئے ایک مرتبہ درسی کتابوں کو محنت سے پڑھنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ تم سے کچھ اور کام بھی لینا ہے، تذکرہ نگاروں نے بھی حضرت کی علمیت اور ولایت دونوں کا تذکرہ بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کو جامع سیادت علم وولایت لکھا ہے۔

سیر محمدی اور مختلف کتاب خانوں کی فہرست وغیرہ سے حضرت کی ۳۰۰ سے زیادہ کتابوں کا سراغ ملتا ہے، جن میں چند شائع ہوگئی ہیں، ان کی اہم ترین کتابوں میں تفسیر کشاف پر حاشیہ، مشارق الانوار کی شرح اور اس کا فارسی ترجمہ، عوارف المعارف کی شرح اور اس کا فارسی ترجمہ، ابوبکر کلاباذی کی معرکہ آراء کتاب التعرف لمذاہب اہل التصوف کی شرح، سلسلہ سہروردیہ کے اصلی بانی ضیاء الدین ابونجیب سہروردی کی کتاب آداب المریدین کی شرح عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں، ابن عربی کی فصوص الحکم اور عین القضاہ ہمدانی کی تمہیدات کی شرح، ابوالقاسم قشیری کے رسالہ کا ترجمہ، قوت القلوب پر حواشی، رسالہ سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ مکتوبات، ملفوظات اور اجازت نامے اور دیوان اشعار بھی آپ کی تصنیفات میں شامل ہیں، آپ کی ایک کتاب 'آداب المریدین بھی ہے جو اپنے زمانے کے احوال وظروف کو سامنے رکھ مریدین کے لیے بطور ہدایت نامہ لکھی گئی ہے اور حسن اتفاق سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

حضرت کی کتابوں میں جو علوم و معارف اور اسرار وحکم ہیں، ان کے لیے تو ایک سفینہ چاہیے کہ اس بحرِ بے کراں کی لامحدود فضاؤں میں علمی سیر کرسکے، لیکن صرف فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف کی وہ فضا جو تیسری چوتھی صدی کے بغداد میں سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی، حارث محاسبی، سری سقطی، ابوبکر شبلی اور حمدون قصار کے زیر اثر وجود میں آئی تھی، اس کی ایک بازگشت اور بازدید گلبرگہ شریف کے دامن میں حضرت سید محمد الحسینی کے یہاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے تصوف کی امہات کتب کو اپنے عہد کے قاری تک پہنچایا اور قرآن وحدیث سے اس کا رشتہ استوار کیا، بلکہ حضرت خود ایک تفسیر تصنیف فرما رہے تھے؛ لیکن وہ چار پاروں سے زیادہ نہیں لکھی جاسکی۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی آپ نے ایک رسالہ تصنیف فرمایا تھا جو غالباً سرزمین ہند پر لکھی جانے والی سیرت کی اولین کتاب ہوگی۔ سید محمد الحسینی جامع کمالات صوری و معنوی تھے، ہندوستان کے اندر تصوف کی تاریخ میں ایسے اساطین کم گزرے ہیں جنہوں نے علم وعمل سے اس طرح دامان تصوف کو مالا مال کیا ہو۔

23.11 سید علی ہمدانی

امیر کبیر سید علی ہمدانی داعی دین اور مبلغ اسلام تھے، کشمیر جنت نظیر کو دولت ایمان سے مشرف کرنے میں حضرت امیر کبیر کی خدمات سب سے زیادہ ہیں، انہوں نے اس وادی میں اسلام کی اشاعت بھی کی اور یہاں مسلم معاشرے کی بنیادیں بھی استوار کیں، ان کا کارنامہ صرف یہی نہیں ہے؛ بلکہ انہوں نے صنعت وحرفت کے فروغ کے ذریعہ کشمیر کی مالیات اور اقتصادیات کو بھی نئی جہات اور نئی ترقیاں عطا کر کے اس کے لئے ایک نئے مستقبل کا باب وا کر دیا۔

حضرت امیر کبیر 12 رجب المرجب 713ھ مطابق 22 اکتوبر 1313ء کو ایران کے شہر ہمدان میں پیدا ہوئے، والد جو بڑے علم دوست تھے ان کی شدید خواہش تھی کہ ان کا بیٹا بڑا عالم بنے، اس لئے انہوں نے بیٹے کی تعلیم وترقی پر بڑی توجہ دی، ابتدائی تعلیم کے بعد ان کو اپنے وقت کے جید عالم اور صوفی شیخ علاؤالدولہ سمنانی کی خدمت میں بھیج دیا، آپ آٹھ سال ان کی خدمت میں رہ کر باطنی کیفیات کی تکمیل کرتے رہے، اس کے بعد آپ نے بعض دوسرے علماء وفضلاء سے بھی علم حاصل کیا اور تکمیل علوم کے بعد عالم کی سیاحت کے لئے نکل پڑے۔ تقریباً 20 یا 21 برس کی طویل سیاحت کے بعد آپ نے وطن مراجعت کی اور ہمدان میں دعوت

وتبلیغ اورارشاد واشاعت اسلام کا کام کرنے لگے، اس دوران آپ کو کشمیر کی طرف سفر کرنے کا داعیہ پیدا ہوا اور آپ کشمیر تشریف لائے اور یہاں اسلام کی اشاعت میں مشغول ہوگئے، کشمیر میں اس وقت حکومت مسلمانوں کی تھی لیکن عوام بڑی تعداد میں بدستور اپنے آبائی مذہب پر تھے اور جو مسلمان تھے ان میں بھی بے عملی اور بدعقیدگی بہت تھی، حضرت امیر کبیر کی مساعی جمیلہ سے یہاں نہ صرف اسلام کی اشاعت ہوئی بلکہ جو غلط رسوم ورواج معاشرے میں جڑ پکڑے ہوئے تھے ان کی بھی اصلاح ہوئی۔

کہتے ہیں کہ امیر کبیر کے ساتھ تقریباً سات سو داعی بھی تھے اور امیر کبیر کی تبلیغ و اشاعت سے کشمیر میں 73 ہزار لوگوں نے اسلام قبول کیا، سید محمد قادری نے کشمیر میں آپ کی آمد کے اثرات کا تذکرہ ہوئے ایک قطعۂ تاریخ لکھا جس کا ترجمہ ہے:

> ''میر سید علی جو ہمدان کے شہر میں تھے انہوں نے ساتوں اقالیم کی سیر کی، کشمیران کے آنے سے بابرکت ہوگیا اور اس کے لوگ ہدایت کے طالب ہوگئے۔ ان کے آنے کی تاریخ ''مقدم شریف او'' سے برآمد ہوتی ہے''۔

میر سید علی ہمدانی کی کاوشوں سے غیر اسلامی روایات ورسوم کا خاتمہ ہوگیا، خود سلطان کے نکاح میں دو سگی بہنیں تھیں، امیر کبیر کی تلقین سے اس نے اس غلطی کی اصلاح کی امیر کبیر کی تلقین سے راجہ نے ہندوانہ لباس ترک کر کے اسلامی لباس اختیار کیا۔

کشمیر کے ایک ہندو رئیس نے امیر کبیر کے ایک ساتھی میر سید حسین سمنانی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، ان کا نام شیخ سلیمان رکھا گیا، ان کے ایک اور ساتھی سید قاضی تھے انہوں نے علاقہ لتار پور میں اسلام کی اشاعت کی۔

میر سید علی نے ''ذخیرۃ الملوک'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں مسلم حکمرانوں کے لئے ہدایات ہیں، یہ کتاب ہنوز متداول ہے، اس کتاب کے علاوہ بھی سید علی ہمدانی نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں تھیں، بعض مؤرخین کے مطابق امیر کبیر کی تصنیفات کی تعداد 45 ہے، میر واعظ مولوی عمر فاروق نے اپنے تحقیقی مقالہ جو ذخیرۃ الملوک کے انگریزی ترجمہ کا مقدمہ ہے میں حضرت امیر کبیر کی جملہ دستیاب کتب اور ان کے مخطوطات کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

23.12 شیخ عین الدین محمد گنج العلم

حضرت شیخ عین الدین گنج العلم کا اصل نام محمد تھا، گنج العلم یا گنج العلوم کے لقب سے مشہور تھے، 706ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے اور شمالی ہند کے متعدد علماء سے علوم کی تکمیل کی، انھوں نے مختلف علوم کے ماہرین سے ان کے مقام پر جا کر علوم کی تکمیل کی، مثلاً ضلع بلند شہر کے ایک مقام بھنوارا میں مولانا قوام الدین سے صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی، تجوید کی تحصیل کے لیے راجستھان کے جودھپور گئے۔ لغت اور خطاطی آگرہ میں مولانا منہاج الدین تیجی کنوری سے اور پنجاب میں مولانا اسمعیل کانوری سے پڑھی۔ اس کے بعد درسیات کی تکمیل کے لیے دکن میں دولت آباد گئے اور حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک ہم سبق اور مشہور عالم مولانا شمس الدین وامغانی سے درسیات کی تکمیل کی اور بعض دیگر علماء سے اصول فقہ اور بلاغت وتفسیر کا علم حاصل کیا، درسیات کی تکمیل کے بعد سید علاء الدین جیوری سے بیعت ہوئے اور سلوک ومعرفت کی منازل طے کیں، مرشد کی وفات کے بعد گلبرگہ کے ایک قریبی مقام سکر میں فروکش ہوئے اور اس مقام پر رہ کر طالبان حق کی اصلاح ورہنمائی کے کام میں لگ گئے۔

سکر کے مقام پر حضرت عین الدین نے تقریباً 36 سال درس و تدریس اور اصلاح و تربیت کا سلسلہ جاری رکھا، وہاں آپ نے باضابطہ ایک خانقاہ تعمیر کی تھی، اس خانقاہ میں حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور خواجہ حسین شیرازی نے آپ سے استفادہ کیا تھا، ان کے علاوہ آپ کے تلامذہ و متوسلین میں شیخ ضیاء الدین غزنوی، شیخ ابراہیم سنگانی، شیخ محمد جنیدی اور شیخ عبداللہ غزنوی کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔

حضرت عین الدین آخر عمر میں بیاپور تشریف لے گئے جہاں 795 ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت عین الدین درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے، آپ کی کتابوں کے متعلق مختلف تذکروں میں جو اندراجات ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے مختلف دینی اور سیکولر موضوعات پر 125 کے قریب کتابیں تصنیف کیں تھیں، افسوس کہ زمانہ کی دست و برد سے ان میں سے اب کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے، لیکن ماضی قریب تک محض کتابوں کے موجود ہونے کے شواہد ہیں، کیا عجب ہے کہ موجودہ دور کا اطلاعاتی انفجار حضرت کی تصنیفات کی دریافت کا بھی موجب بن جائے۔

حضرت عین الدین کی ایک خاص خوبی یہ بھی تھی کہ آپ نے اپنی بعض تصنیفات کے لئے دکنی اردو زیادہ استعمال کی تھی اگر حضرت کے رسائل و کتب دستیاب ہو جائیں تو وہ اردو کے اولین نمونے ہوں گے۔ حکیم اللہ قادری نے لکھا ہے:

> ''آپ نے چھوٹے چھوٹے کئی رسالے دکنی زبان میں تصنیف کئے تھے، منجملہ ان کے تین رسالے ایک مجموعے میں کالج قلعہ سینٹ جارج کے کتب خانے میں موجود تھے۔ ان کے اوراق کی مجموعی تعداد چالیس تھی اور ان میں فرائض و سنن کے متعلق احکام و مسائل تحریر تھے۔ (اردو کے قدیم، ص 41)

حضرت عین الدین کی خانقاہ میں ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، اس میں ممکن ہے کہ حضرت کی کتابیں بھی رہی ہوں؛ لیکن اب اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

دکن میں تصوف کے فروغ اور خاص طور پر جنیدی سلسلہ کے فروغ میں حضرت عین الدین کی گراں قدر خدمات ہیں اور آج بھی ان کا فیضان وہاں جاری ہے۔

23.13 سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی

سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی کی شخصیت ایک طرف عملی تصوف میں بہت بلند مقام پر فائز ہے تو دوسری طرف ان کا علمی مرتبہ اور معقولات و منقولات میں ان کی دستگاہ بھی قابل ذکر ہے۔

ان کی شخصیت کے گرد عقیدت کے جالے اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ حقیقی شخصیت کو تلاش کرنا دشوار ہوگیا ہے، تاہم اب ان کی شخصیت کو جاننے اور ان کے کمالات سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ ان تمام عقیدت مندیوں کی زرنگاری میں ہی اس شخصیت کے حقیقی خد و خال کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔

سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی کے بارے میں لطائف اشرفی میں لکھا ہے، ان کے والد بزرگوار محمد ابراہیم سمنان کے بادشاہ تھے اور والدہ خدیجہ بیگم خواجہ احمد بسیوی کی بیٹی تھیں، ابراہیم مجذوب کی دعاؤں سے سید محمد اشرف پیدا ہوئے؛ بچپن سے ہی بڑے ذہین تھے، سات سال کی عمر میں قرآن پاک مع قرأت سبعہ یاد کرلیا اور چودہ سال کی عمر میں معقولات ومنقولات میں کامل دستگاہ حاصل کرلی جس کی وجہ سے سارے عراق میں ان کی شہرت ہوگئی۔

والد بزرگوار کے بعد تخت نشین ہوئے اور اپنی پوری قلمرو میں عدل وانصاف کا جھنڈا گاڑ دیا، ان کے غیر معمولی عدل وانصاف اور رعایا پروری کے قصے لطائف اشرفی میں منقول ہیں، کہتے ہیں کہ جب ان کو حکومت کرتے ہوئے ایک طویل زمانہ گذر گیا تو ایک مرتبہ خواب میں حضرت خضر کی زیارت ہوئی اور انہوں نے حکم دیا کہ حکومت چھوڑ دو اور ہندوستان جاکر اسلام کی اشاعت کرو، اس کو انہوں نے اشارہ غیبی سمجھا، حکومت اپنے بھائی سلطان محمد کے حوالے کی اور خود والدہ ماجدہ سے اجازت لے کر عازم ہند ہوئے۔

تین منزل تک شاہی لشکر رخصت کرنے آیا، اس کے بعد بھی بہت سا ساز وسامان اور گھوڑے ساتھ تھے جن کو رفتہ رفتہ الگ کرتے گئے اور سمرقند آتے آتے مکمل فقیرانہ وضع اختیار کرلی، وہاں سے چل کر اوچ میں حضرت سید جلال الدین بخاری اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی خدمت میں باریاب ہوئے، انہوں نے دیکھتے ہی کہا کہ بنگال میں علاء الحق تمہارے منتظر ہیں، راستے میں رک نہ جانا۔

وہاں سے رخصت ہوکر بنگال کا رخ کیا، بہار شریف پہنچے تو دیکھا کہ حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحیٰ منیری کا جنازہ رکھا ہوا ہے، اور حضرت کی وصیت تھی کہ ان کی نماز جنازہ ایسا شخص پڑھائے جو سات قرأتوں کا قاری ہو، صحیح النسب سید ہو اور حکومت ترک کرکے آیا ہو، یہ خوبیاں سید محمد اشرف کے سوا کسی میں پوری نہیں تھیں، اس لیے نماز جنازہ انہوں نے پڑھائی اور کچھ دن حضرت کے مزار پر فیوض وبرکات حاصل کرنے کے بعد بنگال کا رخ کیا۔

بنگال میں شیخ علاء الدین علاء الحق بن اسعد لاہوری کا فیض جاری تھا، یہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بزرگ تھے اور پنڈوہ میں مقیم تھے، ایک دن انہوں نے اپنے مریدوں کو خبر دی کہ جس کا انتظار ہم دو سال سے کررہے ہیں وہ شخصیت اب پہنچنے ہی والی ہے اور ایک دن اچانک بولے: 'بوئے یار می آید' یہ کہتے ہوئے باہر نکلے، ان کو باہر نکلتے دیکھ کر مریدوں کا ہجوم ساتھ ہولیا، جب یہ جلوس شہر سے ایک کوس کے فاصلے پر پہنچا تو دیکھا کہ سید محمد اشرف جہانگیر تشریف لارہے ہیں، انہوں نے حضرت شیخ علاء الدین کو دیکھا تو فوراً قدموں میں گرپڑے، حضرت نے بڑی شفقت سے اٹھا کر گلے لگایا اور یہ شعر پڑھا:

چہ خوش باشد کہ بعد از انتظارے

بامید رسد امیدوارے

(کتنا اچھا ہے کہ انتظار کے بعد امیدوار کی امید برآئے)

حضرت علاء الدین اپنے نووارد مرید کو اعزاز واکرام کے ساتھ خانقاہ میں لائے اور بیعت کیا، ساتھ ہی خلافت سے بھی سرفراز فرمایا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے خود سید محمد اشرف نے ایک رباعی اس طرح کہی:

نہادہ تاج دولت برسر من

علاء الحق و الدین گنج نابات

زہے پیرے کہ ترک او سلطنت داد

برآوردہ مرا از چاہ آفات

(علاء الحق والدین جو شیرینیوں (مٹھائیوں) کے خزانے ہیں انہوں نے دولت کا تاج میرے سر پر رکھا۔ کیا ہی اچھا پیر ہے کہ اس نے مجھے مصیبتوں کے کنویں سے نجات دلائی)

سید محمد اشرف بارہ برس مرشد کی خدمت میں رہے مرشد نے خرقہ خلافت کے علاوہ جہانگیر کا خطاب دیا اور انہوں نے اس خطاب کو اپنے لیے حکم نامہ سمجھ کر جہانگیری پر کمر کس لی، مرشد سے اجازت لے کر جونپور کا رخ کیا، ساتھ بڑی تعداد میں اونٹ گھوڑے اور خچر تھے، لوگوں نے اس امارت کو دیکھ درویشی پر اعتراض کیا، حضرت نے جواب دیا کہ 'میخ طویلہ درگل زدہ ام نہ در دل، (یعنی میں نے طویلہ کی میخ مٹی میں گاڑی ہے اپنے دل میں نہیں)۔

اس سفر میں منیر سے بھی گذر ہوا، بعض لوگوں نے اس سفر میں ان پر رافضی ہونے کا بھی الزام لگایا؛ لیکن بعض علماء کی حمایت کی وجہ سے وہ الزام ان کی مقبولیت کو زیادہ متاثر نہ کر سکا، اسی سفر میں بہت سے روؤسا بھی ان کے مرید ہوئے جن میں شیخ کبیر سر پوری بڑی مشہور شخصیت ہیں جو عالم بھی تھے اور صاحب ثروت بھی۔

جونپور پہنچنے پر قاضی شہاب دولت آبادی نے بھی قدم بوسی کی اور پھر قاضی شہاب کی وساطت ہی سے سلطان ابراہیم شاہ اپنے خوانین قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا اور حضرت کی ملاقات سے بہت متاثر ہوا، حضرت کی بڑی تعریف وتوصیف کی اور کہا کہ ا برگزیدہ لوگوں کا ہندوستان میں ورود بڑی سعادت کی بات ہے اور خود بھی مرید ہو گیا نیز اپنے بیٹوں کو بھی مرید کرا دیا۔

سید محمد اشرف جہانگیر ایک عرصے تک جونپور میں رہے پھر عنان سفر اختیار کی، اور اس دفعہ سعادت سکونت کا فال کچھو شریف کا نکلا جو بالآخر آپ کی آخری آرام گاہ بھی ثابت ہوئی۔

کچھوچھہ شریف میں ایک جوگی رہتا تھا جو ہوا میں اڑتا تھا، اس نے حضرت سے مقابلہ کرنا چاہا؛ لیکن حضرت کی زیارت بعد ایسا مرعوب ہوا کہ اپنے دعوی سے باز آیا اور اپنے پانچ ہزار چیلوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا، اس کا اسلامی نام بابا کمال پنڈت گیا اور اسی کی مڑھی میں خانقاہ تعمیر ہوئی اور یہیں ملک الامراء محمود نے آپ سے بیعت کی۔

خانقاہ کا نام کثرت آباد رکھا گیا، عبادت کے لیے ایک حجرہ تعمیر ہوا اس کا نام وحدت آباد رکھا گیا اور مجلس علم وادب کے ایک خاص حصہ متعین کیا گیا، اس کا نام دار الامان رکھا گیا۔

سید محمد اشرف کے فیوض وبرکات کچھوچھہ کے علاوہ جائس، رودولی اور انہونہ وغیرہ میں بھی پہنچے اور ہر جگہ ہزاروں لوگ سے مرید ہوئے، ان مریدین میں بہت سے جید علماء، صلحا اور اصحاب ثروت بھی شامل تھے۔

اعتکاف سے فارغ ہوکر ماوراء النہر کے راستے ہندوستان کا رخ کیا، راستہ میں شیخ بہاؤ الدین نقشبندی سے اجازت حاصل کی اور خرقہ خلافت پایا، ترکستان میں اپنے نانا خواجہ احمد بسیوی کی اولاد سے ملے، پھر بخارا، قندھار، غزنی اور کابل ہوتے ہوئے ملتان پہنچے۔ اس کے بعد اجودھن میں حضرت فرید الدین گنج شکر کے مزار پر حاضری دی، پھر دہلی اور وہاں سے اجمیر گئے اور وہاں سے گلبرگہ شریف جاکر حضرت سید محمد گیسو دراز سے ملے، پھر گجرات گئے وہاں سے واپس اپنی خانقاہ کچھوچھہ شریف تشریف لے آئے۔

اس طویل سفر کے دوران حضرت نے اپنے اصلی وطن سمنان کی بھی زیارت کی اس وقت عزیزوں میں صرف ایک بہن زندہ تھیں۔

حضرت نے اس کے بعد ایک مرتبہ پھر بلاد اسلامیہ کا سفر کیا اور اس دفعہ ساتھ تھے امیر کبیر سید علی ہمدانی، اس سفر میں بھی متعدد اہم مقامات کی زیارت کی اور تقریباً چار سو کاملین کی صحبت سے فیض اٹھایا اور ان کی ہم رکابی اختیار کی، اس سفر میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے بھی تیسری دفعہ ملاقات کی۔

اب پیمانہ عمر بھی لبریز ہو چکا تھا، آخر 28 رمحرم الحرام 808ھ کو کچھوچھہ شریف میں ان کا انتقال ہوگیا، مادہ تاریخ ''اشرف المومنین'' ہے، وہیں دفن ہوئے، وفات کے وقت عمر مبارک ایک سو بیس سال تھی۔

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کے خلفاء کی بڑی تعداد ہے، جن میں بہت سے معروف لوگ ہیں، جیسے قاضی شہاب دولت آبادی، شیخ شمس الدین اودھی، مولانا صفی الدین رودولوی، شیخ سماء الدین رودولوی اور مولانا علم الدین جائسی وغیرہ۔

سید محمد اشرف کے سلسلہ میں ظاہری شریعت کی پابندی بنیادی شرط تھی، شریعت کی پابندی کے بغیر کوئی شخص منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا، البتہ شریعت کی اتباع کے ساتھ شیخ پر مکمل اعتماد اور اس کی ہر ہدایت کو حرز جاں بنانا راہ سلوک کی اولین شرط ہے، شیخ کی ہر بات کو بنا تاویل اور قیل وقال کے بغیر تسلیم کرنا مرید کے لئے ضروری ہے۔ حضرت شیخ مزاجاً وحدت الوجودی تھے تاہم وحدت الوجود کی خود تشریح کرتے تھے، ان کی نظر میں وحدت کی دو قسمیں ہیں: وحدت مطلقہ من حیث الذات والصفات اور وحدت مقیدہ من حیث الصفات لامن حیث الذات۔ یہ دونوں وحدت جناب باری عز اسمہ کی دو کیفیات ہیں، ایک میں اس کی ذات کی وحدت کو اس طرح ثابت کیا جاتا ہے کہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دوسری میں اس کی صفات کو اس کے لیے اس طرح خاص کیا جاتا ہے کہ اس کی صفات میں بھی وہ واحد و یکتا ہے جیسے اس کا قدیم ہونا۔

عام صوفیاء کی طرح ان کے یہاں بھی اصل اہمیت توحید کی معرفت کو حاصل ہے، توحید کی معرفت جس کو حاصل ہوگئی وہی ولی کامل ہے۔

راہ سلوک کی بنیادی شرائط میں سے ایک علم بھی ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ اگر علم نہ ہو تو زاہد شیطان کے ہاتھ میں ایک مسخرہ ہے۔ اس لیے راہ سلوک اختیار کرنے سے قبل علم ضروری ہے، اس کے بعد توحید، معرفت، شریعت اور طریقت کی ڈگر پر قدم رکھے۔ فرماتے تھے کہ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ اس کی زندگی کے صرف سات دن باقی ہیں تو اس کو چاہئے کہ علم فقہ حاصل کرے؛ چوں کہ ایک مسئلے کو جاننا ہزار رکعت نفل نماز سے افضل ہے۔

سید اشرف جہانگیر کی تعلیمات 'لطائف اشرفی فی بیان طوائف صوفی' میں بہت تفصیل سے مذکور ہیں، ان کے علاوہ بشارت المریدین اور مکتوبات اشرفی میں بھی ان کی تعلیمات ہیں اور اخبار الاخیار میں بھی ان کا ایک طویل خط شامل ہے۔

معلومات کی جانچ

1. نظام الدین اولیاء کی پیدائش کس شہر میں ہوئی؟
2. شرف الدین یحیٰ منیری کس سلسلے میں بیعت حاصل کی تھی؟
3. سید محمد حسینی بندہ نواز کے شیخ کا کیا نام تھا؟
4. ہمدان کس ملک میں واقع ہے؟
5. سید اشرف سمنانی کے ملفوظات کا کیا نام ہے؟

23.14 سید محمد غوث گوالیاری

سید محمد غوث گوالیاری سلسلہ شطاریہ کے سب سے بڑے عالم اور صوفی تھے، انہوں نے ہی اس سلسلہ کو شہرت کے بامِ عروج پر پہنچایا، ان سے قبل یہ سلسلہ بہت محدود تھا، شیخ محمد غوث گوالیاری کے بارے میں عام طور پر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت دائمی سکر میں رہتے تھے، لیکن بظاہر ان کا سکر ایسا تھا جس پر فرزانگی بھی قربان ہو؛ چونکہ حضرت نے نہ صرف یہ کہ مغل حکمرانوں سے قریبی روابط استوار کیے بلکہ میدان جنگ میں ان کی اعانت کی اور شیر شاہ کی داروگیر سے بچنے کے لئے آپ نے ہجرت بھی کی، آپ کا انداز بود و باش رئیسانہ اور شاہانہ تھا آپ بالکل بادشاہوں کی طرح رہتے تھے، آپ جب چلتے تو طبل و نقارہ کے ساتھ چلتے تھے اور آپ کی جائیداد وغیرہ بھی کروڑوں میں تھی۔

شیخ کا ابتدائی زمانہ گوالیار میں بسر ہوا، جب مغل حکمران بابر نے گوالیار کا محاصرہ کیا اس وقت حضرت قلعہ کے اندر ہی تھے اور ان کی ترکیب سے مغل فوج نے وہ قلعہ فتح کیا تھا اس کے بعد حضرت کے تعلقات مغل حکمرانوں سے قائم ہوگئے، بابر کے بعد ہمایوں بھی حضرت کا بڑا معتقد رہا لیکن شیر شاہ سوری کے ہاتھوں ہمایوں کو شکست کھا کر ہندوستان سے جانا پڑا، اس کے بعد شیر شاہ نے ان مشائخ و صوفیہ سے بھی بدلہ لینے کی سعی کی جو مغل خاندان سے اچھے تعلقات رکھتے تھے، کئی مشائخ اس داروگیر میں پریشان کئے گئے، شیخ محمد غوث نے اپنے متوسلین اور مریدین کے ہمراہ گجرات کی طرف ہجرت کر کے اپنے آپ کو اس مصیبت سے بچایا۔ آپ تقریباً 18 سال گجرات میں رہے زیادہ وقت احمد آباد میں گزارا، ان کے قیام گجرات کے زمانے میں مشہور ہندوستانی محدث شیخ علی متقی برہانپوری نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا، شاہ محمود گجراتی نے شیخ وجیہہ الدین گجراتی سے استصواب رائے کیا لیکن انہوں نے علی متقی کے فتوئی کی مخالفت کی اور خود بھی جا کر شیخ محمد غوث کے مرید ہوگئے، اس کے بعد ان کو گجرات میں قبول عام حاصل ہوگیا۔

ہندوستان کی بساط سیاست نے بھی اس دوران نئی کروٹ لی ہمایوں دوبارہ ہندوستان پر قابض ہوگیا، اور سوری سلطنت ختم ہوگئی۔ شیخ نے بھی حالات کی تبدیلی دیکھ کر گجرات سے گوالیار کی طرف واپس کی اور پھر آگرہ بھی تشریف لائے، ہمایوں کا انتقال

ہو چکا تھا، اکبر نوعمر اور بیرم خاں اتالیق تھے، شیخ گدائی صدر الصدور تھے، انہوں نے حضرت کی بعض تحریروں، خاص طور پر اس دعویٰ پر اعتراض کئے کہ انہوں نے جاگتے میں اللہ تعالیٰ کی زیارت کی ہے۔ اس پر دربار میں ان سے سوال وجواب ہوئے، غالباً اکبر بھی ان سے زیادہ متاثر نہیں تھا اس لئے ان کو دو کروڑ روپیہ دے کر گوالیار کی طرف واپس بھیج دیا، وہیں 1562ء میں شیخ گوالیاری کا انتقال ہوگیا۔

شیخ محمد غوث گوالیاری عظیم صوفی اور بڑے متبحر عالم تھے، انہوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد اور مذہبوں کی روحانی بنیادوں میں یکسانیت تلاش کی، اس لئے حضرت کا طرز عمل ہندو جوگیوں کے ساتھ بڑی عقیدت اور احترام کا تھا، وہ آتے تو حضرت کھڑے ہو جاتے تھے، حضرت کی کتابوں میں، بحرالحیات اور جواہر خمسہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے علاوہ امرت کنڈم کا ترجمہ بحرالحیات کے نام سے کیا، اس کے علاوہ رسالہ معراجیہ کلیہ مخازن، ضمائر و بصائر، دعائے سیفی اور اوراد غوثیہ ان کی اہم تصنیفات ہیں، ان میں انہوں نے اپنے روحانی تجربات بیان کئے ہیں اور خاص طور پر جواہر خمسہ میں ہندوستانی جوگ اور روحانیت پر گفتگو کی ہے۔ حضرت کی علمیت اور وسیع المشربی کی وجہ سے حضرت کی تصنیفات کو ان کے زمانے میں بھی قبول عام حاصل تھا اور بعض کتابیں آج بھی اہمیت اور ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

شیخ محمد غوث گوالیاری ترک دنیا اور سلاطین سے بےزاری کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ دراصل ان کے طریقے میں بنیادی بات تربیت نفس ہے۔ نفس کی مخصوص تربیت کے بعد انسان کے لئے نہ کوئی عہدہ کوئی معنویت رکھتا ہے اور امراء وسلاطین سے قربت کچھ مضرت رساں ہوسکتی ہے، اس لئے انہوں نے حکمرانوں سے اچھے روابط رکھے اور بسا اوقات ان کا فائدہ بھی اٹھایا، لیکن عوام کی اصلاح وتربیت اور عام لوگوں کی روحانی ترقی سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔

23.15 خواجہ باقی باللہ

حضرت خواجہ باقی باللہ کا اصل نام خواجہ عبدالباقی تھا، والد کا نام عبدالسلام اور بدخشاں کے رہنے والے تھے، آپ کی ولادت کابل میں 971ھ کے قریب ہوئی، مولانا محمد صادق حلوائی سے تلمذ اختیار کیا، حضرت کی طبیعت میں کچھ ایسی بےچینی اور بےقراری تھی کہ کتابی علم اس کی تسکین کے لئے ناکافی تھا، آخر شدید اندرونی داعیہ کے سبب درسیات کی تحصیل ترک کر کے حصول علم باطن میں سرگردانی اختیار کی، متعدد اکابر مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے، توبہ کی، بیعت کی لیکن طبیعت کو مطلوبہ استقامت نہ مل سکی، متعدد مرتبہ توبہ شکنی کی اور نئے مرشد کی تلاش میں سرگردانی اختیار کی۔ اسی درمیاں خواجہ بہاؤالدین نقشبند کے طریقہ کی طرف رجحان پیدا ہوا، اس سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ بابا کبروی سے مستفید ہوئے اور خواجہ عبیداللہ امراء کی کتب ورسائل سے استفادہ کرتے رہے، اس کے بعد شیخ محمد امکنگی سے ملاقات ہوئی اور طبیعت سلسلہ نقشبندیہ کے طریقہ پر جم گئی اور اس طریقہ کے ہو رہے۔

باطنی علوم کی تکمیل اور منازل سلوک کی راہ پیمائی کے بعد آپ نے اس سلسلہ کی اشاعت شروع کی، پہلے ماوراءالنہر میں لوگوں کی اصلاح کرتے رہے، پھر ہندوستان کا رخ کیا اور دہلی میں قیام پذیر ہوئے، اس وقت ہندوستان کا پایۂ تخت آگرہ تھا؛ لیکن حضرت کی چشم باطن نے دیکھ لیا تھا کہ دہلی جلد ہی مرکز حکومت بن جائے گا اور دہلی میں رہ کر سلسلہ کی خدمت زیادہ بہتر طریقہ پر کی جاسکتی ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ خواجہ باقی باللہ میں ہندوستان آنے کے بعد بھی تلاش مرشد کا سلسلہ اور روحانی استاذ سے فیض حاصل کرنے کا جذبہ باقی تھا، گڈھ مکتیسر میں ایک بزرگ شیخ اللہ بخش تھے، ان سے بھی آپ نے فیض حاصل کیا اس کے بعد مستقل سکونت دہلی میں اختیار کی۔

حضرت خواجہ باقی باللہ بڑے صاحب کرامات بزرگ تھے، جذبہ دروں بے تحاشا تھا، آپ کی رباعیات میں ان کے جذب باطن کی جھلک ہر صاحب ذوق محسوس کرسکتا ہے، اس کے ساتھ کسر نفسی بے انتہا تھی، علماء وفضلاء کا غایت درجہ اکرام کرتے تھے، حضرت مجدد الف ثانی کی باطنی کیفیات کو محسوس کر کے ایک مرتبہ ایک خط میں تحریر فرمایا کہ شیخ احمد ایسے آفتاب ہیں جن کی روشنی میں ہم جیسے گم ہوجائیں گے۔

انکسار اور تواضع کی وجہ سے اکثر لوگوں کو خاص طور پر اہل علم کو ذکر کی تلقین سے بھی اعراض فرماتے تھے، بعض لوگوں نے اپنے مرید ہونے کے واقعات کو جس انداز میں لکھا ہے وہ پوری ایک داستان ہے، اس کے ساتھ حضرت خواجہ میں تحمل و بردباری بھی اعلیٰ درجہ کی تھی، ایک واقعہ مولانا کشمی نے لکھا ہے کہ آپ کے پڑوس میں ایک نوجوان رہتا تھا جو بڑے فسق وفجور میں مبتلا تھا، لیکن آپ اس کی ہر چیز کو برداشت کرتے رہتے تھے، آخر آپ کے ایک مرید نے اس کی شکایت کر کے حکام سے اسے گرفتار کرادیا، حضرت کو خبر ہوئی تو مرید پر برہم ہوئے اور پوچھا کہ تم نے کیوں اس کی شکایت کی؟ اس نے کہا حضرت وہ بڑا فاسق وفاجر تھا اس لئے میں نے ایک حاکم سے اس کی شکایت کردی۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں بھائی تم اہل صلاح وتقویٰ ہو اس لئے تم کو اس کا فسق وفجور نظر آ گیا، ہم نے اپنے آپ کو کبھی اس سے بہتر نہیں سمجھا اس لئے ہم نے اس کی کبھی شکایت بھی نہیں کی۔ اس کے بعد آپ نے کوشش کر کے اس نوجوان کو رہا کرایا، وہ حضرت کے اس احسان سے اتنا متاثر ہوا کہ حضرت کا مرید ہوکر تمام فسق وفجور سے تائب ہوگیا۔

صاحب زبدۃ المقامات نے حضرت کے ایسے بہت سے واقعات نقل کئے ہیں جو حضرت کی تواضع، انکساری، تحمل، بردباری اور فروتنی نیز مخلوقات سے محبت اور شیفتگی کی علامت ہیں۔

حضرت کا اصل کارنامہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی تربیت ہے، حضرت خواجہ باقی باللہ نے حضرت مجدد کی ایسی تربیت فرمائی اور سلسلہ نقشبندیہ کو ان کی شکل میں ایسا آفتاب و ماہتاب عطا کیا کہ یہ سلسلہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے بلاد اسلامیہ میں پھیل گیا، اور اس کی ضیا پاشی سے سارا مشرق روشن ہوگیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کو قدرت کی طرف سے گویا اسی کام کے لئے مامور کیا گیا تھا، آپ نے یہ کارنامہ انجام دیا، اس کے بعد فوراً بعد ہی داعی اجل کا پیغام آن پہنچا اور صرف چالیس سال کی عمر میں 14 / جمادی الآخر 1014ھ کو آپ کا انتقال ہوگیا، مزار مبارک دہلی میں ہے اور ہنوز زیارت گاہ خلائق ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ نے اصل تصنیفی کام انسانوں کی تصنیف یعنی تربیت رجال کا کیا تھا، صفحہ قرطاس پر روئے خامہ سے انہوں نے بہت کم لکھا، صرف چند رسائل اور کچھ رباعیات ہیں، لیکن ان سے بھی حضرت کے جذب وشوق، ذوق واستغراق اور علمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت کے چند ملفوظات یہ ہیں:

حضرت نے فرمایا کہ اگر کوئی سالک مقام معصیت میں پھنسا ہوا ہے، یا دنیا کی طرف اس کی رغبت کم نہیں ہوتی تو اس کے اندر درج ذیل اسباب میں سے کوئی سبب ضرور ہوگا۔

1. یا وہ بقدر ضرورت معاش پر قانع نہیں ہوگا۔
2. یا عوام کے ساتھ اس کا اختلاط زیادہ ہوگا۔
3. یا اس کے اوقات ذکر الٰہی سے معمور نہیں ہوں گے۔
4. یا وہ خدا سے غیر خدا کا طالب ہوگا۔
5. یا اس کے مجاہدہ نفس میں کمی ہوگی۔
6. یا وہ اپنے احوال و مقامات اور اپنی قوت کو سراہتا ہے۔
7. یا پھر ازلی احکام کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا ہوگا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ توکل یہ نہیں ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے، یہ تو بے ادبی ہے، توکل کا مطلب ہے سبب کو قائم کرنا، لیکن سبب کو اصل نہ سمجھنا، سبب دراصل دروازے کے قفل کے درجے میں ہے۔

23.1 مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی

شیخ احمد سرہندی 4 رشوال 971ھ/ 26 رمئی 1564ء کو بروز جمعہ پنجاب کے ایک گاؤں سرہند میں پیدا ہوئے، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق سے جاملتا ہے، آپ کا خانوادہ بھی ایک علمی گھرانہ تھا، خود آپ کے والد ایک بڑے عالم اور صوفی تھے، انہوں نے لائق فرزند کی تعلیم و تربیت کا بہتر انتظام کیا، سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد معقولات کی تکمیل اپنے عہد کے مشہور عالم ملا کمال کشمیری سے کی، تفسیر اور بخاری شریف نیز دیگر کتب حدیث کی تحصیل یعقوب صرفی اور قاضی بہلول بدخشانی سے کی۔ سترہ برس کی عمر میں تکمیل علوم سے فارغ ہو کر وطن تشریف لائے، تین سال تزکیہ نفس میں مصروف رہے اس کے بعد آگرہ تشریف لے گئے، اور یہاں ابوالفضل اور فیضی جیسے بڑے علماء کی محفل کو زینت بخشی، کہتے ہیں کہ انہوں نے فیضی کی تفسیر سواطع الالہام کی تصنیف میں مدد کی تھی، اور ابوالفضل کو ان سے خاص تعلق تھا، ابوالفضل کی مجلس میں وہ مستقل شریک ہوتے تھے، ایک دفعہ کسی مسئلہ پر بحث کے دوران ابوالفضل نے امام غزالی کے بارے میں کوئی ناروا بات کہی جس سے ناراض ہو کر شیخ ان کی مجلس سے باہر چلے گئے، کہتے ہیں کہ ابوالفضل نے معذرت کر کے شیخ کو واپس بلا لیا تھا، لیکن پھر کسی ایسے ہی واقعہ کے بعد یہ ناراضگی کا وقفہ طویل ہو گیا اور اس کی خبر شیخ کے والد کو بھی پہنچی تو وہ سرہند سے آگرہ تشریف لائے اور شیخ کو اپنے ساتھ واپس لے گئے۔

واپس سرہند جاتے ہوئے تھانیسر کے مقام پر پنجاب کی مشہور شخصیت شیخ سلطان سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنی بیٹی کا رشتہ شیخ احمد سے کر دیا، شیخ احمد نے سرہند پہنچ کر کئی سال صرف مطالعہ اور مجاہدہ میں صرف کیے، خاص طور پر تصوف کی کتابوں کا یکسوئی

سے مطالعہ کیا اور اپنے والد کی نگرانی میں سلوک کے منازل طے کیے، شیخ احمد نے اپنی اس روحانی تربیت کا تذکرہ اپنے بعض مکتوبات میں اور اپنی کتاب 'مبدأ و معاد' میں کیا ہے۔

1007 / 1597 میں شیخ کے والد کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد انہوں نے حج کا ارادہ کیا اور دہلی تشریف لائے، دہلی میں ان کی ملاقات خواجہ باقی باللہ سے ہوئی اور ان کی شخصیت میں ایسا جذب اور ایسی مقناطیسیت تھی کہ شیخ احمد سب کچھ ترک کر کے انہی کے ہو رہے، پیر کو بھی اپنے مرید کے اندر ایسی عظیم شخصیت کا جلوہ دکھائی دیا کہ چند ماہ کی تربیت کے بعد پیر نے اعلان کر دیا کہ شیخ احمد ایسا روشن چراغ ہیں کہ ان کی روشنی پوری دنیا کو منور کرے گی۔ اور پیر کا فرمان حرف بحرف درست ثابت ہوا، شیخ احمد نے نقشبندیہ سلسلے میں بیعت کر کے اس سلسلہ کو پورے عالم اسلام میں پھیلایا اور یہ سلسلہ اتنی تیزی کے ساتھ پھیلا کہ سلطان جہانگیر نے لکھا ہے کہ شیخ کے مریدین ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیل گئے ہیں۔

شیخ احمد کے مرید ہندوستان کے اہم شہروں جیسے لاہور، دہلی، آگرہ، سہارن پور، بدایوں، جونپور، الہ آباد، مکن پور، پٹنہ، منگل کوٹ (بنگال) اور برہان پور میں پھیل گئے۔ ہندوستان کے علاوہ شادماں (اصفہان) حسین ابدال (کابل) کشم (بدخشاں) بیرک (قندھار) اور طالقان میں بھی شیخ کے مرید اور خلفاء کی بڑی تعداد موجود تھی، ان تمام مقامات پر حضرت کے مریدین اور خلفاء نے شیخ کے افکار کی اشاعت کی اور شیخ جو تجدیدی کارنامہ انجام دے رہے تھے اس کے دست و بازو بنے۔

شیخ احمد نے جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا اس کے تین پہلو ہیں، ایک سرکاری، دوسرے علماء اور تیسرے صوفیہ، سرکاری سطح پر اس دور میں اکبر کے دین الٰہی کا چرچا تھا، اکبر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اب اسلام کو آئے ہوئے ایک ہزار سال پورے ہوگئے، جو کسی بھی مذہب کی طبعی عمر ہے، اس لیے اب اسلام کو ختم کر کے نئے دین کا آغاز ہونا چاہیے، اکبر کے بعض درباری علماء جیسے ابوالفضل، فیضی اور ان کے والد ملا مبارک، میر فتح اللہ شیرازی اور شریف آملی وغیرہ نے اکبر کی اس سلسلہ میں بڑی مدد کی، بلکہ سچ یہ ہے کہ انہی درباری علماء نے اکبر کو یہ راہ سجھائی اور اکبر نے مختلف مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کو یکجا کر کے ایک نیا دین تیار کروایا، جس کا نام دین الٰہی رکھا اور سرکاری طور پر اس کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا، لیکن یہ مذہب تو پورے طور پر ناکام ہوگیا اور چند درباری لوگوں کے سوا کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا۔ البتہ اس کے اثرات اسلام پر بہت ناروا مرتب ہوئے، رسول اللہ کی شخصیت کو کھلے عام تنقید کا نشانہ بنایا جاتا، وحی کا مذاق اڑایا جاتا، قیامت اور حشر و نشر کے تصورات کو نشانہ تضحیک بنایا جاتا، شریعت کے محرمات کو حلال کر دیا گیا اور حلال چیزوں پر پابندی لگائی گئی، خطبہ جمعہ میں سے صحابہ کے نام نکال دیئے، عربی مدارس کی امداد موقوف کر دی گئی، مجوسیت کے زیر اثر آگ کی عظمت کا بیان ہونے لگا وغیرہ بہت سے اعمال ہیں، جن کا تذکرہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اور خود شیخ احمد سرہندی نے مکتوبات میں کیا ہے۔

ان نامساعد حالات میں اسلام کے لیے بحیثیت ایک مذہب زندہ رہنا مشکل ہوگیا، متعدد مقامات پر مسجدیں شہید کی گئیں اور اسلامی اعمال کی انجام دہی مشکل ہوگئی، اسلام کے ارکان کو نشانہ تضحیک بنایا جانے لگا حتی کہ بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی جانیں بھی محفوظ نہیں رہیں، شیخ احمد نے اپنے خطوط میں اسلام کی اس زبوں حالی کا تذکرہ کیا ہے۔

اکبر کی وفات کے بعد تخت نشینی کے مسئلہ میں جہانگیر کو بعض ایسے درباری امراء کی حمایت حاصل ہوگئی جو اکبر کی مذہبی پالیسی کے خلاف تھے، خاص طور پر صدر جہاں، امیر خاں اور شیخ فرید کی حمایت مل جانے سے جہانگیر تخت نشین ہوا، شیخ احمد نے ان تمام امراء کو خطوط لکھے اور ان کو توجہ دلائی کہ وہ اسلام کو از سر نو نافذ کرنے کی جدوجہد کریں، مثلاً صدر الصدور صدر جہاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''اب جبکہ صورت حال بدل چکی ہے، لوگوں کی عداوتیں کم ہو چکی ہیں، اسلامی زعماء اسلام اور علماء اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش کریں، اسلام کے جو ارکان منہدم ہو گئے ہیں ان کو دوبارہ رائج کریں، اگر بادشاہ شریعت مصطفویہ کے نفاذ میں کوشاں نہ ہوا اور اس کے قریبی لوگ اپنے آپ کو اس معاملے میں معذور سمجھیں اور وقت کو اسی طرح گزار دینا چاہیں تو آگے چل کر عام مسلمانوں کو جن کے لیے کوئی قوت حاصل نہیں ہے زندگی دشوار ہو جائے گی''۔

اس طرح شیخ احمد نے اکبری عہد میں اسلام اور مسلمانوں پر ہوئے اثرات بد کے ازالے کے لیے کوششیں کیں اور دوسرے ہزارے کے تصور کے تحت اسلام کی جو چیزیں ترک کر دی گئی تھیں ان کا احیاء کرنے کے لیے درباری امراء کو متوجہ کیا۔

شیخ احمد سرہندی کا دوسرا بڑا کارنامہ علماء کی اصلاح کا تھا، اس زمانے میں بہت سے علماء خاص طور پر دربار سے وابستہ علماء کے زیر اثر بدعات اور مشرکانہ اعمال کا زور بڑھ گیا تھا، تاریخ اسلامی خاص طور پر عہد صحابہ پر سخت تنقیدیں کی جانے لگیں۔ قاضی نور اللہ شوستری اور ان کے ہم خیال علماء نے صحابہ کرام پر سب وشتم شروع کر دیا تھا، بہت سے علماء وحی اور نبوت پر شک کرنے لگے، شیخ احمد سرہندی نے ان اثرات کے ازالے کے لیے اثبات النبوۃ اور رد روافض دو کتابیں لکھیں، اور دلائل سے ثابت کیا کہ نبوت خلاف عقل نہیں ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ آخری نبی ہیں، نبوت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، جو وہ اپنے منتخب بندوں کو دیتا ہے، یہ کسبی چیز نہیں بلکہ وہبی نعمت ہے، کشف اور الہام کے ذریعہ نبوت کی حقیقت کو جانا جا سکتا ہے لیکن یہ کشف والہام سے بدرجہا بلند ہے، اسی طرح صحابہ کرام کے بارے میں لکھا کہ مشاجرات صحابہ اجتہادی عمل ہیں، حضرت علی برسر حق تھے اور ان کے مخالفین غلطی پر تھے لیکن ان کی غلطی بھی اجتہادی تھی، اس لیے ان کو سب وشتم کرنا جائز نہیں ہے اور صحابہ کرام کی اس تنقیص سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حرف آتا ہے کہ آپؐ نے (نعوذ باللہ) ایسے لوگ تیار کیے جنہوں نے آپ کی وفات کے فوراً بعد آپ کی ہدایات کو چھوڑ دیا۔ اس طرح شیخ احمد نے علماء کی غیر شرعی موشگافیوں پر تنقید کی اور صحیح افکار کی اشاعت کے لیے بھرپور کوشش کی۔ کتابوں کے علاوہ انہوں نے خطوط لکھ کر بھی لوگوں کی اصلاح کی کوششیں کیں۔

شیخ احمد سرہندی کے کار تجدیدی اور اصلاحی کوششوں کا تیسرا بڑا میدان جاہل صوفیہ کی اصلاح اور ان کے اثرات کا ازالہ تھا، اس دور میں صوفیہ کے اندر سماع، وجد اور رقص عام تھا، فرائض اور سنن کے مقابلے میں ذکر واذکار کو اہمیت دیتے تھے، پیروں کے بارے میں یہ تصور عام تھا کہ ان کے اندر ایسی قوت ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی سے ناراض ہو جائیں تو اس کو روحانی ترقی سے محروم کر سکتے ہیں، پیروں کو سجدہ تعظیمی کیا جاتا تھا، مزاروں پر منت مانگی جاتی تھی، وجودی صوفیہ تو شریعت کو حجاب قرار دیتے تھے، زندگی کا مقصد فنا اور بقاء کے تجربات بن گیا تھا، کشف وکرامات پر بے انتہا اعتماد کیا جاتا تھا، بعض صوفیہ اپنے وضو کے ماء مستعمل کو بطور تبرک مریدوں

میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے ان تمام امور پر تنقید کی اور ان کو بدعت قرار دیا، رقص وموسیقی اور سماع و وجد پر تنقید کی، سجدہ تعظیمی کی شدید مذمت کی، کشف و کرامات کے بارے میں یہ بتایا کہ یہ ولی کی عظمت و شان کے لئے ضروری نہیں ہیں، انہوں نے دلیل دی کہ جتنے بڑے صوفیہ گزرے ہیں جیسے حضرت خواجہ جنید بغدادی ان سے چند کرامات بھی منسوب نہیں ہیں، اگر کرامت ولی کے لیے معیار ہوتیں تو بڑے صوفیہ سے زیادہ کرامات کا صدور ہوتا۔ وحدۃ الوجودی صوفیہ پر ان کی تنقید اور سخت ہے، انہوں نے وحدۃ الوجود کے مقابلے میں ایک مستقل فلسفہ اور نظریہ پیش کیا جس کے مطابق وحدۃ الوجود کی کیفیت کو غیر حقیقی اور صرف بندے کے ذہن کا تخیل قرار دیا، انہوں نے بتایا کہ وحدۃ الوجود راہ سلوک کی ایک منزل ہے، آخری منزل نہیں۔ آخری منزل عبدیت کا اثبات ہے، بندہ کی معراج یہ ہے کہ اس کو اپنی عبدیت کا احساس ہوجائے، وحدۃ الوجود نہیں، اس لیے انہوں نے زور دے کر کہا کہ وحدۃ الوجود جو مقام جمع کی ایک کیفیت ہے وہ صرف احساس اور مشاہدہ ہے، اس کو وحدۃ الشہود کہنا زیادہ موزوں ہے، بندے کی منزل اس جمع کے بعد فرق کا اثبات ہے جب بندہ اس کیفیت سے آگے بڑھتا ہے تو اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ مقام جمع یا وحدۃ الوجود صرف ایک تخیل تھا، حقیقت اس کے برعکس ہے، بندہ کی معراج عبدیت کا اثبات ہے وحدۃ الوجود نہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''فناء اور بقاء شہودی ہے وجودی نہیں، بندہ نہ تو خدا بن سکتا ہے اور نہ خدا کے ساتھ متحد ہوسکتا ہے، بندہ ہمیشہ بندہ رہتا ہے اور خدا ہمیشہ خدا۔ جو لوگ فنا اور بقاء کو وجودی کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بندہ اپنے وجودی تعینات سے بالاتر ہوکر ذات حق سے جو تعینات اور قیود سے بالاتر ہے متحدہ ہوجاتا ہے، یا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قطرہ تھا جو دریا میں مل گیا اور دریا ہوگیا، اور ان کی وجودی انفرادیت ذات واحد میں گم ہوگئی، وہ لوگ ملحد اور زندیق ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرح کے ملحدانہ افکار سے محفوظ رکھے''۔

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے سترہویں صدی کے پس منظر میں شریعت کی زبردست خدمت کی، انہوں نے علماء سوء کے ذریعے شریعت کی من مانی تعبیر کی اصلاح کی، حکمران وقت نے مذہب کو جو زک پہنچائی تھی اور ایک نئے دین کا آغاز کرنے کی کوشش کی تھی اس کا مقابلہ کیا اور جاہل صوفیہ نے تصوف کو من مانے معنی پہنا کر جو گمراہی پھیلائی، اس کی اصلاح کی اور ان تمام فتنوں کے درمیان اسلام کی حقیقی تصویر کو از سر نو اجاگر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ دین کی اصل بنیاد نہ فصوص الحکم ہے نہ فتوحات مکیہ اور نہ صوفیہ کے کشف و کرامات؛ بلکہ دین کی بنیاد قرآن وسنت ہے اور یہی دونوں دین کا معیار ہیں۔ اگر کسی صوفی کا کشف قرآن وسنت کے مطابق ہے تو اس کو اہمیت دی جاسکتی ہے، لیکن جو کشف ان دونوں بنیادوں کے خلاف ہو، وہ قابل رد ہے۔ شریعت کا مصدر قرآن وسنت ہے کوئی اور چیز نہیں، چاہے وہ صوفی کا کشف ہو یا سالک کا مشاہدہ، ان سب کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر جانچا جائے گا۔

شیخ احمد سرہندی کے یہ افکار جتنے ان کے عہد میں اہم تھے اتنے ہی اہم آج بھی ہیں، آج بھی اس کی ضرورت ہے کہ مختلف افکار و نظریات اور فلسفہائے حیات کے درمیان شریعت مطہرہ کی حقانیت کو اس کے بنیادی مصادر اور ماخذ کی روشنی میں جانا جائے اور ان سب کا جائزہ قرآن وسنت کی روشنی میں لیا جائے، شیخ احمد سرہندی کی یہ فکر اور ان کا پیغام آج بھی زندہ و تابندہ اور اہم ہے۔

23.17 شاہ ولی اللہ دہلوی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بن شاہ عبدالرحیم دہلوی (1114ھ شوال مطابق 2 / مارچ 1703ء ـ 29 محرم الحرام 1176ھ مطابق 20 اگست 1762ء) اپنے وقت کے جید عالم، محدث، مفسر، مورخ اور متکلم تھے، وہ بلاشبہ اپنی صدی کے مجدد تھے۔ فقہ میں ان کو گہری بصیرت حاصل تھی، تصوف کے امام تھے، ایسی جامع العلوم شخصیت اسلامیان ہند میں کوئی دوسری نظر نہیں آتی، انہوں نے برصغیر کی پوری علمی روایت کو تبدیل کر دیا، ان کے والد شاہ عبدالرحیم (م: 1719) ایک متبحر عالم اور نقشبندیہ سلسلہ کے عامل صوفی تھے، ان کا تعلق چشتیہ اور قادریہ سلسلوں سے بھی تھا، ان کے والد کا دہلی میں اپنا مدرسہ تھا 'فتاویٰ عالمگیری' کے مرتبین میں آپ کا نام بھی تھا۔

شاہ عبدالرحیم نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور شاہ ولی اللہ نے پانچ سال کی عمر میں ہی مکتب شروع کر دیا، سات سال کی عمر میں وہ نماز اور روزہ کے پابند ہو گئے اور قرآن مکمل کر لیا تھا، اسی عمر میں انہوں نے فارسی کے قصے کہانیاں بھی پڑھنی شروع کیں، دس سال کی عمر تک آتے آتے وہ آزادانہ طور سے لکھ پڑھ سکتے تھے۔

شاہ ولی اللہ نے اپنے والد سے حدیث میں صحیح بخاری، مشکوٰۃ المصابیح کے درس لئے اور تفسیر قرآن، فقہ اور دینیات کی تعلیم بھی حاصل کی، اس کے علاوہ ان کو نظریہ وحدت الوجود کے ابن عربی اسکول کے شیوخ جیسے عبدالرحمان جامی (1492) اور فخرالدین عراقی (1289) کی تصانیف سے روشناس کر دیا گیا، انہوں نے علم نجوم، ریاضی، عربی، فارسی زبان و گرامر، طب کی تعلیم بھی حاصل کی جس کی واضح جھلک ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔

1719 میں اپنے والد کی وفات کے بعد سے شاہ ولی اللہ نے بارہ سال دینی علوم کی درس و تدریس میں گذارے، ساتھ ہی روحانیات کا سلسلہ بھی جاری رہا، اپریل 1731 کے قریب شاہ ولی اللہ حج و زیارت کے لئے عازم سفر ہوئے، مکہ اور مدینہ میں ان کے قیام کا عرصہ تقریباً چودہ ماہ تھا، وہ دسمبر 1732 میں ہندوستان واپس آئے۔

حجاز میں شاہ ولی اللہ کا قیام ان کے فکر و نظر اور آئندہ زندگی کے لائحہ عمل میں بہت اہم ثابت ہوا، دونوں مقدس شہروں کے قیام کے دوران انہوں نے مشاہیر علماء سے حدیث، فقہ اور تصوف کی تعلیم حاصل کی جن کا تذکرہ انہوں نے انفاس العارفین میں کیا ہے، شیخ ابو طاہر الکردی المدنی (م 1733)، شیخ وفداللہ المکی اور شیخ تاج الدین القلعی الحنفی (م 1734) نے ان پر سب سے گہرا اثر چھوڑا ہے، مکہ کے ان اساتذہ نے شاہ ولی اللہ کو علم حدیث میں ابھرتی ہوئی آفاقیت کے رجحان سے روشناس کیا جو اٹھارہویں صدی میں شمالی افریقی، حجازی اور ہندوستانی مطالعہ اور ارتقاء کی روایت کی ہم آہنگی کے باعث ظاہر ہو رہا تھا۔ انہی مقدس شہروں کے قیام کے دوران امام مالک کے مجموعہ حدیث 'الموطا' کے تئیں ان کی پسندیدگی میں اضافہ ہوا اور بعد میں مسویٰ اور مصفّی کے نام سے انہوں نے اس کی دو تفسیریں بھی لکھیں۔ مکہ اور مدینہ میں شاہ ولی اللہ کو کئی روحانی تجربے حاصل ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خواب میں تشریف لائے، ان کے سوالات کی تشنگی دور فرمائی اور ہندوستان میں تعلیم و تدریس کی مہم چلانے کی ہدایت کی، شاہ ولی اللہ کا خیال تھا کہ یہ رویاء ان کے دینی مقصد اور اعلیٰ مدارج کا اظہار اور منظوری ہے اور اسی کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''فیوض الحرمین'' میں کیا ہے۔

حج سے واپسی پر انہوں نے دوسری شادی کی، اس شادی سے ان کے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں، ان کی پہلی شادی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پہلے سے موجود تھے۔ شاہ ولی اللہ کا انتقال 1762 میں ہوا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کو دست فیاض نے بڑی عبقری صلاحیتوں سے نوازا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ شاہ عبدالرحیم جیسے عالم کی سرپرستی مل گئی، سفر حجاز نے ان صلاحیتوں کو مزید نکھار دیا، اس طرح شاہ ولی اللہ کو مختلف علوم میں غیر معمولی دستگاہ حاصل ہوگئی، خاص طور پر حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف اور کلام میں ان کی عبقری شان بالکل انوکھی اور نرالی ہے۔

حدیث شاہ ولی اللہ کی فکری اور علمی جولانگاہ کا اصل میدان تھا، شاہ صاحب نے برصغیر میں حدیث کی مختلف کتابوں کے درس کا آغاز کیا، صحاح ستہ کی باقاعدہ تدریس شاہ صاحب ہی کی دین ہے، ان سے قبل حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوٰۃ الانوار کا رواج تھا، شاہ صاحب نے اور کتابوں کا درس شروع کیا اور ایک ایسے وقت میں جب حدیث کی تدریس عالم عرب میں بھی کم ہوگئی تھی، برصغیر اس جوت سے جگمگا اٹھا۔

درس و تدریس کے علاوہ شاہ ولی اللہ نے حدیث میں متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں، موطا امام مالک کی شرح مصفی (فارسی) اور مسوی (عربی) اہل علم سے داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ بخاری کے ابواب کے تراجم بھی آپ کی ایک اہم اور منفرد تصنیف ہے۔

علم تفسیر میں بھی شاہ ولی اللہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، انہوں نے قرآن کریم کو لوگوں کے درمیان رائج کرنے کی سعی بلیغ فرمائی اور اس مقصد کے لئے انہوں نے خود ایک ترجمہ قرآن فارسی زبان میں تحریر کیا اور اس پر حواشی لکھے، جو اگرچہ مختصر ہیں لیکن اپنے معانی کے اعتبار سے بہت مبسوط ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے قرآن کے مطالعہ اور اس کے ترجمہ کے طریقہ اور آداب بھی بیان کئے۔ ان کی کتاب 'مقدمہ در قوانین ترجمہ' اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اصول تفسیر پر ان کی کتاب 'الفوز الکبیر' اپنے موضوع کی پہلی مکمل کتاب کہی جاسکتی ہے۔ ان سے قبل علامہ ابن تیمیہ نے ایک مختصر سا رسالہ اس موضوع پر تصنیف کیا تھا۔ ان کے علاوہ میراث اسلامی کے پورے ذخیرہ میں ایسی کوئی اور کتاب نظر نہیں آتی۔

فقہ میں شاہ ولی اللہ نے کوئی باضابطہ کتاب تو تصنیف نہیں کی، لیکن فقہ سے متعلق اصولی مباحث پر کلام کیا ہے، جیسے عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، اسی طرح غایۃ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، یہ کتابیں فقہ سے متعلق اصولی مباحث پر ہیں اور بلاشبہ اپنے فن کی بہترین کتابوں میں شامل ہیں۔

موطا امام مالک کی دونوں شرحوں اور حجۃ اللہ البالغہ میں انہوں نے فقہی ابواب پر تفصیل سے کلام کیا ہے جو ان کی فقہی بصیرت کا بین ثبوت ہے۔

کلام کی روایت میں شاہ ولی اللہ کا مقام بڑا منفرد ہے، حجۃ اللہ البالغہ کو ایک طرح سے جدید عہد میں علم کلام کی سب سے مبسوط اور جامع کتاب قرار دیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ البدور البازغہ، العقیدۃ الحسنۃ اور التفہیمات الالٰہیہ میں کلامی موضوعات پر تفصیل سے گفتگو ملتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کی عبقری شخصیت کا اظہار تصوف کی روایت میں بھی ہوا ہے، شاہ صاحب تصوف کے امام تھے، انہوں نے تصوف کی تاریخ، تصوف کے اعمال اور تصوف کے نظریات میں جس مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ کلام کیا ہے وہ انہی کا میدان ہے، مہمات، سطعات، القول الجمیل، لمحات، فیوض الحرمین، الخیر الکثیر وغیرہ میں انہوں نے تصوف کے مختلف پہلوؤں پر کلام کیا ہے اور رسالہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں انہوں نے تصوف کے ان دو اہم مسائل میں تطبیق دینے کی سعی بلیغ فرمائی ہے۔

شاہ ولی اللہ نے تصوف کی تاریخ کے جو ادوار مقرر کیے ہیں اس سے بھی تصوف کی تاریخ اور مختلف علوم میں ان کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیفات متعدد ہیں اور مختلف تذکرہ نگاروں نے ان کی تعداد مختلف رکھی ہے، غالباً تعداد میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ ان کی بعض کتابیں ایسی ہیں جو بعض دوسری کتابوں میں بھی شامل ہیں اور ان کی حیثیت الگ کتاب کی بھی، مثلاً انفاس العارفین گیارہ رسالوں کا مجموعہ ہے، اس طرح التفہیمات الالٰہیہ کے بعض تفہیمے مستقل کتاب کی حیثیت سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ خاص طور پر العقیدۃ الحسنہ، رسالہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود، اور الوصایا وغیرہ۔

شاہ ولی اللہ کی تصنیفات کی تعداد میں اس اختلاف کے باوجود عمومی طور پر ان کی تعداد 50 سے 60 کے درمیان تسلیم کی جاتی ہے، غلام مصطفیٰ قاسمی جو شاہ ولی اللہ کے علوم اور ان کی تصنیفات کے ماہرین میں ہیں، انہوں نے شاہ ولی اللہ کی 52 کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

23.18 مرزا مظہر جانِ جاناں

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں دور آخر کے ایسے صوفی ہیں جن کو صرف زمانی تاخر ہے ورنہ وہ بے شمار متقدمین پر بھی سبقت لے گئے ، علم، ادب، رواداری، کسر نفسی اور شان استغنا کی جیسی مثال ان کی شخصیت میں ملتی ہے اس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی، حضرت 11 رمضان 1110ھ میں پیدا ہوئے، والد عالمگیری منصب دار تھے اور ان کا نام مرزا جان جانی تھا، انہوں نے حسب روایت اورنگ زیب کو بیٹے کے پیدا ہونے کی خبر دی، اورنگ زیب نے نام پوچھا تو مرزا مظہر بتایا اورنگ زیب نے فرمایا بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے اس لئے ان کا نام جان جاناں رکھئے۔ اس طرح وہ مرزا مظہر جان جاناں ہوگئے، لقب شمس الدین حبیب اللہ تھا؛ لیکن نام سے ہی زیادہ شہرت پائی۔

مرزا مظہر نے دربار سلطانی کی منصب داری کی طرف توجہ نہیں دی، بلکہ دربار الٰہی میں دست سوال دراز کیا اور وہاں سے بقدر ظرف خوب عطا ہوا، شاعری کا بھی ذوق تھا، کم عمری میں شعر کہنے لگے اور فارسی اور اردو میں مستقل دیوان مرتب کیا، اس کے ساتھ حفظ اوقات، اتباع شریعت اور ثابت قدمی میں بے مثال تھے، ان کے معاصر اور جید عالم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان کا تذکرہ لکھنا شروع کیا تو عنان رخش قلم روئے قرطاس پر چھوٹ گئی اور رو میں یہاں تک لکھ گئے کہ: ''شریعت و طریقت کے راستہ اور کتاب و سنت کی پیروی میں اس قدر ثابت قدم تھے کہ اس وقت بلاد ہند میں اس کی مثال نہیں مل سکتی، بلکہ شاید مرحومین میں بھی ان کی مثال نہ ملے، اور سچی بات یہ ہے کہ ایسے صاحب اوصاف لوگ ہر زمانے میں عزیز الوجود ہی رہے ہیں اس عہد فتنہ وفساد کا تو ذکر ہی کیا۔''

وسیع المشرب ایسے تھے کہ ہندوؤں کو بھی اہل کتاب کے مانند سمجھتے تھے، اور یہاں تک لکھ گئے کہ تناسخ ارواح کا عقیدہ رکھنا کفر کو مستلزم نہیں ہے اور ویدوں کو الہامی کتاب قرار دیا، اپنے ایک خط میں ہندو مذہب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان (ہندوؤں) کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ملائکہ بحکم خدا اس دنیا پر تصرف رکھتے ہیں یا بعض کامل ارواح ایسی ہوتی ہیں کہ جسم سے ان کا تعلق ختم ہو جانے کے بعد بھی ان کا اس دنیا میں تصرف رہتا ہے، یا بعض ایسے زندہ افراد ہیں جو ان کے عقیدے کے مطابق زندہ ہیں، مثلاً خضر علیہ السلام ان کی صورت بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور اس توجہ کی بدولت کچھ مدت اس صاحب صورت کے ساتھ اپنا انتساب قائم کر کے اور اس نسبت کی بنا پر اپنے دنیاوی اور اخروی حوائج کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ عمل صوفیہ اسلامیہ کے معمولات سے مشابہت رکھتا ہے کہ تصور پیر کرتے ہیں اور فیض یاب ہوتے ہیں، فرق یہ ہے کہ شیخ کی ظاہری صورت نہیں بناتے اور یہ بات کفار عرب کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی؛ کیونکہ وہ بتوں کو مؤثر اور متصرف بالذات کہتے تھے۔''

ایک طرف حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی یہ وسیع المشربی ہے دوسری طرف ان کی شہادت کا واقعہ یہ ہے کہ تین شیعہ مذہبی لوگوں نے ان کو گولی مار کر شہید کر دیا تھا اور ان پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے اپنے بالا خانے پر کھڑے ہو کر محرم کے جلوس پر تبصرہ کیا تھا، ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس پورے معاملے پر تنقیدی نظر سے گفتگو کی ہے اور نہایت محکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ واقعہ ہوا ہی نہیں اور درایتاً ایسا ہو بھی نہیں سکتا کہ ایک 85 سالہ آدمی اپنے بالا خانے سے سات محرم کو جلوس کی ریہرسل کے دوران لعن طعن کرے، سڑک پر گزرنے والا جلوس اس کو سن بھی لے اور سمجھ بھی لے اور اتنا مشتعل ہو جائے کہ حضرت کو گولی مار دے، دراصل یہ افواہ پھیلائی گئی کہ حضرت نے محرم کے جلوس کے بارے میں تنقیدی کلمات ارشاد فرمائے ہیں، محرم کے جلسوں میں لوگوں کے جذبات بھڑکائے گئے اور چند بدطینت لوگ اس افواہ سے مشتعل ہو کر ایک شام گھر آئے، نیچے بلایا اور گولی مار کر شہید کر دیا۔ جو شخص ساری زندگی امام عالی مقام کی مدحت کرتا رہا ہو، جس کی وسیع المشربی کا یہ عالم ہو کہ ہندوؤں کے بارے میں اس کے وہ خیالات ہوں جو اوپر ذکر ہوئے، وہ بھلا کیسے ایسی گستاخی کر سکتا ہے کہ محرم کے جلوس پر زبان طعن دراز کرے؟!۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے حضرت کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مرزا مظہر اپنے دور کی بڑی شخصیت تھے۔ ان میں وہ ساری انسانی خوبیاں موجود تھیں جو اس دور میں کسی ایک ذات میں نہیں نظر آتیں، وجامع فقر و فضیلت اور سخن گستری تھے، درویش عالم، صاحب کمال، معزز و مکرم بھی تھے، اور ایسے خوش تقریر بھی کہ بیان سے باہر ہے، علم حدیث اور تصوف پر گہری نظر رکھتے تھے، ان کے بے شمار مرید اور بہت سے شاگرد تھے۔ شعر ایسے پڑھتے تھے کہ اکثر لوگ ان سے شعر سننے کے لئے آتے تھے۔ آداب معاشرت، حسن سلوک، مراتب فضل و کمال اور بزرگی و قدر دانی میں یکتائے روزگار تھے''۔

23.19 حاجی امداد اللہ مہاجر مکی

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، سلسلہ چشتیہ صابریہ کے وہ عظیم المرتبت بزرگ ہیں جن کے فیضان نظر سے تبلیغی جماعت، علماء دیو بند بلکہ موجودہ عہد میں اسلامی بیداری کے اساطین پیدا ہوئے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، اشرف علی تھانوی جیسے اساطین علم و دین آپ کے خلیفہ مجاز تھے جن کی مساعی جمیلہ عصر حاضر میں احیاء اسلام کا عنوان اور جدید دور میں اسلامی بیداری کا سرچشمہ ہیں۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی 1233ھ میں پیدا ہوئے اور 1317 میں آپ کا انتقال ہوا، مشہور تاریخی قصبہ نانوتہ آپ کا وطن تھا۔ بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی چلے گئے اور وہاں مختلف لوگوں سے فارسی و عربی کی منتہی درسیات تک تعلیم حاصل کی، مثنوی معنوی سے بڑا لگاؤ تھا، شاہ عبدالرزاق صاحب سے درسا درسا پڑھی۔ ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد باطنی علوم کے لئے کوچہ صاحبدلاں کی سرگردانی کی اور آخر بڑی تگ و دو کے بعد محض عنایت الٰہی سے میانجیو نور محمد جھنجھانوی کی خدمت میں پہنچے اور ان سے مرید ہو گئے، حضرت میانجیو نور محمد صاحب کو باطنی فیضان غالباً میاں راج شاہ کی خدمت میں ملا تھا، بہر حال حاجی امداد اللہ نے سلوک کے مراحل ان کی خدمت میں طے کئے، اس کے بعد سفر حجاز کیا حرمین کی زیارت سے فارغ ہونے کے بعد واپس ہندوستان تشریف لائے اور مریدین کی اصلاح و تربیت میں لگ گئے۔

1857 کی سعی انقلاب میں آپ نے نہایت سرگرم کردار ادا کیا؛ لیکن چند ابتدائی کامیابیوں کے علاوہ کوچہ دل میں ناکامی ہی حاصل ہوئی، لیکن کامیابی کا فیصلہ تو کہیں اور رہوتا ہے، انھوں نے وطن عزیز پر نثار ہونے میں کسر نہ اٹھا رکھی، جب دار و گیر کا سلسلہ شروع ہوا تو ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور وہاں رہ کر اپنی ضیاباریوں سے ہندوستان کی شب تاریک کو روشن کرنے کی سعی کرتے رہے، ایک طرف دار العلوم دیو بند کا قیام عمل میں آیا دوسری طرف مولانا رشید احمد گنگوہی نے فقہ و فتاوی کے میدان میں نئے حالات میں لوگوں کی رہنمائی کی، تیسری طرف مولانا اشرف علی تھانوی نے عوام کی اصلاح اور طریقت کی حقیقت سے لوگوں کو روشناس کرانا شروع کیا۔ اس طرح حضرت کا فیضان پورے ملک میں جاری ہوا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے تقریباً دس کتابیں تصنیف فرمائیں، آپ کی تصنیفات میں سب سے مشہور ضیاء القلوب ہے، اس کے علاوہ ارشاد مرشد، مثنوی تحفۃ العشاق، بیان وحدۃ الوجود، حاشیہ مثنوی مولانا روم، مثنوی غذائے روح، مثنوی گلزار معرفت، رسالہ درد غمناک، مثنوی جہاد اکبر اور نالہ امداد غریب آپ کی تصنیفات ہیں۔ چونکہ حضرت حاجی صاحب پر اکثر غلبہ حال رہتا تھا اس لیے زیادہ کتابیں نظم میں لکھی ہیں اور مثنویوں کی شکل میں ہیں، ان میں مثنوی ضیاء القلوب کو تو لازوال شہرت حاصل ہوئی اور وہ آج بھی اسی طرح مقبول ہے۔

مثنوی ضیاء القلوب میں حضرت حاجی صاحب نے راہ سلوک کے سفر اور اس کے منازل کا بیان کیا ہے، کتاب کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ جب بندے پر اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ہوتی ہے تو اس کے دل میں رجوع الی اللہ کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اس مرحلے میں سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ شیخ کامل کی تلاش کرے، شیخ کامل وہ ہوتا ہے جو شریعت و طریقت کا جامع ہو، ہر معاملے میں

قرآن وسنت کی پابندی کرتا ہو۔اس کے بعد انہوں نے وصول الی الحق کے مختلف طریقے، راہ سلوک کی ریاضتیں ومجاہدات، ذکر اور اس کی اقسام، ذکر اسم ذات، نفی واثبات، پاس انفاس وغیرہ، اس کے بعد ذکر کے اعلیٰ مراتب، سلطان الاذکار، شغل سرمدی، شغل بساط اور مراقبات وغیرہ کا بیان کیا ہے۔

تصوف کے مراحل میں مختلف سلسلوں اور ان کے اذکار کا بھی بیان ہے آخر میں تلاوت قرآن مجید، نماز وزکوۃ کی تفصیلات اور ختم خواجگان وغیرہ اعمال کی تفصیل ہے۔

حضرت حاجی صاحب کی دیگر کتب بھی دراصل تصوف کے غوامض ومعانی کی عقدہ کشائی سے عبارت ہیں ان کے علاوہ حضرت کے خطوط بے بہا معلومات کا گنجینہ ہیں، ان میں تصوف کے علاوہ بھی بہت سی مفید معلومات ہیں۔

23.20 شیخ عبدالقادر ثانی

حضرت شیخ عبدالقادر ثانی کے والد حضرت مخدوم شیخ محمد حسینی جیلانی (793 تا 894) تھے، وہ حضرت غوث اعظم پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے تھے، سلسلہ قادریہ کی نسبت وبرکت کو آپ ہی ہندوستان لے کر آئے اور اوچ میں قیام فرمایا، حضرت کے ساتھ آپ کے حشم وخدم کی ایک بڑی تعداد تھی اور دنیاوی اسباب واحوال کی بھی بڑی فراوانی۔ اوچ کا حاکم آپ سے مل کر آپ کا معتقد ہوگیا، اس وقت اوچ علماء وفضلاء کا مرکز تھا، بادشاہ کی ارادت سے عوام اور علماء دونوں میں آپ کی مقبولیت ہوگئی اور اس طرح آپ کا فیضان تمام لوگوں میں جاری ہوگیا۔ آپ نے ایک لمبے عرصے تک اوچ میں سلسلہ قادریہ کی اشاعت کا کارنامہ انجام دیا اور پورے ہندوستان میں اس سلسلہ عالیہ کی داغ بیل ڈالی، جو اگرچہ مسلکاً ایک حنبلی عالم یعنی حضرت غوث پاک سے شروع ہوا تھا لیکن اس کو غیر معمولی مقبولیت حنفی مسلک کے پیروکاروں میں ملی اور پورے ہندوستان میں اس کے اثرات مرتب ہوئے۔

ہندوستان میں سلسلہ قادریہ کی داغ بیل تو حضرت شاہ محمد حسینی جیلانی نے ڈالی تھی، لیکن اس بابرکت سلسلہ کو اصل فروغ ان کے لائق صد افتخار فرزند حضرت مخدوم شیخ عبدالقادر (862 تا 940) کے زمانے میں حاصل ہوا، حضرت مخدوم جو اپنے جد اعلیٰ حضرت غوث پاک کے ہم نام بھی تھے اور برصغیر میں اس سلسلہ کی اشاعت میں آپ نے جو کارنامہ انجام دیا اس کی وجہ سے حضرت عبدالقادر ثانی کہلاتے تھے، شخصی طور پر آپ کی زندگی صاحبزادوں کی زندگی تھی، دولت کی فراوانی نے بےفکری عطا کی اور معاشرے میں عزت ووقار نے اعتماد وحوصلہ دیا، جوانی کا زمانہ زیادہ تر لہو ولعب اور محفل سماع یا شکار میں بسر ہوا، اسی اثناء میں ایک دن ایک تیتر کی صدا سنی، رحمت حق کس کی طرف کس بہانے سے متوجہ ہوجائے اس کا کوئی ریاضیاتی اصول نہیں ہے، تیتر کی دل نشیں آواز نے وہ کام کیا جو حضرت واعظ کے دفتر لغت ہائے حجازی نہ کر سکے، اس وقت آلات لہو ولعب توڑ ڈالے، تمام عیش وآرام سے توبہ کی اور اپنے جد اعلیٰ کے طریقہ پر تن من دھن سے گامزن ہوگئے، اس درمیان والد محترم کا وصال ہوگیا اور یہ ان کی جگہ جانشین مقرر ہوگئے، دل کی لگی جب لگتی ہے تو ہر لگاوٹ ختم ہوجاتی ہے، حضرت کے لئے بھی دنیا کے سارے لگاؤ بے معنی ہو چکے تھے، شاہی وظیفہ جو حضرت کے والد کو ملتا تھا وہ حضرت کے نام جاری ہوا۔ لیکن آپ نے اس کو لینے سے سختی سے منع کر دیا اور ساری زندگی توکل اور فقر کا نمونہ بن کر بسر کی۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ ہمہ وقت ایک خاص طرح کے جذب کے زیر اثر رہتے تھے، یک گونہ سکر کی کیفیت رہتی تھی، اپنے اوراد و اشغال، مریدین کی تربیت اور سلسلہ قادریہ کی اشاعت کے علاوہ آپ کو کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی، چہرے پر ایسا نور موجزن رہتا تھا کہ کفار و فساق آپ کا دیدار کرتے ہی تائب ہوجاتے اور آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوجاتے تھے، اسی طرح فقر و توکل، جذب و سرمستی میں آپ نے پوری عمر بسر کی۔ لیکن سلسلہ قادریہ کی توسیع و اشاعت کے لئے ایسی بنیادیں فراہم کردیں کہ پھر یہ سلسلہ پورے ملک میں پھیل گیا۔

طالب علموں کو ایک بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ بعض شخصیات کے گرد عقیدت و کرامت کے ایسے ہالے تعمیر کردیے جاتے ہیں کہ ان کی شخصیت ایک چیستاں اور ان کی تعلیمات ایک پہیلی بن کر رہ جاتی ہیں۔ حضرت عبدالقادر ثانی کے بارے میں بھی طرح طرح کی روایات ہیں۔

23.21 شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی ولادت 1208ھ میں ہوئی اور ایک سو پانچ سال کی طویل عمر پا کر 1313ھ میں وفات پائی، آپ بڑے زبردست صوفی اور جلیل القدر عالم تھے، فقہ حدیث، تفسیر اور تصوف کے امام تھے، طول عمر نے آپ کو حدیث میں علو سند سے بھی نوازا تھا اس لئے حدیث شریف کی اعلیٰ سند کے لئے مختلف علاقوں کے علماء و فضلاء آپ کی طرف رجوع کرتے تھے، علماء دیوبند جن کا حدیث شریف کے ساتھ زیادہ تعلق اور شغف ہے وہ خاص طور پر علو سند کے لئے حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان سے حدیث کی اجازت لیتے اور وہ اجازت باضابطہ مسند کے ساتھ درس میں پڑھائی جاتی تھی۔

مولانا فضل رحمٰن کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ جس طرح مسلمانوں کی روحانی تعمیر و ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے، اس طرح مسلمانوں کی سماجی فلاح و بہبود کے لئے بھی سرگرم رہتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام میں آپ کی مساعی جمیلہ کو بڑا دخل رہا ہے، اسی طرح 1857ء کی جنگ آزادی میں باوجود پیرانہ سالی کے آپ نے شرکت کی۔

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، اصلاً سندیلہ کے رہنے والے تھے، لکھنؤ میں پرورش اور تعلیم و تربیت حاصل کی، مولانا نورالحق فرنگی محلی سے درس نظامی کی تکمیل کی، شاہ عبدالعزیز سے حدیث پڑھی اور سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ شاہ محمد آفاق سے نسبت مجددیہ حاصل کی، اجازت و خلافت لے کر گنج مرادآباد جو ضلع اناؤ کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اس میں سکونت اختیار کی اور پھر آخر عمر تک اسی قصبہ میں رہے۔

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک مستقل کتاب ''تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی'' تصنیف فرمائی ہے، جس میں حضرت کے مفصل حالات اور آپ کے علم و تدین پر مفصل تبصرہ ہے۔ اپنی دوسری کتاب تاریخ دعوت و عزیمت میں وہ مولانا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا فضل رحمٰن، گنج مرادآبادی رحمتہ اللہ علیہ کے جذبہ قوی، نفس گرم، زہد و تجرید، اتباع شریعت، علم سنت و حدیث اور عشق الٰہی وحب نبویؐ نے نصف صدی سے زائد تک ہندوستان کی فضاء کو گرم اور منور رکھا''۔

مولانا علی میاں کے والد حکیم سید عبدالحئی حسنی اپنی شہرہ آفاق کتاب نزہتہ الخواطر میں لکھتے ہیں:

''عقیدت مندوں نے پروانوں کی طرح ہجوم کیا اور تحائف و ہدایا کی بارش ہوئی، بڑے بڑے امراء اور رؤسا، دور دراز اور دشوار گزار علاقوں سے عقیدت مندانہ حاضر ہوئے۔ اور آپ کی ذات مرجع خلائق بن گئی اور ایسی مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہوئی جو اس زمانے میں کسی شیخ طریقت کو حاصل نہیں تھی جہاں تک آپ کے کشف و کرامات کا تعلق ہے وہ حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں اور اس بارے میں اولیاء متقدمین میں بھی سیدنا عبدالقادر جیلانی کے علاوہ اور کوئی نظیر نہیں ملتی۔''

حضرت مولانا سید فضل رحمٰن گنج مرادآبادی نے قرآن مجید کا ٹھیٹ ہندی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا جو ''من موہن کی باتیں'' کے عنوان سے شائع ہوا، اگر چہ یہ ترجمہ مکمل نہیں ہے لیکن حضرت نے اس میں خالص ہندی میں ہر لفظ کا ترجمہ کرکے ایک نیا لسانی تجربہ کیا ہے، افسوس اہل ظرف اور اہل ہمت کی کمی کے باعث یہ تجربہ آگے نہ بڑھ سکا، ورنہ شاید ہندی زبان کو نئے آفاق و معانی اور نئے گوشے عطا ہوتے۔

معلومات کی جانچ

1. سلسلہ شطاریہ کے بانی کون تھے؟
2. حضرت باقی باللہ کا مزار کس شہر میں واقع ہے؟
3. مجدد الف ثانی کا سلسلہ نسب کس صحابی سے ملتا تھا؟
4. سواطع الالہام کس کی تصنیف ہے؟
5. تصوف میں شاہ ولی اللہ کی تین کتابوں کے نام بتائیے۔
6. حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی پیدائش کب ہوئی؟

23.22 خلاصہ

ہندوستان دین دھرم کی سرزمین ہے، تصوف اس ملک کے رگ و پے میں رچا بسا ہے، یہاں کا معاشرہ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب یہاں کی فضا پوری طرح تصوف نے تشکیل دی ہے، صدیوں کے اس طویل دورانیے میں تصوف کے رنگ نے یہاں کی ہر چیز کو معمور کر دیا ہے، جن صوفیہ کرام نے یہ خدمت انجام دی ان کی تعداد بہت ہے۔ اوپر کے صفحات میں چند اہم صوفیہ کرام اور ان کی خدمات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

23.23 نمونے کے امتحانی سوالات

1. حضرت شیخ علی ہجویری کی حیات وخدمات پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. حضرت نظام الدین اولیاء کا ہندوستانی تہذیب کے فروغ میں کیا کردار ہے؟
3. سید اشرف جہانگیر سمنانی کے بارے میں بتائیے۔
4. شیخ احمد سرہندی کون تھے؟ انہوں نے ہندوستان میں کیا کارنامہ انجام دیا؟
5. شاہ ولی اللہ کے مقام ومرتبہ کے بارے میں بتائیے۔
6. حاجی امداداللہ مہاجر مکی پر ایک نوٹ لکھیے۔

23.24 فرہنگ

توکلاً علی اللہ	اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے
بلاد وامصار	ملکوں وعلاقوں
حَکَم	ثالث
مسترشد	طالب ہدایت
طرۂ امتیاز	امتیازی صفت
مرجعیت	مقبولیت
لم یزل	ہمیشگی
منشور	نشر کیا ہوا
ارتکاب	سرزد ہونا
نامساعد	غیر مددگار
جولانگاہ	میدان عمل
انہماک	کسی چیز میں ڈوب جانا
حظوظ نفسانی	حظوظ جمع حظ۔ حصہ
نافذ المشیت	ارادہ پورا ہونا

صاحب الاشراق	فلسفہ اشراق والے
عطر بیز	مہکنے والا
صوم داؤدی	ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھنا
جادہ مستقیم	سیدھی راہ
اساطین	بڑے لوگ
متداول	مستعمل، جاری وساری
دست و برد	ظلم وستم
اطلاعاتی انفجار	Explosion of knowledge
زرنگار	سنہری تحریر والا
دستگاہ	قبضہ واقتدار
قلمرو	حکومت
میخ	کیل
عنان سفر	سفر کی لگام
فالِ سعادت	خوش بختی کی علامت
حرزِ جاں	جان کا وظیفہ
قیل وقال	گفت وشنید، بحث ومباحثہ
اتالیق	نگراں
بساط سیاست	بساط: چادر، چٹائی
وسیع المشربی	وسیع النظری
تزکیہ	نفس کی صفائی
استغراق	کسی چیز میں ڈوب جانا
حشر ونشر	قیامت کے بعد اٹھایا جانا
سب وشتم	گالی گلوچ

مشاجرات	لڑائی جھگڑے
تنقیص	برائی کرنا
عازمِ سفر	سفر کا ارادہ کرنے والا
لائحہ عمل	عمل کا منصوبہ
سعیِ بلیغ	زبردست کوشش
مبسوط	پھیلا ہوا، تفصیلی
استغنا	بے نیازی
رخش	گھوڑا
عزیز الوجود	مقبول خلائق
تناسخ	اواگون
مساعی جمیلہ	نیک کوششیں
عقدہ کشائی	مسئلہ حل کرنا
غوامض	دشوار و پیچیدہ مسائل
چیستاں	پہیلی
شغف	دلچسپی
سخن گستر	گفتگو کرنے والا
حوائج	حاجتیں، ضرورتیں
آفاقیت	عالمیت

23.25 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. بزمِ صوفیہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن
2. سیر الاولیاء: امیر خورد کرمانی
3. سیر العارفین: شیخ جمالی

4. اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی

5. نزہتہ الخواطر: مولانا عبدالحیٔ لکھنوَ

6. تذکرہ علماء ہند: رحمان علی

7. تصوف اسلام: مولانا عبدالماجد دریابادی

8. تصوف اور شریعت: پروفیسر محمد عبدالحق انصاری (اردو ترجمہ: مفتی محمد مشتاق تجاروی)

9. برصغیر ہند میں اشاعت اسلام کی تاریخ: ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی

10. تاریخ مشرب شطار: فضیل احمد قادری

11. محبوب سبحانی سید نعیم اشرف جائسی

اکائی 24 : صوفی تصنیفات

اکائی کے اجزاء

24.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ تصوف کے طلبہ تصوف کی امہات کتب، ان کے مصنفین اوران کے بنیادی مباحث سے واقف ہوجائیں تاکہ ان کو تصوف کی تصنیفات سے ایسی مناسبت پیدا ہوجائے کہ وہ تصوف کے مختلف موضوعات پر مطالعہ یا تحقیق کرتے ہوئے ان کتابوں سے استفادہ کرسکیں۔

24.2 تمہید

تصوف کی تاریخ میں باضابطہ کتاب لکھنے کا آغاز احادیث شریفہ کے ان مجموعوں سے ہوا جو الزہد کے نام سے لکھے گئے۔اس کے بعد لوگوں نے باضابطہ تصوف پر کتابیں لکھنی شروع کیں، اس اکائی میں ہماری کوشش ہوگی کہ طلبہ کو تصوف کی باضابطہ اوراہم ترین کتابوں سے واقف کرادیا جائے اور طلبہ یہ بھی جان لیں کہ ان کتابوں کے بنیادی موضوعات اوران میں زیر بحث مضامین کیا تھے، اس لئے ہم نے اس میں اہم کتابوں کے مصنف، اس کتاب کی اہمیت اوراس کے بنیادی مباحث کا خلاصہ درج کردیا ہے۔

24.3 الرعایۃ لحقوق اللہ

الرعایۃ لحقوق اللہ، حارث بن اسد محاسبی کی تصنیف ہے، حارث محاسبی کا شمار مشائخ کبار میں ہوتا ہے، وہ بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن زیادہ تر وقت بغداد میں بسر کیا، حضرت جنید بغدادی کے مشہور اساتذہ میں ہیں اور تصوف کے اوّلین مصنّفین میں تھے اور انہوں نے بہت کچھ لکھا، علم کلام کے بانیوں میں سے ہیں۔ان کی تقریباً تین درجن کتابیں دستیاب ہیں، ان میں سب سے ضخیم کتاب جیسا کہ عبدالحلیم محمود نے وضاحت کی ہے یہی الرعایۃ لحقوق اللہ ہے۔اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد کتابیں دستیاب ہیں، لیکن وہ نسبتاً چھوٹی ہیں، یہ کتاب چارسو صفحات سے زیادہ پر محیط ہے اوراس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، کئی لوگوں نے اس کو الگ الگ ایڈٹ بھی کیا ہے، عبدالحلیم محمود نے اس کو ایڈٹ کیا ہے، لیکن اس کا سب سے اچھا نسخہ وہ ہے جس کو عبدالقادر احمد عطا نے ایڈٹ کیا، اس کا چوتھا ایڈیشن جامع ترین ایڈیشن ہے، اس میں تخریج وتحقیق کے علاوہ اختلاف نسخ کو بہت تفصیل سے درج کردیا گیا ہے۔

حارث محاسبی کو تذکرہ نگار 'مرشد الجماہیر' کہتے ہیں یعنی عوام کے رہنما، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کی فکر اوران کے کلام کا محور عوام کی اصلاح وفلاح ہے، الرعایۃ جو ان کی اہم ترین کتاب ہے، یہ کتاب بھی اپنے موضوع سے شروع نہیں ہوئی بلکہ پہلے عوامی تربیت ہے، اس کے بعد کتاب کا آغاز ہے، اس کا پہلا باب حسن استماع پر ہے، یعنی سالک کو یا طالب علم کو کیسا ہونا چاہئے اور حصولِ علم کے لئے حسن استماع کی کتنی اہمیت ہے، لکھتے ہیں:

> اے سالک تیری طرف سے حسن استماع اور جو میں جواب دوں ان کو دھیان سے سننا ضروری ہے، شاید کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس چیز کی سمجھ عطا کرے، فائدہ پہنچائے جو اس "الرعایۃ لحقوق اللہ عزوجل والقیام بہا" کے ذریعہ پیش کررہا ہوں؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا کہ جو اس طرح دھیان سے سنے جس طرح اللہ پسند فرماتا ہے۔تو جو وہ سنتا ہے وہ اس کے لئے نصیحت اور نافع بن جاتا ہے۔

اس کے بعد حارث محاسبی نے اس کے دلائل بیان کئے ہیں۔

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، اصل کتاب دراصل سوالات وجوابات کے پیرائے میں ہے، ایسا لگتا ہے کہ مصنف سے مختلف سوالات کئے گئے اور مصنف نے ان کے جوابات دئے، دوسری خاص بات یہ ہے کہ وہ بالعموم قرآنِ مجید کے حوالے دیتے ہیں۔

حسن استماع کی تلقین کے بعد وہ الرعایۃ لحقوق اللہ کے تصور کی وضاحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو حقوق انسانوں پر واجب کئے ہیں، ان کی حفاظت اور ان پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے، یہ انسان کے اوپر فرض ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی ذمہ داری تقوی کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ حارث محاسبی نے تقوی اور اس کے مفہوم وتقاضے تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ان کے بعد ورع کا بیان ہے۔ انسانی زندگی میں ایک اہم ترین مسئلہ خود فریبی کا ہے، انسان بزعم خویش یہ سمجھتا ہے کہ وہ اچھا انسان ہے، حارث محاسبی نے تقوی وورع کے بعد اس خود فریبی کا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان پر غور وفکر لازمی ہے اور اپنے اعمال کا احتساب بھی کرتے رہنا ضروری ہے تاکہ وہ صحیح راستہ پر گامزن رہے۔ اس کے بعد انہوں نے تقویٰ کا راستہ اختیار کرنے، توبہ کی طرف توجہ اور اللہ تعالیٰ کی وعیدوں پر خوفزدہ ہونے جیسے موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ توکل بھی ایک اہم انسانی صفت میں سے ہے اس کا بیان ہے، اس کے بعد حقوق اللہ، اس کے اسباب واوقات اور حقوق اللہ سے متعلق قلب ودل کے احوال کا بیان ہے۔

کتاب الریا کے نام سے ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور اس میں ریا سے متعلق نہایت شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی ہے، اس کے بعد مختلف ابواب میں انسانی کی بشری کمزوریوں کا بیان ہے اور ان کے علاج پر گفتگو کی ہے جیسے عجب، خود بینی، حسد وغیرہ، اور آخری باب مرید کی تعلیم وتربیت سے متعلق ہے، اس کا عنوان ہے تأدیب المرید، اس میں مرید کے دن ورات کو کس طرح بسر ہونا چاہئے اور اس کو کن آداب کی رعایت کرنی چاہئے اور آخری بات یہ ہے کہ زندگی کس کیفیت میں بسر کرنی چاہئے۔

الرعایۃ لحقوق اللہ سالکین کے لئے ایک رہنما کتاب ہے، اس میں آداب سلوک سے لے کر انسان کی ذمہ داریاں، اس کے نفسیاتی امراض اور ان کا علاج اور سالک کے ایام کو کس طرح بسر ہونا چاہئے اس سب کا تفصیلی بیان ہے۔

24.4 اللمع فی التصوف

ابونصر سراج اپنے عہد میں بڑے پائے کے صوفی تھے؛ بلکہ ان کے خاندان کو اولیاء کا خاندان کہا جاتا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورا خاندان زہد وعبادت کے لیے مشہور تھا، ان کے والد علی بڑے زبردست بزرگ تھے، ان کی وفات کا قصہ اکثر کتابوں میں اس طرح درج ہے کہ انہوں نے سجدے کی حالت میں وفات پائی۔

خود ابونصر بھی بڑے زبردست صاحب دل بزرگ تھے، ان کے عہد میں لوگ ان کو 'طاؤس الفقراء' کہا کرتے تھے، اور چوں کہ انہوں نے تصوف کو مضبوط دلائل اور روشن براہین سے اس طرح ثابت کیا ہے جس طرح فقہاء اپنے مسلک کو ثابت کرتے ہیں؛ اس لیے ان کو تصوف کا فقیہ کہا جاتا ہے۔

ابونصر سرّاج کے ذاتی فضائل ومناقب بھی بہت ہیں اور یہ ان کو صوفیاء کے درمیان اہم مقام دینے کے لئے کافی ہیں، لیکن ان کو جس چیز نے اصل شہرت اور پائیدار ناموری نصیب کی ہے وہ دراصل ان کا یہ امتیاز ہے کہ ان کی کتاب 'اللمع فی التصوف' تصوف کے موضوع پر لکھی جانے والی پہلی دستیاب کتاب ہے۔اس طرح وہ گویا تصوف کے مورخ اور مدون ہیں۔

ان سے قبل بھی تصوف پر بعض کتابیں لکھی گئیں اور بعض ان میں سے دستیاب بھی ہیں جیسے ابوسعید الخراز کی کتاب الصدق یا حارث محاسبی کی تصنیفات، لیکن یہ کتابیں ان کی اپنی آراء کا مجموعہ ہیں، خود تصوف کیا ہے اس کے امتیازات کیا ہیں، صوفیا کون ہیں اور کیوں صوفی کہلاتے ہیں، ان کے افکار، علوم اور کیفیات اور راہ سلوک کیا ہیں؟ ان تمام موضوعات پر ابونصر سراج کی مایہ ناز تصنیف اللمع فی التصوف پہلی کتاب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بے مثال بھی۔

کتاب اللمع فی التصوف کے مصنف ابونصر سرّاج کا پورا نام عبداللہ بن علی بن محمد بن یحیٰی ابونصر سرّاج الطوسی ہے، طوس کے رہنے والے تھے، وہیں پیدا ہوئے اور طوس میں ہی پرورش پائی۔

کتاب اللمع فی التصوف کو بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، اس کے متعدد قلمی نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں، اول اول اس کو نکلسن نے انگریزی خلاصے اور ایک مقدمہ کے ساتھ شائع کیا، اس کے بعد اس کا ایک حصہ مزید دریافت ہوا، اس کو آربری نے 'صحف من کتاب اللمع' کے نام سے شائع کرایا، اس کے بعد عبدالحلیم محمود اور طہ عبدالباقی سرور نے اس کو ایڈٹ کیا اور قاہرہ سے شائع کرایا، یہ مکمل نسخہ ہے، آربری کا دریافت کردہ صحیفہ بھی اس میں شامل کردیا گیا ہے۔

اس کتاب کے دو اردو ترجمے بھی ہوئے، ایک ترجمہ سید اسرار بخاری نے کیا جو اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور سے 1984ء میں شائع ہوا، دوسرا ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن نے کیا جو ادارہ تحقیقات اسلامی، پاکستان سے 1986ء میں شائع ہوا۔

کتاب اللمع فی التصوف بلاشبہ ایک معرکہ آرا تصنیف اور ایک بے مثال ذخیرہ ہے، اس نے تصوف کی تاریخ اور اس کے افکار کو ایک ایسے دور میں منضبط کردیا جب کہ تصوف اپنی ابتدائی شکل میں تھا، اس کے ذریعہ ابتدائی دور کے صوفیاء کے افکار سے واقفیت ہوتی ہے اور ہمارے لیے آسان ہوجاتا ہے کہ اجلہ صوفیاء کے اصل خیالات کو صحیح طور پر سمجھ سکیں، اور ان پر بعد کے تذکرہ نگاروں نے عقیدت میں غلو اور دوراز عقل اضافوں سے جو صورت بگاڑ دی ہے اس کو اصل افکار سے الگ کرسکیں۔

ابونصر سرّاج نے شروع میں تقریباً ۶۰ صفحات میں تصوف، اس کی حقیقت، اس کے مراجع، تصوف پر اعتراضات اور توحید وغیرہ کے بارے میں صوفیاء کے افکار پیش کیے ہیں، اس کے بعد احوال ومقامات کو بیان کیا ہے، پھر اتباع سنت، قرآن وسنت کے فہم اور اس کے معانی مستنبط کرکے صوفیانہ منہاج کو مع امثلہ واضح کیا ہے۔

کتاب کا ایک بڑا حصہ صوفیاء کے آداب کے لیے مختص ہے، یہی دراصل کتاب کی جان ہے، تقریباً دوسو صفحات پر مشتمل اس حصے میں صوفیاء کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے علاوہ سماع، وجد، کرامات، صوفیاء کی مخصوص اصطلاحات، شطحات وغیرہ کا بیان ہے اور آخر میں گمراہ صوفیاء پر تنقید ہے، اس میں ہر گروہ کی گمراہی الگ الگ بیان کرکے ان پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً حریت وعبودیت میں غلطیاں، نبوت وولایت اور حلول وغیرہ کا ذکر ہے۔

کتاب اللمع میں شروع میں پندرہ ابواب ہیں، جو مختصراً تصوف کے جملہ پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، تصوف اور اس کی اہمیت، حدیث اور فقہ کی اہمیت، صوفیہ کے طبقات یہ بحث کہ لفظ تصوف کے استعمال کی ضرورت کیا ہے، صوفیہ کا فقہاء پر اعتراض، صوفی نام کی تشریح، تصوف ہے کیا صوفیہ کون ہیں؟ علم توحید اور تصوف، معرفت، عارف وغیرہ مباحث ہیں۔

کتاب کے اگلے حصہ میں مستقل کتابیں ہیں، جیسے کتاب الاحوال والمقامات، اس میں صوفیہ کے احوال و مقامات کو بیان کیا گیا ہے۔ حال تبدیل ہونے والی کیفیت کا نام ہے جیسے محبت، خوف، شوق وغیرہ۔ اس کے بعد کتاب اصل صفات ہے، اس کے بعد کتاب المستنبطات ہے، اس میں صوفیہ کے ذریعہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کی جو کوشش ہے اس کا بیان ہے۔ اس کے بعد کتاب صحابہ ہے، پھر آداب کتاب صوفیہ اس میں شرعی امور میں صوفیہ کے آداب بیان کئے ہیں اس کے بعد کتاب المسائل ہے، اس میں صوفیہ کے مخصوص مسائل جیسے جمع وفرق، صدق، اخلاص، فقر، مروت وغیرہ کا بیان ہے۔

کتاب المکاتبات میں صوفیہ کرام کی باہمی مکاتبت اور ان کے مکتوبات کے کچھ نمونے دیے ہیں۔ کتاب السماع میں سماع کے آداب اور اس کے جواز کے دلائل نیز سماع میں صوفیہ کے معمولات کا بیان ہے۔ کتاب الوجد کتاب الکرامات وغیرہ میں صوفیہ کے وجد اور کرامتوں کا بیان ہے۔ چونکہ تصوف ایک نیا فن تھا اور اللمع فی التصوف اس فن کی پہلی کتاب ہے اس لیے مصنف نے تصوف کی مشکل اصطلاحات کی تشریح بھی ہے۔

تصوف کی تاریخ میں شطحات نہایت اہم مسئلہ ہے، ابونصر سراج نے اس پر بھی ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر نہایت شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے۔

آخر میں گمراہ صوفیہ کے بارے میں بھی لکھا ہے جنہوں نے تصوف کا ظاہری طور پر دعویٰ تو کیا لیکن وہ شریعت مصطفوی کے جادہ مستقیم سے منحرف ہوگئے۔

یہ کتاب یقیناً بے مثال اور تصوف کے علوم کی جامع ہے، اس میں صوفیاء کے افکار کو مضبوط اسناد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

24.5 التعرف لمذہب اہل التصوف

ابوبکر کلاباذی کا نام محمد بن اسحاق بن ابراہیم ہے، لقب تاج الاسلام ہے، مسلکاً حنفی تھے اور حنفی کے فقہاء میں ان کا شمار ہوتا تھا اس لیے نام کے ساتھ الحنفی کی نسبت بالعموم لگی رہتی ہے۔

بخارا کے ایک محلّہ کلاباذ کے رہنے والے تھے، اس لیے الکلاباذی کہلاتے ہیں، اور بخارا کے تھے اس لیے البخاری کہلاتے ہیں۔ لیکن کلاباذی کو جس کتاب نے زندہ جاوید بنایا اور جس کتاب کی وجہ سے ان کا نام آج بھی زندہ ہے وہ ہے ان کا مشہور کارنامہ 'التعرف لمذہب اہل التصوف'۔

یہ کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے بہت مختصر ہے، صرف 105 صفحات کا کتابچہ ہے؛ لیکن تاریخ تصوف میں اس کا مقام اتنا بلند ہے کہ عموماً تذکرہ نگار کہتے ہیں، لولا التعرف لما عرف التصوف (اگر کتاب تعرف نہ ہوتی تو لوگ تصوف سے واقف ہی نہ ہوتے)۔

اس کتاب کو عہد اسلامی میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، اس وقت بھی دنیا کے مختلف کتب خانوں میں اس کے سینکڑوں مخطوطات موجود ہیں اور اس کی متعدد شروح وحواشی بھی میراث اسلامی میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی کچھ شروح یہ ہیں۔

1. نور المریدین وفضیحۃ المدعین، اسمعیل بن محمد بن عبداللہ المستملی (434ھ): یہ کتاب لکھنؤ سے 1912ء میں چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

2. حسن التصرف فی شرح التعرف، علی بن اسماعیل بن یوسف القونوی (۷۲۷ھ/۱۳۲۶ء): اس کے متعدد مخطوطات مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

3. شرح۔ مجہول المؤلف مخطوطہ۔

4. شرح: شیخ الاسلام عبداللہ انصاری: اس شرح کا ذکر عبدالحلیم محمود نے کیا ہے اور لکھا ہے: وھو شرح لطیف (یہ بہت اچھی شرح ہے)۔

التعرف کے مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہوئے ہیں، آربری نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو بہت مقبول ہے اور متعدد جگہ سے کئی بار شائع ہو چکا ہے۔

اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، عربی میں بھی یہ کتاب کئی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ 1231ھ میں احیاء العلوم کے حاشیہ پر استنبول سے چھپی تھی۔ اس کا محقق ایڈیشن ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور طہ عبدالباقی سرور نے، قاہرہ سے 1960ء میں شائع کیا۔

التعرف کے مباحث کا خلاصہ اس طرح ہے:

اس کتاب میں کل 57 ابواب ہیں: ہر عنوان پر ایک باب قائم کیا ہے، پہلے باب میں یہ بحث ہے کہ صوفیاء کو صوفیاء کیوں کہا جاتا ہے اور تصوف فی نفسہ ہے کیا؟ اس کے بعد دوسرے باب میں تصوف کی اہم شخصیات کے نام ہیں، انہوں نے حالات زندگی لکھنے کا اہتمام نہیں کیا اور نہ ہی اس باب میں ان کے افکار بیان کیے، بلکہ اس باب میں صرف صوفیاء کے نام ذکر کیے ہیں۔

تیسرے باب میں ان صوفیاء کا ذکر کیا ہے جنہوں نے رسائل اور خطوط کے ذریعے فن تصوف کی اشاعت کی۔ اس باب میں بھی صرف نام مذکور ہیں، مزید تفصیلات نہیں ہیں۔ چوتھا باب صوفی مصنفین کے لیے مخصوص ہے، اس میں ان لوگوں کے نام ہیں جنہوں نے باضابطہ تصوف میں تصنیفی کام کیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ جنید بغدادی کا تذکرہ پہلے باب میں اور دوسرے باب میں حارث محاسبی کو رکھا ہے۔

ان تمہیدی ابواب کے بعد پانچواں باب توحید سے متعلق ہے، یہ باب اور اس کے بعد کے چند ابواب پر ان کے معاصر افکار کا خاصا اثر نظر آتا ہے، مثلاً انہوں نے صفات کے ذیل میں لکھا ہے کہ صفات باری تعالیٰ نہ جسم ہیں نہ عرض، نہ جوہر نہ ذات، لیکن اس کے سمع، بصر، وجہ اور ید وغیرہ ہیں۔

ساتویں باب میں صفت خلق پر بحث کی ہے، آٹھویں میں اسماء حسنیٰ سے متعلق صوفیاء کا موقف بیان کیا ہے اور نواں باب قرآن سے متعلق ہے، صوفیاء کا مسلک یہ لکھا ہے کہ وہ قرآن کو مخلوق اور حادث نہیں مانتے ہیں۔

دسواں باب کلام الٰہی کے بارے میں ہے، یہ کافی مفصل ہے اس کے بعد رویت، قدرت، استطاعت، جبر، وعد وعید، شفاعت، تکلیف شرعی اور نابالغ فوت شدہ بچوں کے بارے کیا ہوگا، ان مباحث کا بیان ہے۔

یہاں تک تمام مباحث وہ ہیں جو تصوف کے نہیں ہیں بلکہ عقائد اور کلام کے ہیں، کلاباذی نے ان میں صوفیاء کا موقف لکھا ہے جو بالعموم وہی ہے جو عام اہل سنت کا ہے۔

اکیسویں باب سے تصوف کے اصل مباحث شروع ہوتے ہیں، سب سے پہلی بحث معرفت ہے جو دو ابواب پر مشتمل ہے، اس میں معرفت کی حقیقت، نوعیت اور معرفت کے اسباب پر گفتگو کی ہے، اگلے دو ابواب میں روح اور فرشتوں کا بیان ہے، پھر اولیاء اللہ کی کرامتوں پر گفتگو کی ہے، اور یہ بحث کافی مفصل ہے۔

اکتیسواں باب علم الاحوال سے شروع ہوتا ہے، پھر کشف وخواطر، استرسال، توبہ، زہد، صبر، فقر، تواضع، خوف، تقویٰ، اخلاص، شکر، توکل، رضا، یقین، ذکر، انس، قرب، اتصال اور محبت وغیرہ احوال ومقامات پر گفتگو کی ہے۔

باونواں باب تجرید وتفرید سے شروع ہوتا ہے، پھر وجد کا بیان ہے اس کے بعد غلبہ سکر، غیبت وشہود، جمع وفرق، تجلی واستفسار اور فناء وبقاء جیسے امتیازات کو ایک ایک باب میں بیان کیا گیا ہے، فناء اور بقاء جو تصوف کے امتیازی پہلو ہیں ان پر سب سے زیادہ مفصل بحث کی ہے اور مختلف صوفیاء نے ان کے جو معانی لیے ہیں ان پر کلام کیا ہے۔

ساٹھواں باب معرفت کے حقائق پھر توحید کی حقیقت، عارف کی پہچان، مرید اور مراد، مجاہدات ومعاملات وغیرہ کا بیان ہے۔

اگلا باب ایک منفرد باب ہے، اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سالک کب اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنے لگے، اس میں مختلف صوفیاء کے کلام کی کیفیات بھی بیان کی ہیں۔

اس کے بعد کے تمام ابواب مستقل اور منفرد ہیں، مثلاً ایک باب میں صوفیاء کی غایت تقویٰ واحتیاط اور کثرت مجاہدات کا بیان ہے، ایک باب میں غیبی آوازوں کے ذریعہ تربیت کے واقعات جمع کیے ہیں، ایک باب میں فراست مومن سے اپنی تربیت کے واقعات ہیں، ایک باب میں خطرات نفس اور دل میں بات گذرنے کے واقعات ہیں۔

ایک مستقل باب اس پر قائم کیا ہے کہ خواب میں کس طرح صوفیاء کو تنبیہ کی جاتی ہے۔ ایک باب میں مشکلات پر صبر، ایک باب میں مشکلات سے معجزانہ طور پر نجات اور ایک باب میں یہ بتایا ہے کہ مرنے کے بعد صوفیاء کو خواب میں دیکھنے والوں نے کس طرح کے واقعات نقل کیے ہیں۔

ایک باب میں صوفیاء کی مختلف کیفیات کا بیان اور آخری باب سماع سے متعلق ہے، صرف ایک صفحہ میں سماع پر گفتگو کی ہے۔ کلاباذی کا رجحان بظاہر سماع کی حمایت کا نہیں ہے۔

اوپر مذکور کتاب کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ التعرف بلاشبہ تصوف کی بڑی اہم جامع اور معیاری کتاب ہے، اس میں مصنف نے تمام ضروری مباحث اور ان میں صوفیاء کے موقف کو واضح کردیا ہے۔

اس کتاب میں مصنف کا طریقہ تصنیف یہ ہے کہ وہ ایک عنوان قائم کرتے ہیں پھر اس عنوان کے تحت اصولی بات نقل کرتے ہیں کہ صوفیاء اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں، اس اصولی بات کو نقل کرنے کے بعد صوفیاء کی دیگر آراء کو بھی حسب ضرورت بیان کرتے ہیں، انکا اسلوب یہ ہے کہ ان کے الفاظ کم سے کم استعمال ہوں اور زیادہ دوسرے صوفیاء کے اقوال بیان کیے جائیں تا کہ صوفیاء کا اپنا موقف واضح ہو سکے۔

التعرف میں بہت سے مباحث ایسے ہیں جو صوفیاء کی کسی کتاب میں نہیں ہیں، اور ان کا اسلوب تو کسی نے اختیار ہی نہیں کیا۔ ان کے مباحث سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تصوف میں دخیل اثرات پوری طرح محسوس کرتے ہیں اور ان اصطلاحات کی بہترین تاویل کرتے ہیں جن کے ذریعے بعض صوفیاء کچھ غلط چیزوں کو رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح کی بحثیں جمع وفرق اور مشاہدہ وغیرہ مباحث میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ابوبکر محمد بن اسحاق بن ابراہیم بن یعقوب الکلاباذی البخاری کی وفات کے بارے میں بھی خاصا اختلاف ہے، عام طور پر 380ھ/ 990ء کو ان کا سنہ وفات قرار دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ 383ھ/ 995ء اور 395ھ/ 1005ء کی روایات بھی ملتی ہیں۔

24.6 الرسالہ القشیریۃ

تصوف کی تاریخ میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ تو اول دن سے قائم ہے لیکن فن تصوف پر پہلی باضابطہ کتاب اللمع فی التصوف ہے۔ اس کے بعد ابوبکر الکلاباذی کی 'التعرف لمذهب اهل التصوف' ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لولا التعرف لما عرف التصوف (اگر تعرف نہ ہوتی تو تصوف پہچانا ہی نہیں جاتا)۔

ان دونوں کتابوں کی اولیت اور زمانی تقدم نیز اہمیت ومعنویت کے باوجود ابوالقاسم قشیری کی کتاب الرسالہ کو جو شہرت ومقبولیت ملی ہے وہ بھی بے نظیر ہے، پوری تاریخ تصوف میں الرسالہ القشیریہ بطور درسی کتاب اور بطور متن کے پڑھائی جاتی رہی، تصوف کے شائقین نے اس کو اپنا حرز جان بنائے رکھا۔

الرسالۃ القشیریۃ کو تصوف کے متون میں غیر معمولی شہرت ملی، اللمع کا صحیح تعارف اس وقت ہوا جب مستشرقین نے اس کی طرف توجہ کی اور اس کو ایڈٹ کر کے شائع کیا، لیکن الرسالۃ القشیریۃ بہت پہلے سے لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا رہا، اور اس کی اشاعت بھی بہت پہلے شروع ہو گئی تھی۔

الرسالۃ القشیریہ کی شہرت اور مقبولیت کے پیچھے یقیناً یہ بات بھی کارفرما ہے کہ یہ اپنے موضوع پر ایک مکمل اور جامع کتاب ہے، اس میں فن تصوف سے متعلق جملہ پہلوؤں پر کافی وشافی بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ یہ بھی ایک عامل رہا ہوگا کہ اس کے مصنف امام قشیری بڑے مشکل اور نامساعد حالات سے گزرے، ان کی مشکلات کے صلے میں ان کو بارگاہ رب العزت سے شہرت ومقبولیت کا تحفہ ملا۔

امام قشیری ایران کے شہر خراسان کے نواح میں پیدا ہوئے، مشہور ہے کہ نسلاً عرب تھے اور ان کا خاندان [illegible]
کا ہے، تذکرہ نگاروں نے ان کا اور ان کی والدہ کا نسب لکھا ہے، ان کی والدہ کے بھائی ابو عقیل سلمی اپنے علاقے کے سرکردہ لوگوں میں تھے۔

خراسان میں ایک مضافاتی قصبہ استوا ہے، امام قشیری وہیں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش ربیع الاول ۳۷۶ ہجری ہے اور پورا نام عبدالکریم بن ہوازن بن عبدالملک القشیری ہے، بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے، سن شعور کو پہنچنے کے بعد ابوالقاسم الامانی سے تعلیم حاصل کرنی شروع کی، ابوالقاسم عربی کے بڑے عالم تھے ان سے قشیری نے عربی ادب کی کتابیں پڑھیں۔

امام قشیری جس گاؤں میں رہتے تھے وہاں زمینداروں نے کسانوں پر بھاری ٹیکس لگا رکھے تھے، اکثر لوگ ان کی وجہ سے پریشان تھے، وہاں کسی نے بتایا ہوگا کہ محکمہ استیفاء ٹیکس کی مقدار متعین کرتا ہے، اگر کسی کی وہاں تک رسائی ہو تو یہ ٹیکس کم کیا جا سکتا ہے۔ قشیری کو یہ بات سمجھ میں آگئی اور انہوں نے طے کر لیا کہ حساب (ریاضی) سیکھ کر محکمہ استیفاء میں ملازمت کروں گا اور اپنے گاؤں کے لوگوں کو اس بھاری ٹیکس سے نجات دلاؤں گا۔

حساب سیکھنے کی غرض سے قشیری نیشاپور گئے، ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ قشیری کو دنیاداروں کی قربت بہت پسند تھی اور نیشاپور گئے بھی اسی لیے تھے کہ دنیاداری کا علم حاصل کریں؛ لیکن ہوتا وہ ہے جو دست قدرت کو منظور ہوتا ہے اور دست قدرت نے ان کے لیے دنیاداری نہیں بلکہ دین داری لکھ رکھی تھی، درویشی لکھ رکھی تھی، ولایت کے مقامات لکھ رکھے تھے، اور اس کے اسباب اس طرح پیدا ہو گئے کہ ایک مرتبہ ان کا گذر ابو علی دقاق کی مجلس میں ہوا، ابو علی دقاق نیشاپور کے زبردست خطیبوں میں شمار ہوتے تھے، ان کا وعظ سن کر قشیری کی دنیا بدل گئی، ترجیحات بدل گئیں جس مقصد سے آئے تھے اس کا سودا دماغ سے نکل گیا اور ایک نیا سودا سما گیا۔

امام قشیری نے بہت ساری کتابیں تصنیف کیں ان کی تصنیفات کی تعداد مورخین نے تیس کے قریب لکھی ہے، اور ان میں سے اکثر کتابیں مطبوعہ شکل میں دستیاب ہیں، انہوں نے تفسیر، حدیث، تصوف، کلام وغیرہ موضوعات پر کتابیں لکھیں، ان کی دو مستقل تفسیریں موجود ہیں، جن میں سے ایک التفسیر الاشاری ہے۔ یعنی قرآن مجید کی صوفیانہ شرح، یہ بھی مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

امام قشیری کی جامع کمالات شخصیت کا اصل کارنامہ جس نے ان کو زندہ و جاوید بنا دیا اور ان کی دیگر خصوصیات کو صیقل کر دیا وہ ان کا رسالہ ہے، جو الرسالۃ القشیریۃ کے نام سے معروف ہے، یہ رسالہ بلاشبہ تاریخ تصوف میں ایک سنگ میل ہے، اس کتاب نے صوفیاء کو بہت متاثر کیا ہے، یہ کتاب صوفیاء کے یہاں بطور نصابی کتاب کے استعمال کی جاتی رہی ہے اور مختلف صوفیاء نے اس رسالہ کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔

اس رسالہ کی ایک شرح سدید الدین ابو محمد عبدالمعطی بن ابی الثناء الاسکندری نے لکھی ہے، یہ چھٹی صدی ہجری کے عالم ہیں، اس شرح کو ابوالعلاء عفیفی نے ایڈٹ کر کے شائع کرایا ہے۔ دوسری شرح فارسی میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے لکھی، یہ شرح بھی طبع ہو گئی ہے۔ تیسری شرح زین الدین زکریا محمد بن احمد انصاری نے لکھی ہے، اس کا نام ہے 'احکام الدلالۃ علی تحریر الرسالۃ' ہے، اس کی چوتھی شرح ملا علی قاری نے لکھی ہے۔

الرسالہ کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں، اردو میں اس کے دو ترجمے دستیاب ہیں، ایک ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن نے کیا ہے جو ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد سے 1970ء میں شائع ہوا، یہ ترجمہ اچھا ہے لیکن اس کی اصل اہمیت اس کے حواشی ہیں، انہوں نے 200 صفحات پر مشتمل بہت عمدہ حواشی لکھے ہیں، جن میں شخصیات کی سوانح، موضوعات کے مراجع اور مشکلات کی توضیح ہے۔

الرسالہ کا دوسرا ترجمہ مولانا نور محمد نے کیا، یہ ترجمہ سہارنپور سے شائع ہوا ہے اور بلاشبہ یہ الرسالہ کا بہترین ترجمہ ہے اور کتب تصوف کے تراجم کے لئے ایک رہنما کتاب بھی۔

الرسالہ کا انگریزی ترجمہ مارگریٹ اسمتھ نے کیا ہے جو Sufi Path of Love: a Reading from the mystics of Islam کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ایک اور جزوی انگریزی ترجمہ Wilson Hume نے بھی کیا ہے۔

الرسالہ کا جرمن زبان میں ایک ملخص ترجمہ Rochard Hartmann نے Al-Kusehouris Darstellungdas Sufitums (Barlin 1915) کے نام سے کیا گیا ہے۔

الرسالۃ القشیر یہ کی مقبولیت کے پیچھے اصل راز وہ موضوع اور مباحث ہیں جن کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے، یہ کتاب اپنے موضوعات اور اپنی ترتیب کے اعتبار سے بھی منفرد ہے اور اس اعتبار سے دیگر کتب حتیٰ کہ اللمع پر بھی فائق ہے۔

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ شروع میں تصوف کی تعریف بیان کی ہے، پھر توحید سے متعلق صوفیاء کا نقطہ نظر بیان کیا ہے، صفات باری تعالیٰ کا مسئلہ اس دور میں مہمات مسائل میں شمار ہوتا تھا، اس پر بھی گفتگو کی ہے۔

دوسرے باب میں مشائخ طریقت کے احوال بیان کیے ہیں اور جستہ جستہ ان کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ اس ضمن میں ۳۸ مشائخ کے احوال کا بیان ہے۔ اس کے بعد ایک باب میں صوفیاء کے مخصوص افکار کا تذکرہ کیا ہے، جیسے وقت، مقام، حال، قبض، بسط، ہیبت، انس، جمع، فرق، جمع الجمع، فرق ثانی، فنا و بقا، صحو اور سکر وغیرہ۔

احوال و مقامات جیسے توبہ، توکل، قناعت، تواضع یا مجاہدات و ریاضات پر الگ الگ ابواب میں گفتگو کی ہے، یہ تقریباً 73 ابواب ہیں اور کتاب کا اصل حصہ بھی یہی ہے، ان ابواب میں ہر موضوع پر خاصی تفصیلی بحثیں ہیں، جن کے خلاصہ کا یہ موقع نہیں ہے، البتہ موضوعات اس طرح ہیں: توبہ، مجاہدہ، خلوت، تقویٰ، ورع، زہد، خاموشی، خوف، رجاء، حزن، بھوک اور ترک اشتہاء، خشوع و تواضع، نفس کی مخالفت، حسد، غیبت، قناعت، توکل، شکر، یقین، صبر، مراقبہ، رضا، عبودیت، ارادت، اخلاص، استقامت، صدق، حیا، حریت، ذکر، فتوت، فراست، خلق، جود و سخا، غیرت، ولایت، دعا اور فقر وغیرہ۔

اس کے بعد کے ابواب میں لفظ تصوف کی تحقیق، ادب، صوفیا کے احکام سفر، صحبت، توحید، معرفت، محبت، شوق، سماع، کرامتیں، اولیاء اللہ کے خواب اور آخر میں مختلف فصول کے اندر مریدوں اور مبتدیوں کو مفصل ہدایات دی گئی ہیں، یہ آخری حصہ تربیت وغیرہ کے اعتبار سے بہت اہم ہے، اس میں وہ ہدایات موجود ہیں جن کے ذریعہ صوفیاء بالآخر راہ سلوک کو طے کر سکتے ہیں۔

یہ حصہ کتاب کے تقریباً ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں نظری ہدایات کے علاوہ مختلف مشائخ صوفیاء کے واقعات اور ان کے ملفوظات بھی مذکور ہیں۔

الرسالہ القشیر یہ اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے، جو مصنف کی دیدہ وری کا آئینہ دار ہے، اور بلاشبہ تصوف کی نصابی کتابوں میں شامل ہے۔

معلومات کی جانچ

1. کتاب الرعایہ کا مصنف کون ہے؟
2. ابونصر سراج کی کتاب کا کیا نام ہے؟
3. کتاب التصرف کا انگریزی میں مشہور ترجمہ کس کا ہے؟
4. امام قشیری کی پیدائش کہاں ہوئی؟
5. رسالہ قشیریہ میں کتنے مشائخ کا تذکرہ ہے؟

24.7 فوائد الفواد

امیر حسن علا سجزی نے فوائد الفواد مرتب کی، یہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، دراصل ایک مرتبہ امیر حسن سنجری اپنے دوستوں کے ساتھ شغل مے نوشی میں مشغول تھے۔ اتفاق سے حضرت نظام الدین اولیاء کا ادھر سے گذر ہوا، آپ کو دیکھ کر امیر حسن نے ایک شعر پڑھا، جس میں یہ شکایت تھی کہ آپ کی صحبت میں بھی ہم سدھر نہ سکے، حضرت نے مسکرا کر محفل میں آنے کی اجازت دے دی۔ امیر حسن سنجری نے محفل ادب کی اس باریابی کو غنیمت جانا اور زبان مبارک سے ادا ہونے والے لعل و گوہر کو نوک قلم کے ذریعے روئے قرطاس پر ثبت کرنے لگے، مشفق مرشد کو بھی اپنے مرید سے بڑی انسیت تھی، اور حضرت نے خود اپنے عزیز مرید کو اس عظیم کام یعنی سلطان المشائخ کے دربار کی وقائع نویسی کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔

حضرت کے یہ ملفوظات بعد میں فوائد الفواد کے نام سے مرتب ہوئے، ان ملفوظات کی پہلی مجلس 3 رشعبان 707ھ مطابق 28 رجنوری 1308 بروز اتوار شروع ہوتی ہے، اور آخری مجلس 20 رشعبان 722 مطابق 5 رستمبر 1322ء بروز اتوار لکھی گئی، یعنی کم وبیش 25 سال تک اس کتاب کی تسوید کا کام ہوتا رہا، اس کتاب میں 188 مجلسوں کے ملفوظات ہیں، بعض بہت طویل ہیں اور بعض مختصر ہیں، مجلسوں کی تسوید کے درمیان زمانی فاصلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دوران امیر حسن سجزی کو بار بار دہلی سے باہر جانا پڑا اور یہ غیر حاضری کبھی کبھی کئی کئی ماہ طویل ہوگئی، تاہم عام طور پر ہر جمعہ کو یہ مجلس ہوتی تھی اور اس کے ملفوظات امیر حسن سجزی لکھ لیا کرتے تھے۔ یہ ملفوظات موجودہ کتاب کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے لیکن خود مصنف نے تکرار وغیرہ کو حذف کر کے زیر نظر مجموعہ تیار کیا اور باقی مسودات کو قبرستان میں لے جا کر دفن کر دیا۔

مضامین اس طرح بیان کئے ہیں کہ اس کتاب میں درج ذیل موضوعات و مضامین پر حضرت کی گفتگو ملتی ہے: تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، تاریخ، سیرت، سیر الاولیاء، ملفوظات مشائخ، تصوف، اعمال، عبادات اوراد، آداب المریدین، آداب صوفیہ، تزکیہ نفس، اخلاقیات، اصطلاحات صوفیہ، فلسفہ، منطق، آداب معاشرت، تعبیر رویاء، حکایات مشائخ، اصول عقائد، ادب وشعر، سماع، لغت، وعظ وتذکیر، تمثیلات، لطائف، فوائد الفواد میں ان موضوعات کے علاوہ بھی بہت کچھ زیر بحث ہے، لیکن اس کتاب کا محوری موضوع بہرحال تصوف ہے اور دیگر موضوعات ضمناً زیر بحث آئے ہیں۔

پہلی مجلس میں توبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تائب متقی کے برابر ہوتا ہے کیونکہ متقی تو وہ ہوتا ہے کہ مثلاً اس نے ساری عمر کبھی شراب نہ چکھی، یا اور کوئی گناہ نہیں کیا اور تائب وہ ہوتا ہے کہ گناہ کیا پھر توبہ کر لی۔ اس کے بعد فرمایا کہ دونوں اس حدیث کے مطابق برابر ہیں کہ 'التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ (گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں)۔ یہ تشریح بھی اس ضمن میں فرمائی کہ جس نے گناہ کیا اور گناہ سے خوب ذوق پایا، جب وہ توبہ کرتا ہے اور طاعت کرتا ہے تو اس طاعت میں بھی خوب ذوق پاتا ہے اور عین ممکن ہے کہ اس راحت کا ایک ذرہ جو اسے طاعت سے حاصل ہوا وہ ذرہ گناہوں کے خرمن جلا ڈالے۔

ولایت اور نبوت میں افضلیت کی بحث صوفیہ کے درمیان رہی ہے، بعض لوگوں نے ولایت کو افضل قرار دیا، حضرت نظام الدین اولیاء نے لکھا ہے کہ یہ عقیدہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ فرمایا کہ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ کہ اولیاء انبیاء پر فضیلت رکھتے ہیں کیونکہ انبیاء کا اکثر وقت مخلوق کے ساتھ مشغولیت میں گزرتا ہے، یہ باطل ہے، کیونکہ انبیاء اگرچہ مخلوق کے ساتھ مشغول رہتے ہیں، لیکن جس وقت حق کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں وہ ایک وقت اولیاء کے سارے اوقات پر شرف رکھتا ہے۔ انبیاء اور اولیاء کی عصمت کے بارے میں ارشاد ہوا کہ انبیاء معصوم ہیں وار فقراء کے نزدیک اولیاء بھی معصوم ہیں؛ لیکن انبیاء واجب العصمت ہیں اور اولیاء جائز العصمت ہیں۔

اظہار اسلام کے سلسلے میں آپ سے دریافت کیا گیا کہ جو ہندو کلمہ پڑھے اور اللہ تعالیٰ کو ایک جانے اور پیغمبر خدا کی رسالت کا قائل ہو؛ لیکن جب مسلمان آئیں تو چپ ہو جائے اس کا انجام کیا ہوگا؟ خواجہ نے فرمایا کہ اس کا معاملہ حق سے ہے، خواہ اسے بخشے، خواہ عذاب دے۔

سماع کے سلسلے میں فرمایا کہ جب چند چیزیں ہوں تو سماع سنا جاتا ہے اور وہ چند چیزیں یہ ہیں، مسمع، مسموع، مستمع اور آلہ سماع، پھر تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مُسمع گانے والا ہے، وہ عمر رسیدہ مرد ہونا چاہیے۔ نہ بچہ ہو نہ عورت، مسموع یہ ہے کہ جو کچھ گایا جائے وہ گندہ اور فحش نہ ہو، مستمع یہ کہ جو کچھ سنا جائے وہ حق کے لیے سنا جائے اور یادِ حق سے مملو ہو، اور آلہ سماع ومزامیر ہیں جیسے چنگ ورباب۔ اس طرح کی چیزیں درمیان میں نہیں ہونی چاہییں، ایسا سماع حلال ہے پھر فرمایا کہ سماع ایک موزوں آواز ہے وہ حرام کیسے ہو سکتی ہے، اور جو کچھ گایا جاتا ہے وہ معنی ومفہوم رکھنے والا کلام ہے، وہ کیونکر حرام ہوگا؟ دیگر یہ کہ سماع تحریک قالب ہے، اگر یہ تحریک یادِ حق میں ہو تو مستحب ہے اور فساد کی طرف مائل ہو تو حرام ہے۔

24.8 قوت القلوب

ابو طالب مکی کا پورا نام ابو طالب محمد بن علی بن عطیۃ الحارثی المکی ہے۔آپ کی وفات 386ھ میں ہوئی۔آپ اپنے وقت کے بڑے عالم فاضل تھے خاص طور پر تصوف اور علم کلام کے امام تھے، حدیث پر بھی بڑی وسیع نظر تھی، آپ کی معرکہ آراء تصنیف ''قوت القلوب'' کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب قدیم زمانے سے ہی تصوف کی امہات کتب میں شمار ہوتی ہے، امام غزالی کی شہرہ آفاق کتاب احیاء العلوم کا ایک بنیادی مرجع ابو طالب مکی کی یہی کتاب قوت القلوب ہے۔اس کتاب کا پورا نام ''قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب و وصف طریق المرید الی مقام التوحید'' ہے۔

قوت القلوب کو ابو طالب مکی نے 48 فصلوں میں تقسیم کیا ہے اور دو فصلوں میں اسلامی زندگی سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی، وہ اپنی کتاب قرآن مجید، احادیث شریفہ، آثار صحابہ اور بعد کے لوگوں کے اقوال کو بکثرت نقل کرتے ہیں، حضرت حسن بصری کی روایات بھی کثرت سے ذکر کی ہیں، ان کے علاوہ دیگر صوفیہ جیسے حارث محاسبی، سری سقطی ذوالنون مصری اور دیگر اجلہ صوفیہ کے اقوال بھی بیان کرتے ہیں۔

ابو طالب مکی نے قوت القلوب میں بتایا ہے کہ ذکر کی مجلس اہم ترین مجالس میں سے ہے یہ قصہ گوئی یا واقعات بیان کرنے کی مجلس نہیں ہوتی؛ بلکہ اللہ کے ذکر کی مجلس ہوتی ہے، قصوں کے ذریعہ یہ بدعات وخرافات پھیلتی ہیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قصہ گوئی کی مجلسیں منعقد نہیں ہوتی تھیں۔اور انہوں نے صحابہ کرام خاص طور پر حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عمر اور تابعین جیسے حضرت حسن بصری وغیرہ کے واقعات نقل کئے ہیں کہ انہوں نے کس طرح قصہ گوئی کو ناپسند فرمایا، اور اگر مسجد میں کوئی قصہ بیان کرر ہا ہوتا تو وہ اس کو مسجد سے نکال دیا کرتے تھے۔

ابو طالب مکی نے خود بھی قصہ گوئی کا التزام نہیں کیا ہے، ضمناً کچھ واقعات بیان کئے ہیں، اور زیادہ تر واقعات بنی اسرائیل کی روایات سے لئے ہیں، چند قصے حضرت عیسی علیہ السلام کے بیان کئے ہیں۔

ابو طالب مکی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ علماء آخرت صوفیہ کرام ہیں وہی سنت کے متبع اور دین پر عمل کرنے والے ہیں، اور اس کی وضاحت کی ہے کہ صوفی کو صاحب حدیث صوفی ہونا چاہئے، یعنی صوفی کو پہلے محدث ہونا چاہیے۔اس سلسلہ میں انہوں نے معروف کرخیؒ کی شخصیت کو بطور مثال پیش کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل اور یحیی بن سعید جیسے جلیل القدر محدث بھی ان سے احادیث دریافت کیا کرتے تھے۔ابو طالب مکی نے اپنی کتاب میں مسلم علماء کی کتابوں کی تاریخ بھی بیان کی ہے، ان کے مطابق اسلام میں پہلی کتاب ابن جریج کی آثار ہے، پھر مجاہد، عطا اور ابن عباس کی تفسیری روایات، پھر معمر بن راشد کی جامع، امام مالک کی موطا، ابن عیینہ کی جامع وغیرہ کتابیں ہیں۔

قوت القلوب کی اہمیت کے پیش نظر بہت سے علماء نے اس کی تلخیص بھی کی ہے، ان میں محمد بن خلف بن سعید اندلسی اور حسین بن معن کی بہت مشہور ہیں۔

قوت القوب سے ایک اقتباس حسب ذیل ہے:

نقصان کا سبب غفلت ہے اور غفلت آفات نفس سے پیدا ہوتی ہے، نفس کی طبیعت میں حرکت ہے، جب کہ اس کو سکون کا حکم دیا گیا ہے، اس میں اس کا امتحان ہے تاکہ نفس مولی کی طرف متوجہ رہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ "تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو،تم اللہ تعالی سے دعا کرو کہ وہ تم کو دین اسلام پر موت دے۔ اور انسان کے جلد باز ہونے کی بات بھی قرآن میں کہی گئی اور اللہ تعالی کا حکم اتنا قریب ہے کہ اس کے لیے جلد بازی کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اللہ تعالی نے امتحان کے لئے جلد بازی ترک کرنے اور صبر وثبات اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اگر سکینہ نازل ہوتو اس سے ایمان کی کیفیات زیادہ ہوتی ہیں اور نفس بحکم الہی حالت سکون میں آجاتا ہے۔

24.9 کشف المحجوب

کشف المحجوب کے مصنف علی بن عثمان الہجویری الجلابی ہیں، اصل وطن غزنین تھا، غزنین کے دو محلے ہجویر اور جلاب ہیں، ان کی طرف ہی ان کی نسبت ہے، عرف عام میں حضرت داتا گنج بخش کے نام سے معروف ہیں، علامہ اقبال نے بھی ان کو گنج بخش، فیض عالم اور مظہر نور خدا کہا ہے، اپنے وقت کے بڑے جلیل القدر صوفی تھے، علم اور عمل کے جامع تھے، ان کی تصنیف کشف المحجوب کئی اعتبار سے اہم ترین کتاب ہے، ایک تو یہ کہ فارسی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب ہے، اس سے قبل تصوف کے موضوع پر تصنیفی کام صرف عربی زبان میں ہوتا تھا اور اس وجہ سے اس کا دائرہ اثر بھی ان علاقوں تک محدود تھا جو عربی زبان بولنے والے علاقے تھے، کشف المحجوب نے اس دائرہ اثر کو یکدم دو چند کر دیا اور عجم کے علاقے میں بھی تصوف پھیل گیا۔

کشف المحجوب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر لکھی جانے والی یہ تصوف کی پہلی کتاب ہے، اس سے قبل ہندوستان میں تصوف پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی اور برصغیر میں اس کتاب کو بڑی قبولیت بھی حاصل ہوئی، برنی نے لکھا ہے کہ اکابر علماء لگاتار اس کتاب کا مطالعہ کرتے رہتے تھے، حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا ہے کہ کشف المحجوب ایسی بابرکت کتاب ہے کہ اگر کسی کے پاس پیر کامل نہ ہوتو اس کے مطالعہ کی برکت سے اس کا پیر کامل نصیب ہو جائے گا۔

کشف المحجوب میں بھی اس دور کے عام رواج کے مطابق تصوف کے اور صوفیہ سے متعلق جملہ پہلوؤں کو شامل کیا ہے، وہ خود حضرت امام قشیری کے شاگرد تھے اور اپنی تصنیف میں الرسالۃ القشیریۃ کے انداز اور اسلوب سے پوری طرح متاثر نظر آتے ہیں، انہوں نے اپنی کتاب کو تیس ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب ایک جامع کتاب کی طرح ہے، پہلا باب اثبات علم ہے، اس میں علم کی اقسام اور ان کے احکام کا بیان ہے، دوسرا باب اثبات فقر میں ہے، اس میں فقر کا مقام و مرتبہ اور اس کی خوبیاں بیان کی ہیں اس کے بعد تصوف اور صوفی پر تحقیقی بحث کی ہے، اور تصوف کی تعریفات اور انسانی زندگی میں اس کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔

پانچواں باب فقر وصفوت سے متعلق ہے، چھٹے باب میں تصوف کا ایک اہم ترین سلسلہ یعنی ملامت کا بیان ہے، دراصل صوفیہ میں ایک گروہ ہے جو ملامتیہ کہلاتا ہے، اس باب میں اس کا بیان ہے اور صوفیہ پر جو لوگ لعنت ملامت کرتے ہیں، ان کی حقیقت بیان فرمائی ہے۔

اس کے بعد اس کتاب میں تاریخی ابواب کا آغاز ہوتا ہے، پہلے صحابہ کرام کے حالات ہیں، پھر اہل بیت، اس کے بعد اصحاب صفہ، پھر ائمہ تابعین اور تبع تابعین کے حالات لکھے ہیں، پھر صوفیہ کرام اور مشائخ تصوف کے حالات بیان کیے ہیں۔

شیخ علی ہجویری نے ایک زبردست کام یہ کیا ہے جو اس عہد کی دوسری کتابوں میں نہیں کہ انہوں نے تصوف کے سلاسل کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ اس وقت تک معروف معنوں میں تصوف کے سلاسل قائم نہیں ہوئے تھے بلکہ صوفیہ کرام اپنے مشائخ کی طرف نسبت کرلیا کرتے تھے، یہ تصوف کے سلسلوں کا آغاز تھا، داتا صاحب نے ان کی بھی تاریخ لکھی ہے۔

چنانچہ محاسبیہ، قصاریہ، طیفوریہ، جنیدیہ، نوریہ وغیرہ مختلف فرقے اور گروہ اور مکاتب کی تاریخ لکھی ہے، آگے تصوف کی عملی چیزیں توبہ اور اس کے متعلقات، محبت اور اس کے متعلقات، جود وسخا، بھوک و پیاس اور ضبط نفس کے احکام، مشاہدہ، صحبت اور اس کے متعلق مباحث، صحبت کے آداب، صحبت کی مختلف اقسام اور ان کے آداب، کھانے کے آداب، چلنے پھرنے کے آداب، سفر وحضر کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، چپ رہنے کے آداب اور بولنے کے آداب، سوال کے آداب اور ترک سوال کے آداب، نکاح اور تجرد کے آداب بیان کیے ہیں۔

24.10 الاربعین فی التصوف

الاربعین فی التصوف امام غزالی کی معرکہ آراء تصنیف ہے، امام غزالی پانچویں صدی کے مجدد، اعلی درجہ کے متکلم، فقیہ اور صوفی تھے، آپ طوس کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعہ بہت جلد امام الحرمین جوینی کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے، اور ابھی آپ کی تعلیم مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ آپ کی علمیت کا شہرہ ہوگیا، آپ کے فضل وکمال کے ذریعہ اللہ تعالی نے آپ کی رسائی نصیر الدین طوسی کے دربار تک کرائی، وہ خود بھی بڑے عالم فاضل تھے، اور فلسفہ واخلاق پر بڑی مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، انہوں نے امام غزالی کے جوہر قابل کو پہچان لیا اور ان کو مدرسہ نظامیہ میں تدریس کی ذمہ داری عطا فرمائی، امام غزالی نے چند سال ہی درس دیا؛ لیکن اس قلیل عرصہ میں آپ کے گرد شاگردوں کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی اور ساتھ ہی تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا، اس دوران امام غزالی نے فقہ شافعی کے کئی اہم متون تصنیف فرمائے، علم کلام، اصول فقہ اور فقہ پر آپ کی کتابوں نے ایک عالم کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، اس کے ساتھ فلسفہ پر آپ کی تنقید نے اس وقت کے فلاسفہ کو بھی حیرت زدہ کردیا، آپ کی کتابیں، مقاصد الفلاسفہ، معیار العلم اور تہافتہ الفلاسفہ فلسفہ اور علم کے متعلقات میں آج بھی توجہ اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔

امام غزالی کو اس دنیاوی جاہ وجلال اور شان وشوکت میں ایک عرصہ سے زیادہ اطمینان نہیں ملا اور حقیقت کی تلاش میں سفر پر نکل کھڑے ہوئے، اثنائے سیاحت طویل مجاہدات کیے، اس سفر میں احیاء علوم الدین جیسی معرکہ آراء کتاب تصنیف کی، اور سفر کے خاتمہ پر ایک مختصر رسالہ المنقذ من الضلال کے نام سے لکھا جو ایک طرح سے ان کے ذہنی سفر کی روداد ہے۔

امام غزالی گوناگوں خوبیوں کے مالک ہیں، مختلف علوم میں وہ درجہ امامت پر فائز ہیں، خاص تصوف میں بھی ان کی شان نرالی ہے، احیاء العلوم بھی تصوف کی کتاب ہے، اس کے علاوہ انہوں نے جواہر القرآن، القصور العوالی وغیرہ رسائل میں تصوف کے مباحث پر کلام کیا ہے۔

الاربعین فی التصوف ان کی خاص تصوف کے موضوع پر ایک تصنیف ہے اس کتاب میں انہوں نے تصوف کی چالیس بنیادوں کو عنوان بنا کر ان پر گفتگو کی ہے، اس کتاب کے مباحث کے عنوانات اس طرح ہیں، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، تلاوت قرآن، ذکر الٰہی، کسب حلال، حقوق العباد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اتباع سنت، طہارت قلب، مذموم صفات جیسے زیادہ کھانا، حرص طعام، کثرت کلام، زیادتی غضب، حسد، بخل، حب دنیا، حب جاہ، رعونت، نخوت، تکبر، خود پسندی، ریاء کاری، وغیرہ پر شرح وبسط کے ساتھ کلام کیا ہے اور ان کے علاج تجویز کئے ہیں۔ اس کے ساتھ اخلاق حسنہ جیسے توبہ، انابت، خوف، زہد، صبر، شکر، اخلاص و صدق نیت، توکل اور فکر آخرت وغیرہ کے عنوانات پر بھی گفتگو کی ہے۔

امام غزالی نے اس کتاب میں ایک نکتہ یہ لکھا ہے کہ اعمال وعبادات اور حقوق العباد کی ادائیگی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بندہ اپنے اوقات کو تقسیم کرلے اور پھر اس تقسیم کی پابندی کرے، مثلاً عبادات کے لئے جو وقت مخصوص کیا تھا اس میں عبادت کرے، جو وقت سماجی خدمت کے لئے مختص کیا تھا اس میں سماجی خدمت کرے، اس طرح انسان کو توازن کے ساتھ تمام اعمال کی انجام دہی کا موقع ملے گا۔

24.11 فتوح الغیب

حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نام نامی واسم گرامی کسی کے لئے محتاج تعارف نہیں، تصوف کے ارتقاء کے دور آخر میں آپ نے جس طرح تصوف کی آبیاری کی اور اس کو مشرق ومغرب میں مقبول بنایا اس کی مثال نہیں ملتی، مولانا عبدالماجد دریابادی نے حضرت کا ذکر شروع کیا تو قلم استدلال کی زبان بھول گیا اور لکھنے لگا کہ صحیفہ زندگی کی ایک ایک سطر احکام شرعیہ کے مطابق تھی، مکتوبات ومواعظ کا ایک ایک لفظ آیات کلام مجید سے مستنبط، تعلیمات میں سب سے زیادہ زور اتباع شریعت پر، آخری وصیت بھی آپ کی یہی تھی کہ زندگی اللہ کے تقوی کے زیر سایہ گذاری جائے۔ حضرت نے ساری زندگی درس وتدریس اور وعظ وتذکیر میں بسر کی، آپ نے چند کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جن میں غنیۃ الطالبین، الفتح الربانی اور فتوح الغیب بہت مشہور ہیں۔

فتوح الغیب اگرچہ بہت مقبول کتاب رہی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس کتاب کے کچھ حصوں کی شرح بھی لکھی ہے، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر عہد وسطی میں اس کتاب کو وہ مقام نہیں ملا جو اس کے شایان شان تھا، اس کتاب کو دوبارہ منصۂ شہود پر لانے کی سعادت بھی قسام ازل نے ایک ہندوستانی عالم عبدالحق محدث دہلوی کے نام لکھی تھی، حضرت شیخ حج کرنے گئے تو فتوح الغیب کا نسخہ اپنے ہمراہ لے کر آئے اور یہاں دستیاب نسخوں کی مدد سے اس کا فارسی ترجمہ کیا اور شائع کرایا، اس طرح اس نادر کتاب کو علمی حلقوں میں دوبارہ قبول عام حاصل ہوا۔

فتوح الغیب ایک مختصر سی کتاب ہے لیکن اس میں شریعت وحقیقت کے تمام رموز وغوامض کھول کر رکھ دیئے ہیں، حضرت نے اس کتاب کو 78 ابواب میں تقسیم فرمایا، ہر باب جس کو اس کتاب میں مقالہ کا عنوان دیا گیا ہے، مستقل بالذات ہے اور اس میں کسی ایک پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، مثلاً پہلا باب تعمیل اوامر، اجتناب نواہی اور رضا بالقضاء پر ہے، یعنی شریعت کی بنیادی چیز اللہ کے احکام کو بجالانا، اس کی حرام کردہ چیزوں سے رکنا اور تقدیر الٰہی پر رضا مند رہنا، گویا اس بنیادی مسئلہ سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ دوسرا باب اتباع سنت اور ترک بدعت پر ہے، تیسرا باب ابتلاء ومصائب پر صبر کا راستہ اختیار کرنے پر ہے، چوتھا مقالہ موت

اور اس کے مراتب، پانچواں مقالہ دنیا کی مثال اور دنیا میں وابستہ لوگوں کے حال پر ہے، ساتواں مقالہ، مخلوق سے مستغنی ہونے پر ہے، اس کا آٹھواں مقالہ خالص تصوف کی انتہائیات یعنی کشف و مشاہدہ پر ہے، اس طرح مختلف ابواب یا مقالات کے تحت شریعت کے اعمال اور تصوف اور راہ سلوک کے مسائل کا بیان ہے، مثلاً ایک مقالہ توکل پر ہے، ایک قناعت کے بیان میں ہے، ایک میں رضاء کا بیان ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اس کتاب میں دینی ترجیحات کو بھی ملحوظ رکھنے کی بات کہی ہے، یعنی سالک کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دین کی ترجیحات میں اپنی طرف سے کوئی حذف و اضافہ نہ کرے، مثلاً ایک مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے کہ: اس آدمی کی حماقت کے بیان میں کہ اس کے ذمہ فرض باقی ہے اور وہ نوافل کا اہتمام کر رہا ہے۔

اس طرح ایک مقالہ زہد کے بارے میں ہے آخری مقالات میں اپنے صاحبزادگان کو وصیتیں کی ہیں اور ایک مقالے میں ارباب محاسبہ و مجاہدہ کے حقائق کا بیان ہے۔

اس طرح یہ کتاب شریعت و طریقت کے تمام پہلوؤں کے سلسلہ میں رہنمائی کرتی ہے، اور سالکین کو خصوصی طور پر اس کتاب کا مطالعہ اور اس پر عمل ضروری ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے عام طور پر قرآن و حدیث کے حوالے دیئے ہیں، دیگر اجلہ صوفیہ کے افکار سے استفادہ تو کیا ہے، لیکن ان کے حوالے بالعموم نہیں ہیں، اس کی وجہ اس عہد کا اسلوب ہے، خاص طور پر حضرت جنید بغدادی کے افکار کی صدائے بازگشت پوری کتاب میں کئی جگہ سنائی دیتی ہے، مثلاً تصوف کے بارے میں حضرت نے لکھا ہے کہ ہم نے تصوف قیل و قال سے نہیں سیکھا، بلکہ بھوک پیاس اور مرغوبات کے ترک سے سیکھا، یہ حضرت جنید بغدادی کا مقولہ ہے۔

فتوح الغیب میں مختصر جملوں میں ایسے نادر نکات بیان ہوتے ہیں کہ ان کی شرح میں پوری کتاب درکار ہے، مثلاً فقر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے نہایت حکیمانہ جملہ استعمال فرمایا: فقر کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی جیسی کسی ہستی کا محتاج نہ رہ۔ اس طرح کے خوبصورت اور جامع جملوں سے پوری کتاب لبریز ہے۔

24.12 عوارف المعارف

ابوحفص شہاب الدین عمر بن محمد البکری سہروردی بڑے جلیل القدر صوفی تھے، ان کا لقب شیخ الشیوخ ہے، آپ ابونجیب سہروردی کے بھتیجے تھے، ابونجیب سہروردی، سلسلہ سہروردیہ کے اصل بانی ہیں؛ لیکن اس سلسلہ کو شہرت کے بام عروج تک ابوحفص شہاب الدین نے ہی پہنچایا تھا۔ حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے قریبی مراسم تھے؛ بلکہ حضرت غوث پاک نے ایک قصیدہ میں ان کی بڑی تعریف کی ہے اور خود حضرت نے بھی حضرت غوث پاک کی سیرت و مناقب میں ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی۔

شہاب الدین سہروردی کی سب سے مشہور کتاب عوارف المعارف ہے، عوارف المعارف دور آخر میں لکھی جانے والی تصوف کی سب سے اہم اور جامع کتاب ہے، اس کتاب کا ایک امتیاز یہ ہے کہ صوفیہ کی بعض کتابوں میں تصوف کے حوالے سے نسبتاً

کمزوری آ گئی ہے؛لیکن عوارف المعارف میں بالعموم صحیح احادیث سے استدلال ہے اور اگر کہیں کمزور روایات لی ہیں تو ان پر تحکیم کردی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب صوفیہ کے تمام حلقوں میں یکساں مقبول رہی ہے، سلسلہ سہروردیہ کے علاوہ سلسلہ چشتیہ کی بھی بنیادی کتاب یہی ہے۔

شہاب الدین سہروردی نے اس کتاب کو دو جلدوں میں مرتب فرمایا ہے، جلد اول میں 32 ابواب ہیں، اور جلد دوم میں 21 ابواب ہیں اس طرح کتاب میں کل 23 ابواب ہیں۔

حضرت نے اس کتاب کو بنیادی طور پر جاہل صوفیہ اور ڈھونگی پیروں سے تصوف کو ممتاز کرنے کے لئے لکھا تھا، لوگوں نے تصوف کے نام پر دکانداری شروع کرر کھی تھی، عوام کو غیر شرعی رسم ورواج میں جکڑ رکھا تھا، حضرت کا اصل منشا یہ تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ حقیقی تصوف کیا ہے؟ اور اس چشمہ صافی میں لوگوں نے جو کدورت ملادی ہے اس کو دور کیا جائے۔

چنانچہ کتاب کا آغاز ہی ان جملوں سے ہوتا ہے کہ گروہ صوفیہ میں انحطاط پیدا ہو چلا ہے، ان کے اعمال فاسد ہوتے جارہے ہیں، ان کے نقال بہت سے پیدا ہو گئے ہیں، اتباع کتاب وسنت ہاتھ سے چھوٹ رہی ہے اور مخلوق تصوف کی حقیقت سے بدگمانی ہو چلی ہے گویا انہوں نے بدگمانی اور بے عملی کی اس روش پر تنقید کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی؛لیکن کتاب پورے طور پر مثبت انداز میں لکھی گئی ہے، اس میں تنقیدی پہلو غالب نہیں ہے، گویا یہ آئینہ ہے جس میں اہل تصوف اپنے آپ کو دیکھ لیں۔

مقدمہ کے بعد کتاب کے ابواب کا بیان ہے، اس کے بعد حضرت جنید بغدادی کا ایک قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ ہمارے اس علم کی بساط سالہا سال قبل ہی لپیٹ دی گئی تھی، اور ہم تو اب اس کے صرف حاشیہ پر گفتگو کر رہے ہیں، اس کے بعد خود لکھا ہے کہ حضرت جنیدؒ نے یہ بات اس وقت فرمائی تھی جب سلف صالحین اور تابعین عظام کا زمانہ قریب تھا، اب جبکہ اس قدر زمانہ گذر چکا ہے تو علماء زاہدین اور عارفین حقائق کم ہو گئے ہیں تو بھلا انحطاط کا کیا عالم ہوگا۔

کتاب کے ابواب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے علم تصوف کی ابتدائی تاریخ بیان کی ہے اس کے بعد صوفیہ کا حدیث شریف سے اشتغال اور اس کی برکات اس کے بعد علم تصوف کی فضیلت، صوفیہ کے احوال اور ان کے باہم اختلاف طرق، تصوف کی مہارت، تصوف کی وجہ تسمیہ وغیرہ کا بیان کرنے کے بعد ملامتی، مصنوعی اور جھوٹے مدعیان تصوف کی قلعی کھولی ہے، شیخ کے مقام و مرتبہ، مریدین اور خرقہ مشائخ کا بیان ہے پھر تین ابواب میں اہل صفہ کے ساتھ اصحاب تصوف کی مناسبت پر گفتگو کی ہے، اس کے بعد تین ابواب میں صوفیہ کے قیام وسفر وغیرہ کے آداب پر کلام کیا ہے اور آگے صوفیہ کے توکل اور کسب کا بیان ہے۔

ایک باب میں تجرد اور نکاح کا بیان ہے، اس کے بعد چار ابواب میں صوفیہ کے سماع کی بحث ہے، آگے تین ابواب میں چلے کشی پر گفتگو ہے، ایک باب اخلاق صوفیہ کے بیان میں ہے، یہ پہلی جلد کے ابواب ہیں ان میں ساری گفتگو تصوف اور صوفیہ سے متعلق ہے، اس کے بعد دوسری جلد شروع ہوتی ہے، اس میں شرعی امور طہارت، وضو، نماز، آداب لباس، فضائل شب بیداری جیسے موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے ساتھ ہی کچھ ابواب تصوف کے احوال ومقامات اور راہ سلوک کی منازل کے بیان میں بھی ہیں۔

عوارف المعارف شریعت اور طریقت کے اسرار و معارف اور علوم و افکار کا ایک نادر گنجینہ ہے؛ اس لئے یہ ہر زمانے میں صوفیہ اور علماء کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔

24.13 فتوحات مکیہ

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا اصل نام محمد بن علی الطائی ہے، آپ کی ولادت 17 رمضان المبارک 560ھ جون 1160 کو اندلس کے شہر مرسیہ میں ہوئی، آپ کا تعلق قبیلہ طے سے تھا، اس لئے الطائی کہلاتے تھے، آپ کی ولادت کے حوالے سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بشارت دی تھی اور ولادت پر آپ کے لئے دعا فرمائی، اسی برس کی عمر میں آپ کا وصال 28 ربیع الاول 638ھ/16 نومبر 1240ء کو ہوا، تصوف کی تاریخ میں آپ کے بارے میں عقیدت مندوں اور حاسدوں نے غلو اور تنقیص سے کام لیا، مگر حضرت مجدد الف ثانی کا آپ کے علوم کے ساتھ انتہائی معتدل اور متوازن رویہ ہے۔

فتوحات مکیہ آپ کی معرکہ آراء تصنیف ہے، مشرق و مغرب میں اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اور فلسفہ وحدۃ الوجود جو تصوف پر ایک امتیازی وصف بنا رہا اور آج بھی بڑی حد تک ہے اس فلسفہ کے بنیادی خدوخال اور اس کی تشکیل دراصل ابن عربی نے ہی کی تھی، اور سب سے پہلے اس نظریہ کو اپنی کتاب فتوحات مکیہ میں ہی بیان کیا تھا، بعد میں اس فلسفہ کو مزید آسان انداز میں دوسری کتابوں جیسے فصوص الحکم اور الکبریت الاحمر میں بیان کیا ہے۔ فتوحات مکیہ اسلامی علوم کا ایک دائرۃ المعارف ہے، اس کتاب میں ابن عربی نے صوفی تجربات و مکاشفات کی روشنی میں اسلامی عقائد و اعمال کی تاویل کے عمل کو اور آگے بڑھایا ہے اور اپنی ضخیم کتاب فتوحات مکیہ میں نہایت تفصیل سے یہ کام کیا۔ اس میں انہوں نے تمام اسلامی عقائد و اعمال کی تشریح اپنے فلسفہ وحدۃ الوجود کی روشنی میں کی ہے، ساتھ ہی ان چیزوں کی ایسی تشریح کی ہے جو عام مسلمانوں کے عقائد و روایات کے مطابق ہو۔ چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں 560 ابواب ہیں اور ان ابواب میں معارف، معاملات احوال، منازل، منازلات اور مقامات کی ظاہری و باطنی جہتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا اسلوب اور زبان و بیان ادب کی چاشنی سے بھرپور ہے کہ قاری کو اپنے سحر انگیز ہالے میں اس طرح قید کر لیتی ہے کہ قاری وہی پڑھتا ہے جو وہ کتاب پڑھوانا چاہتی ہے، اور وہی سوچتا ہے جو مصنف کتاب کا منشا ہوتا ہے، اس کا ایک نمونہ مصنف کی قائم کردہ فہرست مضامین سے ہوتا ہے، مثلاً مصنف نے بالکل ابتدائی ابواب کے عنوانات اس طرح مقرر کئے ہیں، الفصل الاول فی معرفة الحامل القائم باللسان المغربی دوسری فصل ہے: فی معرفة الحامل المجحول الازم باللسان المشرقی، تیسری فصل ہے: الابداع و الترکیب باللسان الشامی، چوتھی فصل: فی معرفة التخلیص و الترتیب باللسان الیمنی ہے اور ان چار مختصر فصلوں میں انہوں نے فلسفہ اور روحانیت کے چار اسکولوں کی وضاحت کی ہے۔ انداز بیان ایسا بدیع اور نادر ہے کہ قاری اس میں پوری طرح بہہ جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا فتوحات مکیہ ایک دائرۃ المعارف ہے، اس میں تقریباً 3 ہزار صفحات پر مشتمل اسلامی علوم کا مکمل خزینہ موجود ہے، ہمارے پیش نظر عربی نسخہ میں تقریباً 50 صفحات پر ان مضامین کی فہرست ہے جو اس کتاب میں زیر بحث آئے ہیں۔

چند ابواب کے عناوین ذکر کیے جاتے ہیں، جس سے کتاب کے اسلوب و منہاج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، پہلی جلد کے جزء رابع سے اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے، اس میں پہلا باب ''فی معرفۃ الروح '' ہے، صوفیہ کرام کی نظر میں اصل اہمیت روح کی ہے، جسم تو ایک کالبد خاکی ہے جو وقت کے ساتھ مٹی ہو جائے گا، اس لئے ابن عربی نے سب سے پہلے روح پر گفتگو کی اور چونکہ ان کے نزدیک روح اللہ رب العالمین سے وابستہ ہے، اور خدا اور روح کے درمیان جو واسطہ ہے وہ علم واسطہ ہے، اس لئے روح کے بعد حرف وصوت، حرکات، علم، عالم اور معلوم کی حقیقت ان کے مراتب اور پھر اسماء الٰہیہ کا بیان ہے، حروف دراصل صوت کی تصویریں ہیں، آواز کو حروف کے مادی پیکر میں قید کیا جاتا ہے، اس مادی پیکر یعنی حروف کی آواز یا صوت کے ساتھ مناسبت ضروری ہے، ابن عربی نے اس مناسبت کو بڑی خوبی کے ساتھ ہر حرف، اس کی شکل، اس کے منقوط اور غیر منقوط ہونے کی اہمیت، منقوط میں نقطوں کی تعداد وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور ان حروف کی صورت میں جو علم وحکمت اور دانائی اور معرفت وحقائق قید ہوئے ہیں اس کا بیان ہے۔ خدا کی معرفت، زمان ومکان، اولین وآخرین کا علم، آباء واجداد اور امہات وجدات کا علم، انبیاء وصلحاء کا علم، اور اس کے ساتھ ولایت، معرفت اور اسرار نفس پر گفتگو کی ہے۔

اوپر صرف ایک مثال دی گئی اس طرح ابن عربی نے مختلف علوم پر تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ کلام کیا ہے جیسے قربی صحت، خلافت وغیرہ۔

24.14 مثنوی معنوی

مولانا جلال الدین رومی تاریخ تصوف کے ایک درشاہوار ہیں، مولانا اصلا تو بلخ کے رہنے والے تھے؛ لیکن فتنہ چنگیزی میں والد ہجرت کر کے قونیہ چلے گئے، مولانا کی نشو ونما قونیہ میں ہوئی اور ایک بڑے عالم اور متقی کی حیثیت سے مولانا کا مقام سب کے نزدیک قابل تسلیم تھا۔ اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ میں درس دیتے اور فتوی نویسی کرتے تھے؛ لیکن مولانا کی طبیعت اور مزاج میں ایک اور ہی جوہر مخفی تھا، ضرورت تھی کہ کوئی صاحب دل اس چنگاری کو بطون قلب کی گہرائیوں سے نکال کر زبان اعمال کا حصہ بنادے اور آخر ایسا موقع آ گیا، شمس تبریزی جن کے بارے میں تاریخ خاموش ہے نہ معلوم کہاں سے نکل کر آئے اور مولانا کے قلب وجگر میں وہ آتش عالم فروز روشن کر گئے جس کی روشنی آج بھی تاریک راہوں کے مسافروں کی رہنمائی کرتی ہے۔

مولانا جلال الدین رومی نے تین کتابیں تصنیف کیں، ایک ان کا دیوان ہے جو دیوان شمس تبریزی کے نام سے معروف ہے، ایک نثری کتاب فیہ مافیہ ہے اور اس کی اشاعت اول کا سہرا ہندوستان کے ایک عالم مولانا عبدالماجد دریابادی کے سر ہے۔

مولانا کی شہرت کا اصل سبب مولانا کی تیسری اور منظوم کتاب مثنوی معنوی ہے، اس کتاب کو یوں تاریخ میں نہایت مقبولیت حاصل رہی، اس کے باضابطہ درس ہوتے رہے، علماء نے اس کی شروحات لکھیں، یہ محفلوں میں تلاوت ہوتی رہی، واعظوں نے اس کے اشعار سے اپنے خطابوں میں جان پیدا کی اور سالکوں نے اس کی جوت سے اپنے سفر سلوک کی منزلوں کا نشان حاصل کیا۔

مثنوی کے بارے میں ایک شعر مشہور ہے:

مثنوی مولوی معنوی ، ہست قرآن در زبان پہلوی

یعنی مولانا روم کی مثنوی تو فارسی زبان کا قرآن ہے۔

مثنوی کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ شمس تبریزی کے غائب ہو جانے کے بعد جب مولانا کو ایک گونہ ٹھہراو پیدا ہوا تو ان کے مرید حسام الدین چلپی نے مولانا سے درخواست کی کہ منطق الطیر کے انداز پر ایک مثنوی تصنیف فرمائیں، حضرت کو یہ بات پسند آئی اور اس طرح مثنوی کی تصنیف شروع ہوئی، کم وبیش پندرہ سال میں مثنوی کے چھ دفتر مکمل ہو گئے اور ساتواں دفتر مولانا کی وفات کی وجہ سے نامکمل رہ گیا۔

مثنوی ایک بیانیہ مثنوی ہے جس میں مختلف قصے، اسرار و مواعظ اور حکمت و درو جمع کر دیئے؛ لیکن اس میں کوئی موضوعاتی ترتیب نہیں ہے، بلکہ غیر مرتب انداز میں واقعات نظم کئے گئے ہیں اور ان کے ذریعہ راہ سلوک کے معارف، دینی حقائق، طریقت کے غوامض اور زندگی کے رازہائے دروں کو آشکار کیا گیا ہے۔

مثنوی کے چھ دفاتر میں تقریباً 2666 اشعار ہیں، ان اشعار میں علم وحکمت کے ایسے گنجینے ہیں کہ طالبان راہ حق ان پر دیوانہ وار ٹوٹتے ہیں لیکن ان کے خزینے ختم نہیں ہوتے، مولانا علی میاں نے لکھا ہے کہ

> مثنوی نے عالم اسلام کے افکار وادبیات پر بڑا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا، اسلامی ادب میں ایسی کتابیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں، جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقے کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا، [illegible] سے مسلسل دنیائے اسلام کے عقلی، علمی، ادبی حلقے اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو حرارت بخش رہی ہے۔

مثنوی آج بھی زندہ وتابندہ ہے، بیسوی صدی جس میں عالم اسلام پر دوبارہ مادیت اور حسیت کا حملہ ہوا ہے اور یوروپ کے نئے فلسفے اور سائنس نے قلب و ذہن کو شک وارتیاب کی وادی میں دھکیل دیا ہے، غیبی حقائق پر ایمان کمزور ہو رہا ہے، ایسے میں ہماری قدیم میراث جس میں عقلی دلائل سے غیبی حقائق کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی فرسودہ ہو گئی ہے، لیکن مثنوی کا فطری اسلوب اور نفسیاتی طریق استدلال نوجوان نسل کے شک وشبہات کے دائرے میں گھرے ہوئے ذہن کو مطمئن کر رہا ہے اور لوگوں کو مثنوی کی بدولت دوبارہ دولت ایمان نصیب ہو رہی ہے۔

24.15 مکتوبات امام ربانی

امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کا شمار نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام کے اجلہ صوفیہ میں ہوتا ہے ان کے اثرات ہندوستان کے علاوہ وسط ایشیاء بلکہ افریقی ممالک تک پہنچے، اور سلسلہ نقشبندیہ کو دراصل ان کی مساعی جمیلہ نے ہی وسعت عطا کی اور ان کی وجہ سے ہی اس سلسلہ کو قبولیت ملی۔

مجدد الف ثانی کی اس غیر معمولی کامیابی کے پیچھے سب سے اہم سبب ان کا طریقہ کار ہے، ان کے افکار ونظریات تصوف کی تاریخ میں اہمیت کے حامل تھے لیکن ہر وقت ضرور تھے، خاص طور پر وحدۃ الوجود کی فضاء میں انہوں نے ایک مستقل نظریہ وحدۃ الشھود پیش کیا، جس نے روایت پسند صوفیہ کو فوری طور پر اپنی جانب متوجہ کر لیا، اور علماء وصوفیہ کے درمیان جو خلیج چلی آ رہی تھی وہ بڑی حد تک کم ہو گئی۔

مجدالف ثانی نے اپنے افکار کی اشاعت کے لئے خطوط کا سہارا لیا، انہوں نے مختلف علاقوں کے علماء امراء وحکام اور اپنے مریدین کو خطوط لکھ کر اپنے نظریات وافکار سے آگاہ کیا، اور آپ کا یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ بہت کم عرصہ میں آپ کے نظریات ہند اور بیرون ہند پھیل گئے۔

مجدد الف ثانی کے مکاتیب کا مجموعہ ''مکتوبات امام ربانی'' کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوا ہے جو دفتر کہلاتے ہیں، دفتر اول میں 313 مکتوبات ہیں، اصحاب بدر کی تعداد کے مطابق خطوط کی یہ تعداد مجدد الف ثانی کی زندگی میں بلکہ گوالیار کی اسیری سے قبل مرتب ہوئی، اس کے مرتب خواجہ یار محمد بدخشی تھے، دفتر اول کے مکتوبات میں تصوف کے تمام مقامات واحوال، مثلاً عروج و ہبوط، فناء وبقا، مراقبہ ومشاہدہ، جذب وسلوک، جلال وجمال، ذات وصفات حق تعالیٰ، مقام عبدیت اور سیر الی اللہ وغیرہ کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

دفتر دوم کے مکتوبات اسماء حسنیٰ کے مطابق 99/ مکتوبات پر مشتمل ہیں، ان کا دوسرا نام نور الخلائق ہے، ان کو 1619 میں خواجہ عبدالحی نے جمع کیا تھا، اس دفتر میں خطوط کی تعداد تو کم ہے، لیکن زیادہ تر خطوط بہت مفصل اور کتابچوں کے انداز کے ہیں۔

دفتر سوم کے مکتوبات قرآن پاک کی سورتوں کی مناسبت سے 114 ہیں، اس دفتر کی تدوین وترتیب کا کام میر محمد نعمان نے شروع کیا تھا اور خواجہ محمد ہاشم نے مکمل کیا، یہ مجموعہ 1622 میں مرتب ہوا، اس میں وہ خطوط ہیں، جو حضرت نے گوالیار کی اسیری میں لکھے اور لشکر شاہی میں قیام کے دوران لکھے، یہ دفتر معرفۃ الحقائق کے نام سے مشہور ہے، بعد میں اس مجموعہ میں دس خطوط کا اور اضافہ کیا گیا اس طرح خطوط کی تعداد 124 ہوگئی۔

ان تینوں دفتروں میں مجموعی طور پر 536 مکتوبات ہیں اور مکتوب الیہم کی تعداد 192 ہے، مکتوبات میں ایک وہ ہیں جن میں لوگوں کے دریافت کردہ مسائل کا جواب ہے، دوسرے وہ جن میں حضرت نے ازخود اپنے افکار کی وضاحت کی ہے اور شریعت مطہرہ کے لئے مکتوب الیہ کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا ہے، حضرت کے مکاتیب کسی ایک طبقے یا گروہ کے لئے نہیں ہیں، بلکہ ان کے مخاطب علماء، صوفیہ، امراء وحکام اور آپ کے مریدین سب طرح کے لوگ ہیں، ان خطوط میں آپ نے جو منفرد بات کہی ہے اور پوری اسلامی میراث میں جس کی اس طرح وضاحت کہیں اور نہیں ہے وہ ہے صوفیانہ تجربات کی حقیقت، یعنی سالک کو راہ سلوک میں جو تجربات ہوتے ہیں اور وہ جن روحانی کیفیات سے گذرتا ہے ان کی حقیقت کیا ہے؟ اسی ضمن میں آپ نے نظریہ وحدۃ الشہود بھی پیش کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ سالک جب غلبہ حال میں صرف ذات واحد کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس ذات کے علاوہ ہر وجود کی نفی کر دیتا ہے تو حقیقتاً ہر وجود معدوم ہوتا ہے یا اس کی حقیقت کچھ اور ہے اور یہ سالک کے لئے فریب نظر ہی ہوتا ہے۔ مجدد الف ثانی کا خیال ہے کہ سالک کے لئے یہ کیفیت صرف ایک مشاہداتی کیفیت ہوتی ہے، اور یہ ایک درمیانی منزل ہے سالک کو اس سے آگے گزرنا ہوتا ہے، یہاں رکنا نہیں ہے، جب سالک اس سے آگے گزر جاتا ہے تو اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ صرف ایک وجود کو ہی تنہا وجود تسلیم کرنے کی کیفیت عارضی تھی، خدا کا وجود الگ وجود ہے اور مخلوقات کا وجود الگ وجود ہے، اس لئے مجدد الف ثانی نے اس مقام کو وحدۃ الشہود کا نام دیا ہے۔

مکتوبات امام ربانی کو غیر معمولی قبولیت حاصل ہوئی، ان کے مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئے، ان پر حواشی لکھے گئے، مختلف ملکوں میں ان کی اشاعت عمل میں آئی، ترکی میں ایک پورا وقف ہے جو مجدد الف ثانی کے مکتوبات کو شائع کرتا ہے، یوروپ میں بھی ان مکتوبات کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے، اہل یوروپ نے ان مکتوبات پر یا مکتوبات کی روشنی میں مجدد الف ثانی کے افکار و نظریات پر کتابیں لکھی ہیں۔

24.16 التکشف عن مہمات التصوف

مولانا اشرف علی تھانوی پچھلی صدی کے ایک عظیم صوفی اور مرشد تھے، انہوں نے بے شمار کتابیں لکھیں اور مختلف موضوعات کو اپنی فکر کی جولانگاہ بنایا؛ لیکن ان کا اصل دائرہ گفتگو تصوف اور اصلاح رسوم تھا۔ انہوں نے بیان القرآن کے نام سے تفسیر لکھی اس میں بھی تصوف سے متعلق آیات کی الگ سے تفسیر لکھی، تربیت السالک تو ان کی معرکہ آراء تصنیف ہے، جس میں تصوف کے غوامض کی نہایت لطیف پیرائے میں عقدہ کشائی کی ہے۔

مولانا تھانوی 1280ھ میں پیدا ہوئے، دارالعلوم دیوبند سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد کانپور میں مدرس ہو گئے، اسی دوران حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت ہو گئے، حج کے سفر میں حضرت حاجی صاحب سے باضابطہ اجازت لے کر واپس آئے اور حاجی صاحب کے مشورہ سے ہی تھانہ بھون میں خانقاہ قائم کر کے لوگوں کے لئے فیض رسانی کا سلسلہ شروع کیا جس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

مولانا نے تصنیف و تالیف اور اصلاح و تربیت کے ساتھ مواعظ کا سلسلہ بھی جاری رکھا، آپ کے مواعظ سینکڑوں کی تعداد میں چھپ کر مقبول عام ہو چکے ہیں، ان مواعظ میں تصوف کے دقیق نکتے نہایت آسان زبان میں بیان کئے، مثنوی مولانا روم کے اشعار کی دلنشیں تشریح کی اور اس کثرت سے کی کہ ان مقامات کو یکجا کر کے مثنوی کی ایک ضخیم شرح تیار ہو گئی۔

خاص تصوف کے موضوع پر مسائل السلوک من کلام الملوک کے علاوہ فصل السبیل، التشرف فی احادیث الحقوق، حقیقۃ الطریق، من السنۃ الانیقہ، تربیۃ السالک، عرفان حافظ وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

تصوف کے راستہ کے محققین کے لئے آپ نے ''التکشف عن مہمات التصوف تصنیف فرمائی یہ کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے''، پہلا حصہ حقیقت ہے دوسرا طریقت، تیسرا حقوق طریقت، چوتھا تحقیق کرامت اور پانچواں دیگر مضامین پر مشتمل ہے۔

التکشف عن مہمات التصوف بلاشبہ ایک اعلی درجہ کا تحقیقی کام ہے، اس میں پوری تاریخ تصوف میں موضوع بحث بنے ہوئے مسائل جیسے وحدۃ الوجود، اور شخصیات جیسے حسین بن منصور حلاج وغیرہ پر نہایت متوازن اور مبسوط کلام ہے اور ان کو محمل حسن پر اتارنے کی کوشش کی ہے، حقیقت اور طریقت کے موضوع پر نہایت عالمانہ گفتگو کر کے ان کے بارے میں شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، حافظ شیرازی کے اشعار کی صوفیانہ شرح بھی اس میں شامل ہے۔

معلوم کی جانچ

1. فوائد الفوائد کس کے ملفوظات ہیں؟
2. قوت القلوب کا مکمل نام کیا ہے؟
3. ہندوستان میں تصوف پر لکھی جانے والی پہلی کتاب کا نام بتائے؟
4. امام غزالی کے استاد کون تھے؟
5. فتوح الغیب کس کی تصنیف ہے؟
6. شیخ اکبر کس صوفی کا لقب ہے؟
7. مولانا تھانوی کس سے بیعت تھے؟

24.17 خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کی تاریخ میں بالکل ابتداء سے ہی اہم ترین کتابیں لکھی جاتی رہیں، اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، ہر دور میں صوفیہ کرام نے اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق کتابیں لکھیں اور ان کے ذریعہ لوگوں کو تصوف کی حقیقت سے آگاہ کیا، ان کتابوں میں کچھ تو باضابطہ تصنیفات ہیں، کچھ خطوط و رسائل کا مجموعہ ہیں، کچھ افادات و ملفوظات ہیں، اور کچھ سوالات و جوابات ہیں، ان کتابوں کے اندر بڑا تنوع ہے۔ مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے تصوف کی 12/ صد سالہ تاریخ سے کچھ اہم کتابیں منتخب کر کے ان کا تعارف کرایا ہے، مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو تصوف کی میراث کی اہم ترین کتابوں سے واقفیت ہو جائے اور ان کے مصنفین سے متعارف ہو جائیں، اور ان کتابوں کے مضامین اور مباحث سے یک گونہ مناسبت پیدا ہو جائے۔

24.18 نمونہ کے سوالات

1. الرعایۃ لحقوق اللہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. کشف المحجوب کا تعارف کرائیے۔
3. فوائد الفواد کے مضامین کا خلاصہ لکھیے۔
4. عوارف المعارف کا تعارف کرائیے۔
5. مکتوبات امام ربانی پر ایک نوٹ لکھیے۔

24.19 فرہنگ

استفادہ	فائدہ حاصل کرنا
تخریج	کسی کتاب میں وارد آیات واحادیث کی نشاندہی کرنا اوران کے مصادر کا ذکر کرنا۔
استماع	سننے کی خواہش یا طلب کرنا
پیرایہ	طریقہ، اندازِ بیان
ورع	خوف
خود بینی	خودکو دیکھنا، خودکو پسند کرنا
تادیب	ادب سکھانا
طاؤس	مور
اجلہ صوفیاء	بڑے صوفیاء
مستنبط	حاصل شدہ، ماخوذ
مکاتبات	خط وکتابت
جادۂ مستقیم	سیدھا راستہ
زمانی تقدم	زمانے کے لحاظ سے پہلے ہونا
صیقل	چمک
قرطاس	کاغذ
تسوید	کتاب یا مضمون کورف لکھنا
خرمن	آشیانہ، مکان
عصمت	گناہ سے محفوظ رہنا
متبع	پیروکار
دوچند	دوگنا
معرکتہ الآراء	زبردست

اثنائے سیاحت	سفر کے دوران
غوامض	جمع غامض : پوشیدہ
منصۂ شہود	منظرِ عام
کنہیات	حقائق سے متعلق
مرغوبات	جمع مرغوب : پسندیدہ
گنجینہ	خزانہ
بدیع	انوکھا
ارتیاب	شک وشبہ
مساعی جمیلہ	اچھی کوششیں
تدوین	جمع کرنا
جولانگاہ	میدان

24.20 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. تصوف اسلام : از عبدالماجد دریابادی۔
2. روشنی کا سفر : پروفیسر اختر الواسع۔